بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن نمبر

سیارہ ڈائجسٹ



کیا مومنوں کے لیے اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لیے جھک جائیں؟

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

تہدیہ

اُن نوجوانوں کے نام :

جو آج کے مادہ پرستانہ ماحول اور بے سروپا نظامِ تعلیم میں گھِر کر بھی قرآن کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔

اُن جانبازوں کے نام :

جو قرآن کا عَلَم بلند رکھنے کے لیے قربانیاں دیتے چلے آ رہے ہیں۔

اُن ماؤں اور بہنوں کے نام :

جو قرآن کی تعلیمات کو آسان بنا کر نئی نسلوں کی طرف منتقل کرنے والے ہیں۔

اُن اساتذہ و مُصنّفین کے نام :

جنہوں نے گھروں کی فضاؤں کو نغمۂ قرآنی کی گونج سے مالا مال کر رکھا ہے۔



جلد اول میں کیا ہے

عاشقانِ رسولؐ کی خدمت میں

سیّارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز، دلکشا اور رُوح پرور پیش کش

فرمانِ رسولؐ نمبر



شائع ہوگیا ہے

❀

اللہ کے آخری پیغمبرؐ کے ارشاداتِ گرامی کا ایک ایک زرّیں، نُورافشاں اور مقدّس لفظ جو عالمِ انسانیت کی ظاہری اور باطنی زندگیوں کی مکمل فلاح کا باعث ہے

سیّارہ ڈائجسٹ ۱۶۔ بی ساندہ روڈ۔ لاہور فون: ۷۲۴۵۴۱۲

دستک

لیجیے، اس بار ہم آپ کے نہاں خانۂ قلب کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں، جہاں ایک ایسا روزن کُھلتا ہے جس میں سے آیات و تجلیاتِ الٰہیہ اور روحانی و ملکوتی حقائق و اسرار کی کرنیں داخل ہوتی ہیں اور حیاتِ جسمانی کے خاکدانِ تاریک کو روشن کر دیتی ہیں —— بشرطیکہ آدمی نے خود ہی اس روزن کو بند نہ کر رکھا ہو!

آپ کے دل کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے ہمارے ہاتھوں میں ایک ایسا ارمغانِ محبت ہے، جس سے بہتر کوئی چیز اپنے عزیز ترین برادرانِ ملّت و حلقۂ احبابِ انسانیت کی خدمت میں پیش کرنا ہماری استطاعت سے باہر ہے۔

یہ ہدیۂ اخلاص "قرآن نمبر" ہے!

قرآن نمبر ہم ایسے ممتاز تاریخی مرحلے پر پیش کر رہے ہیں جبکہ ہم نزولِ قرآن کے انقلاب آفریں واقعہ پر چودہ صدیاں پوری کر کے پندرھویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں —— سامنے وہی ماہِ رمضان ہے جو نزولِ قرآن کا مبارک مہینہ ہے اور جس کے ساتھ بار بار آنے والی لیلۃ القدر ایک ہزار چار سو مرتبہ ہمارے سامنے نُور پاش ہو چکی ہے۔

پچھلے رمضان سے اس رمضان تک کا پورا سال واقعۂ نزولِ قرآن پر چودہ صدیاں پُوری ہو جانے کی تقاریبِ مسرّت کے لیے وقف رہا ہے۔ یہ تقاریب بڑے جوش و خروش سے منائی گئیں۔ محفلیں اور جلسے، زیبائش اور آرائش، جھنڈیاں اور قمقمے، تقریریں اور تحریریں، کیا کچھ نہیں ہوا۔

ہم نے ان تقاریبِ مسرت میں اپنا ناچیز سا حصّہ ادا کرنے کا یہ راستہ منتخب کیا کہ انسانیت کی کتابِ رہنما GUIDE BOOK کے متعلق ایک ایسا دستاویزی مجموعہ قوم کے سامنے رکھا جائے جو نہ صرف دلچسپ، مفید معلومات و تصاویر اور مقالات و واقعات پر مشتمل ہو، بلکہ اس میں مؤثر رُوحِ تذکیر کارفرما ہو۔ سیارہ ڈائجسٹ کا قرآن نمبر ہمارے لیے بھی اور ہمارے قارئین کے لیے بھی اس حقیقت کی یاددہانی ہو کہ ہمارا نظریاتی، ملّی اور تہذیبی وجود خدا کی کتاب اور اس کے پیغام و قانون کے بل پر قائم ہے یہی کتاب ہمارے عروج و ترقی کا باعث بنی، اسی کا حق ادا نہ کرنے کی پاداش ہم مدت سے دنیا کے گوشے گوشے میں بھگت رہے ہیں، —— اور اب وقت آگیا ہے کہ ہمارا بچہ بچہ اپنی پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کرنے کے لیے عزمِ نو کے ساتھ اٹھ کھڑا ہو اور قرآن پاک کو مشعلِ راہ بنا کر اخلاقی و مادی دونوں طرح سے متوازن ترقی و کامرانی اور فلاح و سعادت کی راہ پر گامزن ہو۔

یہ نمبر اگر یاددہانی کے اس مقصد میں کسی درجے میں بھی کامیاب نکلے تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی

قرآن نمبر کو پیش کرتے ہوئے جہاں ہمیں دلی مسرت ہے، وہاں اس امر کا شدید احساس بھی ہے کہ خدا کی کتابِ عظیم و مقدس کی تجلیات کاغذ کے اوراق پر لانے میں ہماری کوششیں نجانے کس درجہ ناقص رہی ہوں گی۔ بس اتنی بات باعثِ اطمینان ہے کہ سیارہ ڈائجسٹ کے مالکان اور مدیران و کارکنان کے علاوہ تحقیقی مقالات مرتب کرنے والی ٹیم نے حسنِ نیت اور طلب رضائے الٰہی کے ساتھ محنت و کاوش کی ہے۔ نیز جن بے شمار لکھنے والوں نے اس کارِ خیر میں حصہ لیا ہے ان سب نے اخلاص کے ساتھ کام کیا ہے۔

توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی کوتاہیوں سے صرفِ نظر فرما کر ہماری نیتوں اور کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

○

یہ قرآن نمبر اس لحاظ سے اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے کہ اس کے لیے دو تین سال مسلسل کام کیا اور کرایا گیا ہے۔ بے شمار کتب اور تحریروں سے استفادہ کیا گیا، برٹش میوزیم، ترکیہ کی لائبریریوں اور خود اندرونِ ملک متعدد اشخاص اور اداروں سے مقاماتِ نزولِ قرآن (و مقامات مذکور بہ قرآن) اور قرآنی رسم الخط کے مختلف نمونوں کے فوٹو حاصل کیے گئے ہیں۔ پھر اس نمبر کے لیے خاص طور پر نقشہ ارض القرآن تیار کرایا گیا ہے جو ملکی سرمایۂ علم میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

○

یہ بات تو ہر قاری خود محسوس کرے گا کہ تدوینِ مضامین سے لے کر طباعت تک ادارۂ سیارہ ڈائجسٹ نے صرفِ کثیر سے کام لیا ہے۔ لیکن اس مہم کو کاروباری ذہن سے بالاتر اور سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر شروع کیا گیا تھا۔ اس کی ایک واضح علامت یہ ہے کہ ہم نے اس نمبر میں ایسے اشتہارات کو شامل نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو کسی بھی لحاظ سے قرآن کے مقصد و پیغام اور احکام و قوانین کے خلاف ہوں۔ حتیٰ کہ جاندار تصاویر کے ساتھ بھی کوئی اشتہار قبول نہیں کیا گیا۔ نمبر کی ضخامت اور طباعتی معیار کے پیشِ نظر مالی لحاظ سے ہمارے اس فیصلے کے جو کچھ اثرات ہو سکتے ہیں، ان کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

○

بہرحال خدا کے کلام اور اس کی آخری الہامی کتاب کی اس ناچیز خدمت کو ہم اسی دعا کے ساتھ آپ کے ہاتھوں تک پہنچاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ادارے، نمبر کے مرتبین، اس کے قلمی معاونین، اس کے ایجنٹوں، اس کے مشتہرین، اس کے قارئین اور تمام مسلمانوں کو دنیا میں قرآنی ہدایت کے انوار سے نوازے۔ قرآنی نظامِ حیات کے قیام کی راہیں ہموار کرے اور آخرت میں قرآن اور حاملِ قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہم سب کے لیے ذریعۂ شفاعت بنائے! آمین!

نعیم صدیقی: مدیر اعزازی برائے قرآن نمبر
خورشید عالم مدیر: سیارہ ڈائجسٹ

سیارہ ڈائجسٹ

قرآن نمبر

دسمبر 2001ء

مُدیرِ اعلیٰ: امجد رؤف خان

مُدیر: شاہ جہاں

نائب مدیر: محمد ثاقب، کامران امجد

کتابت: علی احمد

کمپوزنگ: خرم احمد خان

نگران پرنٹنگ خالد محمود۔ محمد توفیق (لاہور)

سرکولیشن: محمد بشیر

ناظم اشتہارات: طارق محمود۔ خرم احمد لاہور۔ شائستہ ارم (کراچی)

فی جلد -/100 روپے　مکمل سیٹ -/300 روپے

خط و کتابت و رابطہ کیلئے: 16-بی سانده روڈ لاہور - فون: 7245412

امجد رؤف خان پبلشر نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر 16-بی سانده روڈ سے شائع کیا

قرآن نمبر

کا وسیع تر نظامِ ادارت

علمی مقالات و مضامین

تحقیق ۔ تدوین ۔ انتخاب و حصولِ نگارشات

نقشہ ارض القرآن کی تیاری

متعدد قرآنی مقامات اور قرآنی رسم الخط کے نمونوں کے فوٹو

بہ اہتمام

ادارۂ معارفِ اسلامی، کراچی

مدیرِ اعلیٰ

پروفیسر خورشید احمد

رفقاء و معاونین

سید ابوالخیر کشفی ○ مولانا افتخار احمد بلخی ○ سید معروف شاہ شیرازی

ممتاز احمد ایم اے ○ نثار احمد ○ شہزاد احمد ○ محمد کلیم ○ منور حسین

و دیگر احباب

واقعاتی داستانیں انٹرویوز مذاکرے

انعامی کہانیاں (مقابلہ)، فیچر، رپورتاژ، تاریخی داستانیں، تازہ واقعاتی رودادیں

چوکھٹوں کے لیے عبارات، مزید تصاویر و عکسیات

کتابت ، ڈیزائننگ ، ترتیب

بہ اہتمام

مدیرِ اعزازی قرآن نمبر

نعیم صدیقی

ڈائرکٹر ادارۂ مطالعہ و تحقیق ۔ لاہور

رفقاء و معاونین

سراج نظامی ○ عابد نظامی ○ محمد عالم مختار حق ○ نوید اسلام

جمیل رانا ○ جلال انور ○ عاصم نعمانی

دیگر حضرات

مالکان و ادارۂ سیّارہ ڈائجسٹ

و

جملہ مدیرانِ قرآن نمبر

اُن تمام حضرات کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں

جنھوں نے

قرآن نمبر کی ترتیب میں قلمی تعاون کیا، انٹرویوز دیے، تحریری مذاکروں میں حصہ لینے کے لیے وقت نکالا، ہمت افزا پیغامات بھجوائے یا مفید تجاویز اور مشوروں سے نوازا

— علی الخصوص —

ہم

ڈاکٹر الیاس مسعود — محمد عالم مختار حق،

اور

— ڈاکٹر عابد احمد علی۔ ایم اے علیگ —

ڈائرکٹر بیت القرآن، لاہور

کے بے حد ممنونِ احسان ہیں

نیز

ہمارے لیے مجلسِ تعلیماتِ پاکستان کے ارکان کا تعاون بھی بے حد قیمتی تھا جنھوں نے مجلس کا ایک خصوصی اجلاس قرآن نمبر کے سلسلے میں قرآنی تعلیم کے موضوع پر منعقد کیا

خدا اِن سب حضرات کو فلاحِ دارین نصیب کرے!

تزئین کاران:

سرورق : آفتاب ظفر

مختلف حصّوں کے ذیلی سرورق : اسلم کمال

عنوانات اور صفحات کی آرائش : سلیم اختر، فیاض طارق، بشیر احمد مرزا

نقشہ ارض القرآن کی فنی تکمیل

"الخطاط" لاہور

خوش نویس

نفیس رقم — محمد صدیق — عبدالرشید خاکی — ارشد جاوید

محمد سلیم کیلانی — عظمت علی — ارشاد حسین — غلام نبی بزمی

مختار احمد — محمد رفیق — محمد یوسف

فوٹوگرافی

محمد اشرف (اے۔ ون سٹوڈیوز)

آفسٹ کیمرہ آپریٹر : فلک شیر

ناظم طباعت : صالح محمد یوسف

قرآن نمبر جلد اوّل

پیغامات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفتیِ اعظم فلسطین السیّد محمد امین الحسینی (بیروت)

مجھے آپ کا گرامی نامہ ملا جس میں آپ نے قرآنِ کریم کے نزول کو چودہ صدیاں گزرنے پر ماہنامہ "سیّارہ ڈائجسٹ" کا خاص نمبر شائع کرنے کے سلسلے میں مجھ سے پیغام مانگا ہے۔ میں اس سلسلے میں چند سطور پیش کر رہا ہوں اور اللہ رب العزت سے دُعاگو ہوں کہ وہ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیابی سے سرفراز فرمائے اور آپ کو اسلام اور اہلِ اسلام کی بہتری کی توفیق عطا فرمائے۔

دُنیائے اسلام کی اطراف وجوانب کے جملہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ نزولِ قرآن کے اس واقعے کی یادگار منانے کا اہتمام کریں بلاشُبہہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو قیامت تک دوبارہ مُنعقد نہیں ہوگا۔ یہ واقعہ خاتم الانبیاء والرُّسل حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنِ حکیم کے نزول کا واقعہ ہے۔ قرآن انسانوں کے لیے ہدایت اور فرقان وہُدیٰ کے واضح دلائل کا مجموعہ ہے اور انھیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لانے کا ذریعہ ہے۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کے سابقہ پیغامات کی تصدیق و تاکید کے لیے آیا ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کیا جائے تو وُہ لفظ عقیدہ اور شریعت ہیں۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو پروردگار سمجھ کر اُس پر ایمان لایا جائے، جس کے سوا اور کوئی عبادت کے قابل نہیں اور اللہ کے رسُولوں پر ایمان لایا جائے جو انسانوں کے راہبر و ہادی تھے۔ اس میں اُخروی زندگی پر ایمان بھی شامل ہے۔

اور جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، اس سے مُراد وہ نظام ہے، جس کے مطابق ایک مسلمان کو زندگی بسر کرنی چاہیے کیونکہ اس میں ہماری حیاتِ اُخروی کی فوز و سعادت پوشیدہ ہے۔

جومسلمان دُوسرے مسلمانوں اور عام انسانوں کو اِس عقیدہ وشریعت کی طرف دعوت دیتا ہے، وہ نیک اعمال کی طرف اللہ کا قاصد ہے۔

صالح اوزجان (استنبول)

قرآنِ کریم وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے نازل فرمائی تاکہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر نورِ ہدایت کی طرف لایا جائے اور انھیں بندوں کی عبادت سے ہٹا کر خدائے واحد کی عبادت کی طرف متوجہ کیا جائے اور بتوں کے ظلم سے بچا کر اسلام کے عدل کی طرف لایا جائے موجودہ دَور میں، جبکہ دشمنوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور ہر طرف سے زمین کو ہمارے لیے تنگ کر دیا ہے۔ اللہ کی شریعت کے سوا ہمارا کوئی نجات دہندہ نہیں ہے۔

اِس دور میں ہر قسم کے مرض کا علاج قرآنِ حکیم کے اتباع میں پوشیدہ ہے۔ ان حالات میں ہمیں چاہیے کہ ہم اس طرح کتاب اللہ کی معرفت حاصل کریں جیسا کہ اس کا حق ہے۔

قرآن وہ کتابِ عظیم ہے جو مخلوقات کے حق میں ازلی نصبُ العین اور ابدی مُبصر ہے۔ عالمِ غیب اور دُنیائے شہادت کا مُفسّر ہے اور معنوی خزائن کا کشّاف ہے۔

قرآن قولِ شارح، تفسیرِ واضح، بُرہانِ قاطع اور ترجمانِ ساطع ہے۔ قرآن ضیاءُ الاسلام ہے، مُرشدِ حقیقی ہے اور ہادیِ انسانیت ہے۔ قرآن کتابِ شریعت ہے، کتابِ حکمت ہے، کتابِ عبُودیت ہے، کتابِ دُعا و رجاء ہے اور کتابِ ذکر وفکر ہے

جب سے ہم نے قرآنِ حکیم کی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور اُسے اپنے پسِ پُشت ڈال دیا تو شکست اور مغلوبی ہمارا مُقدّر بن گئی۔ ہم مُستقبل میں اللہ کی اسی کتاب پر عمل کر کے رفعت وبلندی حاصل کر سکتے ہیں۔ اللہ ہمیں اس کتاب کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بلاشبہہ وُہ سُننے والا، قبول کرنے والا ہے۔

اُبُوبکر القادری رباط (مراکش)

مجھے آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نزولِ قرآن کی چودہ صد سالہ تقریب پر

ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" کا عظیم الشان قرآن نمبر نکال رہے ہیں

حضرت سیّدُ الانام صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نزُول وہ عظیم الشّان ثقافتی انقلاب تھا جس کی نظیر چشمِ عالم نے آج تک نہیں دیکھی۔ خدائے عظیم وجلیل نے قرآن کریم اس لیے نازل فرمایا کہ وہ اُمّتِ اسلامیہ کے لیے روشنی کا کام دے اور دُنیا کی تاریکیوں میں اُن کی راہنمائی کرے نیز اُن کی زندگیوں کے تمام اُمور ومعاملات میں ہدایت ورہنمائی کا فریضہ سر انجام دے۔

ہمارے اسلاف قرآن حکیم کی تلاوت ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس کی تطبیق بھی کرتے تھے۔ اُن کی عبادت، اُن کے معاملات اور اُن کے تصرُّفات قرآنی تعلیمات و ہدایات کے عین مُطابق ہوتے تھے۔ وُہ اس کتاب کو چھوڑ کر زندگی بسر کرنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہی ان کی عزت اور خلود کا سبب تھا، لیکن افسوس آج کے مُسلمان قرآن سے بیگانہ ہو چکے ہیں اور اسی وجہ سے اس کی تعلیمات و ہدایات سے محروم ہیں۔ آج اگرچہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن وُہ سیلاب کے خس وخاشاک کی مانند ہیں۔ مختلف اطراف سے دیگر اقوام ان کے خلاف برسرِ پیکار ہیں جن میں صہیونیت کا مکر، صلیبیت کا کینہ اور استعمار کے حربے پیش پیش ہیں ـــــ اب اگر مُسلمان اپنی ذلّت کو عزّت، شکست کو فتح، بدحالی کو خوش حالی، انتشار کو وحدت اور کمزوری کو قُوّت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں انھیں قرآن کی طرف لَوٹنا چاہیے۔

عبداللہ العقیل (الکویت)

قرآن کریم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہے جو اس نے اپنے آخری رسُول اور ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی تاکہ وہ انسانی زندگی کے دستور کا کام دے۔ دُنیائے انسانیت اسی کی روشنی میں اپنی منزل متعین کرے اور اسی کے احکام کے تحت قانون سازی کا کام ہو۔

قرآن حکیم جس کے نزول کو چودہ صدیاں گذر چکی ہیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے نہیں نازل فرمایا تھا کہ ہم غور وتدبر اور عمل کے بغیر ہی اس کی آیات کی تلاوت کرتے رہیں۔



قرآن حکیم اس لیے بھی نہیں کہ اس کے ذریعے سے محلات کی دیواروں کو مزین کیا جائے اور نہ ہی اس لیے ہے کہ مُردوں پر اس کی تلاوت کی جائے۔ بلکہ اس کے نزول کا مقصد ان تمام باتوں سے کہیں زیادہ عظیم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیشہ انسانوں کے لیے کتاب ہدایت کا کام دے، لوگ اس سے روشنی، ہدایت اور رہنمائی حاصل کریں اور اللہ کی زمین میں اللہ کا نظام قائم کریں۔

مولانا سید ابُوالاعلیٰ مودُودی

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوُئی کہ آپ "سیّارہ ڈائجسٹ" کا قرآن نمبر شائع کر رہے ہیں۔ میری دِلی دُعا ہے کہ نہ صرف یہ نمبر ہر لحاظ سے کامیاب رہے بلکہ یہ اپنے وسیع حلقۂ قارئین کے سینوں میں ایمان کی روشنی کو تیز تر کرنے کا وسیلہ ثابت ہو اور اسے مُرتّب کرنے والوں، اس میں لکھنے والوں اور اس کے مطالعہ کنندگان کو خداوندِ کریم دُنیا و آخرت میں فلاح و سعادت نصیب فرمائے۔

مولانا ظفر احمد عُثمانی

آپ نے قرآن نمبر شائع کرنے کا اِرادہ کیا ہے۔ اس سے بے حد خوشی ہوُئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو کامیاب و کامران فرمائے۔

جسٹس بی۔ زیڈ۔ کیکاؤس

قرآنِ پاک کی تعلیم کو بُھلا دینے کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس نہ دُنیا ہے، نہ آخرت۔ اگر اللہ کی کتاب کے بتائے ہوُئے ایک اُصول پر بھی ہم کاربند ہو جاتے تو آج ہماری حیثیت کچھ اَور ہوتی۔ اوّل تو ہم قرآنِ پاک کو پڑھتے کم ہیں اور پڑھتے ہیں تو عمل کم کرتے ہیں۔ بہت ضرورت ہے ہم کو اسے بار بار پڑھنے اور اس پر عمل کرنے



کی۔ آپ قرآن نمبر شائع کر کے بہت نیکی کا کام کر رہے ہیں۔ پروردگار آپ کو اور بھی نیکی کی توفیق دے۔

آپ نے فرمایا ہے کہ مَیں اپنی زندگی کا کوئی واقعہ قرآن مجید کے متعلق ہو تو تحریر کروں۔ مجھے اب تک وہ سماں نہیں بھُولتا۔ میرے گھر کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ میری عُمر اس وقت دس گیارہ سال کی تھی۔ مَیں مسجد میں بیٹھا تھا اور کوئی اس جگہ سُورۂ بقر کی شروع کی آیات پڑھ رہا تھا۔ ان آیات کو سُن کر میرے قلب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ سُنتا ہی جاؤں۔ مَیں گانا سُننے کا اس وقت بھی بہت شوقین تھا۔ گو میری عُمر تھوڑی تھی، لیکن جو کچھ مَیں سُن رہا تھا، اس سے کسی گانے کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہ رہی تھی کہ قرآن پاک اللہ کا کلام ہے۔ میرا احساس ہی یہ تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

مُلّا واحدی دہلوی

ابتدائے اسلام میں قرآن و حدیث کی خدمت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ مشہور ائمۂ فقہ اور مشہور ائمۂ حدیث ہی نے نہیں، بے شمار عُلما نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے اور علم و عرفان کے دریا بہائے۔ کئی سَو سال یہی حال رہا۔ پھر ساری توجہ صرف فِقہ، یعنی قوانین ماخوذ از قرآن و حدیث کی طرف کر لی گئی۔ خود قرآن و حدیث مہجور ہو گئے۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں یہ حال تھا کہ شہنشاہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مناظرے اور مباحثے کرایا کرتا تھا۔ عیسائی پادری قرآن مجید کا حوالہ دیتے تھے تو مسلمان عُلما مُنہ تکنے لگتے تھے۔ اُس وقت مولانا شاہ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے اسے محسوس کیا اور احادیث پر زور دیا۔ پھر مولانا شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فارسی میں اور اُن کے دو بیٹوں مولانا شاہ رفیع الدینؒ اور مولانا شاہ عبدالقادرؒ نے اردو میں قرآن مجید کے لفظی اور بامحاورہ ترجمے شائع فرمائے۔ اَوروں کے بھی ترجموں پر ترجمے شائع ہوُئے۔

سیّدی خواجہ حسن نظامیؒ جب عام فہم تفسیر القرآن یا تشریح القرآن تیار کر رہے تھے، تو روزانہ اُن کا مسوّدہ میرے پاس آ جاتا تھا اور مَیں بعد نمازِ مغرب اُسے چند مولوی صاحبان کو دکھاتا تھا۔ ایک شام مجلسِ عُلما جمی ہوئی تھی کہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا عبدالماجد دریابادی پہنچ گئے۔ دونوں نے بہت

دیر خاموشی ۔۔۔ سے کام کرتے دیکھا اور آخر میں مولانا محمد علی جوہر نے فرمایا: قرآن ہیرا ہے۔ اسے جتنا گھسا اور رگڑا جائے "ا" چمکتا ہے۔ اس پر غور و فکر تا قیامت ختم نہیں ہوگا"۔

قرآن ۔ ۔ سے غفلت برت کر اور اس پر تدبر کرنا چھوڑ کر مسلمانوں نے اپنا یہ حشر بنایا ہے۔

قابلِ مبارکباد ہیں کارپردازانِ ماہنامہ "ستیارہ ڈائجسٹ" جو قرآن نمبر نکال رہے ہیں۔ مجھے جہاں تک علم ہے فقط ایک ماہنامے نے اور قرآن نمبر نکالا تھا۔

جسٹس چودھری محمد افضل چیمہ

مجھے یہ معلوم کر کے انتہائی مسرت ہوئی ہے کہ "ستیارہ ڈائجسٹ" کا قرآن نمبر جو یقیناً بصیرت افروز اور بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہوگا عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

اس پُرآشوب دَور میں عالمِ اسلام بشمولِ پاکستان جن گوناگوں مسائل سے دوچار ہے غالباً اسلامی تاریخ میں ایسی سنگینیٔ حالات کی مثال نہیں ملتی ۔۔۔۔ ایک طرف اینگلو امریکن طاقتوں کی سازش سے جنم لینے والا اسرائیل ہمارے مقاماتِ مقدسہ اور فلسطینی بھائیوں کے لیے خطرۂ عظیم اور باعثِ عذاب بنا ہوا ہے ۔۔۔۔ اور دُوسری طرف سوشلزم مختلف صُورتوں میں کبھی اسلام کے رُوپ میں اور کبھی مزدُوروں کے ساتھ ہمدردی اور خیرخواہی کے بھیس میں ہماری اعتقادی اور فکری بنیادوں پر حملہ آور ہے۔ ان سازشوں سے پاکستان کے اندر اور دیگر اسلامی ممالک میں ایک شدید فکری اور ذہنی انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ ایسے سنگین اور پُرفتن حالات میں "ستیارہ ڈائجسٹ" کا قرآن نمبر شائع کرنا بلاشُبہ وقت کی اہم ترین ضرورت اور مُلک و ملّت اور اسلام کی عظیم الشان خدمت ہے۔ یہ حقیقت بھی نہایت واضح ہے کہ پاکستان کے دو حصّوں کو جو ایک ہزار میل سے زیادہ دُوری پر واقع ہیں جوڑنے والا واحد رشتہ قرآن پاک ہی کا رشتہ ہے۔ اور خدا کی اسی کتاب مُقدس نے مختلف زبانیں بولنے والوں کو جمع کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ ہمارے عظیم ترین مُفکرین کے بلند پایہ مضامین اس ذہنی انتشار اور سیاسی بحران کو رفع کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ آپ اس قسم کی مساعی کو سلسلہ وار انداز میں جاری رکھیں۔

مولانا علم الدین سالک

بارُعب شخصیت، کردار مُستقیم اور ٹھوس، ایمان کے جلال اور رُوحانیت کے جمال کا امتزاج، طلبہ کے لیے مجسمۂ شفقت، بالادستوں کے سامنے پیکرِ صداقت۔

—— عابد نظامی

مولانا سالک کے نام اور کام سے کون واقف نہیں، وہ حال ہی میں اسلامیہ کالج لاہور سے وائس پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً چالیس سال نوجوان نسل کو تعلیم دینے میں گزارے ہیں۔ اُن کے شاگردوں نے ہر شعبۂ زندگی میں نام پیدا کیا ہے۔ شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ، سردار عبدالقیوم، سردار محمد ابراہیم اور جسٹس یعقوب علی خاں جیسے مشاہیر اور حمید نظامی، عبداللہ بٹ اور شورش کاشمیری جیسے عظیم صحافی ان میں شامل ہیں۔ اُن کے سیاسی کارناموں سے بھی اکثر لوگ واقف ہیں۔ انہوں نے تحریکِ خلافت، کانگریس، کشمیر کمیٹی اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر اپنے ہم وطنوں کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور حافظہ بے حد قوی ہے۔ جو کتاب ایک دفعہ نظر سے گزر جائے اس کے مطالب ذہن میں جڑ پکڑ جاتے ہیں اور ضرورت کے وقت مستحضر رہتے ہیں۔ تحریر و تقریر پر یکساں قدرت حاصل ہے مگر خیالات کی تیزی اور روانی کا ساتھ زبان دے جاتی ہے قلم نہیں دے سکتا۔ موجیں مارنے والے اس بحرالعلوم کو تیز قلم کاتب کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔

ہمارے ہاں استاد یا معلّم کا جو روایتی تصور پایا جاتا ہے اس لحاظ سے دیکھیں تو دورِ جدید کے لاہور میں ۔۔۔۔ چند ہی معلمین ملیں گے جو ہمارے ملی تصور پر پورے اترتے ہوں۔ گنتی کے اُن اساتذہ میں جو لاہور کا سرمایۂ افتخار ہیں' ایک مولانا علم الدین سالک بھی ہیں۔

وسیع مطالعے پر مبنی قابلیت' اپنے مضامین (بلکہ دوسرے کئی مضامین) پر خاصا عبور' شخصیت بارعب، کردار مستقیم اور ٹھوس، ایمان کے جلال اور روحانیت کے جمال کا امتزاج، طلبہ کے لیے مجسمۂ شفقت، بالادستوں کے سامنے پیکرِ صداقت' رفتار میں ہمواری، گفتار میں نرمی و

دلداری ــــــ اِن صفات کے ساتھ سالک صاحب نے اپنی زندگی کا معتدّبہ دَور طالبانہ ذہنیت سے بہت بلند رہ کر گزارا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد اور ہم مرتبہ اساتذہ ہی نہیں، اسلامیہ کالج کے پرنسپل صاحبان اور انجمن کے کارپردازان تک سب ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ وہ جب وائس پرنسپل نہیں تھے تب بھی پیش آمدہ معاملات میں اُن کی رائے سارے سٹاف میں وزنی محسوس کی جاتی تھی۔ خدا نے اُن کو ان کی دینی سرشت کی وجہ سے زمانے کی بہت سی ایسی بیماریوں سے محفوظ رکھا جن سے آج کسی کا بچے رہنا "خلافِ معمول" بات ہو گئی ہے ــــــ یعنی اکابر کے سامنے خوشامد اور قصیدہ خوانی اور اصاغر کے سامنے کبرو تبختر اور ہم سروں کے ساتھ معاملۂ تحقیر و تمسخر!

الحاج مولانا علم الدین سالک محض ایک ریٹائرڈ استاد ہی نہیں ــــــ بلکہ خدا اور رسولؐ سے سچی وابستگی رکھنے والے دردمند مسلمان بھی ہیں۔ قرآن کو ان کی فکری دنیا میں مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ جب تک کالج میں رہے، اُن کے دم سے ہمیشہ دینی تقاریب کا اہتمام ہوتا رہا۔ اچھے اچھے موضوعات پر مختلف اصحاب کو تقاریر کے لیے مدعو کرنا انہی کے ذوق کا کرشمہ تھا۔ آج سے کچھ عرصہ قبل اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں فقیر خانہ کے قرآنی نوادر کی ایک نمائش کا انتظام کیا گیا۔ اس نمائش کے موقعے پر ایک اجلاس بھی منعقد ہوا جس میں مولانا سالک نے قرآن، علومِ قرآن اور قرآن سے متعلقہ فنون کے تاریخی نشوونما پر ایک نہایت فاضلانہ تقریر کی۔ کاش کہ وہ تقریر محفوظ کی گئی ہوتی۔ اس میں معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ تھا۔

اسی تقریر کی یاد محرک بنی کہ سالک صاحب کا انٹرویو حاصل کر کے "قرآن نمبر" میں شامل کیا جائے۔ میرا خیال تھا کہ بعض دوسرے مشاہیر کی طرح مولانا بھی خوشی خوشی انٹرویو دینے پر آمادہ ہو جائیں گے مگر ان کی خدمت میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ اتنا آسان نہ تھا۔ میں نے انٹرویو کے لیے عرض کیا تو فرمایا:

"مجھے انٹرویو سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انٹرویو بڑے آدمیوں کا ہوتا ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔ عرض کیا:

"مولانا! اگر آپ چھوٹے آدمی ہیں تو پھر بڑا آدمی کس کو کہتے ہیں؟ رہا انٹرویو سے دلچسپی کا معاملہ تو آپ کو دلچسپی نہ سہی لیکن ہمیں تو آپ کی باتوں سے دلچسپی ہے اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ سیارہ ڈائجسٹ کے قارئین بھی آپ کے ارشادات میں ضرور دلچسپی لیں گے۔"

مولانا نے میری ایک نہ سُنی اور اپنی بات پر قائم رہے۔ باتوں باتوں میں قرآن مجید کا موضوع چھڑ گیا۔ مولانا کی طبیعت رواں ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا قرآنی علوم و معارف کے دفتر کھل گئے۔ میں نظر بچا کر کاپی پر کچھ نوٹ کرتا تو مولانا فوراً ٹوک دیتے:

"کچھ لکھو نہیں۔"

"مولانا! میں علم کا یہ خزانہ ضرور محفوظ کروں گا۔ آپ مجھے منع نہ کریں۔"

میری اس بات پر مولانا نرم پڑ گئے۔ فرمایا:

"اپنا سوالنامہ مجھے دے جاؤ، میں تیاری کے بعد انٹرویو کے لیے بلا لوں گا۔"

میں سوالنامہ دے کر چلا آیا۔ کئی ہفتے گزر گئے مگر مولانا کی طرف سے بلاوا نہ آیا۔ آخر ایک روز میں اور پروفیسر خالد بزمی پھر اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے، معلوم ہوا سوالنامہ مولانا سے کہیں گُم ہو گیا ہے ــــــ بہر حال مولانا کا انٹرویو جس طرح حاصل کیا گیا، وہ ایک طویل اور صبر آزما داستان ہے، جس سے شاید قارئین کو کوئی دلچسپی نہ ہو گی۔ ہاں اتنا

جان لینا کافی ہے کہ مولانا جیسے شاہین کو زیرِ دام لانے میں کئی ہفتے صرف ہوئے اور بعض اوقات تو باقاعدہ "گھیراؤ" کی تکنیک بھی استعمال کی گئی۔

مولانا سے انٹرویو کے لیے ۲۷ر جولائی کا دن مقرر ہوا۔ اس روز اتوار تھا۔ میں اور پروفیسر خالد بزمی صبح سویرے ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ صوفے پر بیٹھتے ہی میں نے سوال کیا:

"مولانا! آج کل بعض لوگ کہتے ہیں کہ بچوں کو قرآن مجید ناظرہ پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں، انہیں ترجمے سے پڑھانا چاہیئے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

مولانا نے فرمایا:

"آپ نے بیٹھتے ہی سوالات شروع کر دیئے ــــــ چلیے چائے پی کر آرام سے باتیں کریں گے۔"

بزمی صاحب بولے:

"مولانا چائے آتی رہے گی۔ جب تک کچھ بات چیت ہو جائے۔"

میں نے اپنا سوال دہرایا تو مولانا نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا:

"جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ سب سے پہلے سرسید گروپ کے مولوی نذیر احمد نے سرسید کی ہاں میں ہاں ملائی ــــــ کہ قرآن مجید بچوں کو طوطے کی طرح نہیں رٹانا چاہیئے بلکہ اس کا مفہوم و مطلب بھی ان کے ذہن نشین کرانا چاہیے، مگر آخر عمر میں مولوی صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے اس بات کی تردید کی اور کہا کہ بچپن میں بچوں کا گلا اور اُن کی رگیں نرم و نازک اور ملائم ہوتی ہیں۔ اس عمر میں اگر انہیں قرآن مجید کی قرأت سکھا دی جائے تو وہ بڑی آسانی سے حروف کی صحیح ادائیگی پر قدرت حاصل کر سکیں گے۔ اگر خدا توفیق دے اور اُن کی قسمت میں یہ سعادت ہو تو وہ ترجمہ بڑے ہو کر سیکھ لیتے ہیں لیکن اگر بڑے ہونے تک ناظرہ ہی پڑھنا نہ آتا ہو تو ممکن ہے ذہن میں قرآن خوانی اور ترجمہ دانی کا شوق ہی نہ رہے۔ اس لیے میری رائے میں قرآن حکیم بچپن میں بالکل نہ پڑھانے سے صرف ناظرہ پڑھانا بہر حال فائدہ مند ہے۔"

"مولانا! آج کل کچھ لوگ حدیثِ رسولؐ کے بغیر قرآن فہمی کا دعوٰی کرتے ہیں۔ کیا حدیث کے بغیر قرآن فہمی ممکن ہے؟"

"ہرگز نہیں ــــــ" مولانا نے فرمایا: "حدیثِ رسولؐ کے بغیر قرآن مجید کو ہرگز ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا۔ سب سے زیادہ قرآن انہی لوگوں نے سمجھا تھا جنہوں نے خود صاحبِ قرآن سے قرآن کی تفسیر سُنی تھی۔ میری آرزو ہے کہ تعلیمی اداروں میں جہاں قرآن مجید پڑھایا جائے وہاں حدیثِ رسولؐ بھی ضرور پڑھائی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور سیرتِ طیبہ کے بغیر قرآن سمجھنا ناممکن ہے۔ باقی رہا حدیثِ رسولؐ کے بغیر قرآن فہمی کا دعوٰی کرنے والے تجدد پسند ــــــ تو میرے نزدیک ان کی زندگیوں میں اسلام داخل ہی نہیں ہوا ــــــ"

تجدد پسندوں کا ذکر آیا تو میں نے پوچھا:

"مولانا! آپ موجودہ زمانے کی کن کن تفاسیر سے متاثر ہوئے ہیں؟"

"میں نے ابھی عرض کیا ہے میں تفسیر بالحدیث کا زیادہ قائل ہوں۔ بخاری اور مسلم کا مطالعہ قرآن فہمی میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ تاہم موجودہ زمانے کی تفسیروں میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیریں بہت اچھی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تفسیر بھی علمیاتیت

کے رد میں خوب ہے ——— ترجموں میں مجھے مولانا محمود حسنؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ترجمے پسند ہیں۔"

"یہ فرمائیے کہ آپ کو قرآن مجید سے دلچسپی کیونکر پیدا ہوئی؟"

مولانا نے نہایت پُرسکون لہجے میں جواب دیا:

"جب میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا تو وہاں ناظرہ قرآن مجید بڑے اہتمام سے پڑھایا جاتا تھا۔ پھر ایسے حالات ہوئے کہ میں دیال سنگھ کالج میں داخل ہو گیا۔ وہاں قرآن مجید کا کوئی پیریڈ نہ تھا۔ بس شعر و شاعری اور کرکٹ کا زور تھا۔ اس ماحول میں مجھے بھی شاعری کی لت پڑ گئی ——— وہاں پروفیسر کے ایم میترا ہمیں عربی اور فارسی پڑھاتے تھے ایک روز انہوں نے مجھے بلایا اور شعر و شاعری میں میری بڑھتی ہوئی دلچسپی پر سرزنش کی۔ پوچھا:

"تم غالبؔ اور نظیریؔ بن سکتے ہو؟"

ڈرتے ڈرتے عرض کیا:

"جی نہیں۔"

"تو پھر بے کار جھک مارنے سے حاصل؟ مسلمانوں کے لیے اقبالؔ اور ظفر علی خاں دو شاعر کافی ہیں۔ تم تاریخ میں تحقیق کرو۔ اور ہاں سنو! تم قرآن مجید پڑھتے ہو یا نہیں؟"

عرض کیا: "پڑھتا ہوں۔"

پوچھا: "ترجمے سے یا ناظرہ؟"

عرض کیا: "ناظرہ"

بولے: "ترجمے سے پڑھا کرو، بلکہ بہتر ہے تفسیرِ حقانی دیکھا کرو۔ اس سے تمہیں شرح صدر ہو گی اور تمہاری زندگی میں انقلابِ عظیم برپا ہو گا۔ تم میں سادگی، بے خوفی اور بیباکی جیسی اسلامی خوبیاں پیدا ہوں گی۔"

اس کے بعد سالک صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور سامنے دیوار پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا:

"شرح صدر کا لفظ میں نے زندگی میں سب سے پہلے اپنے پروفیسر کے ایم میترا سے سُنا تھا۔ ہائے کیا زمانہ تھا کہ ہندو اُستاد مسلمان طلبہ کو ایسی تعلیم دیا کرتے تھے اور آج یہ زمانہ ہے کہ مسلمان لیکچرار کلاس رُوم میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اُڑاتے ہیں۔"

پھر ایک لمحہ توقف کے بعد فرمایا:

"آج کل تعلیم گاہوں میں اُستاد کو ملازم رکھنے کے لیے فرسٹ ڈویژن اور سیکنڈ ڈویژن جیسی باتیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تعلیم گاہ میں فرسٹ کلاس فسٹ ایم اے اُستاد تو آ جاتا ہے لیکن وہ مُلحد و زندیق بھی اُسی درجے کا ہوتا ہے۔ نتیجۃً طلباً دین سے بے گانہ ہو جاتے ہیں آج نئی نسل میں خدا کی ہستی اور اس کے دین کے بارے میں شکوک و شبہات اور غیر ملکی نظریات سے شغف بلکہ ان سے مرعوبیت محض اسی وجہ سے ہے۔ بے دین اور مُلحد اساتذہ اپنے طلباء کو مذہب بیزار بنا دیتے ہیں۔ اور اس قلبِ ماہیئت کے لیے وہ ایمان کو تحلیل کر دینے والے زہر تکنیک کے ہلکے ہلکے لطیف ڈوز استعمال کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اُستاد کی شخصیت میں قرآنی اثر کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اساتذہ کے تقرر کے وقت اس چیز کو بالخصوص معیار قرار دینا چاہیے۔ اساتذہ کے ذمے گلشنِ ذہن کی آبیاری کا فریضہ ہے۔ اُن کی زندگیوں میں قرآنی اثر ہو گا تو لازماً طلبہ اُن سے فیضیاب ہوں گے۔ اسی طرح والدین اور ائمہ مساجد بھی قرآنی اثر میں ڈوبے ہوئے ہونے چاہئیں۔ آپ یقین کریں کہ میں کالج میں اُن لڑکوں کو جماعت سے نکال دیتا تھا جو صبح قرآن مجید پڑھ کر نہیں آتے تھے۔

اتنے میں چائے آ گئی۔ نہایت لذیذ اور پُرتکلف۔ پھر چائے کا دَور چلا اور ساتھ ہی ساتھ علمی جرعات بھی چھلکتے رہے لیکن اس دوران میں مولانا کی گفتگو تفصیل

سے نوٹ نہ کر سکا۔ خاص خاص منتشر باتیں مختصراً یہ تھیں:

★ "حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآنی وظائف پڑھنے چاہئیں۔ اس سے اگرچہ بعض اوقات نتائج دیر میں مترتب ہوتے ہیں لیکن وہ نہایت دیرپا ہوتے ہیں۔"

★ "برِصغیر میں سب سے پہلے مولانا عثمان خیرآبادی نے (ناصر الدین محمود کے عہد میں) فارسی میں تفسیر لکھی۔ وہ چقندر اور پالک بیچتے تھے اور لوگوں کو مفت قرآنی تعلیم دیتے تھے۔"

★ "درسِ نظامی جدید علوم سے عاری ہے۔ یہ مغلوں کے دورِ انحطاط کی یادگار ہے۔ بہادر شاہ کے زمانے میں مولوی نظام الدین سہالوی نے اسے مرتب کیا اور اُسی زمانے میں یہ مدرسوں میں پڑھایا جانے لگا"———

★ "حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کتاب، سنت اور اجماع کا نام ہے۔"

★ "ہندوستان میں سب سے زیادہ قرآن مجید کی خدمت چشتی سلسلے کے صوفیوں نے کی۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کا جماعت خانہ ہر وقت تلاوت قرآن کی آوازوں سے گونجتا رہتا تھا۔ ان کے ہاں سماع تک میں قرآن خوانی ہوتی تھی اور اس پر لوگوں کو وجد و حال آتا تھا۔"

★ "حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو خلافت عطا فرماتے وقت قرآن مجید کا ایک نسخہ عطا فرمایا اور کہا بادشاہوں کو تاجپوشی کے وقت تلوار پیش کی جاتی ہے، میں تمہیں سلطان الہند بناتا ہوں اور تلوار کی بجائے قرآن پاک دیتا ہوں۔"

★ "بابر نے خطِ بابری ایجاد کیا اور اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھ کر مکہ مکرمہ بھیجا۔"

★ "۱۰۴۳ ہجری میں جب دارا شکوہ لاہور آیا تو اس وقت یہاں تیس ہزار حفاظ موجود تھے۔"

★ "علامہ اقبالؒ کی زندگی میں قرآن نے عظیم انقلاب پیدا کیا۔ اگر علامہ میں قرآنی اثر نہ ہوتا تو وہ جوشؔ جیسے شاعر ہوتے۔"

★ "ابن مقفع (صاحبِ کلیلہ و دمنہ) ایک خوش الحان مسلمان بچے سے قرآن مجید سُن کر مسلمان ہو گیا تھا۔"

★ "کئی مسلمان علماً اور صوفیاء نے خطاطی کا پیشہ اختیار کیا اور اسے درجۂ کمال تک پہنچایا چنانچہ مولانا علی متقی نے صرف ایک ورق پر قرآن مجید لکھا جو بخوبی پڑھا جا سکتا تھا۔"

★ "فیضی نے قرآن پاک کی تفسیر سواطع الالہام لکھی جس میں کوئی منقوط حرف استعمال نہیں کیا گیا۔"[1]

چائے کے بعد پھر باقاعدہ گفت گو کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا اب پہلے کی نسبت زیادہ چاق چوبند نظر آ رہے تھے۔ میں نے پہلو بدلتے ہوئے ان سے سوال کیا:

"کیا آپ کے ابتدائی زمانے کی نسبت اب لوگوں میں قرآن خوانی کا شغف کم ہو گیا ہے؟"

"جی ہاں۔" مولانا بولے۔

"ہمارے زمانے میں صبح سویرے مسلمان گھروں

---

[1] یہ عجیب تفسیر فیضی کی ذہانت ہی کا کمال نہیں، بلکہ اس سے عربی زبان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ (ایڈیٹر)

سے تلاوتِ کلامِ پاک کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں مسجدوں میں تراویح کے لیے جگہ نہ ملتی تھی۔ شبینہ کا رواج عام تھا۔ نتیجتہً مسلمانوں میں یہ بگاڑ نہ تھے جو آج قرآن پاک سے دُوری کی وجہ سے اُن میں پیدا ہو گئے ہیں۔ ہمارے بچپن میں عورتیں گھروں میں آٹا گوندھتے وقت بھی قرآن خوانی کیا کرتی تھیں۔"

"آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ علماء اور صوفیاء قرآن پاک کی خطاطی کیا کرتے تھے۔ کیا آپ اس سلسلے میں تفصیل سے کچھ بتائیں گے؟"

مولانا نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر ایک تاریخ دان کے انداز میں بولے:

"بابا فرید گنج شکرؒ کے خاندان سے ایک بزرگ شیخ جنید حصاریؒ ہوتے ہیں۔ آپ کا زمانہ سلاطین لودھی کا زمانہ ہے۔ آپ جید عالم اور صاحبِ دل بزرگ تھے۔ حافظِ قرآن بھی تھے۔ آپ نے تحصیلِ علم سے فراغت حاصل کر کے حصار کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ وہاں سے اسلام، علومِ اسلامیہ اور خاص طور پر قرآن پاک کی تعلیمات کی اشاعت شروع کی۔ آپ نے ساری عمر درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ کبھی کسی امیر یا صاحبِ ثروت کے آستانے پر نہیں گئے۔ خطاطی سے روزی پیدا کرتے تھے۔ زُود نویسی میں اس قدر کمال حاصل تھا کہ بعض لوگ اسے آپ کی کرامت پر محمول کرتے تھے۔ چنانچہ صاحبِ اخبار الاخیار فرماتے ہیں کہ آپ تین دن میں پورا قرآن حکیم مع اعراب لکھ لیا کرتے تھے۔ اس سے یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیئے کہ آپ درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر کے کتابت کیا کرتے تھے بلکہ درس و تدریس کے بعد فرصت کے وقت آپ یہ فریضہ سر انجام دیتے تھے۔"

"اسی طرح سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے مریدانِ باصفا میں شیخ فخر الدین مروزیؒ ایک خاص مقام اور مرتبے کے مالک تھے۔ آپ مروز کے رہنے والے تھے۔ تحصیلِ علم کے لیے دہلی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اکلِ حلال کے لیے کتابت کا پیشہ اختیار کیا۔ جب تک انگلیاں کام کرتی رہیں اور آنکھوں نے ساتھ دیا آپ نے کتابت ہی سے روزی کمائی۔ قرآن پاک کی کتابت دلی ذوق و شوق سے کرتے تھے۔ قرآن پاک کے حافظ تھے، اس لیے آپ کو کتابت میں سہولت اور آسانی تھی۔"

"اس کے کچھ مدت بعد ایک بزرگ مولانا جلال الدین مانک پوریؒ ہوئے جو زبردست مفسر اور محدث تھے ——— درس و تدریس زندگی کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ ذریعہ معاش مصحف پاک کی کتابت تھی۔ آپ دہلی سے دُور رہتے تھے۔ قرآن پاک کتابت کر چکتے تو دہلی ارسال کر دیتے۔"

"اس کے علاوہ بعض بزرگ ایسے بھی گزرے ہیں جو خوش نویس نہ تھے مگر زادِ آخرت کی خاطر قرآن پاک کے نسخوں کی تصحیح کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا آزاد بلگرامی اور صاحبِ "تذکرہ علمائے ہند" برصغیر کے ایک فاضل مولانا میر محمد جان کے حالات میں بیان فرماتے ہیں کہ جب وہ ہجرت کر کے مدینہ میں آباد ہو گئے تو ان کا دل پسند مشغلہ یہی تھا کہ دن بھر قرآن حکیم کے نسخوں کی تصحیح میں مشغول رہتے تھے۔"

مولانا بڑی روانی سے بول رہے تھے۔ خطاطینِ قرآن کے تذکرے کے بعد وہ رُکے تو میں نے عرض کیا:

"مولانا! اگلے ہاتھوں صوفیاء کی قرآنی خدمات اور شغف کے بارے میں بھی کچھ ارشاد فرما دیجیے۔"

مولانا نے صوفے سے ٹیک لگائی اور پُر سکون لہجے میں کہا:

"حضرت سید محمد حسینی گیسو درازؒ سلسلہ چشتیہ

کے زبردست رُکن تھے۔ آپ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلیفہ تھے۔ دکن میں تبلیغِ اسلام کا بیشتر کام آپ ہی کے ہاتھوں سر انجام پایا۔ آپ سے ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ آپ کا مسلک کیا ہے؟ اور آپ کی فتوحات کا سبب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

"فتحِ کارِ من بیشتر از تلاوتِ قرآن و سماع بُود۔"

"آپ کا معمول تھا کہ دن میں دو مرتبہ درس دیتے تھے۔ یعنی چاشت اور نمازِ ظہر کے بعد۔ آپ نے قرآنِ پاک کی دو تفاسیر لکھیں، جن کے مطالعے سے آپ کی عظیم الشان علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ان دونوں تفاسیر کے بے حد مدّاح ہیں۔

"اس کے بعد حضرت مولانا عبدالقدوس گنگوہیؒ ہیں جو سلسلہ چشتیہ صابریہ کے ممتاز رُکن تھے۔ آپ جید عالم اور صوفیِ صافی تھے۔ مُلّا بدایونی آپ کی روحانیت اور علمی قابلیت کا بے حد معترف تھا۔ آپ کے صاحب زادے مولانا رکن الدین سے حضرت مولانا کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"پدرِ بزرگوارِ من از اولیاء بودند۔ تلاوتِ قرآن را وظیفہ داشتند و رسائلِ شرعیہ مطالعہ کردند۔"

اس مقولے سے حضرت گنگوہیؒ کے ذوقِ قرآن خوانی کا پتا چلتا ہے۔

"شاہجہان کے زمانے میں ایک بزرگ شیخ ابوالمعالیؒ تھے۔ امن و سکون کا دور دورہ تھا۔ رعایا خوش حال تھی۔ گھر گھر علم و ادب کے چرچے تھے۔ بادشاہ قدر دان اور امیر شوقین تھے۔ ان کی معارف نوازی اور ادب پروری کے افسانے ایران و عراق تک پھیلے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے اہلِ کمال قدر دانی کے خیال سے کھنچے چلے آتے تھے۔ اُن کی وجہ سے شاہجہان آباد رشکِ عالم بنا ہوا تھا۔ ہر مسجد ایک دارالعلوم اور ہر محلّہ ایک دارالفنون تھا۔"

"شیخ ابوالمعالیؒ شاہ جہان آباد پہنچے۔ ایک مسجد کے حجرے میں قیام کیا۔ کچھ عرصے تک گمنامی کی حالت میں پڑے رہے۔ حافظِ قرآن ہونے کے علاوہ ہفت قرأت کے بھی ماہر تھے۔ آواز میں سوز و گداز تھا۔ خوش الحان اتنے تھے کہ جب قرآن کریم کی تلاوت ترتیل سے کرتے تو سنگ دل سے سنگ دل انسان کا دل بھی موم ہو جاتا۔ جب آپ کی شہرت شہر میں ہونے لگی تو ایک امیر نے موقع پا کر بادشاہ کی خدمت میں آپ کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے اسی وقت فرمان بھیج کر آپ کو دربار میں طلب کر لیا۔

"رمضان کا مہینہ تھا۔ بادشاہ اور امیر روزے سے تھے۔ دربار کی فضا برکات اور روحانیت سے لبریز تھی۔ شاہجہاں نے خواہش ظاہر کی کہ شیخ رمضان المبارک کے متعلق آیات تلاوت فرمائیں ——— شیخ نے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ... الخ۔ والی آیات تلاوت کیں۔ بادشاہ پر رقّت طاری ہو گئی۔ جب شیخ نے یہ آیات ختم کیں تو بادشاہ نے انہیں مکرر پڑھنے کو کہا۔ اب شیخ نے دوسری قرأت میں ان کی تلاوت کی۔ بادشاہ پہلے سے زیادہ متأثر ہوا۔ غرضیکہ شیخ نے ان آیات کو ہفت قرأت میں سنایا۔ بادشاہ اُن کے کمالِ فن سے بہت مسرور ہوا۔ انہیں شمس القراء کا خطاب دیا اور بلگرام کے قریب مددِ معاش کے طور پر جاگیر بھی عطا کی۔"

سالک صاحب اس طرح بول رہے تھے جیسے اُن کے سامنے بے شمار کتابیں کھلی ہوئی رکھی ہوں حالانکہ کتاب تو درکنار اُن کے سامنے کوئی ایسا کاغذ بھی نہ تھا جس

پر اشارات لکھے ہوتے۔ ستر برس کے بزرگ کا اتنا قوی حافظہ میرے لیے بڑی حیران کن بات تھی۔ اتنے میں سالک صاحب کے کوئی مہمان آ گئے۔ گھڑی پر نظر پڑی تو معلوم ہوا چار گھنٹے گزر چکے ہیں۔ طے پایا کہ کل شام کو پھر کچھ باتیں ہوں گی۔

دوسرے روز پیر کو حاضر ہوا تو سالک صاحب میرے منتظر تھے۔ پہلے چائے کا دَور چلا اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ میں نے پوچھا:

"مولانا آج کل تجوید و قرأت کے مقابلے ہوتے ہیں ان کی افادیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

سالک صاحب نے اپنے سر سے ٹوپی اُتار کر میز پر رکھی اور سر کو کھجاتے ہوئے کہا:

"تجوید کے مقابلے میرے نزدیک محض تسکینِ نغمہ کی خاطر ہوتے ہیں۔ اس سے لوگوں کی توجہ قرآن کی رُوح کی طرف نہیں بلکہ آواز کی طرف مرکوز رہتی ہے۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کا بچہ قرآن مجید سنتا تھا تو زمین پر لوٹتا تھا۔ حضرت زبیرؓ نے اسے بلایا اور کہا خبردار! تم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے زیادہ قرآن فہم نہیں ہو۔ یہ زمین پر لوٹنا بند کرو۔"

اس کے بعد سالک صاحب کچھ لمحوں کے لیے رُکے اور پھر بولے:

"بات یہ ہے، ہر چیز کی رُوح ہی اس کی اصل ہوتی ہے۔ رُوح نہ رہے تو وہ چیز ختم ہو جاتی ہے —— قرآن تسکینِ نغمہ کے لیے نہیں ایک عظیم انقلابی کتاب ہے۔ اسے جو لوگ تسکینِ نغمہ بناتے ہیں وہ اس کی رُوح سے مستفیض نہیں ہو سکتے۔"

میں نے عرض کیا:

"مولانا! اس دور میں ہر طرف ریڈیو اور ٹیلیویژن سے گندے گانے اُمڈ رہے ہیں۔ اگر کچھ لوگوں (خصوصاً نوجوانوں) کی توجہ قرأت و تجوید کی طرف منعطف کی جائے تو کیا یہ بہتر صورت نہ ہو گی؟ قرآن کے ساتھ نغمگی ہو بھی تو کم سے کم وہ نغمگی ایک اچھے پیغام اور ایک پاکیزہ کلام کا لباس بنے گی۔ اس سے وہ فسادِ قلب و نظر تو پیدا نہ ہو گا جو فلمی اور ریڈیائی اور ثقافتی نغمگی سے ہوتا ہے؟"

مولانا نے پوری توجہ سے میرا سوال سُنا —— اور فرمایا: ——

"قرآن مجید موسیقی کی جگہ لینے اور گنڈے تعویذ کے لیے نازل نہیں ہوا تھا۔ اس کے الہامی الفاظ براہِ راست انسانی قلوب پر دستک دیتے ہیں۔ انہیں نغمات کے سہاروں کی ضرورت نہیں۔ وہ کونسی نغمگی تھی جس نے حضرت عمرؓ کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا؟"

"اچھا مولانا! یہ بتایئے کہ نئی تعلیمی پالیسی کے پیشِ نظر قرآن حکیم کی تعلیم کے کیا انتظامات ہونے چاہئیں؟"

اس سوال کے جیسے وہ منتظر تھے، بولے:

"اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ ہائی سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں قرآن مجید ترجمے کے ساتھ پڑھایا جائے تاکہ آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے پیغام کو سمجھ سکیں۔ اس کے ساتھ عربی زبان اور کلاسیکی ادب اور گرامر کا پڑھانا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر مطلب سمجھنے میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے۔ دوسرے قرآن کریم عربوں کے قدیم محاورے کے مطابق نازل ہوا تھا۔ بعض ایسے الفاظ ہیں جن کے معانی جدید عربی میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ہر زبان کا کلاسیکی ادب اس ماحول کا عکاس ہوتا ہے جس ماحول میں وہ قوم اور اس قوم کا معاشرہ ان ایام میں متداول تھا۔ اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ کلاسیکی ادب درحقیقت ایک قوم کا 'کلچر' ہوتا ہے۔

قرآن طوطے کی طرح رٹا دینا کافی نہیں کیونکہ اس وقت طلبہ کی نظر نہ تو قرآنی تعلیمات پر ہو گی اور نہ ہی وہ اس کے مطالب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ نیز قرآن کریم کا ترجمہ پڑھانے والے اساتذہ ایسے ہونے چاہئیں جن کی زندگی اور ہر نقل و حرکت قرآنی ارشادات کے مطابق ہو۔ دوسرے لفظوں میں اُستاد کو خود نمونہ بن کر لڑکوں کے سامنے آنا چاہیے، اگر ایسا نہ ہو گا تو پھر اس تعلیم کا مقصد فوت ہو جائے گا۔"

"مولانا! ہندوستان کے غیر مسلموں نے بھی قرآن سے کوئی اثر قبول کیا یا نہیں؟"

مولانا چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئے۔ ان کی ژرف بین نگاہیں عالمِ تصور میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ سوچ کی گہرائیوں سے اُبھرتے ہوئے انہوں نے کہنا شروع کیا:

"جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو اُن میں ایسے بزرگ بھی تھے جن کی زندگی سرِ مو سنّتِ نبویؐ سے اِدھر اُدھر نہ تھی۔ اُن کے معاملات سُنّت کے عین مطابق تھے۔ اس لیے ابتدائی دور میں صرف سلف صالحین کی زندگی ہی باعثِ تبلیغ بن جایا کرتی تھی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں انحطاط واقع ہوتا گیا اور معاملہ درس و تدریس کی حد تک رہ گیا۔ ہندوستان میں تین مسلمان بادشاہوں نے یہ کوشش کی کہ یہاں کا کلچر یک زبانی ہو۔ اُن میں سُلطان زین العابدین بڈشاہ والیٔ کشمیر نے کوشش کی اور کشمیری پنڈتوں کو فارسی پڑھنے اور حکومت میں دخیل ہونے کی دعوت دی۔ اس کے بعد سکندر لودھی نے ایسا کیا۔ آخر میں اکبرِ اعظم نے یہی کام کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے جو درس و تدریس میں حصہ لیتے اور مسلمانوں کے علوم و فنون پڑھایا کرتے تھے۔ سکندر لودھی کے زمانے میں پنڈت ڈونگر مل درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ کشمیر میں بعض لوگوں نے درس و تدریس میں حصہ لیا اور مسلمانوں کی کتابیں پڑھیں۔ شروع شروع میں انہوں نے اپنا نام بدستور رہنے دیا مگر جب اسلام اُن میں سرایت کر گیا تو انہوں نے اپنے نام بھی تبدیل کر لیے اور حلقۂ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ جن لوگوں نے نام تبدیل نہ کیے۔ اُن میں پنڈت جوہر ناتھ کا نام سرِفہرست ہے۔ انہوں نے قرآن، تفسیر اور حدیث کا علم حاصل کیا۔ حج کے لیے حجاز گئے اور ابنِ حجر عسقلانیؒ سے حدیث کی تکمیل کی۔ اِسی طرح اور بھی بہت سے واقعات ہیں جو تاریخ کی ورق گردانی سے یکجا کیے جا سکتے ہیں۔"

مغرب کا وقت قریب تھا۔ نماز کے بعد مولانا کو کہیں تشریف لے جانا تھا، اس لیے میں نے آخری سوال کیا:

"آپ اپنے بزرگوں کی قرآنی خدمات اور قرآن سے ربط کے بارے میں کچھ بتائیں۔"

"اپنے بزرگوں کی قرآنی خدمات"! مولانا نے فرمایا۔ میں فقط اپنے والد حاجی جلال الدینؒ کو جانتا ہوں۔ وہ بالکل اَن پڑھ تھے لیکن جب وہ اسلام کے بارے میں گفتگو کرتے اور قرآن کے نکات بیان کرتے تو کسی کو یقین نہ آتا کہ وہ اَن پڑھ ہیں۔ بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے انہیں صدقِ مقال اور رزقِ حلال کی توفیق بخشی تھی۔ بُرائیوں سے اجتناب برتتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا:

"جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ دو نمازوں کے سوا میں نے سب نمازیں مسجد میں باجماعت پڑھی ہیں۔ ایک بار میں سخت بیمار تھا اور دوسری دفعہ اتنی شدید بارش تھی کہ میں مسجد میں نہ جا سکا۔"

مولانا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

جن دنوں وہ اپنی فٹن چلایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک گانگا اور اس کا آشنا ان کی فٹن میں سوار ہو کر دریا

پڑ گئے۔ بارش سخت ہو رہی تھی۔ نماز کا وقت آیا۔ والد نے وضو کیا۔ نماز پڑھی اور سجدے میں گر کر رو رو کر اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ میں فقط اتنی آسودگی چاہتا ہوں کہ وقت پر نماز پڑھ لیا کروں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور ایک وقت آیا کہ وہ بیس تانگوں کے مالک تھے اور شہر میں معزز ترین انسان سمجھے جاتے تھے۔ اُن کا عام وطیرہ یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد مولانا نجم الدین پروفیسر اورنٹیل کالج کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ یہ درس مسجد خوجیاں اندرون موچی گیٹ میں ہوا کرتا تھا۔

"میرے والد نے پہلے اپنے بچوں کو قرآن پاک پڑھایا اور بعد میں سکولوں میں داخلہ دلوایا۔ اس کے علاوہ ہر کام قرآن و حدیث کی روشنی میں کرتے اور اس معاملے میں کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔ یہ قرآنِ پاک کی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ میرے سب بھائیوں نے قرآنِ کریم پڑھا۔ والد صاحب جب تک زندہ رہے ہم سب بھائی اُن کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے اور درس سننے جاتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے خاندان میں اب تک بچے کو پہلے قرآنِ پاک ناظرہ پڑھایا جاتا ہے اور اس کے بعد اسکول میں داخل کرایا جاتا ہے۔"

قریب کی مسجد سے مغرب کی اذان ہوئی تو مولانا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُٹھتے اُٹھتے میں نے پوچھا:

"مولانا! "قرآن نمبر" کے قارئین کے لیے کوئی پیغام!"

"اچھا" مولانا نے فرمایا۔ "سورۃ بقرہ کی یہ آیات میری طرف سے قرآن نمبر کے قارئین تک بطور پیغام پہنچا دیں:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ
الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ
الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى
حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ
السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ
وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

ترجمہ:- "(مسلمانو!) نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کر دو یا مغرب کی طرف کرو۔ نیکی اُن کی ہے جو اللہ اور روزِ قیامت اور ملائکہ اور کتابوں اور نبیوں پر یقین رکھیں اور اپنا مال اللہ کی محبت میں قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کی ضروریات اور (غلامی وغیرہ سے مظلوموں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں لگائیں اور نماز پڑھتے رہیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں اور جو عہد کریں اپنے عہد کو پورا کریں اور مفلسی، بیماری اور حالتِ جنگ میں صابر رہیں۔ یہ لوگ صادق ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔"

سالک صاحب کا انٹرویو لے کر کھیتوں میں سے گزرتا ہوا میں نہر کے قریب پہنچا تو شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا مگر مجھے اس بات کی بے پایاں خوشی تھی کہ میں "سیارہ ڈائجسٹ" کے قارئین کے لیے قرآنی انوار سمیٹ لایا تھا ——— شاید کچھ لوگوں کے سینوں کے افق سے صبحِ نو نمودار ہو سکے!

———

"قومیں اگر اپنے کو اس (کتاب) میں تلاش کریں گی تو پالیں گی۔ جماعتیں اور مختلف طبقے اگر اپنے کو اس آئینہ میں دیکھنا چاہیں گے تو دیکھ لیں گے۔ افراد۔ ہم اور آپ۔ اگر اپنے کو تلاش کرنے نکلیں گے تو انشاء اللہ ناکام واپس نہیں ہوں گے"

نعیم صدیقی

سید کرامت حسین جعفری

(پرنسپل ایم۔اے۔او کالج، لاہور)

قرآن نمبر کے لیے زندگی اور علوم کے متعلق جو مختلف عنوانات ہم نے سوچے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ قرآن کی راہنمائی علم النفس میں کیا ہے، یا یہ کہ نفسیات پر کیا روشنی پڑتی ہے۔ راقم الحروف برابر اس تلاش میں رہا کہ اس موضوع پر کوئی ایسی شخصیت سامنے آئے جس سے مضمون لکھوایا جائے یا انٹرویو لیا جائے۔

عجیب اتفاق ہوا۔ ایک مجلسِ احباب میں شرکت کا موقع ملا۔ جہاں دو چیزیں وجہ جاذبیت ہوئیں۔ ایک تو چائے یا کافی تھی، دوسری علمی نوعیت کی بات چیت اس نئی قسم کی مجلس نیاز مندانِ لاہور ——— بلکہ نیاز مندانِ پاکستان و عالمِ اسلام و بنی نوع آدم (یہ کوئی تنظیمی ہیئت نہیں تھی) جس میں شامل ہونے والے ہر فرد کے دل میں سارے جہاں کا درد حقیقی معنوں میں سمٹا ہوا تھا اور ہر کوئی اپنا درد علمی گفتگو میں لپیٹ لپیٹ کر دوسروں تک پہنچا رہا تھا اور جواباً یہی سوغات دوسروں سے وصول کر رہا تھا۔ (اس لحاظ سے اسے مجلس دردمندانِ لاہور و پاکستان وغیرہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا) یہ گویا درد و کرب کی ایک چھوٹی سی مارکیٹ تھی جس کا لین دین غیر کاروباری اور غیر منفعت بخش تھا۔ بلکہ یہ وہ لوگ تھے جن کی زندگیاں خسارے میں نفع دیکھنے میں گذری ہیں ——— اور انشاء اللہ تادمِ آخر اسی طرح گذریں گی۔ مگر غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے کہ دو ایک کو چھوڑ کر بقیہ اصحاب شاعر ہرگز نہیں تھے، بلکہ ادیب ہونے کے خطرے سے بھی محفوظ تھے ——— اور مزید خوشی کی بات یہ کہ زیادہ تر اصحاب سخت قسم کے "غیر سیاسی" تھے، اور سیاسی مسائل پر بھی اگر چار و ناچار گفتگو کرتے تو اپنے آپ کو غیر سیاسی حیثیت پر اور زیادہ مضبوطی سے جما کر رعیت کی سطح پر سیاست جیسا کام شریفوں کے کرنے کا نہیں۔ خدا کے فضل سے یہ سب لوگ شریف لوگ تھے۔

اس غیر تنظیمی (یا کہیے کہ اتفاقی) نشست کا موضوعِ فکر یوں تو بڑا محدود سا تھا، یعنی معاشرے کی فلاح و بہبود پر سوچنا مگر چونکہ سب لوگ مختلف میدانوں کے لوگ تھے، اس لیے بات ایک طرف اقتصادی ناہمواری کے مسئلے سے چلتی اور سرمایہ داری، سوشلزم اور اسلامی سوشلزم اور خالص اسلام اور روس اور چین اور نیپ اور بھٹو صاحب کے تذکرے سے یوں گزر جاتی جیسے کوئی ریل گاڑی مختلف اسٹیشنوں سے گزر رہی ہو۔ پھر یہ گاڑی تعلیمی نظام، دفتری نظام، زنسوستانی، جرائم وغیرہ مباحث کے مرحلوں سے فراٹے بھرتی ہوئی نکل جاتی، کہیں کہیں کسی ضمنی بحث کے اسٹیشن پر وقفہ ذرا لمبا ہو جاتا۔ ایسا ہی ایک اسٹیشن آیا جس کا عنوان تھا "ہمارا قومی مزاج کیا ہے"۔ اس پر بہت

کام کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر جب اس ضمن میں جرائم کا موضوع چھڑا، اور سوال اٹھا کہ آخر جرائم کی کثرت کیوں ہے؟ تو اس "اتفاقی مجلس" کے ایک رکن نے اس کی وضاحت یوں کی کہ اگر کسی معاشرے یا تمدن میں اوسط درجے کے کثیر التعداد افراد کسی غلط کام کا خیال آنے اور اس خیال کے جامۂ عمل پہنانے کے درمیان زیادہ وقفہ رکھتے ہوں تو اس میں جرائم کم وقوع پذیر ہوتے ہیں، لیکن اگر کسی جگہ بُرے خیال کے اُبھرنے پر فوری طور پر اسے جامۂ عمل پہنانے کی عادت عام ہو جائے تو جرائم بڑھ جاتے ہیں۔ اس پر اُن سے سوال کیا گیا کہ خیال اور عمل کے درمیان یہ فاصلہ کیسے بڑھایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس کا وضاحت سے جواب دیا، جس کا خلاصہ ایک لفظ میں تھا "تربیّت"۔ یعنی اگر اولاً گھروں میں اور اس کے بعد اسکولوں میں نئی پود کو مؤثر طریقے سے یہ تربیت دی جائے کہ وہ بُرے خیال کو جامۂ عمل پہنانے میں عجلت سے کام نہ لیں، جیسا کہ انسان کی کمزوری قرآن میں بیان کی گئی ہے کہ وکان الانسان عجولا، تو جرائم کو گھٹایا جا سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر اسلام میں چاہا گیا ہے کہ نیکی کے کام میں جلدی کرو، لیکن بُرے کام میں تاخیر اور تامّل سے کام لو، مثلاً غضب کی کیفیت میں حسنِ کردار کو بچانے کے لیے یہ صفت پیدا کرنے کی تلقین کی گئی کہ والکاظمین الغیظ۔ ایک قیمتی بات اجمال کے باوجود بڑی خوبصورتی سے بیان ہو رہی تھی، اور اس میں میری دلچسپی یوں بڑھ گئی کہ یہ ایک نفسیاتی بحث تھی اور جنابِ متکلّم نے اس کو قرآن پر مبنی کیا تھا۔

یہ "جنابِ متکلّم" سید کرامت حسین جعفری، پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج تھے۔ اور یکایک مجھے محسوس ہوا کہ مجھے جس آدمی کی تلاش قرآن نمبر کے سلسلے میں تھی وہ دریافت ہو گیا ہے۔

مجھے جعفری صاحب سے پہلے ہی سے تعارف تھا، مگر ملاقات ہوئے کئی برس ہو چکے تھے۔ جعفری صاحب سے مدت بعد کی یہ ملاقات ایک خوشگوار حادثہ ہی نہ تھی، بلکہ ایک متاعِ گمشدہ کی بازیافت تھی۔ اس وقت میرے سامنے ایک ایسا معلّم تھا جس نے معلّمی کو صرف پیشہ اور ذریعۂ آمدنی نہیں بنایا، بلکہ اسے زندگی کا مشن بنایا اور اس کے ذریعے ۱۹۳۴ء سے لے کر اب تک نئی نسلوں کی بہترین تعمیر کرنے میں اپنی قوتیں کھپائیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ایک صاحبِ ایمان و کردار، فرض شناس، قابل، ذی وقار اور بامقصد معلّم کسی قوم کی ایک متاعِ گراں بہا ہے۔ اس کے ہاتھوں تیس چالیس برس میں انسانیت کے اچھے نمونوں کی خاصی بڑی تعداد تیار ہوتی ہے اور جو نوجوان اس کے معلّمانہ سانچے میں پوری طرح نہیں بھی ڈھلتے، ان کے ذہنوں میں بھی وہ اچھے خیالات و مقاصد کے کچھ نہ کچھ بیج ایسے مدفون چھوڑ دیتا ہے جو اگر فوراً نہیں تو برسوں بعد جا کر کبھی نہ کبھی ضرور اُگتے ہیں اور معاشرے کو اچھے برگ و بار دیتے ہیں۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ایک اچھے معلّم کی پروڈکشن بڑے سے بڑے صنعت کار اور زراعت کار سے زیادہ گراں بہا ہوتی ہے۔ اور ایک قوم کی اصل قوّت کی تعمیر اس کی درسگاہوں میں ہوتی ہے۔ مگر ابھی معلّم کی یہ قدر و قیمت ہمارے یہاں پوری طرح سمجھی اور مانی نہیں گئی ہے، اور شاید مزید کچھ عرصہ تک یہی عالم رہے۔ بہر حال جعفری صاحب بہ حیثیت معلّم پاکستان کے معلّمین کی اس صفِ اوّل میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں جنہوں نے اپنے تعلیمی فرض کو ایک مشن سمجھ کر ادا کیا اور معاشرے کی دوررس تعمیری خدمت انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے جس سال ۱۹۳۲ء کے ہندسے سے کام شروع کیا تھا، وہ اب دگنا ۱۹۶۸ء ہو گیا ہے۔

سیّد کرامت حسین جعفری فلسفے کے عالم اور نفسیات کا ٹھوس مطالعہ رکھتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کی ذہنی ساخت اسلامی تصوّرِ حیات کی بنیادوں پر استوار ہے، لہٰذا وہ اپنے حاصلِ مطالعہ کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھتے اور اس مرکزی شعور کے گرد مرتب کرتے ہیں۔

بہر حال چائے اور علمی گپ شپ کی اسی "مجلسِ دردمنداں" میں بیٹھے بیٹھے میں نے فیصلہ کر لیا کہ قرآن نمبر کے لیے نفسیات کے موضوع پر انٹرویو لینے کے لیے مجھے اسی محترم معلّم (اور مہربان دوست) کو "بکمند آوُر" کرنا ہو گا۔ چنانچہ کچھ کاغذی دام پھینکے اور ایک دو دوستوں کو کمند بنایا۔ مگر معاملہ کچھ ٹھنڈا ہی رہا۔ بیچ میں دو ماہ کی چھٹیاں بھی حائل ہو گئیں، اور خود مجھے بھی طرح طرح کی مصروفیات نے گھیر لیا۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ پرسوں پھر ایک مشترک دوست کے بزنس آفس میں (جہاں بزنس سے زیادہ دوستی کا کاروبار چلتا ہے) جعفری صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ شاید یہ قرآن نمبر کی کرامت ہو۔

اس مرتبہ پھر گفتگو کا مسافر پھرتا پھراتا اپنے مطلب کی ڈگر پر آ گیا۔ جعفری صاحب نے "احسن تقویم" اور "اسفل السافلین" کے موضوعات پر مختصر سی گفتگو کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "احسن التقویم پر پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نشوو ارتقا اور فلاح و سعادت کے لیے تمام ضروری صلاحیتیں Potentialities انسان کو ودیعت کر دی گئی ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ معیارِ کمال پر عملاً بھی پہلے سے فائز ہو گیا ہو۔ صلاحیتوں کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرے تو کمال کو حاصل کرے گا، ورنہ اسفل السافلین میں جائے گا۔ یہاں آ کر لیس للانسان الا ماسعیٰ کا جوڑ بھی مل جاتا ہے۔ پھر موصوف نے ایک اور نکتۂ لطیف بیان کیا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ یعنی دین کی راہِ نیک پر چلنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان پر اس کی فطری (اور نفسیاتی) استطاعت کی حد تک بوجھ ڈالا ہے۔ لیکن موجودہ معاشرہ یا تمدن جس نے اس بوجھ کو بڑھا دیا ہے اور اخلاقی کشمکش کو سخت تر بنا دیا ہے، اس کی پوری ساختِ منشائے خداوند کے خلاف ہے۔

اب بالمشافہ اپنا مدعا عرض کیا۔ عرضی قبول ہوئی اور طے پایا کہ جعفری صاحب مزید دو احباب کے ساتھ میرے ساتھ چائے پر جمع ہوں گے۔ سو کل شام ہم لاہور کے ایک گوشۂ بعید میں مجوزہ "کارِ خاص" کے لیے اکٹھے ہوئے اور نشست تین ساڑھے تین گھنٹے تک جاری رہی۔

یہ انٹرویو دو وجہ سے ذرا انوکھا انٹرویو ہے۔ ایک تو یہ کہ بجائے اس کے کہ انٹرویو لینے والا چل کے جائے، الٹا اسے انٹرویو دینے والی شخصیت کو کھینچ بلانے کا موقع مل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ انٹرویو محض دو افراد (انٹرویو کے عامل اور معمول) کی گفتگو تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ "چار یاری" قسم کا انٹرویو ہے۔ یعنی اس میں چار دوست شریک رہے۔ اور میری کوشش یہ ہے کہ اس اجتماعی انٹرویو کی عکاسی کسی نہ کسی حد تک "مطابقِ اصل" ہو سکے۔

ہماری گفتگو کا پس منظر وہ بنیادی متفق علیہ معلومات تھیں جو ذہنِ انسانی کی ساخت اور نفسیاتی قوتوں اور ان کے طریقِ تعامل کے متعلق قرآن (اور اس کی تشریح

ہیں حدیث ہانے دی ہیں۔ یعنی ذہنِ انسانی میں ایک غیر اختیاری تخلیقی عمل جاری رہتا ہے، وہ متضاد رجحانات کی رزم گاہ ہے، وہ اپنی فطری ساخت کے تحت خیر اور شر یا بھلے اور بُرے کی تقسیم کرتا ہے، وہ متضاد خیالات اور داعیات کی جانچ کرتا ہے، پھر ان میں کسی ایک کا انتخاب کرتا ہے۔ یہی عملِ انتخاب اس کے مقامِ بشریت کا انتہائی عروج ہے اور اسی کی وجہ سے وہ اس اخلاقی ذمہ داری پر فائز ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ خلیفۃ اللہ ہونے سے مشرف ہے۔ اگر وہ انتخاب غلط کرے تو اقوال و اعمال میں برائی نمودار ہوتی ہے، انتخاب صحیح کرے تو نتیجہ خیر و فلاح ہوتا ہے ـــــ اس کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ اگر وہ دو رجحانات میں بروقت انتخاب نہ کر سکے تو وہ حالتِ تذبذب میں رہتا ہے اور اس کی قوتِ فیصلہ کمزور ہوتی جاتی ہے۔ اور اگر وہ متضاد رجحانات کو بروقت پسند کر کے انہیں جمع کر لے تو ذہنی تصادم رُونما ہوتے ہیں جن سے نفسیاتی اور اخلاقی زندگی چوپٹ ہو جاتی ہے۔ اسے غلط رجحانات کا مقابلہ کر کے بہتر انتخاب کرنے کے لیے ایک طرف صبر کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری طرف عزم کی۔ ان اخلاقی صفات کو مستحکم بنانے کے لیے خدا کی بالاتر حاکمانہ قوت کا شعور، آخرت کی جوابدہی کا احساس، نبیٔ پاکؐ کی زندگی کو نمونہ بنانے کا اعتقاد اور ایک متعین ہدایت، ایک ضابطۂ قانون اور ایک حکمت و بصیرت کا سر و سامان کیا گیا ہے۔

جہاں تک میرے اجمالی نوٹ مدد کر سکتے ہیں، میں کوشش کروں گا کہ قرآن نمبر کے قارئین کے لیے اس چار یاری مجلس میں غائبانہ شمولیت کا لطف پیدا کر سکوں۔

اچھا تو لیجیے، اب انٹرویو شروع ہوتا ہے۔ "اب سرگذشت میری ذرا کان دھر کر سنو!"

ایڈیٹر: جعفری صاحب! مرحلۂ آغاز میں مجھے ذاتی طور پر یہ جاننے کی خواہش ہے کہ علم النفس سے آپ کو دلچسپی کیونکر ہوئی؟

پرنسپل جعفری صاحب: نفسیات سے میری دلچسپی اصل میں خود انسان سے میری دلچسپی کا نتیجہ ہے۔

پروفیسر منور: دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی محبتِ انسانیت اس کے لیے محرک بنی ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب: جی ہاں! جو شخص انسانی احوال اور تعلّقات میں دلچسپی لیتا ہے، اور پھر جب وہ ان میں کوئی جھول دیکھتا ہے تو وہ اس کے اسباب کو جاننا اور اسے رفع کرنا چاہتا ہے تو وہ از خود مطالعۂ نفس کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ میں اپنے رجحانات کو ہیومنزم Humanism یا انسانیت مشربی کے تحت جمع کرتا ہوں۔

ایڈیٹر: مگر سید صاحب! آپ خود جانتے ہیں کہ یہ ہیومنزم کی رائج الوقت اصطلاح خود ملحدانہ ذہنیّت کی پیدا کردہ ہے، اور جدید مادی نظام کے سائے میں اس عنوان سے ایک فلسفۂ باطل پروان چڑھا ہے۔ میں فنی خطوط پر لمبی بات کرنے کے بجائے خلاصۃً یہ کہوں گا کہ جدید تارکِ خدا انسان اور معاشرے نے تصوّرِ خدا سے تو اپنے آپ کو فارغ کر لیا، مگر اس کی فطرت میں دوسروں کے لیے کچھ روحانی و اخلاقی رجحانات اتنے پُرزور پائے جاتے ہیں کہ وہ ان کو اپنے آپ سے

پُوری طرح الگ نہیں کر سکتا۔ اس کے ملحدانہ ذہن نے ان رجحانات کو تصوّرِ خدا یا مذہب کے زیرِ عنوان جمع کرنے کے بجائے ہیومنزم کی من گھڑت اصطلاح کے تحت جمع کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا ہے یا یوں کہیئے کہ خود غرضی اور نفع پرستی سے بالاتر محرکات کی ایک توجیہہ ہیومنزم کے فلسفے نے فراہم کی ہے، حالانکہ خود یہ توجیہ اور اس پر مشتمل فلسفہ مادی نقطۂ نظر سے بے سر و پا ہے ـــــ ہاں ایک بات ضمناً یہ کہنی ہے کہ اس انٹرویو میں، اگر ہم ٹیکنیکل اصطلاحات کے چکر سے بچ کے نکلیں تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔

پرنسپل جعفری صاحب: بات یہ ہے کہ مرّوجہ "ہیومنزم" کی غلطی یہ ہے کہ وہ مذہب کا مدِ مقابل بن کر اس کا راستہ روکنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے یا اسے کھڑا کیا جاتا ہے۔ حالانکہ سچا ہیومنزم وہ ہے جو خدا پرستی اور مذہب میں شامل ہے اور اس کا لازمہ ہے۔

ایڈیٹر: تو ایسی صورت میں کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ محبتِ خدا آپ کے لیے انسان اور اس کی نفسیات سے دلچسپی کا باعث ہوئی۔ جیسے ہم گلاب کے پھُول کے حسنِ رنگ و بُو سے بحیثیت مسلم دلچسپی لیتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ بات اُبھرتی ہے کہ یہ خالقِ اکبر کے کمالِ صفات کا ایک مظہر ہے۔ اسی طرح انسان کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ نہ صرف ہمارے خداوندِ معبود کی مخلوق ہے بلکہ اس کی اشرف مخلوق ہے اور اس کا مطالعہ گویا آیاتِ الٰہی کا مطالعہ ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب: میرا زاویۂ نظر اس کے برعکس یہ ہے کہ جب ہم انسان کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو اس راہ پر بڑھتے بڑھتے ہمارے قدم انسان کی ہستی سے آگے تک بھی جا پہنچیں گے۔ انسان کا مطالعہ کرنے والے مسافر کے لیے انسان سے آگے بھی راستہ نکلتا ہے۔ انسان تو حقائقِ الٰہی کا ایک بڑا گیٹ ہے۔ اس گیٹ کی رکاوٹیں ہٹا کر اور جدوجہد کر کے اگر ہم اندر داخل ہو جائیں تو پھر حقائق کا وسیع دائرہ سامنے آ جاتا ہے۔ میرے نزدیک انسان کا مطالعہ اور خصوصاً نفسیاتِ انسانی کا مطالعہ خدا کا شعور حاصل کرنے کا نہایت ہی مؤثر ذریعہ ہے۔

پروفیسر منور صاحب: ایک شعر یاد آ گیا ؎

توبہ توبہ مری، میں اور خدا کو بھُولوں
کل ہی دیکھا تھا اُنہیں، اور خدا یاد آیا

ایڈیٹر: واہ، وا ـــ لاجواب شعر ہے! کہیں آپ ہی کا تو نہیں؟

پروفیسر منور: جی نہیں، یاد نہیں آ رہا، کس کا ہے۔

ایڈیٹر: جعفری صاحب! کیا یہ حقیقت نہیں کہ خالص مادی نقطۂ نظر سے مرتب شدہ جدید علمِ نفسیات کا مطالعہ کرنے سے ہم کسی طرح بھی انسان کا کوئی رشتہ خدا سے نہیں جوڑ سکتے۔ آفاقی حقائق کے اس گیٹ سے داخل ہونے کے بعد اُلٹا بھُول بھُلیاں میں اُلجھ جاتے ہیں۔ بلکہ اجازت ہو تو میں یہ کہوں گا کہ جدید مادہ پرستانہ نفسیات کو قبول کرنے والے ذہن کو نہ تو خدا

سے خدا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اور نہ آخرت کا اعتقاد باقی رہ سکتا ہے۔ اس علم کا موجودہ ڈھانچہ جن نظریات سے بنا ہے وہ انسان سے آگے سوچنے کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔

پرنسپل جعفری صاحب: بات یہ ہے کہ جدید نفسیات انسان کے نفسیاتی حقائق کا مطالعہ اس کے عصبی نظام کے دائرے تک محدود رہ کر کرتا ہے، اور اسی کا وہ ادعا بھی کرتا ہے۔ حالانکہ ہم جسے انسان اور نفسِ انسانی کہتے ہیں وہ اعضاء و اعصاب تک محدود اور محصور نہیں ہے۔ قرآن کے طالب علم کے لیے انسان اس محدود دائرے سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ زندگی اور تمام حقائق — جن میں نفسیاتِ انسانی کے حقائق بھی شامل ہیں — کا آخری منبع خدا کی ہستی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے وضاحتِ مدعا کے لیے یہ نکتہ بڑا اہم معلوم ہوتا ہے کہ جیسا تعلق ہمارے جسم اور خدا کے درمیان ہے، اس کے مقابلے میں وہ تعلق بہت مختلف ہے جو ہمارا ذہن خدا سے رکھتا ہے۔ مادی جسم تمام تر فانی ہے اور اس کے اجزا ہماری زندگی میں برابر فنا ہوتے رہتے ہیں، اور بسا اوقات نہایت اہم اعضا جیتے جی داغِ مفارقت دے جاتے ہیں۔ مگر نفس اور ذہن ایسی محدود شے نہیں ہے جو فنا کی زد میں آسکے۔ نفس تو بجائے خود رہا، اس کے پیدا کردہ خیالات اور اعمال اور ردِ عمل تک مختلف شکلوں میں برقرار رہتے ہیں۔ اس طرزِ فکر کے ساتھ یہ حقیقت سمجھنا ہمارے لیے مشکل نہیں رہتا کہ قرآن کے مباحث دعوت و اصلاح کا محور انسانی نفس و قلب Mind کیوں ہے؟ نیز کیا وجہ ہے کہ دین و نبوت کے بنیادی مقاصد میں "تزکیۂ نفس" شامل ہے۔ میرے نزدیک "تزکیۂ نفس" یا بہتر انسان بننے کا سوائے رجوع الی اللہ کے کوئی راستہ ہی نہیں۔

ایڈیٹر: آپ کے ان ارشادات کی روشنی میں میں یہ سوچ رہا ہوں کہ گویا آپ کی گفتگو میں یہ پیغام مضمر ہے کہ موجودہ علم النفس (اس کی اصولی بنیادوں اور اس کی ترتیبِ معلومات) کے بالمقابل قرآن کو لے کر چلنے والے معاشرے یا نظامِ تعلیم کو ایک نئے علم النفس، فلسفۂ نفسیات (چاہے اسے سائنس کہہ لیجیے) کی ضرورت ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب: بالکل! ہمیں ایسے نفسیاتی فلسفہ کی ضرورت ہے، جس کے لیے میں تھیو سائیکالوجی Theo-psychology کی اصطلاح استعمال کرنا چاہتا ہوں۔

محمود مرزا: مگر سوال یہ ہے کہ یہ لفظ تھیو سائیکالوجی ہمارے ذہنوں کو یورپ کی مشہور اصطلاح تھیوکریسی کی طرف موڑ دیتا ہے۔ کہیں تھیو سائیکالوجی کے الفاظ نوجوانوں کے لیے مغالطہ انگیز تو نہ ہوں گے؟

ایڈیٹر: جعفری صاحب کی اجازت سے میں یہ گذارش کروں گا کہ لفظ تھیو سائیکالوجی

اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جو واسطہ بنتا ہے کسی چیز کو خدا کی طرف منسوب کرنے کا۔ اب اگر کوئی ترکیب یہ اصطلاح کسی غلط نظام کو خدا کی طرف منسوب کرتی ہو تو اس میں لفظ تھیو Theo کا کوئی قصور نہیں ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اسلامی نظامِ سیاست کے ایک فاضل شارح نے مغرب کی اصطلاح تھیوڈیموکریسی Theo Democracy کی وضع کر کے اردو زبان میں ایک اضافہ کیا۔ یہ اصطلاح ایک طرف کسی پیشہ ور مذہبی گروہ کے تسلط کی نفی کرتی ہے، دوسری طرف بادشاہوں کے خدائی اختیارات کا تصور ختم کر دیتی ہیں اور تیسری طرف مغربی جمہوریت کے لادین مزاج کو مسترد کر دیتی ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب: ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ تلاشِ حقیقت کے نقطۂ نظر سے انسانی جسم بہت چھوٹی چیز ہے لیکن نفسِ انسانی بہت وسیع و بیکراں دائرہ ہے۔

ایڈیٹر: تقابلاً تو آپ جسم کو چھوٹی چیز کہہ سکتے ہیں لیکن فی الحقیقت وہ بھی اپنی جگہ ایک عالمِ بے پایاں ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب: میرا مطلب یہ ہے کہ جسم کو لے کر اگر آپ اس کا تجزیہ ANALYSIS کریں تو اس کے ٹکڑوں کے مطالعے سے کوئی براہ راست سراغ خدا کی ہستی کا نہیں ملے گا۔

ایڈیٹر: اور وہ جو کہتے ہیں کہ برگِ درختانِ سبز تک معرفتِ کردگار کے دفتر ہیں تو کیا جسمِ انسانی کو یہ حیثیت بھی حاصل نہیں ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب: اصل میں یہ بات اپنی جگہ الگ ہے کہ جسم اور اس کے نظام کار اور اس کے عجائبات اور اس پر کارفرما قوانین میں آیات الٰہی بھری پڑی ہیں، مگر پہلے سے ایک صحیح نقطۂ نظر اختیار کر کے تو ان آیات کو عقلی و شعوری طور پر سمجھنا ممکن ہے، مگر جسم کا تجزیہ ہمیں کسی ایسے محسوس تجربہ Experience سے دوچار نہیں کرتا جو ہمارا رشتہ خدا سے جوڑ دے۔ البتہ ذہن کا تجزیہ کریں تو ہمارے سامنے گویا ایک سمندر آجاتا ہے۔ اس سمندر کی سطح پر کچھ لہریں متحرک دکھائی دیتی ہیں، ان لہروں کے عوامل بھی شاید ذہن ہی سے اٹھتے نظر آئیں۔ پھر جب آدمی ان لہروں سے نیچے اترتا ہے اور آہستہ آہستہ دور تک چلا جاتا ہے — اتنی دور تک کہ جہاں تک کوئی صاحبِ قلب و نظر جا سکتا ہے — تو ذہنی دنیا میں آپ کو براہِ راست ایسا تجربہ Experience پیش آئے گا جو مجرد آپ کے ذہنی عوامل کی تحریک سے پیدا نہ ہوا ہو۔ یہی تجربہ ہے جس کے ذریعے خدا کا جلوہ آپ کو محسوس ہوگا۔

ایڈیٹر: کچھ آپ اپنے مطالعہ کی روشنی میں یہ بتا سکیں گے کہ جن مصنفین کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے

اچھے یا بُرے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ ذاتی طور پر میری ناقص رائے ایک عامی کے مقام سے یہ ہے کہ موجودہ علم النفس کا پُورا ڈھانچہ Structure اسلامی طرزِ فکر سے ٹکراتا ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب : بلاشبہ متعدد مصنفین کی بہت سی کتابیں خدا پرستی کی راہ سے منحرف کرتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مجرد مشاہدے اور تجربے کو (عمومی معنوں میں) اساسِ فکر بنایا ہے اور حسّی اور مشاہداتی دائرے کی محدودیتوں سے آگے تک نہیں جا سکے۔ ان میں فرائیڈ کو میں ایک نمایاں مثال کے طور پر لوں گا جس کے نظریۂ ژولیدگی Illusion کا مطالعہ کرنے والے مبتدی نوجوان بالعموم خود ہی ذہنی ژولیدگی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے یُنگ Jung نے حسّی دائرے سے آگے جا کر یہ اعتراف کیا ہے کہ ہم نفسِ انسانی کا مطالعہ کرتے ہوئے جب ذرا زیادہ گہرائی میں جاتے ہیں تو ہم بعض نہایت کم اہم ٹھوس حقائق سے دوچار ہوتے اور یہی ٹھوس حقائق جن کو وہ اساسیاتِ مذہب قرار دیتا ہے، ذہنی عوارض Mental Disorders کے لیے بہتر اور مؤثر ذریعۂ علاج ثابت ہوتے ہیں

محمود مرزا : اس سلسلۂ کلام نے میرے اندر ایک سوال اُبھار دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان مرکب ہے جسم اور روح سے اگر یہ صحیح ہے تو پھر اسی حقیقت کی روشنی میں ہمیں اس کی مرکب حیثیت کے لحاظ سے اس کی مکمل ہستی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

پرنسپل جعفری صاحب : آپ کی یہ رائے بالکل درست ہے۔

محمود مرزا : مگر جسم اور روح کے تصوّر کے ساتھ یہ مسئلہ بھی حل طلب ہے کہ آیا روح Soul اور ذہن Mind میں فرق ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب : مغربی علوم اور خصوصاً نفسیات میں سے روح کا تصوّر بالکل خارج از بحث ہے۔ لیکن قرآن پر ایمان رکھنے اور اس کی وسیع اور جامع حکمت سے استفادہ کرنے والا مسلمان روح کا تصوّر ایک مستقل حیثیت سے رکھتا ہے۔ ذہن روح سے بالکل الگ ہے روح، جسم اور ذہن دونوں سے بالاتر حقیقت ہے، ذہن کا دائرہ عمل Realm بالکل علیحدہ ہے جس سے خیال کا چشمہ اُبلتا ہے

پروفیسر منور صاحب : "آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں"

ایڈیٹر : خوب! نفسیات کی تمام حقیقتیں ہماری شاعری میں بہت پہلے سے منعکس ہو چکی ہے۔ مگر جدید نفسیات غیب سے خیال کی آمد کا کوئی تصوّر دلانے سے قاصر ہے حالانکہ خیال اور احساسات وغیرہ، گھٹاؤں کی طرح نامعلوم اطراف سے آتے اور ذہن سے گذرتے ہیں اور کبھی وقتی اور کبھی گہرے اثرات ڈالتے ہیں، لیکن انسان کو خیالات کے اس تسلسل ظہور پر کوئی اختیار نہیں ہے، نہ ہی یہ لازماً خارجی

عوامل کے تابع ہوتا ہے۔

پروفیسر منور صاحب : جدید نفسیات کے لیے ایک بڑا سوال یہی ہے کہ خود خیال کیا ہے؟

ایڈیٹر : اور یہ بھی کہ اس کا رشتہ دماغ کے مادی خلیات سے کس طرح قائم ہوتا ہے! — جعفری صاحب! یہ بالکل ایک ناقابلِ فہم بات گھڑ کر علم اور سائنس کے لیبل سے پیش کر دی گئی ہے کہ جس طرح معدے کا فعل غذا ہضم کرنا، اور آنکھوں کا فعل دیکھنا ہے، اس طرح دماغ اور اس کے مادی خلیات کا عمل خیال (اور احساس) پیدا کرنا ہے۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے جس کے ذریعے مادے کے ساتھ ایک فوق المادی حقیقت کا جوڑ لگا کر مادے کی قدر و قیمت بڑھائی گئی ہے، مگر اس دعوے کو پورے عقلی اور سائنسی معیار سے ثابت نہیں کیا جا سکا، بلکہ یوں کہیئے کہ ایک طرح کی شاعری ہے جسے فلسفہ کی عبا اوڑھا دی گئی ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب : واقعہ یہ ہے کہ ذہن کا عضویاتی Organic تصوّر رکھنے والے علمائے نفسیات خیال کی ماہیت اور دماغ اور خیال کے تعلق کی کوئی اطمینان بخش توضیح نہیں کر سکے۔ اس سلسلے میں سیدھا سا ایک سوال یہ ہے کہ اگر اصل چیز ہمارا عضویاتی یا اعصابی نظام Nervous system ہے، اور ذہن Mind اس سے الگ یا بالاتر کوئی حقیقت نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ عصبی نظام کی تقریباً یکسانی رکھنے کے باوجود ماحول، تربیت اور سعی کی مساوی یا کم و بیش ہوتے ہوئے، جو کام شیکسپیئر کر سکا وہ میں نہیں کر سکتا۔ اور کروڑوں کی تعداد میں پائے جانے والے انسان عصبی نظام تقریباً مساویانہ نظام رکھتے ہوئے ذہنی عمل میں تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ، برابر نتائج نہیں دکھا سکتے۔

محمود مرزا : یہ فرق تو بہر حال انسانوں میں ہوگا اور اس کے بہت سے وجوہ ہوتے ہیں جن کو علم النفس میں زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

ایڈیٹر : مگر اُن استثنائی حد تک متمیز شخصیتوں کی کیا توجیہ ہوگی جو کسی جگہ یکایک نمودار ہو جاتی ہیں مثلاً پچھلے دنوں ایک انگلش میگزین میں ایک فرانسیسی نوجوان کا تذکرہ آیا تھا کہ جس نے حکمانہ انٹرویو یا ٹسٹ میں تمام سابق ریکارڈز کے خلاف سارے کے سارے مشکل سوالات بہت کم وقت میں حل کر دیئے۔ اس شخص کو بڑے شک و شبہ سے دیکھا گیا، مگر جب پے در پے وہ ہر ٹسٹ اور انٹرویو میں مشکل سے مشکل سوالات Calculations کو کم از کم وقت میں صحیح حل کر کے دکھاتا گیا تو ایک بڑے فوجی افسر نے اس کی طرف خصوصی توجہ کی اور اس کی ذہنی جانچ کرنے کے بعد کوشش شروع کی کہ اسے فوجی زندگی سے نکال کر کسی سائنسی ادارے کے ریاضیاتی شعبے میں پہنچایا جائے۔ آخر یہ کوشش بڑی دیر میں کامیاب ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ اس ذہانت میں اس درجہ کا غیر معمولی پن کہاں سے آیا؟ کیا

اس کی توجیہہ عصبی نظام ہی سے کی جا سکے گی؟

محمود مرزا: مگر ایسے نابغہ لوگوں کی طرح شاذ مثالیں احمق اور بلید الذہن لوگوں کی بھی ہوتی ہیں؟

ایڈیٹر: یہ ٹھیک ہے، مگر یہ دونوں قسم کی شاذ مثالیں جو متوسط ذہنی سطح سے اوپر یا نیچے رہتی ہیں فی الحقیقت یہ ان "آیات" میں سے ہیں جو شہادت دیتی ہیں کہ خدا کا پیدا کردہ انسان اپنے مادی جسم سے بالاتر چیز ہے، اور یہ کہ انسانوں کے عصبی نظام سے بڑی کوئی قوت ہے جو عالم النفس میں غیر معمولی قسم کے عجائبات پیدا کر کے اپنے اختیار اور اپنی بالادستی کو ظاہر کرتی ہے۔

پروفیسر منور صاحب: ذہنی قابلیت کے مسلمہ معیارات سے بہت بالاتر یا بہت فروتر ہونا علامت ہے کسی خارجی قوت کے تصرف کی!

پرنسپل جعفری صاحب: اسی لیے کسی غیر معمولی صلاحیت و قابلیت کو قرآنی شعور کے تحت ہمیشہ عطیۂ الٰہی یا نعمت قرار دیا جاتا ہے، اور ایسی چیزوں کے لیے انگریزی میں By the grace of God کہا جاتا ہے۔ جدید نفسیات کسی مرحلے پر، کسی معاملے میں عطیۂ الٰہی یا فیضانِ خداوندی Grace of God کا تصور نہیں دلاتی۔

ایڈیٹر: محض کسی حقیقت یا واقعہ کے عقلی اعتراف یا شعور اور ایمان میں کیا فرق ہے۔ ایمان قرآن کی اصطلاح ہے جس کے مترادف اگر بسا اوقات ناقص، الفاظ دوسرے مذہبی صوفیانہ نظاموں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

پرنسپل جعفری صاحب: عقلی اعتراف اور ایمان دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ عقل اور اس کی فعلیت کا انسانی وجود میں ایک محدود دائرہ ہے، مگر ایمان پوری زندگی پر حاوی ہو جانے والے ایسے شعور کامل کا نام ہے جس کے ساتھ انسانی شخصیت کے تمام عناصر (عقلی، وجدانی، جذباتی، اخلاقی) متحرک ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک عقل کا استعمال یا علم و تحقیق ایک زینہ تو ہو سکتا ہے جو ایمان تک پہنچانے کا واسطہ ہے، لیکن ایمان عقل سے بہت بالاتر حقیقت ہے۔ عقل کے فیصلے ایمان کے مطابق ہو سکتے ہیں، مگر مجرد عقلی فیصلے ایمان نہیں بن سکتے۔

ایڈیٹر: جیسے گاندھی اور بعض مستشرقین نے اسلام یا نبی پاکؐ یا خلفائے راشدینؓ کے بارے میں بسا اوقات ایسے اعترافات کیے ہیں جن کی توقع صرف ایک مسلمان ہی سے کی جانی چاہیے مگر یہ اعتراف ان کو ایمان تک نہ پہنچا سکے۔

پروفیسر منور صاحب: اس کی دلیل قرآن کی وہ مشہور آیت ہے جس میں اعرابیوں کے دعوائے ایمان پر کہا گیا ہے کہ لمّا یدخل الایمان فی قلوبھم اور قرآن نے ان کی صرف یہ حیثیت تسلیم کی کہ ابھی تو تم صرف اسلام (ظاہری پابندئ نظام) کی سطح تک پہنچے ہو۔

ایڈیٹر: پروفیسر صاحب! خوب توجہ دلائی آپ نے۔ یہ آیت حقیقت کو اچھی طرح نمایاں کر دیتی ہے۔ اچھا تو جعفری صاحب نفسیات جرائم کے سلسلے میں یہ فرمایئے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ بسا اوقات انسان ایک کام کو عقلی طور پر غلط جانتے اور مانتے ہوئے اسے عمل میں لاتا ہے اور دوسری طرف کسی کام کو صحیح و مفید اور فرض و لازم تسلیم کرتے ہوئے اس سے انحراف کرتا ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب: دراصل سارا مسئلہ جرم و گناہ اس تصادم یا کشمکش سے تعلق رکھتا ہے جو خواہشوں (یا جذبوں) اور اخلاقی تقاضوں کے درمیان جاری ہے۔ اس کشمکش میں انسان کی وہی کمزوری کام کرتی ہے جسے قرآن نے اس کے سامنے انتباہاً واضح کر دیا کہ کان الانسان عجولا یا خلق الانسان عجل۔ (یعنی انسان کی فطرت میں ایسے محرکات ہیں کہ وہ جلد باز واقع ہوا ہے) بیشتر انسان ٹھوس اور محسوس اور قریب کی اشیا یا کیفیات کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتے ہیں، اور نتائج سے تغافل برتتے ہیں۔ انسانوں کی وہ عاجلہ پسند قسم جو "آئیڈو موٹر" کہلاتی ہے جرائم کی طرف زیادہ جاتی ہے۔ بہر حال اس کشمکش سے تجربہ بتاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی زیادہ تعداد کامیاب ہو کر نکلتی ہے جو خدا پر ایمان رکھتے ہوں اور مذہب کے پابند ہوں۔ جب ایک بار کسی شخص میں یہ تصور راسخ ہو جاتا ہے کہ مجھے کوئی علیم ہستی دیکھ رہی ہے اور میں اس کے سامنے جوابدہ ہوں تو پھر اسے خواہشات کے دباؤ کا مقابلہ کرنے اور اخلاقی اصولوں کی حفاظت کرنے کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے۔

ایڈیٹر: ہاں، مجھے یاد آیا کہ میکڈوگل نے بھی ایک پیراگراف اسی حقیقت کے اعتراف میں لکھا ہے کہ مذہب ذہنی بگاڑ، محرکاتِ جرائم سے تحفظ دلانے میں ایک مؤثر قوت ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب: میں اپنا ایک دلچسپ تجربہ اس سلسلے میں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ بعض ایسے طالب علم جو پڑھنے میں کوتاہ یا کسی دوسرے پہلو سے وجۂ پریشانی ہوئے، ان کو میں نے تلقین کی کہ وہ صبح کی نماز پڑھ کر ایک مختصر سی سورۃ (الفجر) روزانہ پڑھ لیا کریں۔ چنانچہ جن طلبہ نے بھی اس پر عمل کیا ان کی تعلیمی ترقی کی رفتار اور ان کا اخلاقی معیار نمایاں طور پر بڑھ گیا۔ اصل میں خدا کا انکار کرنا تو ایسا ہے جیسے کبوتر بلی کو سامنے دیکھ کر آنکھیں بند کر لے اور سمجھ لے کہ وہ موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مارا جائے گا۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ آنکھیں کھول کر حقیقت کا سامنا کیا جائے، اور خدا کی ہستی کو تسلیم کرتے ہوئے پھر اخلاقی اقدامات کے فیصلے کیے جائیں۔ میرا مشاہدہ و مطالعہ کہتا ہے کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ جرائم اور غلط روی کے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔

ایڈیٹر: مگر ان مثالوں کا کیا جواب کہ ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو حج بھی کرتے ہیں اور سمگلنگ بھی، کچھ وہ بھی ہیں جو شراب بھی خوب پیتے ہیں اور پھر اسلام کی شان میں بہترین تقریر بھی کر دیتے ہیں۔ اور یہی حال اوسطاً مجھ سے لے کر بڑے بڑے حضرات کا ہے کہ ہم سب اضداد میں جوڑ لگاتے ہیں۔

کچھ وہ جو چھوٹے پیمانے پر، کچھ وہ جو بڑے دائرے میں۔ مگر ہاتھوں ایک دلچسپ کردار کا تذکرہ کر دوں۔ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو چوری اور جوئے میں مبتلا تھا۔ وہ کچھ دور تنگ دستی کا گذارتا، لوگوں سے ادھار لیتا، اور پھر جب وہ کوئی معرکہ سر کرکے آسودہ ہو جاتا تو ایک طرف مسجدیں میں بہتر اذان کہتا، قرآن پڑھتا اور دوسری طرف بیواؤں یا غریبوں کی مدد کرتا اور قرضے ادا کر دیتا۔ پھر یہ دور گذر جاتا، اور وہ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے پہلے والے دور میں داخل ہو جاتا۔

پرنسپل جعفری صاحب : ایسے کرداروں کے اعمال کے پیچھے جو تصورِ خدا پایا جاتا ہے، وہ تصوّر خود تحریف شدہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ اس خیال کو غلط مفہوم دے دیا جائے کہ خدا غفور الرحیم ہے لہٰذا جو چاہو کرو، اور پھر کچھ اس کا نام بھی لے لو اور اس کے کچھ احکام بھی پورے کر دو۔ اسی طرح ایک تصوّر تقدیر کے غلط تصوّر کا ہے کہ ہم کیا کریں، خدا نے جو کچھ لکھ دیا سو لکھ دیا۔ ان صورتوں میں انکارِ خدا نہیں ہوتا مگر مقصد وہی پورا ہو جاتا ہے جو منکرینِ خدا اپنی خواہش کی پیروی میں پورا کرنا چاہتے ہیں۔

محمود مرزا : مگر جعفری صاحب! آپ خدا کو ماننے، نہ ماننے کے نتائج بیان کر رہے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص پہلے سے خدا کو ماننے والا ہو تو اس کا رویّہ ایسا اور ایسا ہوگا، یا نہ مانتے گا تو ایسے ایسے تجربے سے گذرے گا۔ آخر نفسیات کا ایک طالب علم جو خدا کو نہ مانتا ہو، وہ اس راستے سے خدا کو کیسے پا سکتا ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ مثلاً طبّی دنیا میں ایک تو علاج کا باقاعدہ فن ہے کہ نظامِ اعضا کو ہم سمجھیں، امراض کی تشخیص کریں، بدن کی کیمیائی تبدیلیوں کو جانیں اور پھر ان کے مطابق کوئی دوا دیں، اور اس دوا کے متعلق ہمیں طبّی اور کیمیاوی طور پر تجرباتی علم ہو کہ وظائفِ اعضا یا نظامِ ہضم، تنفس یا دورانِ خون میں فلاں فلاں تبدیلیاں کرتی ہے۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم کہیں فلاں دوائی دینے سے چونکہ فلاں فلاں یا تینتالیس آدمیوں کی کوئی خاص تکلیف رفع ہو گئی تھی، لہٰذا یہ اس تکلیف کا علاج ہے۔

ایڈیٹر : قطع کلام معاف! عالم النفس، عالمِ اخلاق اور تاریخ تمدّن میں مفید نتائج خود ایک دلیل ہوتے ہیں اس بات کی کہ کسی نظریے میں کتنی صداقت ہے۔ تمدنی و اخلاقی امور محدود نہیں کہ آپ کسی لیبارٹری یا امتحان گاہ کے محدود دائرے میں کسی مختصر مدت کے اندر کوئی تجربہ کر سکیں۔ یہ تو انسان اور انسان کے گوناگوں تعلقات کا وسیع دائرہ ہے جس کے ایک ایک تجربے کی تکمیل صدیوں میں ہوتی ہے۔ پوری تاریخ ایک لیبارٹری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کا ایک بڑا حصہ اسی دعوے پر مشتمل ہے کہ اس نے تاریخ کے مختلف تمدنوں اور اقوام کے

مختلف تہذیبی تجربوں اور افراد کے کرداروں کی عکاسی کرکے یہ دکھایا ہے کہ خدا پرست اور پابندِ دینِ حق افراد کے کردار بھی ہمیشہ درخشاں رہے ہیں، اور ایسی اقوام بھی ہمیشہ فلاح و سعادت سے بہرہ مند ہوتی ہیں۔ بخلاف اس کے مشرک یا بت پرست یا ملحد افراد اور اقوام اور تمدنوں کو بہ حیثیت مجموعی تباہ کن نتائج سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح قرآن نے پوری تاریخ کو اٹھا کر خدا پرستی اور دینِ حق کی صداقت کی دلیل کے طور پر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ نفسیات اور اخلاقیات اور مدنیات میں خود مفید نتائج (جو صرف فوری اور قریبی نتائج تک محدود نہیں ہوتے) کسی اصول یا نظام کی صداقت کی دلیل ہوتے ہیں اور مضر نتائج اس کے بطلان کے شاہد۔ سارا قرآن اسی ایک راز ہی کو تو کھولنے کے لیے نازل ہوا کہ انسانی کردار اور انسانی تمدن کیسے بہتر اور مفید بنتا ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب : یہ حقیقت ہے کہ چاہے پرانے ادوار کا مطالعہ کیا جائے، چاہے دورِ حاضر کا — جن معاشروں میں جب کبھی خدا کا اعتماد ختم ہو گیا ہے، ان میں نفسیاتی اور اخلاقی دونوں طرح کی خرابیاں زیادہ پھیلی ہیں۔ دوسری طرف آپ گہرائی میں جائیں تو یہ بھی دیکھیں گے کہ ہر وہ فرد جس پر غلط خواہشات کا دباؤ زیادہ بڑھ جاتا ہے اور وہ انہیں لازماً پورا کرنا چاہتا ہے، تو وہ اپنے راستے سے ضمیر کی رکاوٹ ہٹانے کے لیے خدا کا انکار کرتا ہے — یا اس کے تصوّر میں تحریف کرتا ہے۔ آپ اپنی زندگی میں ایسے جتنے لوگوں کا مشاہدہ کر چکے ہوں ان سب کا تصوّر ذہن میں تازہ کرکے دیکھ لیجیے کہ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ ٹھیک یہی حال معاشروں اور قوموں کا ہوتا ہے۔ وہ جب اخلاقی لحاظ سے غلط راستوں کو پسند کر لیتی ہیں تو پھر ضمیر کی کشمکش سے نجات پا کر کھلی پیش قدمی کرنے کے لیے تصورِ خدا سے نجات حاصل کرتی ہیں۔ تمام ملحد اقوام اخلاقی بحران سے دوچار ہو کر رہتی ہیں، اور تمام وہ اقوام جو اخلاقی بحران میں مبتلا ہوتی ہیں، وہ یا تو کھلے کھلے الحاد کی علمبردار ہوتی ہیں، یا خدا کا ایسا تصوّر اختیار کرتی ہیں جو ان کی من مانی زندگی میں دخل انداز ہونے والا نہ ہو۔

محمود مرزا : یہاں میں ایک سوال اور اٹھانا چاہتا ہوں جو شاید انٹرویو کے طے شدہ خطوط سے ہٹا ہوا ہو لیکن مبحث سے بے تعلق بھی نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ اقتصادی اور مادی ناہمواری، بے انصافی کا ماحول نفسیاتی اور اخلاقی بگاڑ کا باعث نہیں ہوتا؟ مثلاً جن طبقوں پر غریبی اور محرومی مسلط ہو، ان کے ہاں خدا کو ماننے اور مذہب کے موجود ہونے کے باوجود نفسیاتی و اخلاقی خرابیاں رونما ہوں گی جو جرائم تک پہنچتی ہیں۔

پروفیسر منور صاحب : لیکن کسی کے پاس محض دولت کا زیادہ ہونا بھی خرابیوں کا حل نہیں ہے۔ اور نہ غریبی لازماً بداخلاقی اور جرائم کا باعث ہوتی ہے۔ ایک سوسائٹی اگر اصول کی پابند ہے تو دولت کی زیادتی میں بھی وہ راہِ اعتدال سے نہیں ہٹے گی۔

پرنسپل جعفری صاحب : اصل میں کسی بھی قسم

کے حالات میں خرابی کی راہ پر چلنے کے لئے خدا پر ایمان چھوڑنا پڑتا ہے۔ رہا غریبی کے بجائے دولت کی کثرت کا مسئلہ، سو میرے نزدیک دولت کے زیادہ ہو جانے سے بھی افراد اور معاشرے دونوں کے لیے، گناہ کے بہت زیادہ نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔ زیادہ وسائل غلط روی کے لیے بھی دائرۂ انتخاب کو وسیع کر دیتے ہیں۔

محمود مرزا : کیا آپ کے ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ موجودہ حالات کے چکر میں پڑ کر آدمی کو مجبوراً برائی کرنی پڑتی ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب : نہیں نہیں، میرا مدعا صرف اتنا ہے کہ امکانات کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ جس شخص کے پاس وافر روپیہ ہو، وہ ہر قسم کی اشیاء (حلال و حرام) اور خدمات Services حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کی کشمکش اور آزمائش بڑھ جاتی ہے۔ یہی حال مجموعی طور پر معاشرے کا ہوتا ہے۔

ایڈیٹر : مسئلہ اگرچہ بیچ میں ایسا آگیا ہے کہ اگر ہم اس پر دور تک چلیں تو اصل بحث الگ رہ جائے گی۔ مگر چونکہ محمود صاحب کا یہ مستقل موضوعِ فکر ہے (اور نفسیاتی احوال سے اس کا تعلق بھی ہے) اس لیے میں ایک کلمہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ انسان کے لیے نفسیاتی صورت اور اخلاقی ارتقا کی بہترین صورت "رزقِ کفاف" کی ہے۔ جس کے لیے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے اور اپنی آل کے لیے دعائیں فرمائی ہیں۔

محمود مرزا : اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے؟

: رزقِ کفاف کہتے ہیں، گذر بسر کی متوسط روزی کو۔

محمود مرزا : کیا اس کی کوئی خاص مقدار ہے؟

ایڈیٹر : نہیں، مقدار نہیں، صرف نوعیت ہمارے سامنے ہے۔ یعنی ایسا رزق جس سے تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ آدمی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات بخوبی پوری کر سکے۔

محمود مرزا : لیکن پھر اس معاشرے کو کیا کہیں گے جس میں ایک طرف کروڑپتی ہوں اور دوسری طرف نانِ شبینہ کے محتاج!

ایڈیٹر : یہ تو ایک مسخ شدہ صورتِ حالات ہے، اور اگر اسلام کو ہمیں لے کے چلنا ہو تو اس نقشے کو بدلنا ہوگا۔ کروڑپتیوں والا معاشرہ بنانا اسلام کے پروگرام میں نہیں ہے۔

محمود مرزا : ہاں مجھے معلوم ہے کہ آپ اس معاملے میں اپنے حلقۂ فکر میں زیادہ فارورڈ ہیں۔

ایڈیٹر : جی نہیں، میں اور میرے احباب سب کا طرزِ فکر یکساں ہے، لیکن ہم ایک بات میں سخت ہیں، اور وہ یہ کہ اصلاحِ نظام کے لیے اسلام ہی کے اصولوں سے اسلام ہی کی اصطلاحات کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں، اور کسی دوسرے غیر الہامی اور غیر اسلامی نظام سے مرعوب ہو کر اور اس سے کچھ ہتھیار مستعار لے کر استعمال کرنے کے سخت خلاف ہیں مگر بہتر یہی ہے کہ اس بحث کو یہاں اور آگے نہ چلایا جائے۔

محمود مرزا : بہرحال بات خوب دلچسپ سامنے آگئی۔

ایڈیٹر : اصل میں یہ ہوتا ہے کہ بہت زیادہ دولت بھی انسان کو بگاڑتی ہے اور بہت زیادہ غریبی بھی اس کے امتحان کو سخت تر بنا دیتی ہے۔ مگر دونوں حالتوں میں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو دولت یا غریبی

میں مضبوطی سے دین و اخلاق کے اصولوں پر قدم جمائے کھڑے رہتے ہیں اور ہار نہیں مانتے البتہ میرا خیال یہ ہے کہ اس معاملے میں غریبوں کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ جیسا کہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ: "جیا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب"۔ موجودہ علم النفس کے اثرات بعض افراد پر میں نے بہت ہی خراب دیکھے ہیں۔ آپ کا اندازہ کیا ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب : میرا مشاہدہ یہ ہے کہ جب طالب علم اوّل اوّل اس مضمون کے دائرے میں آتا ہے تو وہ الجھنوں سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ فرائیڈ کے نظریۂ ژولیدگی Illusionism کا مبتدیانہ ذہن سے مطالعہ کرتا ہے تو اس کے بہت بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن پھر جب طالب علم اور آگے چلتا ہے اور خاص طور پر جب وہ غیر صحت مند Abnormal نفسیات کے دائرے میں پہنچتا ہے اور ذہنی امراض Neorosis کی بحثوں سے دوچار ہوتا ہے تو پھر اسے ایسی رہنمائی ملتی ہے جو اسے خدا کے دروازے تک لے جاتی ہے اور بسا اوقات وہ پکا مسلمان بن جاتا ہے۔

ایڈیٹر : کیا ایسے طلبہ کی متعین مثالیں آپ کے سامنے ہیں؟

پرنسپل جعفری صاحب : بہت!

ایڈیٹر : لیکن دوسری طرف ایسا بھی تو ہوتا ہے، کہ جدید علم النفس کے مارے ہوئے بعض حضرات خود اپنا ہی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔

پرنسپل جعفری صاحب : ہاں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ نفسیات پڑھ کر بعض لوگ خدا اور مذہب کے منکر ہو گئے، ذہنی خلجان بڑھتا چلا گیا، ان کی اپنی شخصیت بکھر گئی۔ یہ واقعہ ہے کہ عام فلسفہ کے مقابلہ میں نفسیات کا حصہ ایمانوں کو متزلزل کرنے میں زیادہ ہے۔

پروفیسر منور صاحب : یہ میں آپ کو بتا دوں کہ پرنسپل جعفری صاحب فلسفہ کے استاد ہیں، ورنہ اگر ان کا مرکزی مضمون نفسیات ہوتا تو نہ جانے یہ کیا ہوتے!

ایڈیٹر : کیوں؟

پروفیسر منور صاحب : میں نے نفسیات کے اکثر طالب علموں کو ڈولتے ہوئے دیکھا ہے، اور استادوں کو بھی، کم سے کم جہاں جہاں میں رہا ہوں میں نے آج تک کوئی استادِ نفسیات ایسا نہیں پایا جس کا اپنا ذہنی توازن کچھ نہ کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ چالیس برسوں میں میں نے اس شعبے کے بہت سے نوجوانوں کو ذہنی جھیلے Mental case کی صورت میں دیکھا ہے۔ کچھ نہ پوچھیے "نفسیات گزیدہ" نفسیاتی حضرات کا حال۔

ایڈیٹر : آپ کا مشاہدہ بڑا حیرت ناک ہے۔

پروفیسر منور صاحب : میں ایک دلچسپ بات آپ کو بتاؤں، بشرطیکہ آپ نام شائع نہ کریں۔ لاہور کے ایک نامور استادِ نفسیات پاگل خانے میں رہ چکے ہیں۔

پرنسپل جعفری صاحب : موجودہ علم النفس کی عین بنیاد میں خرابی موجود ہے۔ طالب علم کو سب سے پہلے باب میں جب نفسیات کی تعریف

پڑھائی جاتی ہے تو اوّل قدم پر ہی واضح کر دیا جاتا ہے کہ یہ علم، علمِ رُوح نہیں ہے۔ کیونکہ روح ایک فرسودہ لفظ ہے اور اس سے مذہب کی بُو آتی ہے۔ یعنی پہلے ہی قدم پر طالب علم کا رشتہ خدا اور مذہب سے کاٹنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ایڈیٹر : پھر آخر کیوں ہمارے ہاں یہ اقدام اب تک نہیں کیا گیا کہ نصابی ضروریات کے لیے اس علم کی تدوین تو ہمارے اپنے نظریات کی بنیادوں پہ کرائی جاتے؟

پرنسپل جعفری صاحب : اس کیوں کو دور کتا رکھ کر میں نے اپنی حد تک یہ راستہ نکالا ہے۔ کہ جدید نفسیات کی خرابیوں کا ازالہ استاد اپنے لکچروں میں بطور خود کرے۔ یہ وہ مقام ہے، جس کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ: "جائے استاد خالی است" میں نے اپنی کتاب میں بھی اس طرز پہ کام کیا ہے۔

پروفیسر منور صاحب : Empricism کی بنیادوں پر استوار شدہ نفسیاتِ جدید میں یونانی الحاد اور مادیت سرایت کیے ہوئے ہے۔

ایڈیٹر : جی ہاں، میرے نزدیک جدید علم النفس کا مجموعی مزاج خلافِ اسلام ہے۔

پروفیسر منور صاحب : جعفری صاحب نفسیات کے مطالعہ نے خود آپ پر کیا اثر ڈالا۔ کیا اس سے ایمان میں تقویت بڑھی؟

پرنسپل جعفری صاحب : میرا ایمان شروع سے راسخ تھا، اس لیے مجھ پر کسی مرحلے میں مطالعۂ نفسیات کا کوئی برا اثر نہیں پڑا۔ پھر اس علم میں جہاں جہاں بکھری ہوئی درست باتیں سامنے آئیں جو اسلامی حقائق کے مطابق تھیں تو میرا ذہن اس بات پہ زیادہ مطمئن ہوتا چلا گیا کہ ہمارا قرآنی سرچشمۂ علم ہی زیادہ درست ہے

ایڈیٹر : کیا آپ کے خیال میں مجبوری دور میں یہ صورت مفید ہو سکتی ہے کہ نفسیات کے مروجہ کورس کے ساتھ ایک ایک مختصر کورس مزید ایسا شامل کیا جائے جو ایسے مقالات یا مباحث کا مجموعہ ہو جن میں اسلامی نقطۂ نظر سے نفسیاتی نظریات یا مسائل پر تنقید کی گئی ہو۔

پرنسپل جعفری صاحب : ہاں، یہ ضرور ہونا چاہیئے۔ اور میں کم سے کم اپنی حد تک اسی طریق پر کورس پڑھاتا ہوں کہ ساتھ ساتھ تنقیدی پہلو کو ابھارتا ہوں۔

ایڈیٹر : میرا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے طلبہ کو اس طریق سے اس ذہنی غلامی کے چکر سے نجات دلا سکتے ہیں جس میں وہ برسوں سے مبتلا ہیں کہ بس جو چیز انہیں کسی مغربی مصنف کی پڑھا دی گئی وہ بلا تامل اس پہ ایمان لے آئے، بلکہ ایمان بالغیب۔

محمود مرزا : اس گفتگو میں یہ ایک اہم نکتہ سامنے آیا ہے کہ اس اصول کو تمام علوم میں یکساں استعمال کرنا چاہیئے۔

ایڈیٹر : میری پوری تجویز جو نظامِ تعلیم میں ایک خاموش انقلاب لا سکتی ہے یہ ہے کہ امتحانات میں بھی ہر مضمون کے ساتھ ایک پرچہ تنقیدی پرچہ ہو

> خدا کی بہت سی باتیں مطالعۂ نفس میں سامنے آتی ہیں جو مبہوت چھوڑ دیتی ہیں۔

جس میں طالب علم اسلام کے اصول و عقاید کی اساس پر مغربی نظریات پر تنقیدی حملہ کرنے کی صلاحیت دکھائے۔

اور اس صلاحیت کے بہترین مظاہرے کے مطابق اسے نمبر دیئے جائیں۔ بہرحال اب محترم جعفری صاحب یہ فرمایئے کہ کیا انسانی نفسیات کی ساخت اور اس میں پیدا ہونے والے عمل و ردِ عمل میں کوئی ایسے قوانین کام کرتے ہیں جو ہمیں خدا کی ہستی کا سراغ دے سکیں؟

پرنسپل جعفری صاحب : ہاں ضرور۔ ویسے ایک بڑی حقیقت یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ذہن کے اسرارِ پنہاں Mystries کو جاننے اور ماننے والا جب اسے ناقابلِ احاطہ پاتا ہے تو یہیں سے اس کے سامنے خدا کی ہستی کے تصور کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ جیسے کہ شاعر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ "خدا کی باتیں خدا ہی جانے" تو خدا کی ایسی بہت سی باتیں مطالعۂ نفس میں سامنے آتی ہیں جو مبہوت چھوڑ دیتی ہیں۔

ایڈیٹر : ایمان کے متعلق اگرچہ ہم پہلے بات کر چکے ہیں، مگر ایک عام آدمی یا نوجوان کے لیے عقل کے مقابلے میں ایمان کی مختلف ماہیت کو سمجھنا کارے دارد ہے۔ اس پر کوئی اور بات کہنا چاہیں تو شاید مفید رہے۔

پرنسپل جعفری صاحب : ایمان کی ماہیت و کیفیت تو صرف ایمان کا تجربہ کرنے والے ہی کو معلوم ہو سکتی ہے۔

پروفیسر منوّر صاحب : ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی!

ایڈیٹر : ایک حدیث کے الفاظ میں "... ذاق طعم الایمان مَن ..." یہاں بھی ایمان کے مزے یا اس کی حلاوت کا ذکر ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب : ایک مثال شاید عقل اور ایمان کے فرق کو واضح کر سکے۔ ریاضی کے مختلف مفروضات Propositions اور کیمیا یا کیڑوں مکوڑوں کے متعلق انکشاف کے بے شمار اختلاف ہوتے ہیں۔ مگر ان چیزوں کے لیے نہ کوئی مخصوص گروہ بنتے ہیں، نہ کوئی تصادم ہوتا ہے، نہ کوئی تحریک چلتی ہے لیکن ایمان (خواہ وہ کسی الہامی، غیر الہامی مذہب پر ہو، خواہ انسان کے من گھڑت تمدنی نظریات پر ہو) کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس پر چونکہ پورے انسانی کردار اور تہذیب و تمدن کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے، اس لیے یہاں وہ ٹھنڈی فضا نہیں مل سکتی۔ یہاں تبلیغ سے لے کر تحریک تک، اور بحث و نظر سے لے کر قومی اور بین الاقوامی تصادموں تک سبھی کچھ پیش آتا ہے۔

پروفیسر منور صاحب : مغربی نفسیات میں ذہن Mind کا وجود ہے، مگر قلب کا تصور ناپید ہے، اور ہمارے قرآنی نظامِ فکر میں "قلب" کو بڑی مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ میرے خیال میں عقل کا تعلق ذہن سے ہے، ایمان کا قلب سے۔

ایڈیٹر : میرا خیال ہے کہ اہل مغرب نے ذہن Mind کے زیرِ عنوان شعور و لاشعور کی جو تقسیم کی ہے

اسی میں قلب کو کھپا دیا ہے۔ قلب جو نہ صرف مرکزِ جذبات ہے، بلکہ انسان کو والہیت یا عشق کے مقام تک لے جاتا ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب: میرے خیال کے مطابق لاشعور خداشناسی اور حصولِ ایمان کے معاملے میں زیادہ ممد ہوتا ہے۔

ایڈیٹر: قرآن کی روشنی میں کیا ہم بعض عبادات، اعمال شعائر اور تقاریب کو یہ نفسیاتی اہمیت دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے داخلی ایمان، اعتقاد اور شعور کو مضبوط کرتی ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب: ہاں یہ درست ہے کہ جس طرح اندر سے پیدا ہو کر ہماری ذہنی کیفیات خارج میں مظاہر پیدا کرتی ہیں، اسی طرح اگر خارج میں کچھ مظاہر پیدا کیے جائیں یا کچھ اعمال کو اپنے اوپر طاری کیا جائے تو وہ نفسیاتی باطن میں ویسی کیفیات پیدا کرتے ہیں یا ان کو نشو ونما دیتے ہیں جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً مصنوعی طور پر منہ بنا کر اونچا بولنے اور لڑنے جھگڑنے کے عمل کے نتیجے میں انسان کے اندر غصّہ کی حقیقی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی حال دوسرے جذبات اور میلانات کا ہے۔

ایڈیٹر: بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق قرآنی تعلیمات اور دینی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کیا راستہ تجویز کرتے ہیں؟

پرنسپل جعفری صاحب: جب بچہ سمجھنے کے قابل ہو تو اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قاعدے کے مطابق نیکی اور بدی کے راستے بتانے چاہئیں۔ بچوں کو اگرچہ ایسی بے تحاشا آزادی بھی نہیں دینی چاہیے کہ وہ جو چاہیں کریں کوئی پوچھنے والا نہ ہو، لیکن انہیں جبر کے کوڑے سے ہانکنا بھی مضر پڑتا ہے۔ میرے خیال کے مطابق بچوں کو کسی کام کے کرنے یا کسی بات سے روکنے کی سعی میں شفقت و محبت کا پہلو غالب رہنا چاہیے۔ جبر سے نمازیں پڑھانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسجدیں سونی ہو جاتی ہیں۔ بزرگوں کی مار پٹائی کے خوف سے نمازیں پڑھنے والے بچے جب پہلا موقع آزادی کا پاتے ہیں تو پھر پورے دین ہی سے ایسے بھگڈٹ بھاگتے ہیں اور ایسا گھل کھیلتے ہیں کہ ان کی گرد کو بھی وہ لوگ نہیں پہنچتے جو شروع سے آزادانہ فضا میں ہر قسم کے غلط مشاغل کا تجربہ کرتے چلے آ رہے ہوں۔ بچوں کو مناسب آزادی دے کر بھی حکمت سے ان کی نگرانی کرتے رہنا چاہیے۔

ایڈیٹر: جعفری صاحب! شاید بچوں کو بگاڑنے میں اس تضاد کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے کہ ماں باپ کا طرزِ عمل اور گھر کا ماحول اپنے اندر بعض نمایاں خرابیاں رکھتا ہے، لیکن بچے کو وہ مار پیٹ کر ان خرابیوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر منوّر صاحب: بچوں کی تربیت کے متعلق جعفری صاحب نے ایک کتاب بھی لکھی ہے، کیا نام ہے اس کا؟

پرنسپل جعفری صاحب: Your Child (آپ کا بچہ)

ایڈیٹر: ذہنی اختلال Mental Disordors کو پیدا کرنے کا اصولی سبب کیا ہے جس کی آخری

منزل پاگل پن ہے، اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی صورت کیا ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب: تمام ذہنی اختلال ذہن میں کسی تصادمی عمل Conflict کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاج کا صحیح راستہ یہی ہے کہ متعلقہ فرد کے ذہن سے اس کے تصادمی عمل Conflict کو لاشعور کے پردوں سے نکال کر اس کے سامنے رکھا جائے، متصادم رجحانات میں سے صحیح اور غلط کا شعور دلایا جائے، اور اس کی خودی Ego کو مضبوط کیا جائے۔ خودی کو مضبوط کرنے کے لیے علم ہی بہترین ذریعہ ہے۔ یعنی وہ جانے کہ اس کے اندر کیا قوتیں اور عوامل کام کر رہے ہیں اور ان میں درست کیا ہے؟ آنکھیں بند کر رکھنے سے، یا بند کرا رکھنے سے نہ تصادمی عمل رک سکتا ہے اور نہ ذہنی الجھن کو حل کیا جا سکتا ہے۔

ایڈیٹر: آپ نے فرمایا کہ تصادمی عمل کو لاشعور کے پردوں سے نکال کے سامنے لایا جائے، مگر ہمارے ذہن کے بے شمار تصادمی عمل وہ ہیں جو شعور کی سطح پر جاری رہتے ہیں۔ مثلاً آپ اور ہم ایک نظریۂ عصمت رکھتے ہیں، اور دوسری طرف ماحول ہماری اس دینی قدر یا ہمارے اس قرآنی خلق پیمان احوال کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے جو ایک غیر اسلامی تہذیب نے پھیلا دیئے ہیں۔

پرنسپل جعفری صاحب: یہ آپ نے صحیح کہا، فرائیڈ کے نظریات کے خلاف ہمارے بہت سے تصادمی عمل شعوری ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی وہ ذہن کو بڑی سنگین پیچیدگی میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسی شعوری الجھنوں کا حل شعوری سطح پر حتمی اور قطعی فیصلہ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ یعنی دو ٹکراتی ہوئی چیزیں جن کو ہم ساتھ لے کے چل رہے ہوں، ان میں سے اپنے ایمان و شعور کے مطابق صحیح کا انتخاب کر لیں اور غلط چیز کو ذہن سے خارج کر دیں۔

ایڈیٹر: ذہن کے اتفاقی تجربے جو کبھی خواب کی صورت میں، اور کبھی بلا کسی محرکِ معلوم کے کسی خیال یا احساس یا خواہش کے ابھرنے کی صورت میں پیش آتے ہیں، یا ٹیلی پیتھی وغیرہ پر غور کیا جائے تو ان چیزوں کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب: بات یہ ہے کہ شعوری پہلو سے ہم سب افراد الگ الگ ہیں، اور ہمارے درمیان چار دیواریاں قائم ہیں۔ یہ چار دیواریاں شعوری سطح پر ہمیں آپس میں پوری طرح ملنے نہیں دیتیں۔ لیکن لاشعوری سطح پر ہمارے درمیان دیواریں حائل نہیں ہیں، اور ہم سب کی شخصیتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شعوری طور پر میں اور آپ الگ الگ آدمی ہیں ہم آپس میں اختلاف رکھتے ہیں، مگر لاشعوری طور پر ہم ایک ہیں۔ اسی لاشعوری گہرائی سے اچانک کوئی کرن اوپر آ جاتی ہے، اسے ہمارا شعوری ذہن جب کبھی گرفت میں لے لیتا ہے تو وہ تجربات پیش آتے ہیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے۔

ایڈیٹر: مگر یہ توجیہ تو اسی جدید علم النفس کی ہے

جس کی کمزوریوں پر ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ اور اس توجیہہ کو سائنٹیفک حقیقت تو کیا فلسفیانہ نظریہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اس کی نوعیت بھی شاعری ہی کی سی ہے۔ ہمارے اس سوال کے لیے شاید یہ پیرایہ موزوں ہو کہ آخر ٹیلی پیتھی یا القائی عمل میں ایسے دو افراد کے درمیان جو زمانی یا مکانی لحاظ سے ایک دوسرے سے بعید ہیں، مادی تعبیرات کے لحاظ سے وہ کونسا رشتہ ہے جو ان کی ذہنی دنیاؤں میں رابطہ پیدا کر دیتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہم کو بہ حیثیت قرآن کے طالب علموں کے یوں سوچنا چاہیے کہ ایک ہمارے بکھرے ہوئے محدود ذہنوں کی شیرازہ بندی کرنے والا ایک بالاتر مشترک ذہن موجود ہے اور وہی ذریعہ بنتا ہے ان کے درمیان غیر معمولی قسم کے محیر العقول رابطوں کا۔ معاف کیجیے گا، خدا کی ہستی کے لیے یہ اصطلاح میں نے علم النفس کی ضرورت کے تحت وضع کی ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب : ہاں یہ تصور درست ہو سکتا ہے۔ اور جدید نفسیات میں بھی ایسے تجربات کو بڑی ایمانداری سے من و عن جمع کیا جا رہا ہے اور ان پر غور و فکر جاری ہے ہو سکتا ہے کہ آخر کار کوئی اہم نتیجہ سامنے آئے۔

ایڈیٹر : میں نے یہ مسئلہ اس لیے بھی چھیڑا ہے کہ ذہن کے القائی عمل کے آگے وحی کا مقام آتا ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ مغرب نے وحی کے بارے میں جو غلط تصور پیدا کر دیا ہے اس کے جواب میں اسلام کا تصور ابھارا جائے۔ واضح رہے کہ ہمارے مختلف ادوار میں یہ جو فتنہ ابھرتا رہا ہے کہ انبیا کی وحی مصنفوں اور شاعروں اور فن کاروں کی "آمد" کی سی کیفیت کا نتیجہ ہوتی ہے اور الفاظ ان کے اپنے ہوتے ہیں۔ اس کی پشت پناہی وہ لٹریچر کرتا ہے جو مذہب، نفسیات اور نظریۂ علم وغیرہ کے دائروں میں وحی کا رشتہ بھی لاشعور سے جوڑتا ہے۔ لاشعور کے اس طلسم کو لازماً توڑنا چاہیے۔

پرنسپل جعفری صاحب : سچی بات یہ ہے کہ میں نبوت اور وحی کے بارے میں جو عقیدہ رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ انسانی نظامِ زمان و مکان اور اس کے علوم سے بالاتر ہے۔ میں اس کا سختی سے قائل ہوں کہ وحی لفظی پیغام کی صورت ہی میں آتی ہے۔

پروفیسر منوّر صاحب : اور اس کے لیے "رسالات ربی" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی باقاعدہ ارسال کیا ہوا مکمل پیغام یا پیغامات۔

ایڈیٹر : قرآن پاک کا ایک مقام وحی کے (من جانب اللہ) خارج سے آنے کو بہت اچھی طرح واضح کر دیتا ہے۔ جنوں کا وہ قول کہ اس زمانے میں یہ عجیب بات ہم نے آسمانی فضاؤں میں دیکھی ہے کہ استراقِ سمع کے راستے مسدود ہیں، اور ہر جگہ چوکی پہرے کا انتظام ہے۔ پس کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔ کوئی بڑا خیر، یا کوئی بڑا شر، یعنی کسی قسم کے غیر معمولی فرمان کے صدور کے آثار ہیں۔ دراصل قافلۂ وحی کا گذر ہونے والا تھا۔ آسمانوں میں تحفظ

کا یہ انتظام بتاتا ہے کہ اوپر سے کوئی چیز آنے والی تھی۔

پرنسپل جعفری صاحب : پھر بھی وحی کی ماہیت کا موضوع دراصل فلسفہ و نفسیات کی عقلی بحثوں سے بالاتر ہے۔

ایڈیٹر : میرا مدعا اس گفتگو سے یہ تھا کہ جدید فلسفہ اور نفسیات کے نظریۂ علم کا مدار جن ذرائع پر رکھا گیا ہے، وحی کو ماننے والا مسلمان انہیں نامکمل سمجھتا ہے۔ ان علوم میں یہ اعتراف شامل ہونا چاہیے کہ حسّی اور قیاسی ذرائع سے بالاتر ایک اور ذریعہ الہام و وحی کا ہے جس کی ایک چھوٹی شکل ہوا اکثر لوگوں کے تجربہ میں آتی رہتی ہے، "القا" ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب : بے شک موجودہ علوم وحی کے بارے میں کورے ہیں۔

ایڈیٹر : قرآن نے ایک طرف تو انسان کو احسن التقویم مخلوق قرار دیا، دوسری طرف ولقد کرمنا بنی آدم کہہ کر اس کا اعزاز بڑھایا، تیسری طرف اسے خلافت کا تاج پہنایا، لیکن اس کے ساتھ اسے ظلوماً جھولا، عجولاً، اکثر شیئٍ جدلا اور قتورا بھی گردانا۔ اس سے مطلب؟

پرنسپل جعفری صاحب : بات صرف اتنی ہے کہ جیسے کوئی ان پڑھ دیہاتی ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کرے تو بات اور ہے۔ مگر انسان کو جو صفاتِ اعلیٰ دیئے گئے ہیں، ان کے ساتھ اس کے کردار میں جب پستیاں پائی جاتی ہیں، تو ان پستیوں کا قرآن اسے احساس شدید دلانے کے لیے ان کو پُرزور طریق سے کہتا ہے کہ تم ایسے ہو کر پھر یہ حرکتیں کرتے ہو یعنی اس کی کمزوریوں کا یہ تذکرہ بھی اس کی اصلاح کے لیے ہے۔

پروفیسر منوّر صاحب : قرآن کا یہ انداز زجر و توبیخ اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ شرالدوآب اور "اولٰئک کالانعام بل ھم اضل" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

ایڈیٹر : پاکستان میں تحلیل نفسی کا کوئی ایسا ماہر آپ کی نگاہ میں ہے جس کا بنیادی نقطۂ نظر اسلامی ہو؟

پرنسپل جعفری صاحب : میرے علم میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے۔ بس وہی لوگ جو ذہنی مریض کو صوفے پر لٹائیں گے کچھ لڑکیوں کو گھیرے میں لے کر ان کے اندر سے جنسیت کا کوئی فتنہ برآمد کریں گے۔ ایسے حضرات نہ صرف زیرِ عمل حضرات کو مذہب سے برگشتہ کر دیتے ہیں، بلکہ بالعموم ذہنی الجھنوں میں بھی نئی گرہیں ڈال دیتے ہیں۔

ایڈیٹر : کیا مصیبت ہے یہ! کیا ان عالموں کو یہ حقیقت بالکل معلوم نہیں کہ قرآن خود تجزیۂ نفس کی بہترین کتاب ہے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس حکمت سے من جانب اللہ مالا مال تھے اور انہوں نے نفسیاتی تدبیروں سے بے شمار اصحاب کی گرہ کشائی کی ہے۔ کیا ہمارے پاس ایک بھی مرد ایسا نہیں جو بحیثیت مسلمان اپنا راستہ آپ نکالے؟

پرنسپل جعفری صاحب : تحلیل نفسی کے ان

ماہرین یا ذہنی معالجوں کے مقابلے میں ہمارے ہاں ایک اور طبقہ تھا جو اس میدان میں ہمیشہ زیادہ بہتر طریقوں سے کام لے کر بہتر نتائج دیتا رہا ہے۔ مگر اسے غلط کار لوگوں نے بدنام کر دیا ہے۔ میری مراد ان روحانی بزرگوں سے ہے جن میں ہر کوئی تحلیلِ نفسی کا ماہر تھا اور خدا پرستی اور ذکرِ خدا کے ذریعے ذہنی الجھنوں کی گرہ کشائی کرتا تھا۔

پروفیسر منور صاحب : اسی لیے ان بزرگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے دل میں کوئی غلط خیال بھی نہ آنے دو، کیونکہ انھم جواسیس القلوب یہ لوگ دلوں کے بھید پکڑ لیتے ہیں۔

پرنسپل جعفری صاحب : اب مشکل یہ ہے کہ ایک تو سجادۂ بزرگی پر بھی اہلِ اخلاص کم ملتے ہیں، اور اگر ملتے ہیں تو ذہنی الجھنوں میں گھرنے والا نوجوان طبقہ ادھر رجوع ہی نہیں کرتا۔ وہ تو جب جائے گا، سیدھا Psycho-analist کے پاس جائے گا۔

ایڈیٹر : آج کل بہت سے اخبارات و رسائل اپنے ہاں نفسیاتی تجزیہ و مشورہ کے صفحات اور کالم مخصوص کرتے ہیں۔ اور لوگوں کے خطوط چھاپ کر ان کی ذہنی الجھنوں کا حل بیان کرتے ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی ان کوششوں کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب : میں نے ان چیزوں کا کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کیا کہ رائے دے سکوں۔ البتہ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے علم میں ایسی صورتیں بھی ہیں کہ مفروضہ خطوط لکھنے یا لکھوانے کے بعد ان پر نفسیاتی مشورے شائع کر دیئے جاتے ہیں۔

ایڈیٹر : آپ بہتر طور پر جانتے ہیں کہ جدید دور میں جبری نظاموں کا جو تجربہ ہو رہا ہے اس میں علم النفس کے ذریعے ایسی صورتیں نکالی جاتی ہیں کہ انسان کو اس کے شعوری ارادہ و رضامندی کے بغیر اجتماعی مشین کا زیادہ سے زیادہ متحرک پرزہ بنا کر اس کی محنت و قوت کی زیادہ سے زیادہ مقدار نچوڑی جائے۔ خود سرمایہ دارانہ نظام میں بھی مزدوروں کو استعمال کرنے کے لیے نسبتاً کم درجے کے نفسیاتی حربے کام میں لائے جاتے ہیں۔ تفتیش وغیرہ میں تو جو ظالمانہ طریقے چل رہے ہیں، ان کو جانے دیجیے، علم النفس کے صرف متذکرہ ایک استعمال کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب : یہ سراسر ظلم ہے۔

پروفیسر منور صاحب : بلکہ ظلمِ عظیم۔

ایڈیٹر : عملی نفسیات کے متعلق مغربی لٹریچر بڑی کثیر مقدار میں ہمارے ہاں پھیلتا رہا ہے جس کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ زندگی میں کامیابی اور شہرت اور تعلقات کا حصول کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ لٹریچر انسان کو زندگی کے ہر شعبے میں "سلزمین شپ" کے ہتھکنڈے سکھاتا ہے، حتیٰ کہ شوہر اور بیوی اور والدین اور اولاد کے درمیان بھی ہتھکنڈوں کا یہ پیچ ساری عمر ہوتا رہتا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا تصور رکھتے ہیں؟

پرنسپل جعفری صاحب : یہ نفسیات کا کاروباری استعمال Prostitution ہے

(بقیہ صفحہ 337 پر)

انعامی کہانی

ہائی لینڈز

رحمت علی صابر

۱۹۳۵ء میں میں ٹریننگ ختم کرنے کے بعد سپرنٹنڈنگ انجینئر۔ ایسٹ بہار سرکل کے دفتر میں بطور اپرنٹس ڈرافٹسمین ملازم ہوا۔ یہ دفتر ایک ہنگامی منصوبے کے تحت معرضِ وجود میں آیا تھا۔ جس کا کام ۱۹۳۴ء کے قیامت خیز زلزلے کی تباہ کاریوں سے متاثرہ سرکاری عمارات اور پبلک املاک کا سروے کر کے تعمیر و مرمت کا تخمینہ گورنمنٹ کو پیش کرنا تھا۔

کچھ عرصہ تک تمام اسٹاف بھاگلپور کچہری اسٹیشن کے بالمقابل ایک باغ میں خیمہ نشین رہا۔ پھر دریائے گنگا کے کنارے ایک ہندو وکیل شیو چرن سنہا کی وسیع و عریض کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔ کیمپ کی زندگی کو خیرباد کہہ کر سب نے شہر میں سر چھپانے کے لیے جگہ ڈھونڈ لی۔ میرے دو تین ساتھیوں نے بھی شاہ گنج میں چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ اور کھانا پکانے کے لیے ایک ملازم رکھ لیا۔ اب ہم صبح کو کھانا کھا کر چلے جاتے اور شام کو چار بجے واپس آ جاتے۔

کچہری روڈ سے دفتر جاتے وقت ایک بلند و بالا کوٹھی راستے میں پڑتی تھی۔ جو آرائش و زیبائش کے لحاظ سے اردگرد کی تمام کوٹھیوں میں ایک منفرد مقام رکھتی تھی۔ وسیع و عریض لان، پھولوں سے لدی ہوئی روشیں اور ہرے بھرے درختوں سے جھانکتی ہوئی سُرخ ٹائیلوں کی پُرشکوہ عمارت کوٹھی کے مین گیٹ پر سنگِ مرمر کی تختی پر سیاہ حروف میں "ہائی لینڈز" کندہ تھا۔ ہمارا دفتر اس کوٹھی سے کوئی چالیس پچاس گز آگے تھا۔

جب کام سے دل اکتا جاتا، حالانکہ کام ہی مختصر سا تھا، تو ہم چائے پینے کے لیے کنٹین میں آ بیٹھتے جو لبِ سڑک دفتر کے دائیں ہاتھ واقع تھی۔ وہاں چائے پیتے ہوئے اکثر میں نے شام کو ایک وجیہ صورت گورے چٹے نوجوان کو ایک حسین و جمیل یورپین لیڈی اور ایک تین چار سالہ گڑیا سی لڑکی کے ہمراہ کوٹھی سے بغرضِ سیر و تفریح نکلتے دیکھا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نوجوان کا نام سجاد حسین ہے، جو ڈسٹرکٹ کورٹ کے نامی گرامی بیرسٹر ہیں۔ اور یورپین لیڈی اُن کی بیوی اور گڑیا نما لڑکی اُن کی بیٹی ہے۔ ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے آتے وقت ایک بیگم بھی ہمراہ لے آئے تھے۔ پٹنہ کے مشہور و معروف وکلا سر علی امام اور حسن امام نے یورپین بیگمات لا کر طرح ڈال دی تھی۔ اب جو کوئی بھی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ولایت جاتا۔ ایک آدھ ولایتی بیگم اپنے ہمراہ ضرور لاتا۔

کچھ دنوں بعد ایک خوش رو نوجوان کوٹھی سے دودھ وغیرہ لینے کے لیے کنٹین میں آنے جانے لگا۔ آدمی پڑھا لکھا اور ملنسار تھا۔ اس لیے میری جلد ہی اُس سے دوستی ہو گئی۔ اُس کا نام صغیر احمد تھا۔ صغیر صاحب بیرسٹر صاحب کے ٹائپسٹ اور نجی خط و کتابت کے انچارج تھے اور اُن کے پاس کوٹھی میں رہتے تھے۔ جب کبھی میاں بیوی زیادہ مصروف ہوتے تو وہ اُس گڑیا سی لڑکی کو، جس کا نام لیلیٰ تھا، سیر کرانے کے لیے لے آتے۔ اور ہم بڑی دیر تک اُس سے بچوں کی سی باتیں کر کے دل بہلایا کرتے۔

باتوں باتوں میں صغیر نے بیرسٹر سجاد حسین، اُن کی اہلیہ اور خاندان کے دیگر افراد کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ ایک دن صغیر کہنے لگا کہ سجاد صاحب کے والدین بھی اپنے گاؤں سے کوٹھی میں رہنے کے لئے آ گئے ہیں۔

پھر ایک دن شام کو میں نے ادھیڑ عمر کے ایک بزرگ کو شرعی پائجامہ، پلّے دار ٹوپی اور سفید براق کُرتے میں ملبوس کوٹھی سے نکلتے دیکھا۔ یہ سجاد صاحب کے ابا جان تھے۔ چائے پیتے ہوئے صغیر کوٹھی کے مکینوں کے طرزِ زندگی پر تبصرہ شروع کر دیتا۔ ایک دن اُس نے بتایا کہ سجاد صاحب کی ایک بیوہ بہن بھی یہیں آ گئی ہے۔ وہ کسی مقامی اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہے۔

دن اِسی طرح گزرتے رہے۔ مجھے اُس خاندان سے نہ جانے کیوں دلچسپی سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ میری اُن سے کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ ہم وطنی کا تعلق نہ تھا۔ سوسائٹی میں مقام و مرتبہ میں اُن کا ہم پلہ نہ تھا۔ براہِ راست اُن سے ملاقات نہ تھی۔ پھر بھی بلا ارادہ میں صغیر سے کرید کرید کر اُن کے بارے میں معلومات فراہم کرتا اور وہ بھی نت نئی داستان سناتا اور میں ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ یہ میرا روزمرہ کا معمول تھا۔

ایک دن صغیر نے آتے ہی کہا ”آج تو صاحب غضب ہو گیا۔ بیگم صاحب نے صاحب کی عدم موجودگی میں اُن کی بہن اور ماں باپ کو گھر سے نکال دیا ہے۔“

”گھر سے نکال دیا!“ میں نے بھونچکا سا ہو کر کہا۔ ”یہ تم کیا کہتے ہو!!“

”سچ ہی تو کہہ رہا ہوں۔“ وہ بمشکل اپنے جذبات پر قابو حاصل کرتے ہوئے بولا۔ ”جب سجاد صاحب کچہری سے واپس آئے تو ماں باپ کو نہ پا کر بیگم صاحبہ سے پوچھا:

”امی ابا کہاں ہیں۔ نظر نہیں آتے؟“

”میں نے انہیں گاؤں بھیج دیا۔“ بیگم صاحبہ کا جواب تھا۔

”گاؤں بھیج دیا —— مگر کیوں؟“ سجاد صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

”میرا مکان کوئی سرائے یا مسافر خانہ تو ہے نہیں۔ جو ایرا غیرا چاہے بوریا بستر اٹھائے یہاں ڈیرے ڈال کر بیٹھ جائے.....“

”مگر وہ تو میرے ماں باپ تھے، غیر نہیں تھے۔ پھر میں نے انہیں تمہارے مشورے ہی سے بلایا تھا“ صاحب آزردگی سے بولے۔

”یہ صحیح ہے۔ مگر میں انہیں مستقل طور پر یہاں فروکش ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اس لیے واپس بھیج دیا“

ہارے ہوئے جواری کی طرح سجاد صاحب کچھ دیر تک جرح قدح کرتے رہے۔ پھر اس طرح خاموش ہو گئے۔ جیسے کہ یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔

صغیر اپنے جذبات کی رَو میں کہہ رہا تھا کہ ”سچ تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کی بدسلوکی میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ کاش کہ میں اُن کا ملازم نہ ہوتا...... اسی طرح کوئی میری بہن اور ماں باپ کو گھر سے نکال کے دیکھتا۔ تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ غیرت مند بھائی اور بیٹے کے جذبات سے کھیلنا کتنا مہنگا سودا ہوتا ہے۔“

”جب سجاد صاحب ہی نے اسے معمولی واقعہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ تو ہمارا تمہارا غصہ فضول ہے۔“ میں نے اُس کے غصے کو فرو کرنے کی نسبت سے کہا۔ ”ولایتی بیگم سے اور کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ وہ جہاں رہیں گی۔ تنہا رہیں گی۔ رشتے داروں کا وہاں گزارہ مشکل ہے۔“

”یہ بھی سچ ہے“ وہ کہنے لگا ”مگر انہیں ولایت سے بیوی لانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ان کے اپنے گھرانے

میں ایک سے ایک حسین اور تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیں۔ مگر سکرٹ پہنے اور بے نقاب پھرنے والی میمیں نہیں۔“

اس واقع کے چند روز بعد صغیر میاں مجھے تلاش کرتے ہوئے دفتر میں آ گئے۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے ساتھ کینٹین میں آگیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا۔ ”ننھی لیلیٰ کے لیے ایک ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔ جو اُسے اُردو اور حساب پڑھا سکے۔ پہلے ایک مولوی صاحب یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ مگر وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر جو گاؤں گئے ہیں تو واپس نہیں آئے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ تم یہ خدمت اپنے ذمے لو تو بہتر رہے گا۔“

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر حامی بھری اور شام کو دفتر کے بعد اُس کے ہمراہ اس دیدہ زیب کوٹھی میں انٹرویو کے لیے جا پہنچا۔ میاں بیوی میرے اندازے کے مطابق کچھ کھچے کھچے سے تھے۔ پھر بھی انہوں نے میری تعلیم اور خاندان کی چھان بین کے بعد اگلے دن سے آنے کا وعدہ لے لیا۔ مشاہرہ بیس روپے طے ہوا۔ اور شام کو پانچ بجے سے چھ بجے تک ٹیوشن کا وقت مقرر ہوا۔

میں اگلے دن سے بلاناغہ لیلیٰ کو پڑھانے کے لیے جانے لگا۔ یہ ننھی سی لڑکی بے حد ذہین اور ہوشیار تھی۔ تعلیم کے دوران ایسے ایسے سوال پوچھ بیٹھتی کہ میں بغلیں جھانکنے لگتا۔ وہ انگریزی بڑے پیارے لہجے میں بولتی تھی۔ البتہ اُردو میں گورہ شاہی انداز تھا۔ جو اُسے اپنی ماں سے ورثے میں ملا تھا۔ وقت بے وقت سجاد صاحب اور کبھی کبھی اُن کی بیگم صاحبہ میرے پاس ہی برآمدے میں آ بیٹھتے۔ شاید میرے طرزِ تدریس کو جانچنا چاہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ سجاد صاحب کم گو اور بے حد متین طبع تھے۔ البتہ بیگم صاحبہ کے مزاج میں ذرا تندی کا عنصر تھا۔

کوئی دو ڈھائی ہفتے بعد میں ٹیوشن کے لیے حاضر ہوا تو کوٹھی کے لان میں ساز و سامان بکھرا پڑا تھا۔ اتنے میں بیگم صاحبہ نکلیں اور کہنے لگیں ”بابو آج کوٹھی میں سفیدی ہو رہی ہے۔ اس لیے لیلیٰ کو چھٹی دے دیں۔ کل سے سلسلۂ تدریس شروع کیجیے۔“ میں لوٹ آیا۔ اور آتے ہی دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے کا پروگرام بنا کے شاہ گنج پہنچا۔ اچھوت کینا نام کی پکچر لگی ہوئی تھی، اور سینما میں بے حد ہجوم تھا۔ میں ٹکٹ لینے کے لیے کیو میں کھڑا تھا۔ ہر طرف سے ریلے پر ریلا پڑ رہا تھا کہ اتنے میں مجھے صغیر نظر آیا۔ وہ بھی متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے وہیں کیو میں کھڑے کھڑے اُسے آواز دی۔ وہ دوڑ کر میرے پاس آیا اور آتے ہی بولا ”میں آپ کو تلاش کرتے کرتے آپ کے گھر پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ سینما دیکھنے گئے ہیں۔ اس لیے میں سیدھا یہیں چلا آیا۔“

”مگر میری تلاش کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟“ میں نے پوچھا۔ ”بیگم صاحبہ نے تو خود ہی مجھے آج کی چھٹی دے دی تھی۔ کہ گھر میں سفیدی ہو رہی ہے۔“

”یہ سفیدی ہی تو بربادی کا باعث بن گئی“، وہ فسردگی سے بولا۔

”بربادی! کیسی بربادی!!“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”آپ اس کیو بازی سے چھٹکارا حاصل کریں تو کچھ عرض کروں“

میں نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دی اور اسے اپنی جگہ کھڑا کر کے خود صغیر کے ساتھ سینما کمپاؤنڈ سے باہر نکل آیا۔ اور کہا ”اب کہئے کیا افتاد پڑی.....!“

”بھیا اپنی تو ملازمت آج ختم ہو گئی۔“ وہ افسردہ دلی سے بولا ”مگر ملازمت کے جانے کا مجھے اتنا غم نہیں۔ البتہ جو افسوسناک واقعہ میری آنکھوں نے آج دیکھا ہے اس کا میں خواب میں بھی خیال نہ کر سکتا تھا۔“

"اِس تمہید کو ذرا مختصر کرو" میں نے بے چینی سے کہا "سینما کا وقت ہو رہا ہے۔"

آپ جیسے ہی کوٹھی سے باہر نکلے تو سجاد صاحب کلب سے واپس آ گئے۔ اور کمروں کو دیکھنے لگے۔ یکایک انہوں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا "ایلس! (یہ بیگم صاحبہ کا نام تھا) اِس الماری کی کتابیں کہاں گئیں؟"

"میں نے وہاں کباڑ خانے میں پھنکوا دی ہیں" بیگم نے جواب دیا۔

"کباڑ خانے میں پھنکوا دیں؟" سجاد صاحب نے گھبرا کر فقرہ دہرایا "اری کمبخت اس میں قرآن شریف بھی تھا۔"

"تو پھر کیا ہوا" بیگم صاحبہ نے اسی لاپرواہی سے جواب دیا "تمہارے کس کام کا۔ نہ تم نے اُسے کبھی پڑھا۔ نہ اس پر عمل کیا۔ غلاف میں لپٹا ہوا برسوں سے پڑا تھا۔ میں نے اُسے کباڑ خانے میں پھنکوا دیا۔"

"ایلس!" یکایک وہ جوش میں آ کر بولے "تم نے ایسی جرأت کیونکر کی۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہاری اس حرکت سے مجھے کس قدر تکلیف پہنچی ہے۔ یہ ہماری مقدس کتاب ہے۔ اللہ کا کلام ہے......"

"مقدس کتاب! رات دن قانون کی کتابوں سے تمہیں فرصت نہیں۔ آج سے پہلے تو میں نے تمہیں اس الماری کے پاس بھی کبھی جاتے نہیں دیکھا۔ پھر ایک تاریک دور کی یادگار کو سنبھال کر رکھنے کا کیا فائدہ؟ اس روشنی کے زمانے میں اس ناکارہ سی......" باقی الفاظ ابھی بیگم صاحبہ کے حلق ہی میں تھے۔ کہ بیرسٹر صاحب کا ہاتھ اُٹھا اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس زور کا طمانچہ بیگم صاحبہ کے گال پر پڑا کہ وہ بمشکل گرتے گرتے بچیں، اور کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ صغیر صورتِ حالات کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔

"مدتوں سے تہذیبِ نو کی رنگینیوں میں دبی ہوئی دینی غیرت شعلۂ جوالہ بن کر بھڑکی اور آنِ واحد میں لادینی تاریکیوں کے پردوں کو تار تار کر گئی۔ وہ خاموش طبع مرنجاں مرنج بیرسٹر اُس دن کے انسان سے بالکل مختلف تھا جس نے ماں باپ اور بہن کو، بیوی کے ہاتھوں بے عزت ہو کر گھر سے نکلنے کو برداشت کر لیا تھا۔ مگر قرآن پاک کی بے حرمتی کے خیال ہی نے اُس کی کایا پلٹ دی۔ بیگم صاحبہ کے لیے سُور کا گوشت گھر میں آتا رہا۔ اور وہ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھاتے رہے۔ تمام کمرے حضرت عیسیٰؑ کی مختلف قسم کی تصاویر سے آراستہ تھے۔ اُنہیں گوارا کر لیا۔ بیوی کیتھولک مذہب رکھتے ہوئے بی بی مریم کی مورتی پوجتی رہیں۔ انہوں نے تعرض نہ کیا۔ مگر کلامِ مقدس کی بے حرمتی نے توحید کے نیم فروزاں شعلے کو بھڑکا دیا، جو نہاں خانۂ دل میں عرصۂ دراز سے راکھ کے نیچے دبا پڑا تھا۔ مگر اس جذبۂ تکریم کا انجام بے حد افسوسناک ہوا......!"

"وہ کیا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

بیگم صاحبہ نے بمشکل اپنے تنفر انگیز جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا "مسٹر سجاد! ایک معمولی سے واقعہ سے مشتعل ہو کر تم نے جس وحشیانہ پن کا ثبوت دیا ہے۔ وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ مستقبل کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی۔ مگر فوری فیصلہ اِسی وقت سن لو۔ اِس مکان کی رجسٹری میرے نام سے ہے۔ اور آج کے واقعہ کے بعد سے میں تمہیں کسی حال میں بھی اِس مکان میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ آپ اپنا ذاتی سامان اٹھائیں اور فوراً میرا مکان خالی کر دیں۔"

سجاد صاحب نے یہ فیصلہ خاموشی سے سنا اور مجھے حکم دیا کہ جو جو سامان بیگم صاحبہ تمہیں بتائیں باہر نکال کر رکھ لو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ موٹر میں چلے گئے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد آئے تو دو ٹرک اُن کے ساتھ تھے۔ سامان اُٹھا کر ٹرکوں میں لادا پھر مجھے محبت سے بلا کر دو مہینے کی تنخواہ دے کر بولے "مجھے

ضرورت پڑی تو تمہیں دوبارہ بلوا لوں گا۔ فی الحال اپنی ملازمت ختم سمجھو۔" وہ موٹر میں سوار ہو گئے۔ ٹرک پہلے ہی اُن کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہو گئے تھے۔

وقتِ رخصت لیلیٰ کی بیچارگی قابلِ دید تھی۔ وہ ننھی سی جان حیران تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سوچ رہی تھی، امی کے پاس رہوں کہ ابا کے ساتھ جاؤں۔ اُنہوں نے بیٹی سے پیار کیا۔ اور پھر موٹر اسٹارٹ کر دی۔ بیگم صاحبہ نے چیخ کر کہا "میرا ماہانہ خرچ بغیر یاد دہانی کے مجھے ملتا رہنا چاہیے۔" "بہت بہتر" سجاد صاحب نے جواب دیا اور ساتھ ہی محبتِ پدری نے کہا: "لیلیٰ کا خیال رکھنا۔"

میں یہ روئیداد سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ سینما بینی کا شوق ختم ہو چکا تھا۔ اپنے دوستوں سے ضروری کام کا بہانہ کر کے میں صغیر کے ساتھ چلا آیا۔ راستے بھر اُنہی میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات کے اسی الم انگیز انجام پر خیال آرائی کرتے ہوئے ہم گھر پہنچ گئے۔ ہم سوچتے تھے کہ سجاد صاحب نے یہ کیا حماقت کی، جو ایسا شاندار بنگلہ بنا کر بیگم کے نام ہبہ کر دیا۔ پھر [illegible] خرچ نامہ بھی لکھ دیا۔ شاید یہ پیش بندی بیگم صاحبہ نے خود کی ہوگی۔ کہ ان ہندیوں کا کیا اعتبار۔ کل کلاں کو پردیس میں لے جا کر قطع تعلق کر لیں تو زندگی کے دن کیسے کٹیں گے، اس لیے انہوں نے شادی سے پہلے ہی تحریری طور پر اپنے مستقبل کو محفوظ کر لیا۔ اب کمائیں گے بیرسٹر صاحب اور عیش کریں گی بیگم صاحبہ۔ مگر لیلیٰ کا کیا بنے گا۔ کیا یہ ڈرامہ اب طلاق پر منتج ہوگا۔ اِس کا جواب ہمارے پاس نہ تھا۔

خیر میں گومگو کے عالم میں اگلی شام لیلیٰ کو پڑھانے گیا۔ بیگم صاحبہ اداس سی تھیں۔ وہ سلائیاں اور اون لے کر ہمارے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میری اُن سے پڑھائی کے علاوہ کبھی کوئی بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے میں میاں بیوی کے قطع تعلق پر گفتگو کرنے کا مجاز نہ تھا۔ خیر میں پڑھا کر واپس آ گیا۔ بیگم خاموش تھیں اور لیلیٰ اداس۔ میرا دل بھی اِس افسردہ ماحول میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دن اسی طرح گزرتے رہے۔ بیگم صاحبہ کی خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور میاں سے جدائی کا غم انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو جاتیں۔ وہ روزانہ حسبِ معمول ہمارے قریب آ بیٹھتیں۔ سلائیاں اون کے تانے بانے بنتی رہتیں۔ مگر اُن کا دھیان کسی اور ہی طرف ہوتا۔ نہ ہی اُنہوں نے کبھی کوئی بات کی۔ اور نہ میں ہی اِس کی جرأت کر سکا۔ میں اِتوار کے بجائے جمعہ کو پڑھانے نہیں جاتا تھا۔ ایک دن انہوں نے اِس کی وجہ پوچھی۔ تو میں نے عرض کیا۔ کہ اس دن ہمیں دفتر سے نمازِ جمعہ پڑھنے کی آدھی چھٹی ہوتی ہے۔ اس لیے میں پڑھانے نہیں آتا۔ وہ یکایک بولیں "بابو تم نے قرآن شریف پڑھا ہے؟"

"جی میں نے اپنے اسکول کے زمانے ہی میں پڑھ لیا تھا۔"

"عربی زبان سمجھ لیتے ہیں آپ!" انہوں نے پوچھا۔

"جی ایک حد تک—— ویسے میرے پاس مترجم قرآن شریف ہے۔"

کیا انگریزی میں بھی کوئی قرآنِ پاک ہے۔" انہوں نے اشتیاق بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "اب تو قرآنِ پاک کا دنیا کی تقریباً ہر مروجہ زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔"

"ہو سکے تو مجھے انگریزی میں کسی بلند پایہ مترجم کا قرآن پاک لا دیجیے میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے مجھے سو روپے کا نوٹ دے دیا۔

دوسرے دن میں علامہ عبداللہ یوسف علی کا Holy Quran لے کر گیا۔ بیگم صاحبہ نے بڑے احترام کے ساتھ اُسے میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اپنے

کمرے میں چلی گئیں۔

اب موقع بر موقع وہ مجھ سے قرآن شریف کے متن اور ترجمہ پر تبادلہ خیال کرنے لگیں۔ قرآن خوانی اور اس کے معانی پر بحث کرنے میں میری حیثیت مبتدی کی سی تھی۔ پھر بھی میں اردو ترجمہ شدہ قرآن پاک کا باقاعدگی سے مطالعہ کر کے جاتا۔ اور کافی دیر تک انہیں مطالب و معانی سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا۔ اُن کا شوق مطالعہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اب لیلیٰ کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ مجھے بیگم صاحبہ کو بھی پڑھانا پڑتا۔ اور اس میں مجھے ایک قسم کی راحت سی محسوس ہوتی تھی، ایک قسم کا قلبی سکون۔

ایک دن میں نے اُنہیں طہارت۔ وضو اور نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا۔ اور اس کے فوراً بعد میں اس تبدیلی پر حیرت زدہ رہ گیا۔ کہ وہ باقاعدگی سے پنجوقتہ نماز پڑھنے لگیں۔ رمضان شریف میں اُنہوں نے بڑی پابندی سے روزے رکھے۔

کچھ دنوں بعد ہمارے دفتر کی مقررہ میعاد ختم ہو گئی۔ اور میں بادلِ ناخواستہ ملازمت کی تلاش میں بیگم صاحبہ سے رُخصت ہو کر پٹنہ چلا آیا۔ اور جلد ہی مجھے ریلوے میں گارڈ کی ملازمت مل گئی۔ ایک دن شاید ۱۹۴۰ء کا آغاز تھا۔ میں گاڑی چلانے کے لیے بریک سے باہر نکلا۔ تو ایک صاحب نے آگے بڑھ کر کہا "گارڈ صاحب ایک منٹ رکیں۔ میرا سامان آ رہا ہے" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تو میرے سامنے سجاد صاحب تھے۔ اُنہوں نے بھی مجھے پہچان لیا۔ اور بڑی محبت کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملا کر خیریت دریافت کرنے لگے۔ اتنے میں قلی ریڑھی پر سامان لادے آ گئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے فیروزی ساڑی میں ملبوس ایک بیگم آ رہی تھیں۔ قمیض سلوار پہنے ایک آٹھ نو سال کی لڑکی اٹیچی اُٹھائے اُن کے پیچھے پیچھے تھی۔ یکایک سجاد صاحب بولے "لیلیٰ بیٹی اپنے ماسٹر صاحب سے ملو"

وہ لڑکی حیرت بھری نگاہوں سے مجھے کچھ دیر تک کھڑی دیکھتی رہی۔ گارڈ کی یونیفارم نے اُسے شک و شبہ میں ڈال رکھا تھا۔ پھر وہ بے اختیار میری طرف بڑھی اور جھک کر مجھے سلام کیا۔ میں نے محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وفورِ مسرت سے اُس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا تھا۔ پھر ساری میں ملبوس بیگم صاحبہ نے السلام علیکم کہہ کر مجھے اپنی طرف مخاطب کر لیا۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ وہی بیگم صاحبہ تھیں۔ تر و تازہ پھول کی طرح شگفتہ چہرہ۔ پھر مسکرا کر بولیں "آپ گارڈ بن گئے ہیں۔ یہ مجھے معلوم ہی نہ تھا"

"یہ خدائے پاک کا احسان ہے" میں نے جواب دیا۔ "اب آپ کہاں ہیں" یہ سوال بے ساختہ میری زبان پر آ گیا۔

"سجاد صاحب آج کل پٹنہ میں جج لگے ہوئے ہیں۔ ہماری رہائش آجکل گلزار باغ میں ہے۔ کسی دن ملنے کے لیے ہمارے یہاں ضرور آیئے گا"

"جی بہتر! موقعہ ملا تو ضرور آؤں گا!"

"آپ ضرور آئیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گی"

وہ بولیں۔ "میں آپ کے قرآن کریم پڑھانے کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی ہوں۔ اس کا ذکر میں نے سجاد صاحب سے اکثر کیا ہے"

"میں آپ کا بہت مشکور ہوں" سجاد صاحب بولے "آپ نے ہمارے تعلقات بحال کرانے میں میری بیگم کو قرآن پاک پڑھا کر بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں"

"یہ صرف کلام پاک کا اعجاز ہے" میں نے کہا۔

"ورنہ من آنم کہ من دانم!"

دونوں نے سر جھکا کے اس کا اعتراف کیا۔ رخصت ہوئے، سامان لدوا کر گاڑی میں بیٹھ گئے، اور گاڑی جلدی

موہنی

تنویر احمد خان

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک برِصغیر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصے کا نام پاکستان اور دوسرے کا بھارت رکھا گیا۔ تقسیم ہوتے ہی مسلمان اپنے پیارے وطن پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے اور ہندو بھارت کی طرف جانے لگے۔ قبل تقسیم کے ہندو مسلمان آپس میں بڑے پیار اور محبت سے رہتے تھے۔ مگر ملک کے حصے ہوتے ہی دونوں کے بھی حصے بخرے ہو گئے۔ ایک قوم دوسری قوم کو اپنے علاقے سے نکالنے کے درپے ہو گئی۔

یہ قصہ سندھ کے ایک اچھے قصبے کا ہے جہاں ایک ہندو گھرانہ رہتا تھا جو کہ صرف میاں بیوی پر مشتمل تھا۔ ان کے پڑوسی مسلمان تھے اور آپس میں بڑے اچھے تعلقات تھے۔ کچھ دنوں بعد ہندو گھرانے کے سرپرست نند لعل نے اپنے مسلمان پڑوسی احمد سے کہا "بھائی اب ہمیں چلے جانا چاہیے حالانکہ ہمارا دل نہیں چاہتا کہ ہم جہاں پیدا ہوئے ہوں بڑے ہوئے ہوں، وہ جگہ چھوڑ دیں۔ مگر کیا کریں، مجبور ہیں، حالات دن بدن بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا پتہ کس دن مسلمان بگڑ جائیں اور ہم لوگوں کا نقصان ہو جائے"

احمد نے کہا "نند کیسی باتیں کرتے ہو؟ ہمارے ہوتے ہوئے تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا" مگر چونکہ نند لعل کے دل میں خوف و ہراس پیدا ہو چکا تھا وہ اس کی باتوں پر مطمئن نہیں ہوا اور اس نے گھر میں اپنی بیوی سے کہا کہ جس دن ممکن ہوا ہم اپنے دیش بھارت چلے چلیں گے۔ تم اپنی تیاری مکمل رکھنا۔

تیاری کی یہ بات چیت ہوتے کافی دن گذر گئے۔ ایک دن نند لعل کے برادرِ نسبتی کا خط آیا جو اُن سے کافی دُور رہتا تھا کہ ہم لوگ تو ہندوستان جا رہے ہیں آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ اگر تیار ہوں تو ساتھ ہی چلے چلیں۔ نند لعل نے یہ خط اپنے دوست احمد اور بیوی کو دکھایا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ احمد نے صلاح دی کہ گھر میں بالکل تیاری کر رکھیں اور آپ خود اپنے سالے سے مل کر صلاح مشورہ کر آئیں، پھر مل کر جو فیصلہ کریں اسی پر عمل کریں۔ نند لعل نے تجویز پسند کی اور گھر والی کو بالکل تیار رہنے کا حکم دے کر اپنے سالے سے ملنے چلا گیا۔

نند لعل کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ عمر تو اُس کی پچیس چھبیس سال تھی، مگر اولاد نہ ہونے اور صحت اچھی ہونے کی وجہ سے سولہ سترہ سال کی نظر آتی تھی۔ احمد ایک عرصہ سے اس پر نگاہ رکھتا تھا۔ مگر اس سے کوئی ایسی ویسی بات کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ جب نند لعل اپنے سالے سے ملنے اس کے گاؤں چلا گیا اور گھر پر تیار رہنے کے لیے کہہ گیا تو احمد نے اس سے فائدہ حاصل کرنے کا پروگرام بنایا۔ ایک ظلم اچانک تانگہ لے کر ہانپتا کانپتا نند لعل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اندر سے نند لعل کی بیوی موہنی نے پوچھا: "بھائی کون ہو، کیا کام ہے؟"

احمد نے جواب دیا "بھابھی فوراً تیار ہو جائیں، جو قیمتی چیز ہے، مثلاً زیورات اور نقدی وغیرہ وہ اپنے ساتھ لے لیں اور فوراً چلیں۔ بھائی صاحب آٹھ بجے والی گاڑی

سے آرہے ہیں اُن کے ساتھ ہی آپ کے بھائی وغیرہ بھی ہیں۔ ان کا سیدھے کھوکھراپار جانے کا ارادہ ہے۔ وہ یہاں رُک نہیں سکیں گے۔ میری طرف ایک آدمی کے ہاتھ پیغام بھجوایا ہے کہ میں آپ کو اسٹیشن پر پہنچا دوں، ٹکٹ وغیرہ وہ آپ کا لے کر آرہے ہیں۔"

نندلعل کی بیوی موہنی چونکہ کافی عرصہ سے احمد کو جانتی تھی۔ اور روز بھارت جانے کی باتیں بھی ہو رہی تھیں، سمجھیں کہ واقعی میرے پتی نے کہلوا کر بھیجا ہے۔ فوراً تیار ہو گئی اور جو کچھ نقدی اور زیور تھا، ساتھ لے لیا، باقی کچھ پہلے ہی اِدھر اُدھر دے چکے تھے۔ رہا سہا سامان اپنے ہمدرد احمد کے حوالے کر دیا۔ احمد نے سارا سامان ایک کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا اور موہنی کو تانگے میں بٹھا کر تانگے والے سے کہا، چلو بھائی۔ اسٹیشن زیادہ دُور نہیں تھا مگر تانگہ بہت دیر سے مسلسل چل رہا تھا۔ اس سے موہنی کو کچھ شک ہوا۔ اس نے منہ پر سے پلو ہٹا کر دیا (یاد رہے سندھ کی ہندو عورتیں منہ پر گھونگھٹ کی قسم کا پردہ کھینچے رکھتی ہیں) اِدھر اُدھر دیکھا تو راستہ ہی بدلا ہوا نظر آیا۔ اس نے احمد سے پوچھا کہ "بھائی ہم کدھر جا رہے ہیں، یہ تو اسٹیشن کا راستہ نہیں ہے۔"

چالاک احمد نے جواب دیا "بھابھی گھبراؤ مت ہم اسٹیشن پر ہی پہنچیں گے۔ ہم اگر اسٹیشن مین روڈ سے جاتے تو لوگ ہمیں دیکھتے، اس لیے ہم نے جنگل کا راستہ اختیار کیا ہے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ آپ لوگ کہاں گئے۔" موہنی یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ کچھ دُور چل کر اچانک تانگہ رُک گیا۔ موہنی یہ دیکھ کر کانپ گئی کہ چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے۔ ابھی وہ اچھی طرح سوچ بھی نہ پائی تھی کہ اسے احمد کی آواز آئی: "جانِ من! اب اُتر بھی آؤ، کب تک ایسے ہی تانگے میں بیٹھی رہو گی۔ اپنی اداؤں سے اس دل کو تسکین پہنچاؤ جو کہ پتہ نہیں کب سے تمہارے فراق میں تڑپ رہا ہے۔"

موہنی نے کہا "احمد کچھ شرم کرو، میں نے تمہیں بھائی اور تم نے مجھے بہن بنایا ہوا ہے۔ اس مقدس رشتے کی کچھ لاج رکھو۔"

مگر احمد پر شیطان سوار تھا۔ اس نے موہنی کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور کہا "میری رانی مقدس رشتے بعد میں دیکھیں گے۔ یہ رشتے محض ایک ڈھکوسلے ہیں پہلے تم میرے زخمی دل پر مرہم رکھو۔ ان نشیلی آنکھوں کی شراب پلا کر مجھے مدہوش کر دو۔ ایسے مواقع بہت کم ملتے ہیں اور تم چاہتی ہو کہ ایسا موقع میں رشتے کے نام پر کھو دوں۔ اس موقع سے کچھ تم فائدہ اٹھاؤ کچھ مجھے اٹھانے دو — آؤ، قریب آؤ!"

موہنی ایک زخمی پرندے کی مانند بے بس کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ احمد نے ایک دفعہ پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ موہنی جھپٹ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے رحم طلب نگاہوں سے تانگے والے کی طرف دیکھا، مگر اس کی آنکھوں میں بھی ہوس کے شعلے ناچتے ہوئے نظر آئے۔ آخر موہنی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر احمد سے کہا، "احمد! خدا کے واسطے مجھے برباد نہ کرو۔ میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا اور میں برباد ہو جاؤں گی۔ تمہیں خدا کے پیارے رسولؐ کا واسطہ، میری عزت نہ برباد کرو۔ میرے پاس جتنا بھی پیسہ ہے وہ لے لو، میرے سارے زیورات لے لو۔ ان پیسوں اور زیورات سے تمہیں مجھ سے بھی کئی گنا زیادہ حسین عورتیں مل جائیں گی۔ ان سے اپنی آگ بجھا لو، مجھے چھوڑ دو۔ میں زندگی بھر تمہاری احسان مند ہوں گی۔"

احمد نے جواب دیا: "زیور اور پیسہ تو ویسے بھی میرے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ تم بھی ہو۔ اگر سیدھی طرح باز نہ آؤ گی تو مجھے زبردستی کرنی پڑے گی۔ بولو کیا کہتی ہو۔" موہنی خاموش کھڑی رہی۔ احمد نے جھپٹ کر موہنی کو پکڑ لیا۔

موہنی تڑپتی اور احمد کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر احمد کے طاقتور بازوؤں سے اس کا آزاد ہونا مشکل تھا۔ احمد اسے بازوؤں میں اٹھا کر ایک ٹیلے کے پیچھے لے چلا۔ موہنی کا اور تو کوئی بس نہ چلا، اس نے اپنے دانت احمد کے کندھے

میں جما دیے۔ احمد درد کی شدت سے تڑپ اُٹھا اور موہنی اس کی گرفت سے چھوٹ گئی۔ اور ایک طرف بھاگ نکلی۔ احمد ایک دو منٹ تو اپنے کندھے کو سہلاتا رہا، اس کے بعد اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ تھوڑی دُور جا کر اس نے موہنی کو پکڑ لیا۔ موہنی نے پھر اسے خدا اور اُس کے رسولؐ کے صدقے باز آنے کو کہا۔ احمد نے جواب دیا: "ہر کام اللہ اور اس کے رسولؐ کی مرضی کے سوا نہیں ہو سکتا۔ یہ موقع بھی مجھے اللہ ہی کی مہربانی سے ملا ہے۔"

موہنی کو بچاؤ کا کوئی بھی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ اچانک اس نے اپنے گلے پر ہاتھ ڈالا اور ایک تعویذ جس میں سونے کی زنجیر ڈالی ہوئی تھی توڑ کر ہاتھ میں لے لیا اور احمد سے کہا کہ اس میں تمہاری مقدس کتاب قرآن مجید کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ تمہارا قرآن ہے اس کے صدقے مجھے معاف کر دو، میری عزت نہ برباد کرو، میری عصمت نہ لوٹو۔

احمد نے وہ تعویذ اس کے ہاتھ سے چھین کر دُور پھینک دیا۔ اور لپک کر موہنی کو پکڑ لیا اور دیوانوں کی طرح اس کے کپڑے پھاڑنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں بے کس موہنی بالکل عریاں ہو چکی تھی۔ اور قریب تھا کہ احمد اپنے ناپاک منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر موہنی کو برباد کر دے کہ اس کی چیخ نکل گئی اور موہنی کے بدن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ایک دو منٹ کے اندر ہی اندر موہنی بالکل آزاد ہو چکی تھی۔ احمد ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ موہنی حیران پریشان اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک تین فٹ لمبا کالا سانپ احمد کی ٹانگ سے چمٹا ہوا ہے اور اس کی پنڈلی سے خون بہہ رہا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں احمد تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ احمد کے مرتے ہی سانپ اسے چھوڑ کر ایک طرف چل دیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ دردناک منظر تانگے والا بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً بھاگتا ہوا آیا اور اُس نے وہ تعویذ جسے احمد نے پھینک دیا تھا اُٹھا کر چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ اس کے بعد اس نے فوراً موہنی کے پیر پکڑ لیے اور کہا کہ آج سے تم میری بہن ہو، گناہ گار بھائی کو معاف کر دو۔ اس کے بعد اس نے اپنے صافہ کو موہنی کے سر پر ڈال دیا۔ اُسے عزت و احترام سے اپنے تانگے میں بٹھا کر گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں تانگے والے نے جس کا نام عبداللہ تھا، تعویذ کی بابت معلوم کیا۔ موہنی نے بتایا کہ میرے عرصہ سات سال سے بچے نہیں ہو رہے ہیں۔ میری ایک مسلمان سہیلی تھی، جس نے یہ تعویذ لا کر دیا تھا۔ اس میں ایک ہاتھ کا نشان بنا ہوا ہے اور وہ عورت بتا رہی تھی کہ اس پر سورۃ یاسین اور پانچ آیتیں اور بھی لکھی ہوئی ہیں۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ قرآن کی کیا طاقت ہے، جس نے میری عزت بچائی یہ ایک معجزہ ہے۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس سے مجھے نہیں بچا سکتی، مگر اس نے اللہ کے کلام کی بے ادبی کی تھی، اللہ کا اُس پر قہر نازل ہوا۔ وہ بڑا بے پروا ہے، جسے چاہے اور جس وقت چاہے سزا دے سکتا ہے۔ یہ باتیں کرتے ہوئے وہ گھر پہنچ گئے۔

اتفاق سے ہ والی گاڑی سے نندلعل گھر آ گیا اور اس نے جو گھر کی حالت دیکھی تو حیران رہ گیا۔ اِدھر اُدھر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ موہنی احمد کے ساتھ تانگہ میں گئی ہے۔ نندلعل احمد کے گھر گیا وہاں سے پتہ چلا کہ احمد دوپہر سے گھر نہیں آیا۔

اس بھاگ دوڑ میں رات کے تین بج گئے کہ اچانک موہنی اور تانگے والا گھر پہنچ گئے۔ تانگے والے اور موہنی نے نندلعل کو پورے حالات سے آگاہ کیا۔ یہ سن کر نندلعل بھی دنگ رہ گیا۔ دوسرے دن موہنی اور نندلعل کا ہندوستان جانے کا خیال بدل چکا تھا اور وہ قرآن مجید کا معجزہ دیکھ کر کفر سے تائب ہو چکے تھے۔ اسی شام موہنی اور نندلعل نے اسلام قبول کر لیا، اب ان کے چار بچے ہیں اور بڑے سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے اسلامی نام محمد علی اور عائشہ بی بی ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَیَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(ترجمہ) اُس وقت کو یاد کرو، کہ تم اقلیت میں تھے اور بے حد کمزور تصور کیے جاتے تھے، تمھیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ لوگ تمھیں اُچک کر نہ لے جائیں۔ اِن حالات میں ہم نے تمھاری مدد کی، تمھیں ایک عمدہ ٹھکانہ دیا، تمھیں صاحبِ قوت بنایا، نہایت خوش گوار سامانِ زندگی عطا کیا یہ سب اِس لیے تھا کہ تم شکر ادا کرو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قرآن مجید (سورۃ الانفال۔ رکوع ۳)

ایک خاتون کا عجیب طرزِ گفتگو

— ادارہ —

تاریخ کی واقعاتی داستانوں میں سے یہ ایک ایسی داستان ہے جو اگرچہ متعدد مرتبہ مختلف زبانوں میں شائع ہو چکی ہے مگر اُسے درج کیے بغیر قرآن نمبر میں ایک خلا رہے گا۔ ہمارے دائرۂ انتخاب و اقتباس میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہم نے اسے ایک پُرانے جریدے سے برآمد کیا ہے اور پھر ایک اور مسودے سے تقابل کر لیا ہے۔ یہ داستان زندگی کے موضوعات و مسائل کے متعلق قرآن کی جامعیت اور وسعتِ بیان کی شاہد بھی ہے اور قرآن سے محبت کا ایک اعلیٰ معیار بھی پیش کرتی ہے۔ اس واقعہ کے راوی حضرت عبداللہ بن مبارک ہیں جو عباسی دور میں عظیم المرتبت حق پسند عالم ہو گزرے ہیں۔ جن کے گرد ایک بار ہجوم دیکھ کر قصرِ شاہی تک سے یہ صدا گونجی تھی کہ "بادشاہی تو یہ ہے"۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کی ملاقات ایک سفر میں ایک ایسی معمر خاتون سے ہوئی جو قافلے سے بچھڑ کر راستہ بھٹک گئی تھی۔ پھر جو کچھ ہوا اس کی روئیداد پیشِ خدمت ہے۔

ایک معمر عرب خاتون حج کے راستہ میں ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھی تھی۔ عبداللہ بن مبارکؒ اس کے پاس سے گزرے۔ آپ بھی حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ نبی اکرم صلی اللہ کی غرض سے حالتِ سفر میں تھے۔ بوڑھی کو کچھ پریشان اور مایوس پا کر انھوں نے اُس سے بات کی۔ پورا مکالمہ درج ذیل ہے:۔

حضرت عبداللہ بن مبارک: السلام علیک ورحمۃ اللہ

خاتون: سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ

یعنی سلام نہایت مہربان رب کا قول ہے۔ مراد یہ کہ سلام کا جواب تو خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔

خاتون: مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ جسے اللہ بھٹکا دے اُسے کوئی راہ پر لانے والا نہیں۔ مراد یہ کہ میں راستہ بھول گئی ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ: آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟

خاتون: سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ۔۔۔۔۔ "یعنی پاک

ہے وہ (خدا) جو اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا (مراد یہ تھی کہ میں مسجدِ اقصیٰ سے آرہی ہوں۔)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ : آپ یہاں کب سے پڑی ہیں؟

خاتون : ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۔ برابر تین رات (سے)

حضرت عبداللہ بن مبارک : تمھارے کھانے کا کیا انتظام ہے؟

خاتون : وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ۔ وہ (خدا) مجھے کھلاتا پلاتا ہے (یعنی کہیں نہ کہیں سے رزق مہیا ہو جاتا ہے)

حضرت عبداللہ بن مبارک : کیا وضو کا پانی موجود ہے؟

خاتون : فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا اگر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو (مطلب یہ کہ پانی نہیں مل رہا ہے۔ سو تیمم کر لیتی ہوں۔)

حضرت عبداللہ بن مبارک : یہ کھانا حاضر ہے کھا لیجیے

خاتون : أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۔ روزے رات کے آغاز تک پورے کرو (اشارہ یہ تھا کہ میں روزے سے ہوں)

حضرت عبداللہ بن مبارک : یہ رمضان کا مہینہ تو نہیں ہے۔

خاتون : وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ——— اور جو نیکی کے طور پر خوشی سے روزہ رکھے تو بیشک اللہ تعالیٰ شکر گزار اور علیم ہے (یعنی میں نے نفل روزہ رکھا ہے۔)

حضرت عبداللہ بن مبارک : لیکن سفر میں تو روزہ افطار کر لینے کی اجازت ہے؟

خاتون : وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ——— ۔ اور اگر تم روزہ رکھو تو تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔

حضرت عبداللہ بن مبارک : آپ میرے جیسے انداز میں بات کریں۔

خاتون : مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ——— ۔ وہ (انسان)، کوئی بات نہیں کرتا مگر یہ کہ اُس کے پاس ایک مستعد نگہبان ضرور ہوتا ہے (یعنی چونکہ انسان کے ہر لفظ پر ایک فرشتہ نگہبانی کرتا ہے اور اس کا اندراج ہوتا ہے اس لیے بر بنائے احتیاط میں قرآن کے الفاظ میں ہی بات کرتی ہوں۔)

حضرت عبداللہ بن مبارک : کس قبیلہ سے تعلق رکھتی ہیں؟

خاتون : وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا جو بات تمھیں معلوم نہ ہو اُس کے درپے نہ ہو۔ بیشک کان، آنکھ اور دل اس کی طرف سے جواب دہ ہیں (یعنی جس معاملے کا پہلے سے آپ کو کچھ علم نہیں ہے اور جس سے کچھ واسطہ ہے، اسے پوچھ کر اپنی قوتوں کو ضائع کرتے ہیں۔)

حضرت عبداللہ بن مبارک : مجھے معاف کر دیں۔ میں نے واقعی غلطی کی۔

خاتون : لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اور اللہ تمھیں بخش دے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک : کیا آپ میری اونٹنی پر بیٹھ کر قافلے سے جا ملنا پسند کریں گی؟

خاتون : وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۔ اور تم جو نیکی کرتے ہو، اللہ اُسے جان لیتا ہے (یعنی

اگر آپ مجھ سے یہ حسنِ سلوک کرنا چاہیں تو اللہ اس کا اجر دیگا۔)

حضرت عبداللہ بن مبارک : اچھا تو پھر سوار ہو جائیے۔ (یہ کہہ کر حضرت نے اپنی اونٹنی بٹھا دی)

خاتون : قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ ——— اور ایمان والوں سے کہہ دیجیے کہ وہ (خواتین کا سامنا ہونے پر نگاہیں نیچی رکھیں)

حضرت عبداللہ مدعا سمجھ گئے اور منہ پھیر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ لیکن جب خاتون سوار ہوئیں تو اونٹنی بدکی اور خاتون کا کپڑا کجاوے میں الجھ کر پھٹ گیا اور وہ پکار اٹھیں:

خاتون : وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ ——— ۔ تمھیں جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمھارے اپنے ہی کیے کرائے (کوتاہی و لغزش)، کا نتیجہ ہے۔

(خاتون گویا حضرت عبداللہ کو توجہ دلا رہی تھیں کہ یہاں کچھ مشکل پیش آگئی ہے۔ حضرت عبداللہ سمجھ گئے اور اونٹنی کا پیر باندھا اور کجاوے کے تسمے درست کیے۔ خاتون نے حضرت عبداللہ کی مہارت و قابلیت کی تحسین کرنے کے لیے ایک آیت کے ذریعے اشارہ کیا)

خاتون : فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ ۔ ہم نے سلیمان (علیہ السلام)، کو اس معاملے میں فہم و بصیرت دی اور پھر جب سواری کا مرحلہ طے ہو گیا تو خاتون نے سواری کا آغاز کرنے کی آیت پڑھی:

سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ ——— پاک ہے وہ ذات جس نے اس (سواری) کو ہمارے لیے مفید خدمت کے قابل بنا دیا۔ ورنہ ہم (اپنے بل بوتے پر)، اس قابل نہ تھے۔ اور یقیناً ہمیں لوٹ کر (جواب دہی کے لیے)، اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

اب حضرت عبداللہ نے اونٹنی کی مہار تھامی اور حُدی (عربوں کا مشہور نغمۂ سفر) الاپتے ہوئے تیز تیز چلنے لگے۔

خاتون : وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ——— ۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کرو اور اپنی آواز دھیمی رکھو۔

حضرت عبداللہ بات سمجھ گئے اور آہستہ آہستہ چلنے لگے اور گنگنانے کی آواز بھی پست کر دی

خاتون : فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ پھر قرآن میں جتنا کچھ آسانی کے ساتھ پڑھ سکو پڑھو (یعنی فرمائش ہوئی کہ حُدی (شعر و نغمہ)، کے بجائے قرآن میں سے کچھ پڑھیے۔ حضرت عبداللہ قرآن پڑھنے لگے اور خاتون نے اس پر خوش ہو کر کہا:

وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۔ اور اہلِ دانش و بینش ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ نے کچھ دیر قرآن پڑھنے کے بعد کہا،

حضرت عبداللہ بن مبارک : اے خالہ کیا آپ کے شوہر ہیں؟ (یعنی زندہ ہیں)

خاتون : يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ——— اے ایمان والو ایسی باتوں کے متعلق نہ پوچھو جو اگر تم پر ظاہر کی جائیں تو تمھیں بُری معلوم ہوں (خاتون کا مطلب یہ تھا کہ اس معاملے میں سوال نہ کرو اور قرینہ بتا رہا تھا کہ غالباً خاتون کے شوہر فوت ہو چکے ہیں)



آخرکار اُن دونوں نے قافلے کو جا پکڑا۔

حضرت عبداللہ بن مبارک: کیا اس قافلہ میں آپ کا کوئی لڑکا یا عزیز ہے جو آپ سے تعلق رکھتا ہے؟

خاتون: اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ——— مال اور اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔ (یعنی میرے بیٹے بھی قافلے میں شامل ہیں اور اُن کے ساتھ مال و اسباب بھی ہے)

حضرت عبداللہ بن مبارک: آپ کے لڑکے قافلہ میں کیا کام کرتے ہیں (موصوف کا مدعا یہ تھا کہ اُن کو پہچاننے میں آسانی ہو)

خاتون: وَعَلٰمٰتٍ، وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ

اور نشانیاں ہیں اور ستاروں سے وہ راہ پاتے ہیں۔ (مفہوم یہ تھا کہ وہ قافلہ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں)

حضرت عبداللہ بن مبارک: کیا آپ اُن کے نام بتا سکتی ہیں؟

بڑھیا: وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ○ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ○ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ———

——— اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو دوست بنایا اور موسیٰ سے کلام کیا۔ اے یحییٰ اس کتاب کو قوت سے پکڑو۔ (اِن تین آیتوں کو پڑھ کر خاتون نے بتا دیا کہ اُن کے نام ابراہیم، موسیٰ اور یحییٰ ہیں)

حضرت عبداللہ نے قافلہ میں اُن ناموں کو پکارنا شروع کیا تو وہ تینوں نوجوان فوراً حاضر ہو گئے۔

خاتون: (اپنے لڑکوں سے) ———

فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ

اپنے لوگوں میں سے کسی کو اپنا سکہ (یعنی نقدی) دے کر شہر میں (کھانا خریدنے کے لیے) بھیجو۔ اور اسے چاہیے کہ وہ دیکھے کون سا کھانا زیادہ پاکیزہ ہے۔ پھر اُس میں سے تمھارے پاس روزی لے آئے (یعنی لڑکوں کو کھانا کھلانے کی ہدایت کی)

اور جب کھانا لایا گیا تو خاتون نے حضرت عبداللہ بن مبارک سے کہا:

خاتون: كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ——— ہنسی خوشی کھاؤ پیو۔ بہ سبب اُس اچھے کام کے جو تم نے گذشتہ ایام میں کیا اور ساتھ ہی دوسری آیت پڑھی جس کا منشا یہ تھا کہ میں آپ کے حسنِ سلوک کی شکر گزار ہوں

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۔ نیکی کا بدلہ نیکی ہی ہو سکتا ہے۔

یہاں تک پہنچ کر یہ مبارک گفتگو ختم ہو گئی۔ اور اس ضعیف خاتون کے لڑکوں نے عبداللہ بن مبارک کو بتایا کہ اُن کی والدہ چالیس سال سے اسی طرح قرآن ہی کے ذریعے گفتگو کر رہی ہیں۔



دبئی کے مشہور و معروف استاد خطاط ہاشم محمد کے خطِ ثلث کا شاہکار



نمونۂ خطاطی

قرآن سے میرا عشق



چند اہم شخصیتوں کو ایک مختصر سا سوالنامہ دفتر سے جاری کیا گیا جس میں ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ ان کا ربط اور لگاؤ قرآن سے کب پیدا ہوا؟ اس کا نشو و ارتقا کیسے ہوا؟ کونسا نسخۂ قرآن (معریٰ یا مترجم) ان کے زیرِ مطالعہ رہتا ہے؟ وہ قرآن کی کس سورت یا آیت سے زیادہ متاثر ہوئے؟ کیا کوئی اہم سبق آموز واقعہ یا مشاہدہ ان کے علم میں ہے؟ —— اس سوالنامے کے جو جوابات میں موصول ہوئے وہ درج ذیل ہیں۔ ان میں ہم نے اسی موضوع سے متعلق سید قطب شہید کا ایک مختصر مضمون بھی شامل کر دیا ہے۔ (ادارہ)

مذاکرہ نمبر ۱

سید قطب شہید (مصری)

ابھی میں چھوٹا بچہ ہی تھا کہ میں قرآن پڑھنے لگا۔ اس کے مضامین کے گوشوں تک میرے ادراکات کی رسائی نہ تھی اور نہ ہی اس کے بلند اغراض کو میرا فہم احاطہ کر سکتا تھا۔ تاہم میں اس کے کچھ اثرات اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ میرا سیدھا سادہ ذہن تلاوتِ قرآن کے دوران بعض خیالی صورتیں اخذ کرتا جو بظاہر بڑی معمولی سی ہوتیں۔ لیکن میرے نفس میں اشتیاق اور حواس میں لذت پیدا کرتی تھیں۔ میں دیر دیر تک فرحت و نشاط کے ساتھ ان سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ ان سادہ تصویروں میں سے جو اس وقت میرے ذہن میں مرتسم ہوا کرتی تھیں ایک وہ تصویر ہے جو اس آیت کو پڑھتے وقت میرے ذہن میں منقش ہوا کرتی تھی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ

ترجمہ آیت :۔ اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر سے کرتا ہے، پس اگر اسے بھلائی پہنچے تو وہ اس (عبادت) پر مطمئن رہتا ہے، لیکن اگر اسے کوئی آزمائش پیش آجائے تو وہ (عبادت سے) اپنا منہ موڑ لیتا ہے۔ ایسا آدمی دنیا و آخرت دونوں طرف سے خسارے میں رہا۔ (الحج - ۱۱)

اس خیالی تصور کو اگر میں کسی کے سامنے پیش کروں تو شاید وہ اس کی ہنسی اڑائے۔ یہ تصویر یوں بنی کہ میں ایک گاؤں میں رہتا تھا اور گاؤں کے قریب ہی وادی کا ایک خاص ٹیلہ میری نگاہ میں تھا۔ اسے دیکھ کر میرے تصور میں یہ بات آتی تھی کہ گویا ایک شخص ہے جو ایک جھکے ہوئے بلند مکان کے کنارے پر یا تنگ سے ٹیلے کی چوٹی پر کھڑا نماز پڑھ رہا ہے، لیکن وہ اپنی حالت قیام پر قابو نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنی ہر حرکت کے دوران میں یوں کانپ رہا ہے، گویا کہ گرا ہی چاہتا ہے۔ میں اس کے سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا ہوں، اس کی حرکات

پر غور کرتا ہوں اور عجیب کیف و نشاط محسوس کرتا ہوں ایسی ہی سادہ اشکال میں سے ایک تصوراتی منظر وہ ہے جو اس آیت کو پڑھتے وقت میرے ذہن میں جاگزین ہوا تھا

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (الاعراف: ۱۷۶) میں اس آیت کے مضامین اور اغراض کو تو نہ سمجھتا تھا لیکن یہ نقشہ میرے خیال میں ضرور آتا تھا کہ ایک شخص ہے جس کا منہ کھلا ہوا ہے، زبان لٹک رہی ہے اور وہ کتے کی طرح مسلسل ہانپ رہا ہے۔ میری نظریں اس سے نہ ہٹتی تھیں۔ لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں اس کے قریب جانے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح کی مختلف صورتیں میرے کوتاہ ذہن میں منقش ہوتی تھیں۔ اور میں ان میں غور و فکر کرتے ہوئے لطف اندوز ہوتا۔ اس وجہ سے میرا دل قرآن کریم کی تلاوت کا مشتاق رہتا تھا۔ قرآن مجید پڑھتے وقت اس کی وادیوں میں ایسی تصاویر کو تلاش کرتا رہتا تھا۔ یہ دن وہ تھے جو انہی عمدہ یادوں اور سادہ تخیلات کے ساتھ بیت گئے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب میں نے علمی اداروں میں تحصیل علم کا آغاز کیا اور تفاسیر کی کتابوں سے قرآن کریم سمجھنے کی کوشش کی۔ اساتذہ سے قرآن کی تفسیر سنی لیکن اس پڑھنے اور سننے میں مجھے وہ بے مثال لذت حاصل نہ ہوتی جو مجھے بچپن میں حاصل ہوتی تھی۔ افسوس! قرآن میں حسن کے وہ سب نشانات مٹ گئے اور لذت و اشتیاق سے قرآن خالی ہو گیا۔ کیا یہ دو قرآن ہیں؟ ایک بچپن کا قرآن جو شیریں، سہل اور شوق افزا تھا اور دوسرا جوانی کا قرآن جو مشکل، پیچیدہ اور بظاہر غیر مربوط! شاید یہ تاثرات مقلدانہ انداز تفسیر کا کرشمہ تھے۔

میں نے اب قرآن کو تفسیروں کی مدد سے پڑھنے کے بجائے خود قرآن کی مدد سے پڑھنا شروع کیا تو پھر مجھے وہی محبوب اور دل خوش کن قرآن میسر آ گیا۔ قرآن سے شوق و محبت پیدا کرنے والی وہی سرور آفریں تصاویر مجھے پھر مل گئیں۔ لیکن اب یہ پہلے کی طرح سادہ نہ تھیں، کیونکہ میرے فہم میں تغیر آ گیا تھا۔ اب میں ان کے اغراض و مقاصد کو سمجھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ وہ زندگی میں پیش آنے والے بعض واقعات کی مثالیں ہیں جو نمایاں کی جاری ہیں، لیکن ان کی اثر آفرینی اور جاذبیت لازوال اور دائمی ہے۔

الحمد للہ میں نے قرآن کو پا لیا!

اب میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں اس پہلو سے کچھ بحثیں بطور نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کروں۔ چنانچہ مجلہ "المقتطف" میں ۱۹۳۹ء کو "التصویر الفنی فی القرآن" کے عنوان سے میں نے ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں میں نے قرآن کی چند تصاویر حقائق لے کر منعکس کیں اور ان کے فنی حسن و جمال کو واضح کیا اور خدائے قادر کی عظیم قدرت کی نشان دہی کی جو الفاظ کی وساطت سے ایسی مصوری کرتی ہے کہ جس سے رنگین موقلم اور کیمرے عاجز ہیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ مضمون ایک مستقل کتاب کے لیے موضوعِ بحث بن سکتا ہے۔ کئی سال گزر گئے اور قرآن

(حاشیہ) ؎ ترجمہ آیت مجموعہ:
اور (اے نبی!) ان کو پڑھ کر سنائیے اُس شخص کا حال کہ جسے ہم نے اپنی آیات عطا کیں، اور وہ اُن میں سے بھاگ نکلا، پھر اسے اپنے پیچھے لگا لیا شیطان نے اور وہ گمراہوں میں شامل ہو گیا۔ اگر ہم چاہتے تو ہم اسے ان آیات کے ذریعے بلندی عطا کرتے۔ لیکن وہ تو خود ہی زمین سے چپک کر رہ گیا، اور اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑ گیا۔ سو (اب) اس کی مثال ایک کتے کی سی ہے۔ اگر تو اس پر کوئی بوجھ ڈالے تو زبان لٹکا دے، یا اگر اسے چھوڑ دے تو بھی زبان لٹکا دے۔ (الاعراف-۱۷۶)

کی یہ تصاویر میرے خیالات میں بنتی جا رہی تھیں اور اُن میں فنی اعجاز نمایاں نظر آتے تھے اور جب میں ان کو بغور دیکھتا تو میرا یہ خیال پختہ ہو جاتا کہ میں اس کام کو اپنے ذمے لوں، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں اور جہاں تک ممکن ہو اسے وسعت دوں۔ وقتاً فوقتاً میں قرآنی مطالعہ میں منہمک رہا اور اس سے بے عدیل تصاویر اخذ کرتا رہا اور اس موضوع کو زیرِ بحث لانے کا شوق میرے ذہن میں اور زیادہ پختہ ہوتا گیا۔ لیکن اس معاملے میں کچھ ایسے موانع بار بار پیش آ جاتے کہ یہ چیز بس ایک دلی حسرت اور ذہنی اشتیاق بن کر رہ جاتی۔

آخر کار پورے پانچ سال بعد مجلہ "المقتطف" میں اس سلسلہ کی پہلی کڑی شائع کرنے کا موقع ملا۔ میں نے بحث کا آغاز کیا تو میرا پہلا کام یہ تھا کہ میں قرآن میں سے فنی تصویروں کو جمع کروں، انہیں پیش کروں اور پھر اس ادبی مصوری کی خوبیوں کو اجاگر کروں۔ اور خصوصاً فنی پہلوؤں کو واضح کروں۔ کیونکہ اس بحث میں میرا مقصد دیگر قرآنی مباحث و مطالب پیش کرنا نہ تھا بلکہ خالص فنی پہلو زیرِ توجہ تھا۔

مگر اب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نئی حقیقت ہے جو میرے سامنے اُبھر کر آ گئی ہے۔ وہ یہ کہ قرآنی تمثیلات قرآن کے دیگر اجزا و عناصر سے کوئی مختلف حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ قرآن کریم کا اسلوبِ بیان ہی ادبی تصویر نگاری ہے۔ یہ ایسا اسلوبِ بیان ہے جسے سوائے تشریعی احکام بیان کرنے کے، باقی تمام امور کی وضاحت کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اب میرے سامنے چند ادبی تصویروں کے جمع کر دینے اور ان کو مرتب کر دینے کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ سرے سے اصول تعبیری کی ایک نئی راہ اُجاگر کرنا میرا موضوع بن گیا۔ توفیقِ الٰہی سے، ایک غیر مترقبہ نعمت تھی جو میرے لیے مقدر ہو گئی۔

سو اسی بنیاد پر اس کتاب کے مباحث کا آغاز ہوا۔ اس کتاب میں جو کچھ ہے وہ اسی متذکرہ نظریہ کو واضح کرنے کے لیے ہے اور طریقِ تعبیرِ قرآنی کی ایک اہم خصوصیت کو کھول کر بیان کرنا مقصود ہے۔

جب یہ مقابلہ میں نے مکمل کر لیا تو میں نے محسوس کیا کہ جیسے قرآن میرے دل میں نئے روپ کے ساتھ اترا ہے۔ میں نے قرآن کو اس طرح پایا جس طرح پہلے کبھی نہ پایا تھا۔ قرآن میرے دل میں ایک حسین و جمیل شکل میں تھا۔ ہاں بالیقین وہ پہلے بھی ایسے ہی حسین و جمیل تھا، لیکن منتشر و متفرق حالت میں اور آج وہ میرے سامنے ایک مربوط مجموعہ کی حیثیت سے ہے جو ایک خاص مضبوط بنیاد پر قائم ہے ——— ایک ایسی بنیاد جس میں عجیب و غریب ربط ہے ——— جس کی مجھے پہلے سمجھ بوجھ نہ تھی ——— جس کا میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا، اور شاید کسی اور کے تصور میں بھی ایسا نہ ہو۔

اگر مجھے ان قرآنی تصاویر کو منتقل کرنے اور پیش کرنے میں اپنے ذہنی تصورات اور ضمیر کے احساس کی پوری ترجمانی کرنے کی توفیق حاصل ہو جائے، تو پھر بھی یہ چیز بلاشبہ اس کتاب کی مکمل کامیابی کی ضامن ہو گی۔

(مقدمہ "تصویر الفنی فی القرآن"۔ ترجمہ مولانا عبدالرشید ارشد)

میری امی! مجھے یاد ہے کہ گاؤں میں رمضان کا پورا مہینہ جب ہمارے گھر پر قاری حضرات، دل نشیں انداز میں قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے تو تُو گھنٹوں کان لگا کر پوری محویت کے ساتھ پردے کے پیچھے سے سنا کرتی تھی۔ میں تیرے پاس بیٹھا جب شور کرتا، جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے تو تُو مجھے

اشاروں کنایوں سے چپ رہنے کی تلقین کرتی تھی، اور پھر میں بھی تیرے ساتھ قرآن سننے میں شریک ہو جاتا۔ میں اگرچہ اُس وقت مفہوم سے ناواقف تھا، مگر میرا دل الفاظ کے معجزِ اندازِ سخن سے محظوظ ہوتا۔

پھر جب تیرے ہاتھوں میں پروان چڑھا تو تُو نے مجھے بستی کے ابتدائی مدرسہ میں بھیج دیا۔ تیری سب سے بڑی آرزو ہوتی کہ اللہ میرے سینے کو کھول دے اور میں قرآن حفظ کروں، نیز اللہ مجھے خوش الحانی کی نعمت سے نوازے ——— اور پھر میں تیرے سامنے بیٹھا ہمہ وقت تلاوت کیا کروں۔ چنانچہ میں نے قرآن حفظ کر لیا، یوں تیری آرزو کا ایک حصہ پورا ہو گیا۔

میری امّی! تیرا وہی معصوم پیارا بچہ، آج تیرے خورد سال لختِ جگر کی حیثیت میں تیری ہی تعلیم و تربیت کا ثمرہ تیری خدمت میں ہدیۃً پیش کر رہا ہے۔

اگر حُسنِ ترتیل کے پہلو سے وہ کچھ کوتاہ ہے، تو حسنِ تاویل کی نعمت سے ضرور بہرہ مند ہے۔

(انتساب "تصویر الفنی فی القرآن")

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب صدر دارالعلوم کراچی

قرآن کی ساتھ شغف کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب سے ایمان و اسلام کے ساتھ شغف کی ہوئی کیونکہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہو سکتیں۔ متاثر کرنے میں سب سے پہلے تو وہ اکابر علماً عقلا کا ماحول ہے جس میں پرورش پائی ان کے علم و فضل اور کمالِ عقل، بصیرت اور کمالِ دیانت کا مشاہدہ ہوا۔ ان سب کا اس پر مکمل اتفاق اس کی دلیل تھا کہ مسلمان کے لیے سب سے بڑی دولت قرآن کریم ہے۔ پھر جوں جوں عقل و فہم کو نشو و نما ملا، کائنات عالم میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت ملی اور توحید و رسالت پر یقین میں جلا پیدا ہوا اُسی مناسبت سے قرآن کریم کے ساتھ شغف بڑھتا چلا گیا۔

بیشمار کتابوں کے پڑھنے پڑھانے اور مطالعے کا بھی اتفاق ہوا ان سب میں زیادہ موثر اور قلب پر اثر انداز ہونے والی وہ کتابیں ہیں جنہیں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور صحابہ و تابعین کا تعامل صحیح انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد صوفیائے کرام کی کتابیں۔

فلسفہ اور علمِ کلام کی کتابیں بھی بیشمار پڑھیں مگر وہ کسی مسئلے میں شفا بخش ثابت نہیں ہوئیں۔ اُن میں شکوک و شبہات کے غیر متناہی سلسلے کے سوا کچھ نہیں پایا۔

مولانا عبدالصمد صارم الازہری

بچپن سے اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا شوق عطا فرمایا ہے، ایک علم کا اور دوسرے عمل کا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں جس زمانے میں ایک ناسمجھ بچہ تھا، پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہتا اور جو بھی کوئی اچھی بات پڑھتا اُسے گرہ میں باندھ لیتا اور اُس پر عمل کرتا، یہی وجہ تھی کہ میں اپنے خاندان میں سب سے زیادہ نیک لڑکا شمار کیا جاتا تھا، مجھے خوب یاد ہے کہ جس دن میں نے کتاب میں یہ مسئلہ پڑھا کہ وضو کرنے کے بعد دوسری نماز کے وضو کے لیے لوٹا بھر کر رکھنا مستحب ہے تو میں نے اُسی دن سے اس پر عمل شروع کر دیا ہے غرض، میں ہر چھوٹی بڑی بات پر عمل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

مطالعۂ کتب کا بچپن سے شوق تھا، جب بڑا ہو گیا تو یہ شوق اس قدر بڑھ گیا کہ طبیعت کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی، سوائے کتابوں کے مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی تھی جو کتاب بھی کسی فن، کسی مذہب، کسی علم کی ہاتھ لگ جاتی، میں اسے ختم کر کے دم لیتا تھا۔

مطالعۂ کتب کے اس شوق نے ایک دن سر سید احمد خاں کے رسالہ تہذیب الاخلاق تک پہنچا دیا، اُن کے مضامین پڑھ کر میری آنکھیں کھل گئیں اور مجھے ہر قدیم چیز سے نفرت ہو گئی، رفتہ رفتہ ہر بات میں مجھے سر سید احمد خاں سے اتفاق رائے ہونے لگا، ان کے وہ مضامین جو معجزات کے انکار کے بارے میں تھے مجھے بہت پسند آئے اور شدہ شدہ مجھے مذہب کی ہر بات میں شک ہونے لگا۔

بالآخر میں رفتہ رفتہ نیچری بن گیا اور پھر دہریہ ہو گیا۔ اب مجھے مذہب اور مذہب کی ہر بات سے سخت نفرت ہو گئی تھی اور یہ سب فرسودہ باتیں معلوم ہوتی تھیں، اسی لیے قرآن سے مجھے سخت نفرت (نعوذ باللہ) ہو گئی تھی کہ اس کتاب نے کیا فضول باتیں دنیا میں پھیلا رکھی ہیں، ہر چیز حرام، کفر اور شرک، کیا واہیات (استغفراللہ) ہے۔ شراب اتنی اچھی چیز جسے ساری مہذب دنیا پیتی ہے اور تن درست رہتی ہے حرام، زنا جسے انگریز اور یورپین اقوام سب جائز قرار دیتے ہیں، حرام۔ جوا جو موجودہ تمام ترقی یافتہ ملکوں میں رائج ہے اور بڑی نفع اندوز چیز ہے، حرام۔ یہ سب کچھ کیا ہے، اسلام میں ہر چیز حرام، ڈاڑھی منڈانا بھی حرام، ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہننا بھی حرام، ذرا ذرا سی باتیں حرام، کچھ حلال بھی ہے یا نہیں۔ ان تمام باتوں کی ذمہ دار یہ کتاب ہے۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو دنیا میں اس قدر تاریکی اور فرسودہ خیالی نہ ہوتی۔

لہٰذا میں نے ایک دن قرآن کو زمین پر پھینک کر ایک ٹھوکر لگائی، (العیاذ باللہ) ٹھوکر مارنی تھی کہ میرے پاؤں میں بجلی کا سا کرنٹ لگا اور اُسی وقت سے پاؤں میں درد رہنے لگا، میرا مطالعہ کافی وسیع تھا، میں نے طرح طرح سے فلسفیانہ توجیہات کر کے دل کو مطمئن کر لیا کہ یہ نفس، تحت الشعور، یا قدیم خیالات کا اثر ہے یا محض اتفاق ہے۔ اس طرح میرے عقائد جوں کے توں رہے۔

ایک عرصۂ دراز چوٹی کے حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج کرتے گزر گیا، پرہیز کا اور اصولِ صحت کا میں بڑا سخت پابند تھا مگر مرض میں کمی نہ آئی۔ اس عرصۂ دراز میں خیالات میں کچھ اور انقلاب آ چکا تھا اور میں نے قرآن سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا لہٰذا مجھے اس کتاب سے بڑی محبت ہو گئی تھی، ایک دن میں نے قرآن کو اپنے سامنے رکھا اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی کہ اگر مجھے صحت نصیب ہو جائے گی تو میں تمام عمر قرآن کی بے لوث خدمت کروں گا اور کبھی جاہ و مال کی پروا نہیں کروں گا، درد اُسی وقت کافور ہو گیا اور بغیر کسی دوا پرہیز کے مجھے ایک بڑی مصیبت سے نجات مل گئی، پھر جن جن مضر چیزوں سے مجھے حکیموں اور ڈاکٹروں نے روک دیا تھا وہ سب مضر چیزیں میں نے خوب کھائیں اور دوا بھی چھوڑ دی مگر مرض نہ لوٹا۔

تاریخ القرآن میں نے اسی جذبہ کے ماتحت بڑی کاوش سے لکھی تھی اور اس کے لیے مصر کے تمام کتب خانے پھان مارے تھے، جس کا اب بفضلِ خدا چوتھا ایڈیشن چھپنے والا ہے اور جسے خدائے تعالیٰ نے اتنی مقبولیت عطا کی ہے کہ مصر، شام، عراق اور یورپ کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں اس کے حوالے دئیے ہیں۔

عموماً ایک مسلمان رفتہ رفتہ ہی کافر بنتا ہے اور اگر کافر ہو کر پھر اسلام کی طرف لوٹتا ہے تو وہ بھی آہستہ آہستہ

ہی ہوتا ہے، اک دم تو کوئی کوئی ہی بدلتا ہے۔ ایک عرصہ تک اپنا یہ خیال رہا کہ قرآنی تصوف اتنا بلند نہیں ہے جتنا کہ ویدوں کا تصوف بلند ہے یعنی خدا تک پہنچنے کا جو راستہ قرآن نے بتایا ہے۔ وہ بڑا پیچیدہ ہے اور ویدوں کی بتائی ہوئی راہ بڑی مختصر ہے لہٰذا میں اس دور میں اکثر و بیشتر ویدوں کا مطالعہ کیا کرتا، بھگوت گیتا اور جوگ کی کتابیں پڑھا کرتا اور بڑے بڑے سخت مجاہدات کیا کرتا تھا۔

ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ قرآن اور وید میں بحث ہو رہی ہے، دونوں اپنی اپنی فضیلت ثابت کرنا چاہتے ہیں، آخر قرآن نے کہا، میرا بتایا ہوا راستہ ایسا ہے جس پر ہر شخص آسانی سے عمل کر سکتا ہے اور تیرا بتایا ہوا راستہ ایسا ہے جس پر دنیا کے بہت کم لوگ عمل کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ مجھے ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور تجھے کوئی کوئی۔

صبح صبح کا وقت تھا، اس خواب کے بعد میری آنکھ کھل گئی، مگر میں نے اس خواب کو کوئی اہمیت نہیں دی اور میں بدستور ویدوں وغیرہ کو پڑھتا رہا مگر لاشعوری طور پر اس خواب کے بعد مجھے ہندوانی کتابوں سے، انسانیت کو ناکارہ بنا دینے والی رہبانیت کی بُو آنے لگی اور مجھے قرآن سے دلچسپی ہو گئی، پھر میں نے ان کتابوں کو چھوا تک نہیں اور قرآن کے پڑھنے پڑھانے میں لگ گیا۔

محترمہ پروفیسر الطاف فاطمہ

قرآن حکیم سے دلچسپی اور کشش میرے ذہن میں ایک ایسے شخص کے ذریعہ پیدا ہوئی جو میرا استاد نہ تھا۔ جس سے میرا کوئی ظاہری تعلق یا واسطہ بھی نہ تھا وہ چلتا پھرتا آیا، ہمارے شاگرد پیشے میں چند روز مقیم رہا اور پھر اپنے گاؤں سدھا گیا۔ میں نے اُسے اس کے بعد پھر کبھی نہ دیکھا۔ نہ کبھی اس کا خیال آیا بجز چند مخصوص موقعوں کے جن میں سے ایک موقع وہ تھا جب میں نے قاری باسط کی آواز کو سورۂ رحمٰن کی تلاوت کرتے سنا۔

وہ شخص ایک سفید ریش بوڑھا تھا، قوم کا جولاہا اور ہمارے ملازم مولا بخش کا چچا تھا۔

جب وہ آیا اور میں نے اس کو دیکھا تو یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے نیا نیا قرآن شریف ختم کیا تھا۔ اور جس دن آخری سورت پڑھ کر کلامِ پاک گردان کر رکھا تھا۔ اس کے بعد سے اس کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی ہم کو انگریزی حساب پڑھانے کے لیے ماسٹر صاحب نہیں رکھے گئے تھے اور ہم خصوصاً میں سارا سارا دن باہر احاطے میں کھیلتی رہتی تھی۔ کئی مرتبہ اماں نے کہا بھی؛

"دیکھو تم قرآن شریف پڑھ پڑھا کر بھی بھول جاؤ گی کبھی کبھی بیٹھ کر دہرا لیا کرو"۔ مگر میں ہر بار ٹال جاتی تھی۔ ہماری اماں کی عادت نہ تھی کہ کسی بھی موقع اور بات پر دباؤ ڈال کر اپنی بات منوائیں اور قصہ یہ تھا۔ میں نے قرآن شریف پڑھ تو لیا تھا مگر اس سے کوئی لگاؤ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے جن مولوی صاحب سے پڑھا تھا وہ اپنے غصے اور مرکھنے پن کی وجہ سے جنات مشہور تھے۔ اور ان کے پاس پڑھنے بیٹھنے سے پہلے ان کے قصائی پن کے ہم نے بہت قصے سُن رکھے تھے۔ فلاں کو مارتے مارتے پنکھے کی ڈنڈی توڑ دی، فلاں کا کان پھاڑ دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب پہلے دن وہ ہمیں پڑھانے آئے تو اپنی توقع کے خلاف مجھے ان

سے کوئی خاص ڈر نہیں لگا اور میں نے ان سے آخر دن تک بڑے اطمینان سے پڑھا۔ البتہ ایک چھوٹا سا واقعہ ضرور ہوا تھا کہ ایک دن انہوں نے میرے بھائی کا کان مروڑا تو وہ بستہ ان کے مُنہ پر مار کر اندر چلے گئے تھے۔ اس کے بعد سے وہ ہمیں بڑے ضبط اور تحمل سے پڑھانے لگے تھے۔ بعد میں راز کھلا تھا کہ اماں نے ان سے ہماری عدم موجودگی میں کہا تھا کہ ان بچوں کو مار ڈانٹ کے پڑھائیں گے تو آپ کی محنت اکارت جائے گی۔ یہ ایک حرف بھی پڑھ کر نہ دیں گے۔

بہرحال مولوی صاحب نے ہمیں مارا تو کبھی نہیں البتہ ایک بے تعلقی کا سا انداز ضرور رکھا۔ وہ کچھ ایسی روکھی طبیعت کے انسان تھے کہ اپنے طرزِ تخاطب میں اصناف اور جنس کی تفریق بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ یعنی لڑکے اور لڑکی دونوں ہی کو ایک ہی انداز کے افعال پڑھاتے مثلاً اگر مجھے چلبلاپن کرتے یا منہ چڑا چڑا کر ہنستے دیکھتے تو اپنے مخصوص گاتے ہوئے بھاری لہجے میں تنبیہ کرتے۔

"مان جا بے۔ سیدھی طرح آموختہ سنا"

پھر ہمیں اور ہنسی آتی اور ہم ان کے جاتے ہی ان کی نقلیں کرتے۔ "مان جا بے اے اے۔ سیدھی طرح آموختہ آ آ۔ سنا آ آ۔"

استاد سبق اور بچے کے درمیان جو ایک مثلث رابطہ قائم ہو کر سبق کے وقفوں کو خوشگوار بناتا ہے اس کا دور دور پتہ نہ تھا۔ ہم بوریت کو دور کرنے کے لیے ہر روز پانی پینے کی چھٹی لے کر سرک آتے اور کوشش یہ کرتے کہ اتنی چھوٹی چھوٹی چُسکیاں لے کر پانی حلق کے نیچے اتاریں کہ زیادہ سے زیادہ وقت گذر جائے۔ پھر ایک دوسرے کو ٹھوکتے۔

"جاؤ تا اب کب تک پانی پیو گے پھر مولوی صاحب ڈانٹیں گے"۔

"تو تم خود چلی جاؤ نہ تم تو مجھ سے پہلے پانی پینے آئی تھیں"۔ پھر ہم جوُں کی چال چلتے واپس جاتے۔

مگر مولوی صاحب کی ایک بات قابلِ تعریف تھی۔ وہ یہ کہ ہم چاہے کتنی ہی دیر لگاتے مگر وہ پڑھائے بغیر ہمیں چھوڑتے ہرگز نہ تھے۔

کبھی کبھی ان کا دل خوش ہوتا تو وہ ہمیں ایک آدھ لطیفہ بھی سنا دیا کرتے تھے۔ دراصل اب میں سوچتی ہوں تو یاد آتا ہے کہ مولوی صاحب غم زدہ سے اور کمزور صحت والے انسان تھے ان کی بیوی بیمار رہا کرتی تھیں اور اکلوتی بیٹی بھی بالکل سینک سلائی سی تھی۔ وہ ہمیشہ پیوند لگے سفید کھدر کے کپڑے پہنتے تھے۔ جب سے آج تک میں یہی سوچتی چلی آئی ہوں کہ یہ قرآن پڑھانے والے مولوی اتنے غم زدہ اور کم حیثیت کیوں ہوا کرتے ہیں۔ اب بھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ ـــ میرا وہ قرآن پڑھانے والا استاد مجھے مل جائے تو میں اس کو دیکھ کر بالکل اسی طرح اُٹھ کر تعظیم دوں جیسے سید وقار عظیم اور ڈاکٹر سید عبداللہ کو دیکھ کر خود بخود اُٹھ جانے کو دل چاہتا ہے۔ وہ بھی تو آخر کو میرا استاد ہی تھا کیا ہوا جو وہ میرے ذہن سے ربط پیدا نہ کر سکا اور میرا وہ استاد خستہ حال اور ضرورت مند تھا۔

ایک بار قرآن شریف ختم کروا کر مولوی صاحب وطن گئے تو پھر واپس نہ آئے۔ اور کم سے کم میں نے کبھی ان کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اس لیے کہ اب کھیلنے کی مکمل آزادی تھی اور مولوی صاحب یاد رکھنے کے قابل چیز نہ تھے۔

ان ہی دنوں مولا بخش کی کوٹھری میں ایک قابل

ذکر تبدیلی نظر آئی یعنی اس کی دھلی دھلائی ٹھنڈی اور صاف ستھری کوٹھری میں ایک دراز قد اور سفید ریش بوڑھا نظر آیا۔ مولا بخش کھانا پکاتا تھا۔ سیاہ فام صاف ستھرا سفید شلوکا پہنے چارخانے کی تہمد باندھے کھڑاویں پہنے کھٹ کھٹ کرتا کام کرتا پھرتا۔ پابندی سے پانچوں وقت کی نماز اور صبح کی تلاوت کے علاوہ تہجد بھی کبھی قضا نہ کرتا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر قرآن شریف پڑھا کرتا تھا اور بچوں سے اس کو دلی نفرت تھی۔ کیا مجال جو اس کی کوٹھری میں کوئی قدم بھی رکھ لے فوراً ہاتھ پکڑ کر باہر کر دیتا۔

"یہاں کیا کام ہے، چلو جا کر باہر کھیلو،" اور مجھے کتنا شوق تھا اس کی کوٹھری میں ٹھنڈی چٹائی پر بیٹھنے کا۔ مگر ہم تو اس کی کوٹھری تو کوٹھری آگے والی کھپریل تک میں قدم رکھتے گھبراتے تھے۔ یوں لگتا تھا یہ کوٹھری ہمارے ملازم کی نہیں کسی جن بھوت کی ہے۔

مگر جب سے وہ بڑے میاں آ کر رہے تھے۔ ان کی مسکراہٹ ہماری خاصی ہمت افزائی کرتی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ہم لکڑی کے ستون سے لگ کر انکو مخاطب کرتے :

"بڑے میاں سلام !"

"خوش رہو بیٹا"۔ ان کی آواز نرم اور مسکراتی ہوئی تھی۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے بڑے میاں"

"شکر ہے اللہ کا"

اتنی گفتگو کر کے ہمیں محسوس ہوتا کہ ہم نے مولا بخش کے اس تمام تڑتے اور روکھے پن کو شکست دے دی ہے جو وہ ہم سے روا رکھتا۔

بہار کی صبح کی نرم نرم ہوا، سبزے پر جوہی، مولسری اور کامنی کے پھولوں کا بچھونا سا کر دیا کرتی تھی۔ ایسے دنوں میں میں صبح صبح جاگ جاتی اور سیدھی باہر بھاگتی تاکہ زیادہ سے زیادہ پھول چن سکوں۔

وہ ایسی ہی ایک صبح تھی۔ تمام رات رات کی رانی مہکی تھی اور صبح کی ہوا نے پھولوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ میری آنکھ خود بخود کھل گئی۔ ابھی صبح پوری نمودار نہیں ہوئی تھی۔ نرم نرم ہوا چل رہی تھی میں اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ تقریباً ہر شخص سو رہا تھا۔ لیکن مولا بخش کی کھپریل سے ایک عجیب سحر انگیز سی آواز آ رہی تھی۔ لحظہ بھر کو میرے قدم رکے میں نے ٹھٹک کر سنا۔ اور پھر میں اس طرف کھنچی چلی گئی۔ کھپریل کے ایک گوشے میں کھجور کی چٹائی پر ایک سایہ سا نظر آ رہا تھا اور یہ آواز ادھر ہی سے آ رہی تھی میں اور قریب چلی گئی کورا کورا صاف بدھنا ایک طرف رکھا تھا۔ اور کھجور کی چٹائی پر بیٹھے ہوئے بڑے میاں تلاوت میں مصروف تھے۔ میں چپ چاپ جا کر ان کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ گاڑھے کا کرتا اور گاڑھے کی تہمد باندھنے والا یہ بیمار بوڑھا بغیر قرآن شریف کے تلاوت کر رہا تھا۔ ایک عجیب سی مبہوت کر دینے والی آواز تھی ان کی۔ جس نے میرے قدم پکڑ لیے تھے۔ وہ تمام الفاظ جن میں اب سے پہلے میرے لیے کوئی جان نہ تھی۔ اچانک ہی میرے حواسوں پر چھائے سے جا رہے تھے۔ بڑے میاں کی وہ آواز میرے کانوں میں آج بھی جاگ اٹھی ہے جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ
ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝

اور پھر میں کیا کہوں کہ انہوں نے کیسے دھیرے اور کس انداز سے کہا تھا۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ

میں ان الفاظ کے معنی اور مفہوم سے قطعاً آشنا نہ تھی لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہوں۔ وہ قرأت ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک عجب انداز سے دھیرے دھیرے جھوم رہے تھے۔ اور ان کا بوڑھا اور بیمار چہرہ چمک رہا تھا۔ قرأت ختم کر چکے کے بعد وہ کھنکارے اور کھڑے ہوئے۔

"بڑے میاں سلام"۔

"خوش رہو بیٹا"۔

"بڑے میاں !"

"ہاں بیٹا۔"

"اب بغیر دیکھے قرآن شریف پڑھ لیتے ہیں"۔

"ہاں میں نے حفظ کیا ہے۔"

میں اس دن بغیر پھول چنے ہی واپس چلی آئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے میری جھولی پھولوں سے بھر دی ہو۔

دوسرے دن میں پھر منہ اندھیرے اٹھی لیکن سیدھی اسی کھپریل کی طرف چلی گئی۔ وہ حسب معمول قراءت میں مصروف تھے۔ کچھ دیر سنتے رہنے کے بعد میں دبے قدموں واپس آ گئی۔ اگلے دن مجھے بخار ہو گیا۔ اور دوسری صبح بستر سے نہ اٹھ سکی۔ لیکن بڑے میاں کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝

وہ دن بھی گذر گیا اور دوسری صبح بھی میرا بخار نہ تھا۔ اماں کو فکر سی ہونے لگی۔ تب میں نے ان سے کہا۔

"اماں !"

"ہاں"

"ایک بات مانیں گی"

"کیا؟"

"مجھے باہر جانے دیں گی؟"

"بیٹا تمہیں بخار بہت ہے۔"

"نہیں اماں مجھے بڑے میاں کے پاس بھیج دیجئے۔ میں ان سے کہوں گی میرے اوپر پڑھ کر پھونک دیجئے" میں نے بہانہ کیا۔ میری تھوڑی سی ضد پر انہوں نے ہلکی سی شال اڑھا کر مجھے باہر بھیج دیا۔ اور میں اس پلنگ پر بیٹھ گئی جس پر بڑے میاں بیٹھے تھے۔ ان کو شاید خبر تھی کہ مجھے بخار ہے۔

انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا "اب جی کیسا ہے بیٹا؟"

"بڑے میاں !"

"ہاں !"

"مجھے رحمٰن شریف سنا دیجئے"۔

"اچھا بیٹے۔"

انہوں نے اپنے کندھوں پڑا چارخانے کا انگوچھا اتار کر سر پر ڈال لیا اور اسی ہر چیز کو بھلا دینے والی آواز میں سورۂ رحمٰن کی تلاوت کرنے لگے۔ میں گم سم سی بیٹھی سنتی رہی یوں لگتا تھا جیسے سر کا سارا بھاری پن اور ساری گرمی آہستہ آہستہ غائب ہو رہی ہے۔ اتفاق کی بات میرا بخار اسی دوپہر کو اتر گیا۔ بڑے میاں جتنے عرصہ رہے میں وقت بے وقت پہنچ جاتی۔

"بڑے میاں رحمٰن شریف پڑھئے"۔

"اچھا بیٹا"۔ بجز زوال کے وقت کے وہ ہمیشہ راضی ہو جاتے۔

پھر وہ تندرست ہو کر چلے گئے۔ اور پھر کبھی نہ آئے۔ مجھے بار بار لگتا جیسے کچھ کھو سا گیا ہے۔

اماں پابندی سے تو نہیں لیکن رمضان میں باقاعدہ اور یوں اکثر ظہر کی نماز کے بعد اونچی آواز سے قرآن شریف

پڑھا کرتی تھیں۔ انہیں سورۂ مزمل خصوصیت سے پسند تھی۔ وہ انہیں حفظ تھی اور بڑی اچھی طرح پڑھا کرتی تھیں۔ لیکن اس اچھی طرح پڑھنے کو میں نے پہلی بار بڑے میاں کے جانے کے بعد محسوس کیا۔

چنانچہ میں اب روز روز ان سے فرمائش کرنے لگی۔ لیکن جب تک سورۂ رحمٰن نہ سن لیتی بات ادھوری سی رہتی۔

تب ایک دن اماں نے مجھ سے کہا: "تمہیں یہ سورۃ اتنی پسند ہے کہو تو تم کو یاد کرا دوں۔"

چنانچہ میں نے وہ حفظ کرلی۔

اور پھر آہستہ آہستہ انہوں نے مجھے ایک بار قرآن شریف خود پڑھایا۔ ان کا تلفظ بہت اچھا تھا اور بہت اچھی آواز میں پڑھتی تھیں۔ پھر انہوں نے مجھے ترجمہ پڑھنے کا شوق دلانا شروع کیا۔

میں قرآن شریف بلاناغہ پڑھنے کی عادی ہوتی چلی گئی اور بی اے تک میں نے تلاوت کبھی ناغہ نہ کی تھی۔ لیکن سارا قرآن شریف ایک طرف تھا اور سورۂ رحمٰن ایک طرف۔ اس میں اتنی مانوسیت اتنی آشنائی تھی کہ مجھے لگتا تھا کہ سارے قرآن شریف میں یہی میری اپنی چیز ہے۔ اور آج بھی میرا یہی حال ہے کہ اب جب کبھی قرآن شریف کھولتی ہوں تو سب سے پہلے جو چیز خود بخود کھل کر سامنے آتی ہے وہ ہے سورۂ رحمٰن۔ اس کی وجہ مجھے عرصے تک معلوم نہ ہوسکی اور اب جب میں مسجدوں کے اماموں اور مولویوں کو کرخت آوازوں میں آذانیں دیتے اور ڈپٹ ڈپٹ کر قرآن شریف کی تلاوت اور تفسیر لاؤڈ اسپیکروں میں بیان کرتے سنتی ہوں تو مجھے وہ سبب معلوم ہو جاتا ہے۔ سارا فرق سامنے آجاتا ہے۔

مجھے سورۂ رحمٰن سے اس لیے محبت ہے کہ میں نے اس کو نرم حلیم اور عاجز آواز میں سنا تھا۔ اور ان بے ہنگم آوازمیں دی ہوئی آذانوں سے چڑ کر اور ضد یا کر میں ہی نہیں، نہ جانے کتنے لوگ نمازیں قضا کر دیتے ہونگے۔

یہ قرآن حکیم پڑھانے میں بے تعلقی، اور خطبات و واعظ میں ڈانٹ ڈپٹ، لاؤڈ اسپیکروں میں منہ ڈال کر پھیپھڑوں کا پورا زور صرف کر کے، غیض و غضب، نفرت و حقارت کے الفاظ بول کر دین و قرآن کا پرچار نہیں اپنے ہی ہاتھوں اس کی جڑیں کاٹنے والے مولویوں کا قصور نہیں بلکہ اس میں اوقاف اور اسلامیات کے شعبوں کے سربراہوں، محکمات برائے دینی تعلیم کا بڑا قصور ہے جو احساسِ کمتری کے مارے ہوئے اماموں، مؤذنوں اور مولویوں کی ذہنی نشو و نما تو ایک طرف اتنی بھی تربیت کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ لاؤڈ اسپیکر سے کتنے فاصلے پر کھڑے ہو کر کتنی آواز میں دی ہوئی اذان ہوش رُبا بن سکتی ہے۔ کبھی کبھی میرا دل بے اختیار چاہتا ہے کہ کوئی ان خطیبوں اور اماموں کو جا کر سمجھائے کہ تم اپنی ساری ڈانٹ پھٹکار کو ایک طرف رکھ کر۔ نرم، رحیم، اور ٹھہری ہوئی آوازوں میں صرف ان دو آیتوں۔ فاعتبروا یااولی الابصار اور واللہ عزیز" ذوانتقام کا مفہوم سمجھا دو تو یہ ساری دردسری ختم ہو جائے مجھے یقین ہے کہ جرائم نفرت، حسد، ہوس اور قتل و غارت کے انسداد کے سلسلے میں نرم اچھی اور پیاری آوازوں میں سمجھایا ہوا ان دو آیات کا مفہوم ان سارے خطبوں سے زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہوگا۔ جو وہ لاؤڈ اسپیکروں میں منہ ڈال کر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے دیتے ہیں۔

جناب احمد ندیم قاسمی

میں نے اپنی تعلیم کا آغاز ہی قرآن مجید سے کیا۔ چار برس کی عمر تھی جب گاؤں کی مسجد میں درس لینا شروع کیا۔ ابتدائی پانچ پارے پڑھے تھے کہ یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ پرائمری تعلیم کے بعد جب میں مڈل میں داخلے کے لیے اپنے سرپرست چچا کے ہاں پہنچا تو انہوں نے خود ہی قرآن کی تعلیم دینا شروع کی۔ یہ تعلیم قرآن کو ناظرہ پڑھنے تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ متن کے اردو ترجمے کے علاوہ مفصل تفسیر بھی شامل تھی۔ یہ تفسیرِ حقانی تھی۔ پھر پانچویں جماعت سے بی اے تک میں نے عربی کی تعلیم حاصل کی اور یوں قرآن مجید کی تفہیم میں خاصی مدد ملی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد قرآن کے متعدد تراجم اور تفسیری نسخے زیرِ مطالعہ رہے لیکن اب میرا طریق یہ ہے کہ ترجمے کی صحت معلوم کرنی ہو تو مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ دیکھ لیتا ہوں اور کسی آیت کی تفسیر پیشِ نظر ہو تو مولانا ابوالکلام آزاد سے استفادہ کرتا ہوں۔ یوں تو قرآن مجید کے کسی ایک حصے کو کسی دوسرے حصے پر ترجیح دینا گستاخی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے نظریات پر اس آیت کا اثر بے حد گہرا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا

قرآن مجید کے متعلق مجھے یہ واقعہ کبھی نہیں بھولے گا کہ ایک گاؤں میں ایک نوجوان کسی الزام میں پکڑا گیا۔ معاملے سے تھانے کو مطلع کرنے کی بجائے گاؤں کے ناموس کے نام پر معززین کی ایک پنچایت کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔—— پنچایت نے یہ اعلان کیا کہ اگر یہ نوجوان قرآنِ پاک پر ہاتھ رکھ کر کہہ دے کہ اس پر الزام غلط ہے تو یہ اپنا دعویٰ واپس لے لیا جائے گا۔ نوجوان نے بھی یہ دعوت قبول کرلی۔ قرآنِ مجید کا ایک نسخہ منگایا گیا اور جب نوجوان سے کہا گیا کہ وہ اسے چھو کر قسم کھائے تو وہ ایک قدم آگے بڑھا بھی، مگر پھر جیسے سناٹے میں آ گیا۔ اس کے سارے جسم پر رعشہ طاری ہوگیا۔ رنگ فق ہوگیا۔ ہونٹ کانپنے لگے اور آخر اس نے بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔

احمد ندیم قاسمی

محترمہ مریم جمیلہ بیگم

قرآن مجید تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے عجیب اور پیچیدہ راستے اختیار کرنے پڑے۔ چونکہ میں منزل پر بڑے احسن طریق سے پہنچی، اس لیے مجھے اپنے تجربات پر کبھی بھی افسوس نہیں ہوا۔

عہدِ طفولیت ہی سے مجھے موسیقی بڑی اچھی لگتی تھی خصوصاً وہ استادی گانے تو مجھے بہت ہی پسند تھے جنہیں دیارِ مغرب میں بلند ثقافت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ سکول میں موسیقی میرا پسندیدہ مضمون تھا اور اس میں اکثر مجھے اچھے نمبر حاصل ہوتے تھے۔ جب میں گیارہ سال کی ہوئی تو مجھے ریڈیو پر عربی موسیقی سننے کا اتفاق ہوا۔ جو مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اسے پھر سننے کا فیصلہ کرلیا۔ جب بھی میں عربی موسیقی سنتی، مغربی موسیقی کے لیے میرے دل میں کشش باقی نہ رہتی۔ میں نے والدین کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک دن میرے والد مجھے نیویارک کے شامی علاقے میں لے گئے۔ جہاں سے میں نے اپنے گراموفون کے لیے بہت سے عربی ریکارڈ خریدے۔ ان میں سے جو سب سے زیادہ مجھے پسند آیا۔ وہ اُمِ کلثوم کا وہ ریکارڈ تھا جس میں اُس نے سورۂ مریم کی تلاوت کی تھی۔ اُس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ یہ عورت آئندہ کس بُرے راستے پر گامزن ہونے والی ہے۔ لیکن مجھے اُس کی سریلی آواز اور عقیدت بڑی پسند آئی۔ انہی ریکارڈوں کی بدولت میں

عربی موسیقی کی گرویدہ بن گئی۔ حالانکہ میں عربی الفاظ کا مطلب بالکل نہ جانتی تھی۔ عربی موسیقی کی اس بنیادی قدر و منزلت کے بغیر میرے دل میں تلاوت کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ حالانکہ یہ ایک مغربی باشندے کے لیے اجنبی تھی۔ میرے والدین، رشتہ دار اور احباب عربی اور عربی موسیقی کو از حد دقیانوسی اور تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ اس لیے جب میں ریکارڈ بجانے لگتی تو اُن کا ہمیشہ یہی مطالبہ ہوتا کہ میں تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر لوں تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ ۱۹۶۱ء میں قبولِ اسلام کے بعد، نیویارک کی مسجد میں بیٹھ کر جب مشہور و معروف مصری قاری عبدالباسط کی تلاوت کا ٹیپ ریکارڈ سُنتی تو مسحور ہو جاتی۔ لیکن ایک نمازِ جمعہ میں امام صاحب نے ریکارڈ نہ بجایا۔ کیونکہ اس دن ایک مہمانِ خصوصی آیا ہوا تھا۔ یہ ایک پستہ قامت معمولی لباس میں ملبوس سیاہ فام نوجوان تھا جو زنجبار کا ایک طالب علم تھا۔ جب اُس نے سورہ الرحمٰن کی تلاوت شروع کی تو ایسا معلوم ہوا کہ میں نے اس سے پہلے اتنی شاندار تلاوت کبھی نہیں سنی، قاری عبدالباسط بھی اس کے مقابلے میں ہیچ تھا۔ اس سیاہ فام افریقی نوجوان کی آواز نہایت سریلی تھی۔ یقیناً حضرت بلال حبشیؓ کی آواز بھی بہت کچھ اس سے ملتی ہو گی!

دس سال کی عمر ہی سے میں نے عربوں کے متعلق وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو مجھے سکول یا اپنے فرقے کی لائبریریوں سے حاصل ہو سکیں۔ خصوصاً وہ کتب جنہیں یہودیوں اور عربوں کے تاریخی تعلقات کا ذکر تھا۔ لیکن قرآن مجید کے متعلق اپنے تجسس کی تسلی کرنے میں نو سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا۔ آہستہ آہستہ جب بلوغت کی عمر کو پہنچی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام کو عربوں نے اس بلند مرتبے پر نہیں پہنچایا بلکہ اسلام نے عربوں کو صحرائی بادیہ نشینوں سے دُنیا کا حکمران بنا دیا۔ جب تک میرے دل میں اس انقلاب کی وجوہات دریافت کرنے کا شوق پیدا نہ ہوا اس وقت تک قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔

۱۹۵۲ کے موسم گرما میں، کالج میں بہت سے مضامین کا کورس اختیار کر لینے سے میرے دل و دماغ پر سخت دباؤ پڑا۔ اگست میں مَیں علیل ہو گئی اور میں نے سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ ایک شام جب میری والدہ پبلک لائبریری جانے لگیں تو مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کوئی کتاب منگواؤ گی۔ میں نے کہا کہ مجھے قرآن مجید کا ایک نسخہ لا دیں۔ ایک گھنٹہ بعد جب وہ لوٹیں تو اُن کے ہاتھ میں قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ تھا۔ جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے ایک عیسائی عالم اور مبلغ جارج سیل نے کیا تھا۔ چونکہ اُس کی زبان بڑی فرسودہ قسم کی تھی۔ اور اس میں عیسائی نقطۂ نگاہ سے متن کو بگاڑنے کے لیے حواشی میں البیضادی اور زمخشری کے حوالے دیئے گئے تھے، اس لیے میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اُس زمانے میں اپنے ناپختہ دماغ کی وجہ سے قرآن کو تورات کے مانوس قصص کی مسخ شدہ اور محرف شکل کے سوا کچھ نہ سمجھتی تھی۔ میں تین دن رات تک مسلسل اس کے مطالعے میں منہمک رہی۔ اور جب میں نے اسے ختم کر لیا۔

قرآن کے متعلق میرا پہلا تاثر کچھ اور تھا مگر میں اس کے مطالعے سے باز نہ رہ سکی۔ میں تین دن رات تک مسلسل اس کے مطالعے میں منہمک رہی۔ اور جب میں نے اسے ختم کر لیا تو میری تمام توانائی ختم ہو کر رہ گئی۔

میری عمر اس وقت صرف ۱۹ سال کی تھی۔ اور میرا حال یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو ایک اسی سالہ بوڑھیا کی طرح کمزور محسوس کرنے لگی۔ اس کے بعد میری پوری توانائی کبھی بحال نہ ہو سکی۔

میں قرآن کے متعلق اپنی اس رائے پر قائم رہی۔ ایک دن میں نے ایک دکان پر محمد مارماڈیوک پکتھال کے انگریزی

ترجمۂ قرآن کا ایک سستا ایڈیشن دیکھا۔ جونہی میں نے اُسے کھولا، وہ میرے لیے ایک عظیم انکشاف ثابت ہوا۔ اس کی فصاحت و بلاغت نے میرے پاؤں اکھاڑ کر رکھ دیئے۔ پکتھال نے اپنے دیباچے کے پہلے پیراگراف میں لکھا تھا:

"اس ترجمہ کا مقصد انگریزی خواں طبقے کے سامنے یہ بات پیش کرنا ہے کہ دُنیا بھر کے مسلمان قرآن کے الفاظ سے کیا مفہوم لیتے ہیں اور قرآن کی ماہیت کو موزوں الفاظ میں سمجھانا اور انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ معقولیت کے ساتھ یہ دعوےٰ کیا جا سکتا ہے۔ کہ کسی الہامی کتاب کو ایک ایسا شخص عمدگی سے پیش نہیں کر سکتا جو اُس کے الہامات اور پیغام پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ ہے جو ایک ایسے انگریز نے کیا جو مسلمان ہے۔ بعض تراجم میں ایسی تفسیریں کی گئی ہیں جو مسلمانوں کے لیے دل آزار ہیں اور تقریباً سب میں زبان کا ایسا اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جسے مسلمان غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے۔ یہ قدیم شیوخ کا اور میرا عقیدہ ہے۔ میں نے اس کتاب کو علمی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے لیے کوشش کی گئی ہے کہ موزوں زبان استعمال کی جائے۔ لیکن یہ ترجمہ قرآن مجید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو بے مثل و بے عدیل ہے۔ اس میں اتنی ہم آہنگی ہے کہ لوگ اُسے سُنتے ہی رونے لگتے اور وجد میں آجاتے ہیں۔ یہ تو قرآن کے مفہوم کو انگریزی میں پیش کرنے کی محض ایک کوشش ہے اور اُس کے سحر کی قدرے عکاسی۔ یہ عربی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نہ میرا یہ مقصد ہے ـــــــ"

اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ سیل کا ترجمہ کیوں اتنا ناموزوں لگا تھا۔ اس کے بعد میں نے اُس کا اور دوسرے غیر مسلموں کا ترجمۂ قرآن پڑھنے سے اِنکار کر دیا۔ پکتھال کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں نے عبداللہ یوسف علی، محمد علی لاہوری اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے تراجم کا مطالعہ کیا۔ اور مجھ پر فوراً انکشاف ہوا کہ یوسف علی اور محمد علی کی تفسیر غیر موزوں ہے۔ اس کی وجہ اُن کا لہجہ اور دور از کار اور غیر معقول کوشش تھی جو انہوں نے اُن آیات کی تشریح میں کی تھی جو جدید فلسفے اور سائنسی تصورات سے متصادم ہوتی ہیں۔ اُن کا متن کا ترجمہ بھی کمزور تھا۔ گو مولانا دریا بادی نے اپنے ترجمے میں تورات کے شاہ جیمز کے ترجمے کے نمونے پر قدیم اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ مجھے اُن کی تفسیر عمدہ معلوم ہوئی۔ خاص کر اُس کا وہ حصہ جس میں مختلف مذاہب کا ذکر ہے اور میں نے اس سے بہت کچھ حاصل کیا۔ بہر کیف پکتھال کا ترجمہ مجھے بہت پسند آیا۔ اور آج کے دن تک مجھے اس کے مقابلے کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں مل سکا۔ کسی ترجمے میں وہ فصاحت و بلاغت اور اندازِ بیان نہیں جو اس میں موجود ہے۔ بہت سے دوسرے تراجم میں اللہ کے لیے "گاڈ" کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی گئی ہے۔ لیکن پکتھال نے ہر جگہ "اللہ" ہی استعمال کیا ہے۔ اس سے اسلام کے پیغام میں مغرب کے قاری کے لیے بڑا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ جب تک میں ہسپتال میں صاحبِ فراش رہی پکتھال کا ترجمہ مسلسل میرے زیرِ مطالعہ رہا۔ میں نے اُسے بار بار پڑھا۔ میں نے اُس کے چھ عدد نسخے خراب کیے۔ اللہ تعالیٰ پکتھال پر برکات نازل کرے جس نے امریکہ اور انگلستان کے باشندوں کے

لیے قرآن کی تعلیمات کا مطالعہ آسان بنا دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو میں اُس سے لاعلم رہتی اور اس کی قدر نہ کر سکتی۔

۱۹۰۹ میں، ہسپتال سے باہر آنے کے بعد، میں فرصت کے اوقات میں نیویارک پبلک لائبریری کے مشرقی شعبے میں بیٹھ کر اسلام کے متعلق کتب کا مطالعہ کرتی۔ یہیں مجھے مشکوٰۃ المصابیح مترجمہ الحاج مولانا فضل الرحمٰن کلکتوی کی چار ضخیم جلدوں کا پتہ چلا اور مجھے اس بات کا علم ہوا کہ قرآن مجید کو موزوں اور منفصل طور پر سمجھنا اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک متعلقہ حدیث کا پتہ نہ ہو۔ کیونکہ نبی اکرمؐ کے اسوہ اور فرمودات کے سوا قرآنِ حکیم کی تفسیر کس طرح ممکن ہو سکتی ہے جن پر یہ نازل ہوا تھا! وہ لوگ جو منکرِ احادیث ہیں وہ منکرِ قرآن ہیں۔

مشکوٰۃ کے مطالعے کے بعد میں نے قرآن کو الہامی کتاب مان لیا۔ جس چیز نے مجھے اس بات کا قائل کر دیا کہ قرآن منجانب اللہ ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں وہ اُس کے تسلی بخش اور معقول جوابات ہیں۔ جو اُس نے زندگی کے تمام اہم مسائل کے متعلق دیے ہیں۔ اور یہ ایسے ہیں کہ مجھے کسی دوسری جگہ نہیں ملے۔

میں بچپن میں موت سے بڑی خوفزدہ رہا کرتی تھی۔ خاص کر اپنی موت کے خیال سے اتنا ڈرتی تھی کہ بعض مرتبہ خواب دیکھنے کے بعد آدھی رات کو چیخنے لگتی اور والدین کو جگا دیتی۔ جب میں اُن سے دریافت کرتی کہ میں کیوں مروں گی اور موت کے بعد میرا کیا بنے گا تو وہ صرف اتنا کہہ دیتے کہ وہ ناگزیر ہے اور مجھے اسے قبول کرنا ہو گا۔ اور چونکہ طبی سائنس ترقی کر رہی ہے شاید میں ایک سو سال تک زندہ رہوں میرے والدین، خاندان کے باقی افراد اور تمام دوست احباب بڑی نفرت کے ساتھ حیات بعد الممات، روزِ حشر، جنت کے انعامات اور دوزخ کی سزا کو توہم پرستی اور فرسودہ عقائد سمجھتے تھے۔ تورات کے انبیاء بطریق اور اولیا کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ اُنہیں سزا و جزا اسی دنیا میں ملی تھی۔ حضرت ایوبؑ کی کہانی مشہور ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اُس کے تمام پیاروں کو تباہ کر دیا، اُن کی املاک برباد کر دیں۔ اُنہیں ایک اذیت ناک مرض میں مبتلا کر دیا۔ تاکہ اُن کے ایمان کی آزمائش کی جائے۔ حضرت ایوبؑ نے رو رو کر خدا سے فریاد کی کہ اُس نے کیوں ایک نیکوکار انسان کو مصائب میں مبتلا کیا۔ کہانی کے خاتمے پر اللہ تعالےٰ اُن کے تمام دنیاوی نقصانات کی تلافی کر دیتے ہیں۔ لیکن اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اُن کی حیات بعد الممات میں اُنہیں کیا جزا ملی۔ میں نے انجیل میں بھی اس کا ذکر دیکھا اور اُس کا مقابلہ قرآن مجید سے کیا۔ انجیل کا بیان مبہم ہے۔ میں نے قدیم یہودیت میں بھی مسئلہ موت کا کوئی حل نہیں پایا۔ کیونکہ تالمود کی تعلیم یہ ہے کہ بہترین موت سے بدترین زندگی اچھی ہے۔ میرے والدین کا فلسفہ یہ تھا کہ موت کے خیال کو دل میں ہرگز جگہ نہ دینا چاہیے اور زندگی کی عطا کردہ مسرتوں سے مقدور بھر لطف اندوز ہونا چاہیے۔ اُن کے خیال میں زندگی کا مقصد یہ تھا کہ انسان خوش و خرم اور مسرور رہے، اپنے خاندان سے پیار کرے، دوست احباب سے تعلقات بڑھائے۔ اور اُن تفریحات میں منہمک رہے جن کی امریکہ میں فراوانی ہے۔ وہ زندگی کی اس مصنوعی شکل کے سختی سے قائل تھے۔ گویا یہ اُن کی مسرت اور خوش قسمتی کی ضامن تھی۔ میں نے تلخ تجربے سے معلوم کیا کہ ان باتوں سے پریشانی نصیب ہوتی ہے۔ اور ذاتی قربانی اور جد و جہد کے بغیر کوئی قابلِ قدر چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔

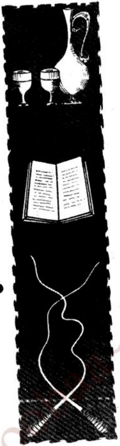
میں اپنے بچپن ہی سے اہم اور بڑے بڑے کام کرنا چاہتی تھی۔ سب سے زیادہ میں اس بات کی خواہشمند تھی کہ اپنی موت سے پہلے مجھے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ میں نے اپنی زندگی کے ایام پُرمعصیت اعمال میں ضائع نہیں کیے۔ میں زندگی بھر سنجیدہ مزاج رہی ہوں۔ میں نے ہمیشہ عصرِ جدید کی ثقافت سے نفرت کی ہے۔ جس کا بڑا چرچا ہے۔ ایک مرتبہ میرے والد نے مجھے یہ کہہ کر سخت پریشان کر دیا کہ دنیا میں کوئی چیز بھی مستقل قدر کی حامل نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم جدید رجحانات کو ناگزیر سمجھیں اور اپنے آپ کو اُن کے سانچے میں ڈھال لیں۔ لیکن میں ہمیشہ اس بات کی خواہاں رہی کہ کوئی ایسی چیز حاصل کروں جو تا ابد قائم رہے۔ اور یہ بات میں نے صرف قرآن مجید سے سیکھی کہ ایسا ممکن ہے۔ اگر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوئی نیک عمل کیا جائے تو وہ ضائع نہیں ہوتا۔ اگر اُسے دنیاوی انعام نہ بھی ملے تو اُسے اس زندگی کے بعد ضرور ملے گا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ لوگ جو اخلاقی اقدار سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے۔ اور آزادی سے من مانی کرتے ہیں۔ اُنہیں اس دنیا میں کتنی کامیابی اور دولت حاصل کیوں نہ ہو جائے اور وہ اپنی مختصر زندگی کو کتنی ہی حسرتوں میں کیوں نہ بسر کریں۔ قیامت کے دن ضرور گھاٹے میں رہیں گے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد پورا کرنے پر پوری توجہ دیں اور ان تمام اعمال اور سرگرمیوں کو ترک کر دیں جو ہمیں اس راستے سے بھٹکاتی ہیں۔ قرآن کی ان تعلیمات کو احادیث نے اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔ اور میں نے انہیں اپنے مذاق کے عین مطابق پایا ہے۔ جب میں آغوشِ اسلام میں آئی۔ میرے والدین، رشتہ داروں اور دوست احباب نے مجھے دیوانی سمجھا کیونکہ میں اس کے بغیر کسی اور بات کا تصور تک نہ کر سکتی تھی۔ اُن کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا۔ جس میں دوسرے اشغال کی طرح ترقی کی جا سکتی تھی۔ لیکن جب میں نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اسلام کسی لہو و

لعب کا نام نہیں ہے۔ اسلام زندگی کی محض ضرورت ہی نہیں، بلکہ خود زندگی ہے!

سنِ بلوغت کے آغاز سے، ۲۸ سال کی عمر میں پاکستان آنے تک میں معاشرتی لحاظ سے مکمل طور پر ناموزوں رہی۔ میں ایک سنجیدہ دل و دماغ کی دوشیزہ تھی۔ ہر وقت لائبریری میں کتابوں کے ڈھیر میں غرق رہتی تھی۔ میں سینما، رقص اور موسیقی سے متنفر تھی۔ مجھے مخلوط پارٹیوں سے نفرت تھی۔ مجھے رومان، شان و شوکت، سنگار، زیورات، فیشن ایبل لباس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے مجھے اس سرد مہری کی پوری سزا ملی۔

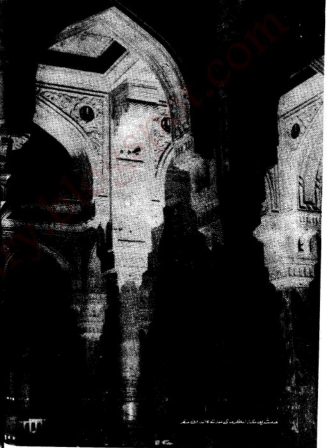
میرے جیسی ہستی کے لیے امریکہ میں کوئی جگہ نہ تھی، اور میں مستقبل سے مایوس تھی، میں وہاں سے نکلی اور پاکستان پہنچ گئی۔ گو پاکستان کی فضا بھی ہر دوسرے مسلم ملک کی طرح، یورپ اور امریکہ سے آنے والے خطرناک گرد و غبار سے آلودہ ہے۔ پھر بھی نیک مسلمانوں کی کمی نہیں ہے۔ جن کی بدولت ایک فرد کو ایسا ماحول میسر آ جاتا ہے جس میں وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ بعض اوقات میں اُن باتوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکتی جن کا اسلام تقاضا کرتا ہے۔ لیکن میں نے اپنی کمزوریوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے قرآن و سنت کی دور از کار تاویلات کرنے کی جرأت نہیں کی۔ میں جب بھی کسی غلطی کی مرتکب ہوتی ہوں، فوراً اُس کا اعتراف کر لیتی ہوں اور اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ مسرت جو مجھے اپنی حیاتِ نو کی طفیل نصیب ہوئی ہے۔ سراسر اس حقیقت کی مرہونِ احسان ہے کہ نسوانی کردار کی اُن صفات کو اسلام میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جنہیں مغربی معاشرے میں نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

رندی عقلیت اور تازیانے



غ. ش. داودی

نہ اس نگارش کا اصل
مواد ٹھوس ہے اور تاریخی
حیثیت رکھتا ہے البتہ اسے
کہانی یا تمثیل کا رنگ دینے
کے لیے کچھ اجزا تخیل
سے مستعار لیے گئے ہیں
نیز بعض چیزوں
میں زمانی تقدیم و
تاخیر کرنی پڑی ہے



حرم شریف مکہ: مکہ مکرمہ کی عمارت کا اندرونی منظر

(۱)

تین سوال

قیصرِ روم نے ایک دفعہ خلیفہ منصور کے حضور میں اپنا وزیر اس غرض سے بھیجا کہ وہاں کے علماء و فضلاء کو جمع کر کے ان سے تین سوالات دریافت کرے۔ اگر وہ ان کے مسکت اور تسلی بخش جواب دے دیں توفبہا، ورنہ خلیفہ کو کہنا کہ آئندہ خراج ادا کرنا ہوگا۔ چنانچہ خلیفہ منصور نے دربار لگایا اور علماء و فضلاء کو جمع کیا۔ ان میں امام ابو حنیفہؒ بھی شامل تھے۔ رومی وزیر منبر پر بیٹھا اور اپنے سوال پیش کیے۔ مختلف اصحابِ علم نے جواب دیے مگر بات قاطع نہ ہو سکی۔ آخر امام ابو حنیفہؒ نے خلیفہ سے جوابات دینے کی اجازت چاہی۔

امام ابو حنیفہؒ: (رومی وزیر سے) تم اِس وقت سائل کی حیثیت میں ہو، اور میں مجیب (یعنی جواب دینے والا) ہوں۔ پس منبر پر بیٹھنا سائل کا نہیں، بلکہ مجیب کا منصب ہے۔

خلیفہ: ہاں یہ بات بہت درست ہے۔

(اس پر رومی وزیر منبر سے اُتر آیا اور امام ابو حنیفہؒ اس کی جگہ اطمینان سے بیٹھ گئے اس ڈرامائی صورتِ واقعہ سے مجلس کا ماحول تبدیل ہو گیا)

امام ابو حنیفہؒ: (رومی وزیر سے) اب اپنے سوالات پیش کرو۔

رومی وزیر: میرا پہلا سوال یہ ہے کہ خدا سے پہلے کیا چیز تھی؟

امام ابو حنیفہؒ: تم ایک، دو، تین، چار، پانچ کی گنتی تو جانتے ہو۔ ذرا یہ بتاؤ کہ ایک سے پہلے کونسا عدد ہے؟

رومی وزیر: ایک سے پہلے کوئی عدد نہیں، یہی سب سے پہلے ہے۔

امام ابو حنیفہؒ: تو پھر جب محض حسابی عدد "ایک" کا حال یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی عدد کا تصور نہیں کیا جا سکتا تو خدا سے جو حقیقت میں واحد (ایک) ہے، اس سے پہلے کوئی چیز کیسے ہو سکتی ہے۔

رومی وزیر: میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ خدا کا منہ کس طرف ہے؟

امام ابو حنیفہؒ: پہلے یہ بتاؤ کہ چراغ کی روشنی کا منہ کس طرف کو ہوتا ہے؟

رومی وزیر: چاروں طرف۔

امام ابو حنیفہؒ: اب سوچو کہ آگ جو عارضی نور ہے، جب اس کے لیے کوئی خاص سمت معین نہیں کی جا سکتی کہ اس کا منہ فلاں طرف کو ہے تو پھر اس اصلی نور کے لیے کوئی خاص رُخ کیوں کر معین ہو سکتا ہے؟

رومی وزیر: میرا تیسرا سوال یہ ہے کہ خدا اس وقت کیا کر رہا ہے؟

امام ابو حنیفہؒ: اس وقت وہ اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ ایک کام یہ بھی انجام دے رہا ہے کہ اُس نے تمھیں اتار کر میرے سامنے کھڑا کر رکھا ہے۔ اور تمھاری جگہ مجھے منبر پر بٹھایا ہے۔

[رومی وزیر ساکت ہو گیا اور اس کا سر جھک گیا۔ خلیفہ منصور اور مجمعِ علماء امام کی حاضر جوابی اور نکتہ رسی پر حیران رہ گئے۔ مگر مسلمانوں کے بنیادی عقائد کے کاشانے میں ایسے غیر خدا ترسانہ سوالات اور بحثوں کی چنگاریاں پھینکنے کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا۔]

(۲)

عقلیّت کا ظہور

(دوسری صدی ہجری —— ایک خفیہ نشست۔
دس بارہ نوجوان افراد —— معمر بن عباد السلمیٰ کی صدارت میں)

معمر: ہاں تو عزیز نوجوانو! آپ لوگ بات کریں، جس کے لیے آپ نے یہ مجلس جمع کی ہے۔

ایک نوجوان: دوستو! بڑی گھٹن ہے۔ ذہن خیالاتِ نو بنو سے بھرے ہوئے ہیں، مگر مجالِ دم زدن نہیں

دوسرا نوجوان: صاحب یہ بات آپ نے چھیڑ دی ہے عین سایۂ تخت کے نیچے۔

تیسرا نوجوان: یہاں تو گھر گھر میں سرکار کی آنکھیں اور کان کام کر رہے ہیں۔

معمر: نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں جو کچھ کہنے والا ہوں، وہ عین شاہی مرضی اور درباری رنگ کے مطابق ہے۔ دراصل ہمارا خلیفہ اَدَامَ اللّٰہُ حَیَاتَہٗ علاً علماء کے تصورِ اسلام سے بھاگنا چاہتا ہے۔ وہ بےحد آزاد خیال ہے مگر عوام کی ذہنی فضا پر قدامت پرست علما کا اتنا گہرا تسلط ہے کہ اُس کے آگے دربار کی سطوت بھی بے بس سی ہے اور علماء کا حال یہ ہے کہ وہ شریعتِ نقلیہ اور مذہب غیر عقلیہ کے ایک ایک لفظ کو اور اس کے تنگ ظاہری مفہوم کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہیں۔ ان کو ذرا سوجھ بوجھ نہیں کہ زمانہ بدل کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا۔ اب جو ایرانی، ہندی، یونانی اور رومی لوگ یہاں آئے ہیں تو ان کی باتیں سن کر پہلی بار ہماری آنکھیں کھلی ہیں کہ علم کیا ہوتا ہے اور علومِ نقلیہ کی زنجیروں میں اگر فکر گرفتار نہ ہو تو وسیع عقلی فضاؤں میں پرواز کیا لطف دیتی ہے۔

چوتھا نوجوان: الظل اللہ مہدی کی ہستی واقعی عجیب کش مکش میں ہے۔ وہ معاشرے کی پرانی قدروں کے چکر سے نکل کر نئے تجربے کرنا چاہتا ہے مگر ایک قدم بھی نہیں اٹھا پاتا کہ مذہبی طبقوں کا دباؤ اُسے ایسے اقدامات پر مجبور کر دیتا ہے۔ جنھیں وہ خود بھی بے حد رجعت پسندانہ سمجھتا ہے، مگر کرے کیا۔

پانچواں نوجوان: کرنے کا کام یہ ہے کہ کچھ لوگ علمی و فکری دائروں میں جدتِ فکر کا محاذ قائم کریں اور علماء کے جمے ہوئے محاذ کو توڑ ڈالیں۔

تیسرا نوجوان: یہ حادثہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا کہ بشار جیسے لطیف الخیال اور نغز گو شاعر کے خلاف اشراف داعیان کا ایک وفد مہدی سے جا کر فریاد کرتا ہے کہ اس شخص کی غزلوں کا فحش پن اور اس کے اندازِ بیان کی عریانی ہماری خواتین اور ہمارے بچوں کے ذہن و کردار کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔ یہ سب علماء کی شرارت ہے بلکہ کم سے کم ان کی بنائی ہوئی ادب دشمن اور ثقافت کش فضاء کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ خلیفہ مہدی نے چار و ناچار بشار کی زبان بندی کا حکم جاری کر دیا۔ ان بھلے لوگوں سے کوئی پوچھے کہ ذرا عریانی اور فحاشی کی کوئی تعریف تو کر کے بتاؤ۔ آخر خود قرآن میں کیا ازدواجی اور جنسی زندگی کے سارے پہلو اور حوروں کے حسن کے تذکرے

مذکور نہیں ہیں۔ پھر ایک شاعر کے شعروں میں وہی باتیں آگئیں تو کونسا سانحہ ہے۔

چھٹا نوجوان: مگر یارو! بشار بھی پکا فتنۂ دوراں ہے۔ اس نے اب عام غزلوں کے بجائے ایسی غمناک غزلیں کہنی شروع کر دی ہیں جن میں وہ اپنی مجبوری و بے بسی کا ماتم بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی عشق و محبت کی وہ ساری باتیں بھی کہہ جاتا ہے جو اس کی رگ رگ میں رچی ہوئی ہیں

تیسرا نوجوان: ہاں بھئی کیا کہنے ہیں بشار کے۔ ایک تازہ غزل میں کہتا ہے کہ میں نے نغفور سے قیروان اور قیروان سے یمن تک کی فضاؤں کو ایسے شعروں سے بھر دیا ہے جن کو الاپتے ہوئے کنواری اور بیاہتا حسینائیں تالیاں بجا بجا کر رقص کرتی ہیں۔ مگر اب چونکہ خلیفہ مہدی نے مجھے شاعری سے روک دیا ہے اس لیے میرا نکتہ آفریں ذہن بسا باز آگیا ہے۔ دوسری ایک غزل میں کہتا ہے کہ میری محبوبہ نے میری ردائے شباب کے لیے پیغامِ طلب بھیجا، مگر میں نے تو اب اُسے لپیٹ دیا ہے۔ شاہِ ذی جاہ نے دوشیزاؤں کے معاملے میں مجھے منع کر دیا ہے اور میں اس حکم کی نافرمانی نہیں کرتا۔ مجھے ہر روز درِ جاناں کا اشتیاق ہوتا ہے، مگر نجانے اب وہ کدھر گیا۔ میرے اور اس کے درمیان خلیفہ حائل ہے۔ پس میں نے اس بارے میں صبر کر لیا ہے۔ وہ باتیں وہی عشق کی کر رہا ہے، مگر ایک گھٹے انداز سے، جو ان باتوں کو اور بھی مؤثر بنا دیتا ہے، اور موجودہ سیاسی ماحول کے خلاف اس میں احتجاج بھی شامل ہے۔

ساتواں نوجوان: اور وہ رقت انگیز قصیدہ بھی تو آپ لوگوں نے سنا ہوگا، جس کا مطلع ہے ؎

وَقَنَتُ الْهَوٰى حَيًّا فَلَسْتُ بِزَائِرٍ
سُلَيْمٰى وَ لَا صَفْرَاءَ مَا قَرْقَرَ الْقُمْرِىُّ

واہ کیا خیالِ پُر تلمیح ہے کہ میں نے اپنی محبت کو زندہ دفن کر دیا اور میں اب محبوباؤں سے کبھی نہیں ملوں گا۔ نہ نہ کرتے ہوئے، ان کے نام بھی گنوا دیے ہیں۔ ساتھ ہی قمری کی چہک کا اشارہ بھی ہے کہ یہ تو فطری معاملے ہیں۔ قمری پر جو قانون نہیں چلتا وہ انسانوں پر کیوں چلے!

معمر: مضمون شعر و شاعری کا چل نکلا ہے۔ اندیشہ ہے کہ یہ حکایتِ لذیذ دراز نہ ہو جائے۔ اصل سوال پیچھے رہ گیا۔ ہم لوگوں کو ایک طرف علومِ عقلیہ کو فروغ دے کر فکری ترقی کی راہیں نکالنی ہیں اور دوسری طرف شعرا اور ادیبوں اور موسیقاروں کی ثقافتی سرگرمیوں کے لیے ماحول کو سازگار بنانا ہے، ورنہ ہم دنیا کی قوموں سے پیچھے رہ جائیں گے۔

ساتواں نوجوان: دو باتیں ضرور سامنے رکھنی ہوں گی: ایک یہ کہ ہمیں سارا کام دین و مذہب کے پیرائے میں کرنا ہے۔ اور قرآن و حدیث کی بھی باتیں کرتے رہنا ہے۔ فرق صرف اندازِ نظر اور تعبیر و تاویلِ مطالب میں ہوگا اور پھر تعبیر و اجتہاد کے راستے کو ہم چوڑا کرتے جائیں گے۔ دوسرے کام کا انداز جوشیلا اور طوفانی نہ ہو، بلکہ دھیما دھیما ہو۔ سامنے سے ٹکر نہیں لینی ہے۔ نیچے سے آہستہ آہستہ سرنگ لگا کر قلعے میں داخل ہونا ہے۔ اور خدا نئے نئے آنے والے پادریوں اور راہبوں کا بھلا کرے۔ اُن کی وجہ سے علماء کی ساری توجہ کلامی جھمیلوں کی طرف ہے اور دوسرے ان کی وجہ سے تحریکِ عقلیت از خود نشوونما

پا رہی ہے۔

آٹھواں نوجوان: دوستو! ہم یونانیوں اور رومیوں اور عیسائیوں اور یہودیوں کے سامنے فلسفیانہ اور حکیمانہ عنوانات پر گفتگو کرتے ہوئے بے حد شرمسار ہوتے ہیں، کیونکہ ہمارے دامن تہی ہیں۔ ہمیں ہمارے علماء نے صرف قال اللہ اور قال الرسول دیا، اور کچھ نہیں، اب ہمیں "اقولُ" اور "نقولُ" کے دروازے کھولنے ہیں۔

پہلا نوجوان: یہ خطوطِ فکر بالکل درست ہیں۔ آج سے یہ مجلس "اخوان الصفا" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ اس کے اجلاس خفیہ ہوں گے۔ آپ سب لوگ تصنیف و ترجمہ کا کام آہستہ آہستہ کریں اور محتاط طریقِ تدریج سے اپنی چیزیں سامنے لائیں۔ دس بارہ برس کا کام موجودہ نقشہ کو بدل کے رکھ دے گا۔ قلم کی لمبی مار ذرا دیر میں اثر دکھاتی ہے۔ مگر ضرب تلواروں سے سخت ثابت ہوتی ہے۔

معمر: میرے عزیز نوجوانو! تم لوگوں کے سینوں میں جو نئی زندگی موجزن ہے اس نے مجھے بھی نئی تاب و تواں بخش دی ہے۔ تم جادۂ عقلیت پر جہاں تک بھی بڑھتے جاؤ گے، مجھے دوش بدوش پاؤ گے۔

پہلا نوجوان: محترم! آپ تو ہمارے رہبر ہیں۔ آپ نے ہمیں روشنی دی۔ ہم آپ کی رکاب تھام کر چلیں گے۔

(۲)

عید نصاریٰ کی تیاریاں ـــــ اربابِ دیر و کلیسا کا اجتماع ـــــ بڈھے پادری کی تقریر

(دیر قنیٰ، معبدِ مطیرہ، خانقاہِ کرخ، دیر شوسی

اور دوسرے تمام گرجاؤں اور دیروں کے سربراہوں کے اجلاس میں بوڑھا پادری رپورٹیں سننے کے بعد تقریر کرتا ہے:۔

"یسوع کے پیارے بھائیو! دینِ مُوئے کے علمبردارو! یوم السعانین قریب آگیا ہے مذہبی لحاظ سے یہ چاہے ایک فریق کے ساتھ مخصوص ہو، لیکن اس کے ساتھ ہمارے جو وسیع مقاصد شامل ہیں، ان کے لحاظ سے عیسائی و موسائی الگ الگ نہیں ہو سکتے، سارا کام مل کر کرنا ہوگا۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ ہمارے لیے اسلام جیسے تعصب آموز مذہب کا مقابلہ کرنا اور مسلمانوں کی عظیم سیاسی قوت کے ہوتے ہوئے لوگوں کو عیسائیت یا یہودیت کا حلقہ بگوش بنانا کچھ زیادہ ممکن نہیں۔ ہم لوگ یہاں اگر مال صرف کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے سامنے دب کر رہنے کے علاوہ بار ہا ہنگاموں کا سامنا کر چکے ہیں تو اس قربانی کا ایک بڑا مقصد ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ مسلم قوت ہمارے لیے نہ صرف مذہبی میدان میں بلکہ سیاسی میدان میں بھی ایک خوفناک آزمائش بن چکی ہے۔ یہ مشرقی طوفان ہماری مغربی دنیا کے لیے ایک متحرک خطرہ ہے۔ جہاں تک مذہبی پہلو کا تعلق ہے۔ اگرچہ درباری اور امراء طبقوں کے عقیدے اور کردار مضمحل ہو چکے ہیں، مگر عوام میں بڑی زبردست رَو موجود ہے اور جو اوپر کے طبقے کو بھی مضبوط تر بناتی ہے۔ دوسری طرف سیاسی و جنگی حیثیت سے یہ ایک ناقابل

نئی قوم ہے اب سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ مسلم قوت کو اندر سے کھوکھلا کرنے کے لیے کام کیا جائے۔ ایرانی نفوذ نے اسلامیت کا اصل خواب تو پریشان کر ہی دیا ہے اب ہمارے لیے دو واضح خطوطِ کار ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو بحثوں اور مناظروں میں ڈال کر اور فلسفوں سے مرعوب کر کے اُن کی قوتِ عقیدہ کو آہستہ آہستہ کمزور کر دیں اور اُن سے ان کی دولتِ یقین چھین لیں اور یہ کام مامون جیسے فراخ دل اور عالی ظرف حکمران کے عہد میں بخوبی ہو رہا ہے، اس کا دارالحکومت ہمارا اہم میدانِ کار ہے جہاں ہر ہفتے خود مامون کی صدارت میں مناظرے کی مجلس آراستہ ہوتی ہے۔ شاید آپ اس خوشخبری سے بھی مطلع ہو چکے ہوں گے کہ خود مسلمان نوجوانوں کے ایک گروہ نے الہامی تعلیم کی گرفت سے نکلنے کے لیے عقلیت کا محاذ قائم کر لیا ہے اور وہ علماء کے اثر و رسوخ کو زائل کرنے کا آغاز کر چکے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر ایسے محاذ کا بن جانا بہت بڑی فالِ نیک ہے۔ ہماری بات تو مذہبی تعصب کی وجہ سے بے اثر رہتی ہے اب مسلم معاشرے کے اندر سے بغاوت پھوٹ رہی ہے، اور ان حالات کو پیدا کرنے میں بائبل کے خداوند کی مدد سے ہم نے بڑا مؤثر حصّہ لیا ہے۔ یونانی فلسفے کو پھیلانے کا جو کام ایک صدی سے ہو رہا ہے اور اب وہ پورے جوبن پر ہے۔ اس نے مسلمانوں کو فرقوں میں بانٹ دیا ہے۔ ابھی ان فرقوں کو مناظرے، بحثیں مزید ٹکڑے ٹکڑے کریں گی۔ شاہی دارالترجمہ اس سلسلے میں جو کام انجام دے رہا ہے ہمیں اُس کا اعتراف کرنا چاہیے۔ یونان اور مغرب کے کباڑ خانوں سے ہم جو بوسیدہ کتابیں لاتے ہیں وہ چاہے خرافات پر مشتمل ہیں۔ یہاں موتیوں سے تُلتی ہیں۔ یہ سلسلہ جتنا جتنا پھیلتا ہے۔ تعلیم یافتہ خوش حال طبقے قرآن و حدیث کے علوم سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ علمِ دین اب محراب و منبر میں پناہ گزین ہے۔ ہمارا دوسرا کام یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی اخلاقی قوت کو تباہ کریں۔ اس غرض کے لیے لونڈیوں کی درآمد اور شراب کے کاروبار کو ترقی دینا بہت مفید نکلا ہے۔ خصوصاً روم اور یورپ کے ادنیٰ طبقوں کی سفید فام لڑکیوں کو ان کے ہوس انگیز اطوار کے ساتھ ہم نے اس معاشرے میں ہر طرف پھیلا دیا ہے۔ رقص کے تال اور سرود کی دھنیں اب گلی گلی سنائی دیتی ہیں۔ شاہی محل بیس بیس ہزار لونڈیوں سے بھرا رہتا ہے۔ ان کی بولیاں الگ الگ، لباس اور طرزِ آرائش الگ، غمزے اور ادائیں الگ، مذاہب الگ، عادتیں الگ، محل کی فضا معجون مرکب بن چکی ہے۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ تمام ذہین لوگ، اہلِ قلم، اربابِ شعر و ادب اپنی شبانہ محفلیں ہمارے شراب خانوں میں جماتے ہیں اور ان میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی لونڈی کا دلدادہ ہے۔ ہمارے اِن ثقافتی اداروں کا کتنا گہرا اثر

پڑا ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ابنِ رامین نے اپنا کاروبارِ زندگی کوفے سے سمیٹا تو روح بن حاتم مہلبی، محمد بن اشعث، معن ابنِ زائدہ اور ابن المقفع جیسے ذہین لوگ جو اس کے عشرت کدہ کی رونق تھے، تڑپ تڑپ گئے۔ یہ سب سلامۃ الزرقاء کے دامِ زلف کے اسیر تھے۔ ان میں سے ایک شاعر نے تو بڑے دردناک شعروں میں اپنے آپ کو ایسے مسکینوں سے تشبیہ دی ہے جو ابنِ رامین اور اس کے طائفہ کی جدائی میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کا ایک بڑا جزو ہمارے مذہبی تیوہار اور میلے ہیں۔ ہمارے لیے تو ان کی نوعیت مذہبی اور مقدس ہے، مگر مسلمانوں کے لیے ہم ان کو کسی اور طرح استعمال کرتے ہیں۔ بے پردہ خوش لباس عورتوں کے ہجوم اور ان کے علاوہ دیس دیس کی لونڈیوں کے انبوہ جن کا زیادہ تر کاروبار ہمارے یہودی بھائی کرتے ہیں۔ ان کو جب مسلمان جمع ہو ہو کر دیکھتے ہیں تو نہ صرف ان کے عقائد و اخلاق متزلزل ہوتے ہیں بلکہ انھیں اپنی بند معاشرت بھی ناگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔ کاش کہ ابن کو چندے اور مہلتِ زندگی ملی ہوتی تو اس کے راج میں برسوں کی منزلیں دنوں میں طے ہو جاتیں۔ اس کا جیشِ دوشیزگان، کٹے ہوئے بالوں اور مردانہ ریشمی صافوں اور لباسوں کے ساتھ جس شان سے اسلامی ایمان و اخلاق پر حملہ آور ہوا تھا وہ سلسلہ اگر جاری رہتا تو اب تک یہاں کی پوری معاشرت تلپٹ ہو گئی ہوتی مگر خیر... کام کرتے رہیں تو ابنِ اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ سو آمدم بر سرِ مطلب، اس موقعے پر ہمیں دو انتظامی مجلسیں بنا دینی چاہئیں۔ ایک وہ جو اس تہوار کا انتظام اپنے مذہبی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کرے۔ یہ مجلس دو تین عیسائی اسقفوں اور پادریوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ دوسری مجلس یہودی احباب میں سے ——— بنائی جائے جو ہمارے مسلم بگاڑ پروگرام کو پورا کرنے کی فکر کرے۔ ایک خصوصی کام مجھے انجام دینا ہے۔ شاہی دربار کی سرپرستی اس تہوار کے لیے حاصل کرنے کے لیے میں خود سلامی کو مع تحائف جاؤں گا۔ رومی لونڈیوں کا ایک طائفہ نذر کرنے کے لیے مہیا ہو گیا ہے۔

(اس کے بعد مختلف انتظامی امور اور پروگراموں پر رائے زنی ہوتی ہے)

(۳)

ایوانِ حکمت کا ایک منظر

(سہ شنبہ کی ہفتہ وار مجلس میں خلیفہ مامون اور ابن ابی دؤاد شریک ہیں۔)

ایک نووارد رومی پادری: جہاں پناہ، امیر المؤمنین! آپ کے علماء کا کیا عقیدہ ہے خداوندِ یسوع مسیح کے بارے میں۔ ہم عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ

کبھی مر نہیں سکتے۔

خلیفہ مامون : حضراتِ علمائے کرام جواب دیں گے۔

ایک مسلمان عالم : یہ تو یوحنا دمشقی مسیحی کی اٹھائی ہوئی بحث ہے۔ حضرت عیسٰیؑ اگرچہ وقتی طور پر زندہ اٹھا لیے گئے ہیں، مگر وہ خدا کے بندے ہیں، وہ مخلوق ہیں، اور نبی ہونے کے باوجود فانی ہیں اور ان کو بھی ہر انسان کی طرح موت کے مرحلے سے گزرنا ہے۔

پادری : بات دلیل سے ہونی چاہیے۔ آپ حضرات یہ فرمائیں کہ قرآن نے حضرت عیسٰی یسوع مسیح کی شان کن الفاظ میں بیان کی ہے؟

مسلمان عالم : کچھ آیات کی تلاوت کرتا ہے۔

پادری : ان آیات میں حضرت عیسٰی کو کلمۃ اللہ بھی کہا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کلمۃ اللہ یا کلامِ الٰہی فانی ہے یا قائم و باقی؟

مسلمان عالم۔ کلامِ الٰہی فانی نہیں، باقی ہے۔

پادری : تو پھر عیسٰی علیہ السلام بھی فانی نہیں، باقی ہیں۔ بحث ختم ہو گئی۔ حق واضح ہو گیا۔

مسلمان عالم : مگر قرآن نے عیسٰی علیہ السلام کو صاف صاف طور پر نہ صرف بندہ قرار دیا ہے بلکہ ان کی موت کا بھی ذکر کیا ہے

دوسرا مسلمان عالم : امیرالمومنین! اجازت ہو تو عرض کروں کہ "کلمۃ اللہ" خود قابلِ غور ہے اور اس کے ساتھ "القاہا" کے الفاظ بھی محلِ نظر ہیں یہاں کلمۃ اللہ محض حکم و امر کے معنی میں ہے نہ کہ کلام کے معنی میں۔

ایک عقلیت پسند نوجوان : امیرالمومنین! قرآن تدبر چاہتا ہے اور ہمارے ہاں تدبر کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ جسے حضورؐ نے شروع فرمایا۔ آج تک کسی مسلمان عالم نے کلمۃ اللہ کے اس مسئلے پر غور ہی نہیں کیا تھا، کہ اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔

ابنِ ابی دؤاد : امیرالمومنین! سیدھی سی بات ہے کہ کلام جب ایک دفعہ ادا ہو گیا تو الفاظ و اصوات ظہور پا کر ختم ہو گئے۔ حقائق و معانی البتہ باقی رہتے ہیں۔ کلام باقی نہیں رہتا۔ کلام اسی طرح مخلوق ہے جس طرح خالق کے سوا ساری چیزیں مخلوق ہیں۔

پادری : پھر آپ لوگ قرآن کو خدا کا کلام کیسے کہتے ہیں۔ یہ تو آپ کے پیغمبر کے ہونٹوں سے ادا شدہ کلام ہے۔ الفاظ کا صدور آپ کے پیغمبر سے ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ حقائق و معانی القا ہوئے ہوں اور حقائق و معانی تو ہمیشہ انسانوں پر القا ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی اشکال نہیں۔ امیرالمومنین، میرا خیال ہے کہ آپ کے علما کو وحی و الہام کے تصور پر بھی غور کرنا چاہیے۔

ابن المقفع : حضور خلیفۃ المسلمین، خدا آپ کا سایہ تادیر قائم رکھے۔ حضور کی مساعی سے معاشرے میں بڑی صحت مند ذہنی تحریک اٹھی ہے۔ لوگ نقل کے گنبد سے نکل کر عقل کی کشادہ فضاؤں میں آ رہے ہیں۔ مسلمانوں کا دین تو عقل کو اولین اہمیت دیتا ہے۔ اس میں اتنا ظرف ہے کہ یہ وقت کے بدلتے رجحانات کا ساتھ دے سکتا ہے

مامون : ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ دماغوں سے پورا کام لیں اور ترقی کریں۔

معمّر ابن عباد السلمی[1] **:** خلیفۃ المسلمین! اس معمولی سے

---

[1] : عباسی دور میں عقلیت و تجدد کی تحریک کا اولین سرگرم محرک، جس پر ہندوستانی افکار کا گہرا اثر تھا۔

پادری نے ہمارے علماء کو چکر میں ڈال دیا ہے۔ آج یہ ضرورت اور بھی واضح ہو گئی ہے کہ ہمیں اپنے عقائد اور احکام کو عقلی معیار پر لانا چاہیے۔

مامون : (بآوازِ بلند ابنِ ابی دؤاد سے) ہاں! یہ امرِ عظیم ہے۔ یا تو حضرت عیسٰیؑ کو غیر فانی ماننا پڑتا ہے یا کلام کو فانی ماننا لازم ہے۔ ہمارے علماء ان دو متضاد باتوں کو جمع کیے ہوئے ہیں۔ مگر اب تو کوئی فیصلہ کرنا ہی ہوگا (روئے سخن مجلس کی طرف کرتے ہوئے)۔ حضراتِ علماء! ہم قصر کو جا رہے ہیں، آپ غور و بحث جاری رکھیے اور اس مسئلے پر ابھی مزید مجالس ہوں گی۔

(۴)

دجلہ کے کنارے

علی بن مدینی : فرمایئے، آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

نووارد : خدا کا واسطہ دلا کر عرض کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے یہ نہ پوچھیے۔ اتنا ہی تعارف کراؤں گا کہ میں ایک مسلمان ہوں۔ آپ کے عالمانہ رتبہ کا احترام رکھتا ہوں۔ دس فرلانگ سے چل کر آیا ہوں۔ ایک تشویشناک امر درپیش ہے۔ اس پر تبادلۂ خیالات یہیں ٹہلتے ٹہلتے کرنا چاہتا ہوں اور پھر یہیں سے رخصت چاہوں گا۔

علی بن مدینی : وہ تشویشناک امر کیا ہے؟

نووارد : دارالسلطنت سے اٹھی ہوئی ایک بحث ہم لوگوں تک جا پہنچی ہے۔ اور پادری جا جا کر عامۃ الناس کو شکوک میں ڈال رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے۔ ان کے بعد کچھ مسلمان نوجوان جاتے ہیں اور وہ بھی اسی طرح کی تقریریں اور گفتگوئیں کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ خبر عام ہو چکی ہے کہ خلیفہ کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ قرآن مخلوق ہے۔ پہلے تو یہ فرمایئے کہ قصہ کیا ہے؟

علی بن مدینی : یہ قصہ صحیح ہے۔ مخالفِ اسلام عناصر معاشرے میں بکثرت گھس گئے ہیں۔ پہلے مجوسی مزاج عجمیت کا تسلط ہوا، پھر یونانیوں کا، پھر ہندیوں اور رومی عیسائیوں اور یہودیوں کا۔ یہ لوگ دربار میں خوشامد کیش بن کر آتے ہیں تحائف پیش کرتے ہیں، کنیزیں اور شرابیں لاتے ہیں، اور ساتھ ہی ملحدانہ طرزِ فکر کو عقل کے نام سے پیش کر کے تشکیک کا روگ پھیلا رہے ہیں۔

نووارد : حضرت! آپ جیسے عالم کیوں ایسے فتنوں کی روک تھام نہیں کر رہے ہیں؟

علی بن مدینی : بھائی، صاف بات یہ ہے کہ ہمارے حاکم اور درباری اشراف ایک طرف تو خالص موروثی بادشاہت اور جبری اقتدار کے حامل ہیں۔ اور اُن کی عملی زندگیاں اسلام سے دور ہو رہی ہیں۔ بغداد اور دوسرے شہروں میں طبقۂ اعلیٰ شراب، بدکاری اور کنیز پرستی میں مبتلا ہے۔ رشوت کا زور ہے۔ غربا کے لیے زندگی عذاب بن گئی ہے۔ اور دوسری طرف یہ لوگ اپنی شانِ مسلمانی کو برقرار رکھنے کے لیے خود اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ اسلام کا حلیہ بدل کر ایسا بنا دیا جائے کہ اُن کی زندگیاں اُن میں نصب ہو جائیں۔ پھر یہ بھی انھیں پسند ہے کہ رعایا اور خصوصاً اہلِ علم کلامی مناظروں میں مصروف رہ کر سیاسی اور اقتصادی حالات کی طرف توجہ نہ

دے سکیں۔

نووارد : لیکن خاص طور پر خلقِ قرآن کا ایک نیا شوشہ اٹھانے سے کیا مقصود ہے؟

علی بن مدینی : یہ بات یوں ہے کہ قرآن کو اگر کلامِ الٰہی کے بجائے کلامِ فانی بنا دیا جائے تو اس کی وہ وقعت ختم ہو جاتی ہے جو اب تک قائم ہے۔ پھر ہر کسی کو آزادی مل جاتی ہے کہ اس میں سے جس طرح کے جو مطالب چاہے نکال لے۔ دوسرا مقصد اس سے طبقۂ علماء کے وقار پر حملہ کرنا ہے۔ تاکہ عوام پر سے اُن کا اثر ختم ہو سکے۔

نووارد : اتنی بڑی سازش ہو رہی ہے تو آپ حضرت امام ابو حنیفہ جیسی مثالوں کو سامنے رکھ کر میدان میں کیوں نہیں آتے؟

علی بن مدینی : بات یہ ہے کہ جبری اقتدار کا مقابلہ کرنا میرے بس میں نہیں۔ مجھ سے امام ابو حنیفہ جتنی مار نہیں کھائی جا سکتی۔ پیچیدگی یہ ہے کہ ایک طرف بادشاہ مسلمان ہے اور خلیفۃ اللہ کہلاتا ہے لہٰذا دینی معاملات میں اس کی حکومت دخل بھی دیتی ہے۔ اور دوسری طرف اسلام سے انحراف کی رَو بھی دربار ہی سے چل رہی ہے۔ ایسے میں کوئی کیا کرے؟

نووارد : تو کیا آپ قرآن میں نقب زنی کی اس کوشش کے آگے سر جھکا دیں گے؟

علی بن حسینی : کوشش تو یہی کروں گا کہ اس پستی سے بچ سکوں۔

نووارد : اچھا یہ فرمائیے کہ آپ کے یہ قاضی ابن ابی دؤاد جو اس مخالفِ قرآن عقل فتنے کے سرخیل بنے ہوئے ہیں، یہ تو حضرت یحییٰ بن اکثم جیسی ہستی کے شاگرد اور تربیت یافتہ ہیں۔ ان کو آخر کیا ہو گیا؟

علی بن مدینی : عزیز مہمان! دنیا بڑی جاذبِ دل و نظر چیز ہے۔ یہ شخص دراصل ایک دنیا طلب روح کے ساتھ پلا ہے۔ یہ اگر کوئی اور راستہ پاتا تو اُسے دنیا طلبی کے لیے استعمال کرتا۔ اسے علمِ دین ہاتھ آیا تو اسی کو دنیا طلبی کا ذریعہ بنا لیا۔ اس کے لیے کوئی فرق نہیں کہ وہ کنیز فروشی کا کاروبار کرے یا دربار میں آیات و احادیث سے سلطان کی ہر خواہش کی تائید کرے۔ پرلے درجے کا خوشامدی ہے۔ سلطان کی نگاہ میں اس کی قدر و قیمت اس لیے ہے کہ اعلیٰ درجہ کا ایک مولوی اس کے لیے آلۂ کار بن گیا ہے۔

نووارد : اس شخص کا انجام انشاء اللہ عبرتناک ہوگا۔

علی بن مدینی : ہاں! مگر اس وقت تو وہ شاہی عصا بنا ہوا ہے۔

نووارد : مجھے ایک پریشانی یہ درپیش ہے کہ نت نئی بحثوں اور اخلاقی تباہی کے مظاہر کے پیچھے جو مخالفِ اسلام قوتیں کام کر رہی ہیں، اُن سے ہم کیسے نجات پائیں۔ سلطنت ہماری ہے مگر فکر اور تہذیب دوسروں کی فرمانروا ہیں۔ تخت کے اوپر ہمارا مسلمان بادشاہ بیٹھا ہے۔ مگر تخت کے سایے میں اغیار نے اپنا جال پھیلا رکھا ہے۔ ان کے معبد تو خیر ہوا کریں، ان کے شراب خانے، رقص خانے، کنیز خانے اور عشرت کدے ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ ذہین طبقہ، ادیب اور شعراء سبھی اُن کے زیرِ اثر چلے جا رہے ہیں۔ اور پھر ایوانِ حکمت بھی دراصل اُن کی فتنہ انگیزیوں

کا اڈہ ہے۔ اس مصیبت کا کوئی حل آپ بیان فرمائیں۔

علی بن مدینی : کوئی حل نظر نہیں آتا۔ یہ لوگ بادشاہ کی خوشامد میں پیش پیش ہیں۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ہر اہم آدمی کو تحائف اور دیس دیس کی کنیزیں اور شرابیں تحفے میں لا لا کے پیش کرتے ہیں۔ بے شمار لوگوں کو انھوں نے اپنے روپے سے باندھ رکھا ہے۔ ان کی ناپسندیدہ حرکات کو بھی شاہی تحفظ حاصل ہے۔ نظام کی نوعیت ایسی ہے کہ مجالِ دم زدن نہیں، دیکھتے رہو، سنتے جاؤ اور خاموش رہو۔

نووارد : اچھا حضرت! آپ کی یاس انگیز باتیں سن کر ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوا میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ یہی کیا کم ہے کہ آپ کی زبان سے میں نے فتنہ کی حقیقت سمجھ لی ہے۔ وقت آیا اور توفیق ہوئی تو میں اس کا مقابلہ کروں گا۔ ورنہ اس کے آگے جھکنے سے انکار کر دوں گا۔ چاہے میری جان چلی جائے۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ اپنی جان قرآن اور قرآن اتارنے والے اور قرآن پیش کرنے والے پر قربان کر دوں۔

علی بن مدینی[1] : ہمارے مہمان خدا تمھارے ساتھ ہو۔ میرے لیے بھی دعا کرنا۔

نووارد : ضرور دعا کروں گا۔ اچھا الوداع۔ اگر آپ یاد رکھ سکیں تو جاتے جاتے عرض کرتا ہوں کہ میرا نام محمد بن نوح ہے۔

(۵)

(بغداد میں دار الرقیق (غلاموں اور کنیزوں کی مارکیٹ) کا ایک یہودی آڑھتی اپنے پرشکوہ دیوان میں مسند پر بیٹھا ہے، قالین اور تخت بچھے ہیں، دو تین خوش پوش نوجوان اور ایک ادھیڑ عمر کا شاعر ایک نئی درآمدہ شراب چکھ رہے ہیں۔ ایک نیم عریاں لونڈی ستار بجا رہی ہے۔ شراب کے چند مٹکے اور سبو چوکیوں پر رکھے ہیں، دیواروں سے موسیقی کے بعض خوبصورت آلات آویزاں ہیں)

یہودی : (گاہکوں سے) کہیے کیسی چیز ہے؟

ایک نوجوان : بس ہر گھونٹ عمر میں دس سال کا اضافہ کر دینے والا ہے۔

شاعر : عمر کی کمی بیشی اور وقت کے گزرنے کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرا نوجوان : (کنیز کی طرف دیکھ کر) اور اس کم بخت ملیحہ کی دھیمی موسیقی بھی جب اس مئے فلک پرواز کے جزئیات میں جذب ہو جاتی ہے تو سرے سے زندگی اور موت میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہ جاتا۔ نہ مرنے کا خوف، نہ جینے کی ہوس، انسان عجیب مقامِ بے نیازی پر جا پہنچتا ہے۔

(ایک تنومند دیہاتی نوجوان سادہ سے حلیے میں دروازے پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کا انداز استفہامی سا ہے۔ وہ مجسمۂ حیرت بنا، بغیر لب ہلائے جیسے استفسار کر رہا ہو کہ یہ سب کیا ہے؟)

---

[1] علی بن مدینی صحیح العقیدہ عالم تھے۔ انھوں نے نظریۂ خلقِ قرآن کے اقرار سے بچنے کی کوشش کی مگر جب دو ٹوک جواب مانگا گیا تو انھوں نے اقرار کر لیا۔

یہودی سیٹھ: آیئے تشریف لایئے۔ آپ بھی شوق فرمایئں، دو گھونٹ پئیں، گانا سنیں

دیہاتی: یہ پینے کی چیز کیا ہے؟

یہودی سیٹھ: یہ فرنگ سے آیا ہُوا آبِ حیات ہے۔

دیہاتی: کیا مطلب؟ یہ کوئی شراب ہے؟

یہودی سیٹھ: ہاں شراب ہے۔ تم کیا ڈھونڈتے پھر رہے ہو؟

دیہاتی: شراب، اسلامی حکومت میں! کنیزوں کا یہ گندا کاروبار عین دارالحکومت میں؟ یہ موسیقی کی دھنیں اور رقص کے تال سُر ہمارے بغداد میں۔ یہ کیوں ہے؟

ایک محو نوش نوجوان: میاں! تم یہاں کیسے آنکلے، کس کی تلاش میں ہو؟

دیہاتی: میں کچھ اون بیچنے اور کتابیں خریدنے بڑی دور سے آیا تھا، خیال آیا کہ اپنی حکومت کے مرکز کی کچھ سیر بھی کر لوں جس کی شان و شوکت کی دھوم ہے، اور یہ بھی دیکھوں کہ یہاں کی زندگی میں اسلامی رنگ کہاں تک ہے؟

شاعر: تو تم اسلام کو ڈھونڈتے پھر رہے ہو؟

نوجوان: اخی! ایسا کرو کہ وہ سامنے ایک مسجد کے منارے نظر آ رہے ہیں، سیدھے وہاں پہنچو، محراب کے نیچے بیٹھ جاؤ اور اگر کوئی کتاب خرید لی ہو تو اُسے مزے لے لے کر پڑھو۔

دوسرا نوجوان: اون اور کتابیں اور اسلام!—— واہ، واہ!

یہودی تاجر: تم بھیڑوں کی بے جان اون بیچتے ہو، اور ہم زندہ زندہ ہرنیوں کے زندہ گیسو فروخت کرتے ہیں۔ تم ساکت و جامد کتابی دنیا میں رہتے ہو اور ہم واقعات کی بدلتی دنیا میں رہتے ہیں۔

شاعر: اور تم اسلام کی تلاش میں ہو، اور ہم وہاں پہنچ گئے ہیں، جہاں اسلام اور کفر گلے مل کر ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں اور ایمان و عصیاں میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔

دیہاتی: میں اِن نکتوں کو تو جانتا نہیں، اتنا جانتا ہوں کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے شراب اور زنا اور عیاشی کے طور طریقوں کو کھلے اور صاف لفظوں میں حرام قرار دیا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگ مسلمان ہیں مگر مجھ دیہاتی کو آپ شہریوں کے علم و دانش پر حیرت ہے کہ آپ سیدھی سادی باتوں سے فرار کرنے کے لیے شاعرانہ اور فلسفیانہ نکتے ڈھالتے ہیں، آپ کے اندر دینی غیرت اور ملّی حمیّت کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔ ایک غیر مسلم تاجر کے سامنے آپ اپنے آپ کو کس شان سے پیش کر رہے ہیں۔ کیا قرآن کے الفاظ "رجسٌ من عمل الشیطان" آپ کے ذہنوں میں نہیں اترتے، اور کیا فَھَلْ انتم منتھون، کی پکار آپ کی روحوں کو جھنجوڑ نہیں دیتی؟

(دیہاتی کی اس غیر متوقع جرأت اور بیباکانہ گفتگو نے سب پر ایک سکتہ طاری کر دیا۔ جام رکھ دیے گئے۔ ایک نوجوان اُٹھا اور سر جھکائے دیوان سے باہر چلا گیا۔)

دیہاتی (یہودی سیٹھ سے) آپ کو معلوم ہے کہ یہ مسلمانوں کی حکومت ہے۔ مسلمانوں کا شہر ہے۔ تم لوگوں کے مذہبی رجحانات کا کتنا لحاظ مسلم اکثریت کرتی ہے، مگر تم لوگ اقلیت میں ہو کر

ہمارے صریح مذہبی احکام کے خلاف یہاں ادارے کھولے بیٹھے ہو اور مسلمانوں کو سفلی جذبات کا شکار بنا کر اُن کی اخلاقی تباہی کا سامان کر رہے ہو۔ یہ کیا غضب ہے؟

شاعر (دیہاتی سے)، دیکھو اخی! یہ غیر مسلم لوگ ہماری حفاظت میں ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے یہاں ان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔

دیہاتی: آزادی کے یہ معنی نہیں کہ اسلام کے اصولوں کو تباہ کرنے والی برائیاں پھیلانے کا کھلا حق بھی دیا جائے کہ جو چاہو سو کرو۔

شہری نوجوان: مگر اخی، تمھارا طریقِ تبلیغ درست نہیں ہے۔

دیہاتی: آپ نے اگر کسی بہتر تبلیغ سے کام لے کر کوئی اچھا نتیجہ پیدا کیا ہو تو ضرور اس سے مجھے آگاہ فرمایئں، میں استفادہ کروں گا۔

شہری نوجوان: میں مولوی نہیں ہوں۔

دیہاتی: اگر لفظ مولوی کو تم گالی کے طور پر استعمال کرتے ہو تو مجھے یہ گالی ہزار بار قبول۔ مگر تم اگر مولوی نہیں ہو تو مسلمان تو ہو!

شہری نوجوان: الحمدللہ میں مسلمان ہوں، مگر تمھاری طرح کا جنونی مسلمان نہیں ہوں کہ راستہ چلتے چلتے آدمی کو اسلام کا دورہ پڑ جائے۔

(آوازیں بلند ہوتی جاتی ہیں، اور آہستہ آہستہ لوگ دیوان کے سامنے جمع ہوتے جاتے ہیں)

دیہاتی: تو کیا اسلام کسی صندوقچے یا کیسے میں چھپا چھپا کر رکھنے کی چیز ہے؟ اُسے زمانے کی ہوا نہ لگ جائے۔ یا کوئی شرمانے کی چیز ہے؟ یا اسلام کو زندگی کے معاملات سے کوئی تعلق رکھنے کا حق نہیں؟ آخر آپ کا تصورِ اسلام ہے کیا؟ غالباً یہ کہ اگر آدمی میں ایمان کا احساس اور اخلاق کا شعور زندہ رہے اور ملّی غیرت یکسر ختم نہ ہو سکی ہو تو وہ جنونی ہُوا اور اس جنونیت سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ دارالرقیق کا طواف کیا جائے، اور غیر مسلموں کے شراب خانوں اور کنیز خانوں میں تفریح کے دن اور عیش کی راتیں گزاری جایئں۔

یہودی سیٹھ: دیکھو بھائی! تم یہاں اجنبی ہو، ہمارے لیے مہمان کی حیثیت رکھتے ہو۔ میں تمھارا لحاظ کرتے ہُوئے سیدھی سی ایک بات کہتا ہوں کہ ہم یہاں کسی کو مجبور کر کے یا مار باندھ کر نہیں لاتے۔ جس کا جی چاہے وہ اپنی مرضی سے خود چل کر آتا ہے۔ اور اپنے پیسوں کو کام میں لاتا ہے۔ تم ہمارے پیچھے پڑنے کے بجائے عوام کو جا کے سمجھاؤ۔ اپنے ایک ایک مسلمان بھائی کو نصیحت کرو۔

دیہاتی: اور تم لوگ بہرحال جو کچھ چاہو کرتے رہو۔ اپنی مملکت میں بھی ہمارے لیے مجالِ دم زدن نہیں۔

یہودی سیٹھ: آخر ہمارا قصور بھی تو ہو نا۔ تمھاری اسلامی حکومت میں اور تمھارے دارالخلافت میں جن چیزوں کی مانگ ہے، ہم تاجر لوگ وہی فراہم کرتے ہیں۔ تمھارا درباری طبقہ اور تمھارے اشراف اور تجار اور ذہین عناصر مسلمان ہوتے ہُوئے انھیں چیزوں کے گاہک ہیں جن کو تم حرام کہتے ہو۔ تمھارے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ اِن چیزوں کی مانگ کو ختم کرو۔ اور ان کے خلاف ایک ایک فرد سے مل کر تبلیغی فرض

ادا کرو۔ یہ تو بڑا سستا نسخہ ہوا کہ سارا غصّہ ہم اقلیتی لوگوں پر نکال لیا جائے۔ ہم نہ جانے روز کیا کیا سنتے اور بھگتتے ہیں۔

(ہجوم میں دونوں طرح کی بولیاں سنائی دیتی ہیں کچھ دیہاتی نوجوان کے حق میں اور کچھ اس کے خلاف)

دیہاتی : یہ جو تم مجھے بار بار افراد میں تبلیغ کا راستہ دکھاتے ہو۔ اس پر مجھے یہ کہنا ہے کہ جب اجتماعی ماحول کو بگاڑ دیا جائے۔ غلط مقاصد کے لیے ادارے اس میں کھول دیے جائیں جرام کاموں کے لیے قانون کی حفاظت میں راستے نکالے جائیں۔ گناہ اور بدی کے لیے سہولتیں اور دینداری اور نیکی کے لیے مشکلات عام کر دی جائیں تو پھر انفرادی تبلیغ ایسے اجتماعی بگاڑ کا توڑ نہیں کر سکتی۔ یہاں آکر مسئلہ سیاسی ہو جاتا ہے اور بدقسمتی سے سیاسی لحاظ سے ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور مخالفِ دین قوتوں کو کام کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔

یہودی سیٹھ : تو پھر جاؤ راستہ ناپو!

دیہاتی (بلند آواز سے)، اچھا تو تم لوگوں کا یہاں اتنا زور ہے کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ اس غیر مہذب انداز سے پیش آتے ہو؟ یہاں فواحش بھی پھیلاؤ، اور مسلمانوں کو بولنے کا اذن بھی نہ ہو!

(ہجوم میں قدرے جوش پیدا ہو جاتا ہے اور کچھ نعرے بلند ہوتے ہیں۔ دیہاتی کی حمایت کا رجحان بڑھ جاتا ہے)

دیہاتی : (ہجوم کے شور کے ساتھ اس کی پرجوش آواز سنائی دیتی ہے)، تم سمجھتے ہو کہ میں یہاں کھڑا ہوں حالانکہ میں اس وقت بھی اپنے فرض کے راستے پر چل رہا ہوں۔ میں اپنی منزل کو خوب جانتا ہوں۔

یہودی سیٹھ : تو اسی طرح ادا کرتے رہو اپنا فرض، روکا کس نے ہے؟

دیہاتی : (شدید جذباتی ہیجان میں)، ہاں، میں اپنے بندھے ہاتھوں سے بھی اپنا فرض ادا کروں گا۔ لے، یہ دیکھ!

(دیہاتی لپک کر شراب کا ایک مٹکا نیچے گرا دیتا ہے۔ چند سازوں کو اُٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیتا ہے۔ کنیز دیوان کے آخری کونے میں ایک تخت کے نیچے چھپ جاتی ہے۔ ہجوم بھی اندر گھس کر توڑ پھوڑ کرتا ہے، پھر یہ ہجوم چند اور اڈوں تک پہنچ کر شراب لنڈھا دیتا ہے اور ساز توڑ ڈالتا ہے۔ یہاں تک کہ محکمہ شرطہ (پولیس) کے لوگ چاروں طرف سے دوڑے آتے ہیں اور ڈنڈے برسا کر لوگوں کو منتشر کرتے ہیں اور کچھ گرفتاریاں عمل میں آتی ہیں۔۔۔ دیہاتی کو تلاش کیا جا رہا ہے مگر اُس کا پتا نہیں چلتا۔)

(۶)

(قصرِ شاہی کی ایک رازدارانہ گفتگو)

مامون : محترم قاضی صاحب! ادھر میں بسترِ علالت پر پڑا ہوں اور مجھے مذہبی گروہ سے سخت پریشانی ہے۔ علماء کا عوام میں بہت اثر ہے اور یہ لوگ ان میں بار بار پرانی مذہبیت کی آگ بھڑکاتے ہیں، حالانکہ زمانے کے حالات و ضروریات کہیں سے کہیں آپہنچے ہیں۔

قاضی ابنِ ابی دوّاد : خداوند کریم امیرالمومنین کو شفا عطا کرے اور سایۂ ہما پایہ ہمارے سروں پر صدہا سال برقرار رکھے۔ باقی جس خطرے کا آپ

نے ذکر فرمایا حرف بحرف بجا ہے۔ وہ واقعات تو حضور کے علم میں ہیں ہی کہ ان ملاؤں کے مذہبی جنون سے متاثر ہونے والے عوام نے بغداد جیسے مرکزِ تہذیب میں کیا ادھم پچھلے دنوں مچایا تھا۔ سرپھرے ہجوم نے غیر مسلموں کے اموال تباہ کیے اور ان سے بدسلوکی کی۔ دوسرے مہذب ممالک تک یہ قصے جب پہنچیں گے تو پوری قوم کی بدنامی ہوگی۔ اور خود اسلام کے متعلق بھی بدگمانیاں پیدا ہوں گی۔ خصوصاً رومی حکومت سے جو دوستانہ تعلقات ایک لمبے عرصے کی محنت سے قائم ہوئے تھے۔ سب غارت ہو جائیں گے۔

مامون : لیکن چارۂ کار کیا ہے۔ اگر ہم اس گروہ کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرتے ہیں تو وہ مظلوم شمار ہوتے ہیں اور ہم بدنام ہوتے ہیں۔ اگر نرمی سے کام لیتے ہیں تو ہمارے لیے مشکلات بڑھتی جاتی ہیں۔ نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن!

قاضی ابنِ دوّاد : حضور! اب سختی کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ حضور کے خاندان کے عظمت مآب بزرگوں نے اس طبقے کو دبانے کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جبھی تو سلطنت قائم رہی۔ حضور کو بھی اپنے عظمت مآب اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنا مناسب ہوگا۔

مامون : قاضی صاحب! قصرِ خلافت سے اگر ان کے خلاف کارروائی ہوتی ہے تو عامۃ الناس ان کو امام حسین کے رنگ میں دیکھتے ہیں، اور ہمیں یزیدیت کے طعنے دینے لگتے ہیں۔ جاہل عوام کی اس ذہنی حالت سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ مسئلہ خلق قرآن میں کھلم کھلا دربار کی مخالفت کر رہے ہیں، اور دربار ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

قاضی ابنِ ابی داوٗد : حضور! اگر سختی کسی ڈھب سے کی جائے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔

مامون : کوئی ڈھب آپ ہی بتائیے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔

قاضی ابنِ ابی دوّاد : خلیفۃ المسلمین! بس ایک فرمان جاری فرما دیجیے اور وہ سلطنت کے تمام قاضیوں اور علماء اور خطیبوں اور دینی مدارس کے اساتذہ کے سامنے رکھا جائے۔ یقین جانیے اُن میں بڑی کثیر تعداد درباری فرمان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے گی۔ کچھ لوگوں کے لیے میں ایسا انتظام کر دوں گا کہ ان کو کچھ دے دلا کر دستخط کرا لیے جائیں۔ باقی اگر اکا دُکا کچھ تیز مزاج جنونی افراد دستخط کرنے سے انکار کریں تو پھر اُن کو بلا رُو و رعایت شکنجے میں کس لیا جائے۔

مامون : قرآن کو غیر مخلوق قرار دینا فی الحقیقت شرک ہے۔ یعنی خدا بھی غیر مخلوق ہے اور اس کے ساتھ قرآن بھی غیر مخلوق ہے۔ دونوں قدیم اور مستقل ہوئے۔

قاضی ابنِ ابی دوّاد : بجا فرمایا حضور والا نے، اسی فرمان کو فرمانِ شاہی ہونا چاہیے۔

مامون: ایسا فرمان آپ کے اندازوں کے مطابق کیا نتائج دیگا۔

قاضی ابنِ ابی دوّاد : اس فرمان کے کئی اجزاء ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ جو شخص مسئلہ خلق قرآن کا قائل نہ ہو وہ قضا یا تدریس یا حکومت کے کسی منصب پر نہیں رہ سکتا۔ اس فرمان کا دوسرا جزو یہ ہوگا کہ جو

لوگ کسی دشمن سلطنت کے ہاتھوں قید ہو گئے ہیں وہ اور اُن کے اولیاء اگر خلق قرآن کے قائل نہ ہوں تو ان کا معاملہ کفار و مشرکین جیسا ہے، لہذا اب ان کو رہا کرانے کی ذمہ داری خلافتِ اسلامیہ کے سر نہیں ہو گی۔ اور حضور کی طرف سے رومی حکومت سے قیدیوں کی رہائی کی سلسلہ جنبانی اِن دنوں ہو ہی رہی ہے۔ اس فیصلے کا بھاری اثر بے شمار افراد پر پڑے گا۔ فرمان کا تیسرا جزو یہ ہونا چاہیے کہ تمام مدارس میں نئی پود کو خلقِ قرآن کے عقیدے کی تعلیم دی جائے۔ اب یہ خلیفہ کا سرکاری طور پر طے کردہ صحیح اسلامی عقیدہ ہے۔

مامون : واللہ! قاضی صاحب! آپ نے بڑا ذہن رسا پایا ہے۔ گویا آپ چاروں طرف سے پوری قوم کو گھیرے میں لے لیں گے

قاضی ابنِ ابی دوّاد : یہ تو حضور کی کرم گستری ہے۔ ان تدبیروں کے آگے کثیر آبادی گردن جھکا دے گی۔

مامون : اور اگر اس کے باوجود کچھ لوگ نظریۂ خلقِ قرآن کی مخالفت پر اتر آتے تو؟ جیسا کہ اس وقت سب علماء اور قاضی مخالفانہ موقف پر ہیں۔

قاضی ابنِ ابی دوّاد : ان کے لیے فرمان کا چوتھا سخت ترین جزء کام کرے گا۔ یعنی جو دربارِ خلافت کے منتج کردہ عقیدۂ صحیحہ کو نہ مانے، اسے ملحد و زندیق اور کافر و مشرک قرار دے کر سنگین سزا دی جائے۔

مامون : گویا سارے ملک میں پرچہ نویس پھیلائے جائیں جو ہر صاحبِ علم اور ہر خطیب اور مدرس کی نگرانی کریں اور اُن کی باتوں کو مدت تک نوٹ کر کے مرکز کو بھجوائیں، پھر جس کسی میں مخالفت کے جراثیم ملیں اُسے قانون کی گرفت میں لیا جائے۔ یہ بڑا بھاری اور طویل سلسلہ کار ہو گا۔ اور ہم ایک ایک آدمی کو پکڑتے رہیں گے اور نت نئے لوگ اُٹھتے رہیں گے۔

قاضی ابنِ ابی دوّاد : حضور یوں نہیں۔ ہم ایک ہی وقت میں اعتقادی جانچ کے لیے ایک سرکلر جاری کریں گے جسے پولیس ایک ایک نمایاں اور با اثر عالم، مدرس اور خطیب تک لے جائیگی اور اس پر دستخط کا مطالبہ کرے گی۔ جو لوگ دستخط نہیں کریں گے، ان کی گرفتاری فوری طور پر عمل میں آ جائے گی۔ ایسی دو چار مثالوں سے ہر طرف خوف طاری ہو جائے گا اور بھاری اکثریت دربارِ خلافت کی ہمنوائی کرے گی

مامون : اگر نتائج مختلف ہوتے اور خاصی تعداد مخالفین کی بھی اُبھر آئی تو کیا ہو گا۔

قاضی ابنِ ابی دوّاد : حضور! میں نے حالات کا گہرا مطالعہ سی آئی ڈی کی رپورٹوں سے کیا ہے۔ نوجوانوں کی ایک تحریک علماء کی تنگ نظریوں کے خلاف ہمارے حق میں میدان ہموار کر چکی ہے۔ غیر مسلم عناصر نے بھی بحث و مناظرہ کی رو چلا کر علومِ نقلیہ کے مقابلے میں علومِ عقلیہ کا محاذ مضبوط کر دیا ہے۔ تاہم اگر دوسری صورت ہو بھی تو یہ صورت کیا کچھ کم مفید ہو گی کہ علماء کی قوت دو محاذوں میں بٹ جاتے اور ان میں باہم دگر لعن طعن کا سلسلہ چل پڑے۔

مامون : اچھا تو پھر؟

قاضی ابنِ ابی دوّاد : حضور کا اذن ہو تو ابھی سربراہ پولیس اسحٰق بن ابراہیم کو بلوا کر عقیدے کی

جانچ کے فرمان کی عبارت شرعی اور قانونی معیار کے مطابق حضور کی رضا میں مرتب ہو جائے۔

(مامون تالی بجاتا ہے۔ ایک غلام اندر آتا ہے۔ مامون حکم دیتا ہے کہ اسحٰق بن ابراہیم کو فوراً حاضر کیا جائے۔ اس دوران میں ہلکی پھلکی گفتگو جاری رہتی ہے)

مامون : قاضی صاحب! میں نے آپ کو حسبِ قلبی وسعت اور بلند نگاہی کے مقام پر پایا ہے، اس پر دُوسرے علماء نہیں پہنچ پاتے۔ ان لوگوں کی تنگ نظری کا یہ حال ہے کہ نہ خود تفریح کرنا جانتے ہیں، نہ کسی دُوسرے کو تفریح اور مسرت کے عالم میں دیکھنے کی اخلاقی جرأت رکھتے ہیں۔ جھٹ سے فسق و فجور کا فتویٰ دے دیں گے۔ یہ کیا بات ہے۔

قاضی ابنِ ابی دوّاد : حضور بات صرف اتنی ہے کہ یہ طبقہ جن مشکل حالات سے اٹھتا ہے اور جس لمبی محنت و کاوش سے نہایت ہی خشک ماحول میں علمِ دین حاصل کرتا ہے اور پھر کلمۃ الحق کہنے کے خبط میں پڑ کر اپنے آپ کو ترقی و خوشحالی سے محروم کر لیتا ہے، ایسے حالات میں تفریح کا کیا مقام۔ ان لوگوں نے دین کو بالکل ایک نظامِ یبوست بنا دیا ہے۔

مامون : مجھے آپ پر حیرت ہے کہ یحییٰ ابن اکثم جیسے پیکرِ علم و تقویٰ کی شاگردی کے باوجود آپ میں موسیقی کا اتنا اچھا ذوق کس طرح پروان چڑھا۔

قاضی ابنِ ابی دوّاد : میں نے تو اس معاملے میں برسوں کی منزلیں پل بھر میں طے کر لیں۔

مامون : وہ کیسے؟

قاضی ابنِ ابی دوّاد : گانے بجانے کو میں بھی مولویوں کی طرح شروع میں بُرا کام سمجھتا تھا، اور گانے والوں اور گانا سننے والوں پر زبانِ طعن دراز کرتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ خلیفہ معتصم (نور اللہ قبرہ) شماسیہ کی طرف نکلے اور مجھے بھی بلا بھیجا۔ میں پہنچا تو گانے کی آواز آئی۔ بس یہ آواز تیر کی طرح دل سے پار ہو گئی۔ مجھے کسی چیز کی سدھ بدھ نہ رہی۔ کوڑا تک میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ بس اسی لمحے موسیقی کے متعلق میری رائے تبدیل ہو گئی، اور پھر یہ ذوق از خود بڑھتا چلا گیا۔

(دستک ہوتی ہے۔ اجازت لے کر اسحٰق بن ابراہیم مجلس خاص میں داخل ہوتا ہے)

قاضی ابنِ ابی دوّاد : (اسحٰق سے مخاطب ہو کر) حضور جلالت مآب، ایک اہم فرمان جاری کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی عبارت لکھ لو۔

اسحٰق بن ابراہیم : (نوٹ بک سامنے رکھتے ہوئے) جی ارشاد۔

قاضی ابنِ ابی دوّاد : پہلے تمہید لکھیے :— چونکہ خلفاء کے سر پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ رعیّت کو خداوند تعالیٰ کی سیدھی راہ دکھائیں، اور جو کوئی اس سے روگردانی کرے اُسے پھر اللہ کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دیں۔ اور چونکہ کچھ جاہل لوگ ایسے ہیں جو حقائقِ دینی سے نابلد ہیں۔ وہ خدا اور اس کی مخلوق میں فرق نہیں معلوم کر سکتے اور انھوں نے خدا اور قرآن کو برابر کر دیا ہے۔ اور قرآن کو غیر مخلوق کہہ کر اِن جہلا نے اپنی دینداری میں بہت بڑا رخنہ اور اپنی امانت میں خلل پیدا کر کے بھاری غلطی کی ہے۔

اور دشمنانِ اسلام کے لیے راستہ آسان کر دیا ہے۔ اور چونکہ حضور ظلِ اللہ اِن جہلا کے اس قول میں نہ دین کا کوئی جزو پاتے ہیں نہ ایمان و لیقین کا کوئی حصہ۔ لہذا وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ایسے لوگوں کے لیے امانت و عدالت' اور شہادت و بیان کا کوئی معزز مرتبہ جائز نہیں۔ نہ رعیت کے معاملات میں سے کسی چیز کی ذمہ داری ان کو سونپی جا سکتی ہے۔

پس حضور خلافت مآب پولیس کے افسرِ اعلیٰ اسحٰق بن ابراہیم کو حکم دیتے ہیں کہ دربار کا یہ فرمان تمام قاضیوں اور نمایاں علماء کے سامنے پیش کیا جائے اور اس پر ان کے دستخط لیے جائیں، جن لوگوں نے اس سے پہلے قرآن کو غیر مخلوق کہا ہے اُن کو توبہ کرنے کے لیے کہا جائے، کیونکہ خلافت کی نگاہ میں ایسا کہنا کفرِ صریح اور شرکِ محض ہے۔ تو پھر جو کوئی توبہ کرلے اس کی توبہ کا اعلان کیا جائے اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ اگر کوئی شخص اپنے شرک پر اصرار کرے اور اپنے کفر و الحاد کی وجہ سے قرآن کو مخلوق ماننے سے انکاری ہو تو اسحٰق بن ابراہیم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کی گردن اڑا دو اور اس کا سر دربار میں بھجوا دو۔ البتہ جن شخصیتوں کے متعلق استثنائی طور پر حکمِ خاص دیا جائے اُن کو گرفتار کر کے بارگاہِ خلافت میں پیش کر دو۔ فقط

مامون: جزاک اللہ! قاضی صاحب! کتنی خوبصورت تحریر ہے اور شریعت و فقہ اور سیاست و تدبر کے لحاظ سے محکم۔

قاضی ابنِ ابی دؤاد: یہ حضور ہی کے ظلِ ہمایونی کا فیضان ہے کہ وابستگانِ بارگاہ کے ذہن اس مقام تک پہنچ سکے۔ خداوند کریم سچائی کے لیے اس اقدامِ جہاد کے عوض حضور کو صحت سے نوازے۔

(فرمان نامے پر پہلے مامون اور پھر قاضی ابو دؤاد دستخط کرتے ہیں اور فرمان اسحٰق بن ابراہیم کے حوالے کیا جاتا ہے)

اسحٰق بن ابراہیم: آمین، ثم آمین! خدا میری عمر کے بقیہ سال بھی امیر المومنین کو عطا کر دے۔

مامون: فرمان کی نقول کتابت خانے میں رات بھر میں تیار کرائی جائیں۔ اور صبح ان پر دربار کی مہریں ثبت کرا کے تمام دائرۂ خلافت میں جاری کر دیا جائے۔ چند بڑے بڑے مخالفین تک یہ حکمنامہ بہ نفسِ نفیس تمھیں لے جانا ہوگا۔

اسحٰق بن ابراہیم: بسر و چشم حضور! پوری پوری تعمیل ہوگی۔

(مجلس برخواست ہوتی ہے)

(۷)

گھی کے چراغ

(دارالرقیق کے اسی یہودی سیٹھ کے ساتھ اس کے گھر پر ایک کی گفتگو)

پادری: برسوں کی ٹھنڈی کوششیں اب رنگ لا رہی ہیں۔

یہودی سیٹھ: وہ کیسے؟ کیا ہوا؟

پادری: اس قوم میں بڑی بھاری پھوٹ پڑ گئی ہے۔ دربار اور نوجوان طبقے اور اربابِ شعر و ادب کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے اور علماء کی اکثریت اس کے

ردّ میں آواز اٹھا رہی ہے کہ قرآن غیر مخلوق ہے۔

یہودی سیٹھ: آزادیٔ خیال کی لامحدود فضا میں مناظروں نے جو فکری انتشار پیدا کر دیا ہے اس کا نتیجہ آخر اسی طرح سے نکلنا چاہیے تھا۔ اگرچہ دیر بہت لگی۔

پادری: آزادیٔ خیال یہاں اس معنی میں ہے کہ ان لوگوں کے عقاید اور عمل میں اتنا تضاد پیدا ہو چکا ہے کہ عقاید کا اپنی اصلی شکل پر برقرار رہنا ممکن ہی نہیں۔ عمل کی حفاظت جب عقاید سے اُٹھ جاتی ہے تو پھر جدھر سے جس کا جی چاہے ان پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔

یہودی سیٹھ: اور یہاں تو حملہ آور بھی خود اُن کے اپنے ہیں۔

پادری: ہاں تو اصل خبر تو ابھی آپ نے سنی ہی نہیں۔ دربارِ خلافت سے اُن تمام لوگوں کے خلاف سزائے موت یا سنگین کارروائی کا حکم جاری ہوگیا ہے، جو نظریۂ خلقِ قرآن کے انکاری ہوں۔

یہودی سیٹھ: نوبت بایں جا رسید! عقلیت اور آزادیٔ خیال کی تحریک نے جبریت کا راستہ اختیار کر لیا اور یہی اس کی کمزوری ہے۔ تمھیں کہاں سے معلوم ہوا۔

پادری: آج تو خیر یہ بات بغداد بھر میں عام طور پر معلوم ہوگئی ہے۔ مجھے اس کا علم پہلے سے تھا۔ تمھیں معلوم ہے کہ میرے خصوصی مراسم قاضی القضاۃ ابن ابی دؤاد سے ہیں۔ بلکہ اس کے دماغ میں اس اسکیم کو نشو و نما دینے میں میرے مشوروں کا بھی حصّہ ہے۔

یہودی سیٹھ: تو پھر منگاؤں مٹھائی؟ شراب تو آپ پیتے نہیں، ورنہ ایسی بیست سالہ نادر چیز میرے پاس ہے کہ آدمی کو محفلِ کہکشاں میں پہنچا دیتی ہے۔

پادری: مٹھائی ہوتی رہے گی۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ہمارے لیے اصل سامانِ مسرت یہ ہے کہ علماء کو کچلنے کے لیے دربار تیار ہو گیا ہے۔ محافظانِ دینِ متین کا محاذ ذرا کمزور پڑ جائے تو پھر ہمارے لیے راستے بالکل کھل جائیں گے۔ عام مسلمانوں کی کٹر مذہبیت اور اس کو قائم رکھنے والا قدامتی طبقہ ہمارے لیے وجہِ مصیبت ہے۔

یہودی سیٹھ: مگر یہاں کے دینی سربراہ جو ہمارے ہاں کی طرح کلیسائیت کی محدود سطح پر نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنی قابلیت اور کردار سے عوام کے دلوں میں جگہ بناتے ہیں اور سیاسی اثر بھی رکھتے ہیں۔ اتنے کمزور نہیں ہیں کہ حکومت کی سختیاں اُن کی قوت کو توڑ سکیں۔ امام ابو حنیفہ کی داستان ہمارے سامنے ہے۔ بڑی سے بڑی عقوبتوں سے یہ شخص گزر گیا۔ مگر دربار اُسے رام نہ کر سکا۔ الٹا عوام کی نگاہوں میں اس کا پایۂ اعتبار اور بلند ہوگیا۔ یوں بھی تاریخ کا اصول یہ ہے کہ جو نظریے اور تحریکیں براہِ راست عوام میں جانے اور دلیل سے راستہ بنانے کے بجائے اقتدار کا سہارا لیں اور تشدد کے کوڑے سے راستہ بنائیں وہ کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتیں۔

پادری: ہاں یہ صحیح ہے۔ اصل میں مکہ میں مسلمانوں کے اسمٰعیل نبی اور اُن کے ساتھیوں نے جبر و تشدد کے مقابلے میں استقامت دکھانے کی جو روایت قائم کر دی ہے اور جس کی آبیاری امام حسینؓ نے اپنے خون سے کی ہے وہ ہر اُس مسلمان کا سرمایۂ ضمیر ہے جو اپنے مذہب کی محبت و

خدمت کی راہ میں اُٹھتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ جبر و تشدد کمزوری کی علامت ہے۔

یہودی سیٹھ: تاہم یہ تصادم ہو جائے تو بُرا نہیں رہے گا۔

پادری: بات یہ ہے کہ اگر دربار جیت جائے تو مذہبی قوت ختم ہو جائے گی جو عوام کے لیے وحدت اور استحکام کی بنیاد ہے اور اگر علما جیت جائیں تو سیاسی قوت مضمحل ہو جائے گی۔

یہودی سیٹھ: یعنی چت بھی اپنی، پٹ بھی اپنی۔

پادری: خداوند کا شکر کرو کہ اسلام کی اصل تعلیم کے مطابق مذہب و سیاست یکجان ہو کر نہیں چل رہے بلکہ ہماری طرح یہاں بھی ثنویت پیدا ہو گئی ہے۔

یہودی سیٹھ: لیکن ہمارے ہاں ثنویت ایک متفقہ اصول بن چکی ہے، یہاں ثنویت کو تسلیم بھی نہیں کیا جاتا، اور علاوہ ہے بھی۔

پادری: بہ ہر حال یہ معاشرہ اب آہستہ آہستہ کمزور ہوتا جائے گا، اور ہمارے سروں سے مستقبل کا خطرہ ٹل جائے گا۔ اچھا، میں اس وقت جاتا ہوں استقفوں اور پادریوں کا ایک اجلاس منعقد کرنے کے انتظامات کرنے ہیں۔

یہودی سیٹھ: آپ استقفوں کا اجلاس منعقد کریں اور بندہ جا کر لونڈیوں کے ساتھ مسلمان خوش باشوں کا اجلاس منعقد کرتا ہے۔

(۸)

مراحلِ شوق

فرمانِ شاہی نافذ ہو چکا۔ سرکاری ملازمت میں منسلک قاضیوں اور معلمین اور دوسرے کمزور علماء کی بہت بڑی اکثریت نے سرکاری جبر کے آگے سر جھکا کر فرمان پر دستخط کر دیے ہیں۔ بعض اصحاب کو مفادو مراعات کے دام سے رام کیا گیا ہے۔ تھوڑی سی تعداد عقیدۂ حق پر قائم رہ کر عقوبت کا سامنا کرتی ہے۔ کچھ ممتاز علماء کو دربار میں بہ طورِ مجرم پیش کرنے کے لیے گرفتار کیا جاتا ہے۔ چار اصحاب اکٹھے گرفتار ہوتے ہیں۔ امام احمدؒ بن حنبل، سجادہ، قواریری اور محمد بن نوح المضروب، سجادہ اور قواریری نے گرفتاری کے چند گھنٹے کے بعد شاہی فرمان قبول کر لیا۔ اب صرف دو قیدی تھے، جنھیں اسحٰق بن ابراہیم کے حکم سے طرطوس روانہ کر دیا گیا۔ اس قافلے کی پوری روئیدادِ سفر ہم یہاں بیان نہیں کر سکتے۔ دو تین باتیں جو مختلف مراحل میں پیش آئیں۔ وہ زمانی فصل کو نظر انداز کر کے یکجا پیش کی جا رہی ہیں۔

مرحلۂ اوّل

(والیٔ بغداد شاہی حکم کے مطابق امام احمد بن حنبل کے عقیدے کا امتحان لیتا ہے)

والیٔ بغداد: آپ قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

حضرت امام: یہ اللہ کا کلام ہے۔

والیٔ بغداد: کیا وہ مخلوق ہے؟

حضرت امام: بس وہ اللہ کا کلام ہے۔ اس پر میں کچھ اور اضافہ نہیں کرتا۔

(اب والیٔ بغداد امیر المومنین کا فرمان نکال کر پڑھتا ہے۔ پڑھتے پڑھتے اس کی زبان پر مندرجہ ذیل آیت قرآنی آتی ہے۔)

والیٔ بغداد: (فرمان پڑھتے ہوئے) لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ!

ایک تیسرا شخص: (درمیان میں) خدا آپ کا بھلا کرے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سمیع ہے کان کے ساتھ اور بصیر ہے آنکھ کے ساتھ۔

والیٔ بغداد: (امام احمد سے) اللہ کے قول السمیع البصیر کے کیا معنی ہیں؟

حضرت امام: اللہ ویسا ہے، جیسا کہ اس نے اپنے متعلق بیان فرما دیا ہے۔

والیٔ بغداد: پھر اس کا کیا مطلب ہے؟

حضرت امام: میں نہیں جانتا۔ اللہ ویسا ہے جیسا کہ اس نے خود کو بیان کیا ہے[1]

(دوسرے اصحاب کے ساتھ ساتھ امام احمد بن حنبل کے جواب بھی والیٔ بغداد نے قلمبند کیے، اور پوری فائل تیار کر کے مامون الرشید کے پاس بھجوا دی۔ نو دن بعد گرفتاری کے لیے شاہی حکم موصول ہوا جس کی تعمیل کی گئی۔)

مرحلۂ دوم

(دونوں محترم و معزز قیدی پابجولاں لے جائے جا رہے ہیں اور لوگ اردگرد جمع ہیں)

ابوبکر الاحول (حضرت امام احمد سے) اے ابو عبداللہ! اگر تمھیں تلوار کے سامنے کھڑا کیا جائے تو کیا تم اس وقت مان جاؤ گے؟

امام: ہرگز نہیں۔

ابوبکر الاحول: خدا آپ کو استقامت دے۔

امام: بات یہ ہے کہ یہ معاملہ نہ صرف دین و اعتقاد کا معاملہ ہونے کی وجہ سے اہم ہے اور غیر مسلم فتنہ طرازوں کا اُٹھایا ہوا خطرناک فتنہ ہے بلکہ میں نے اس لیے بھی اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ہے کہ اگر ایک بار بادشاہت نے یہ راستہ کھول لیا کہ وہ لوگوں کو ان کے عقیدے اور نظریے معین کر کے دے۔ اور اختلاف کرنے والوں کو جبر سے دبائے تو پھر دین و مذہب حکمرانوں کی خواہشوں کا کھلونا بن جائیگا۔ اس رخنے کو بند کرنے کے لیے اگر مجھے اپنی لاش ہی کو کام میں لانا پڑا تو میں انشاء اللہ دریغ نہیں کروں گا۔

ابوبکر الاحول: جزاک اللہ

مرحلۂ سوم

(اثنائے سفر میں جبکہ قیدی اونٹوں پر بندھے ہوئے لے جائے جا رہے ہیں)

ایک اجنبی: (امام احمد بن حنبل سے مخاطب ہوتا ہے) حضرت السلام علیکم۔ آپ مجھے نہیں جانتے مگر یہ گنہ گار اور بدنام بندہ آپ کے عالمانہ مرتبے سے بھی آگاہ ہے، اور اس قصے سے بھی جو آپ کو درپیش ہے (ساتھ چلتے ہوئے) مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔

امام: تو کیا نام ہے تمھارا؟

اجنبی: میرا نام ابو الہیثم ہے۔

امام: (تعجب سے) ابو الہیثم؟ ابو الہیثم؟ تم ابو الہیثم ہو؟

اجنبی: جی میرے محترم، میں ہی ابو الہیثم ہوں۔ ڈاکو

---

[1] : دراصل حضرت امام کوئی بات چھپانے یا جواب سے گریز کی کوشش نہیں فرما رہے تھے۔ ان کا اصولی نقطۂ نظر یہ تھا کہ غیبی امور کے متعلق جو آیاتِ متشابہات وارد ہیں ان میں جتنی بات بیان کی گئی ہے اس پر ایمان رکھنا چاہیے۔ اور تفصیلات کی کرید میں پڑ کر تکلف کے ساتھ تاویل بازی نہیں کرنی چاہیے۔ (راقم)

ابوالہیثم! مجرم ابوالہیثم۔

امام : تو تمھیں مجھ سے کچھ کام ہے؟ کیا کام ہے؟

ابوالہیثم : میرے دل میں ایک بات اٹھی، بس وہی بات کہنے کے لیے میں دور سے آپ کی تلاش میں نکلا ہوں، اور آخرکار میں اس مختصر سے قافلۂ اسیراں تک پہنچ ہی گیا۔

امام : (مزید حیرت سے) آخر کیا بات تمھارے دل سے اٹھی ہے؟

ابوالہیثم : یہ تو آپ کو معلوم ہے ہی کہ میں مشہور ڈاکو ہوں اور میری اسی مشغلے میں عمر گزر گئی ہے۔ میں نے بیشمار قافلے لوٹے، گھروں سے مال اڑایا اور بار بار سزائیں بھگتیں۔

امام : ہاں بخوبی معلوم ہے!

ابوالہیثم : محترم اب میری ذرا بات سنیے۔ میں نے قید کے دَور ہی نہیں گزارے، میری پیٹھ پر سیکڑوں تازیانے برسے ہیں، مگر کوئی سزا میری روش میں تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔ میرا گنہ گار اور سیاہ ضمیر بھی جبر و تشدد کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ڈاکو ہونے کے باوجود میرے اندر جوہرِ انسانیت ہے۔ وہ تازیانوں کو اپنے سے عظیم و برتر نہیں مان سکتا۔ لیکن آپ ...

امام : میں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ تمھیں اپنی رحمت سے نوازے اور پاکیزہ زندگی عطا کرے۔

ابوالہیثم : میری تو دنیا و آخرت خراب ہو چکی لیکن میں آپ سے خدا کا واسطہ دے کر یہ التماس کرنے آیا ہوں کہ اگر ایک ڈاکو محض اپنے نفس کی خاطر اتنی استقامت دکھا سکتا ہے تو آپ تو خدا تعالیٰ کے صراطِ مستقیم پر چلنے والے عالم اجل ہیں خدارا آپ حکومت کے تازیانوں کے سامنے اپنے نورانی ضمیر کو جھکنے نہ دیجیے گا۔

امام : انشاء اللہ! خدا مجھے اس کی توفیق دے۔

ابوالہیثم : اچھا تو السلام علیکم، خدا حافظ! میرے لیے دعا کیجیے گا۔

امام : وعلیکم السلام! اللہ تمھارا اور میرا حامی و ناصر ہو۔[1]

(راستے ہی میں اطلاع ملتی ہے کہ مامون کا انتقال ہو گیا)

مرحلۂ چہارم

(جیل خانے میں اسحٰق بن ابراہیم جیسا بڑا پولیس افسر حضرت امام احمدؒ بن حنبل کی دربار میں پیشی کے لیے خود ہی حکم نامہ لے کر پہنچتا ہے اور امام کو اپنا تہدید آمیز مشورہ دیتا ہے)

اسحٰق (امام احمد بن حنبلؒ سے) تیار ہو جائیے، دربار میں آپ کو پیش ہونا ہے۔

امام : ہاں میں تیار ہوں۔

اسحٰق : میرا ہمدردانہ مشورہ ہے کہ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں اور حکومت سے ٹکر نہ لیں۔

امام : میں نے نہ تلوار اٹھائی ہے، نہ بغاوت کی ہے، نہ ٹکر لینے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ البتہ میں اپنے عقیدے کو کسی خوف یا لالچ سے نہیں بدل سکتا۔

---

[1] : ابوالہیثم کے ضمیر میں جو چنگاری کام کر رہی تھی اور جو اُسے کھینچ کر امام احمد بن حنبل تک صرف یہ پیغام دینے کے لیے کھینچ لائی تھی کہ دینی غیرت و حمیت میں فرق نہ آنے پائے، وہی چنگاری بعد میں اس کے کردار کو نور اور حرارت سے مالا مال کرنے کا ذریعہ بنی اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ تے دم تک اکثر اسے یاد کر کے پکار اٹھتے تھے۔ "خدا ابوالہیثم پر رحم کرے، اس نے مجھے بچا لیا۔"

اور نہ کسی کلمۂ باطل کے ابطال سے باز رہ سکتا ہوں۔ چاہے اس کا علمبردار کوئی بھی ہو۔

اسحٰق : خدا کی قسم اب تم اپنے متعلق خود سوچ لو، خلیفہ تمھیں تلوار سے یکبارگی قتل نہیں کرے گا بلکہ وہ اس پر تُلا ہوا ہے کہ اگر تم اس کی بات پر ہاں نہ کرو تو کوڑے پر کوڑا برسائے گا اور تمھارا خاتمہ ایسی جگہ کرے گا جہاں نہ سورج دکھائی دے، نہ چاند۔

امام : مجھے دین اور حق کے معاملے میں کسی چیز کی پروا نہیں۔ صرف خدا کی مدد درکار ہے۔

اسحٰق : اچھا یہی ضد ہے تو اب دین اور حق کا مزہ چکھ دیکھو۔

(امام کو ہتھکڑی بیڑی کے ساتھ دربار کی طرف لے جایا جاتا ہے)

(۹)

دربار میں

(وزرا، عہدہ داروں اور درباری علما کی ایک بڑی تعداد مسندوں اور کرسیوں پر جلوہ افروز ہے۔ امام جب پیش ہوتے ہیں تو معتصم کے اشارے سے چاروں طرف سے اُلٹے سیدھے سوالات اور اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ مگر امام بغیر کسی مرعوبیت اور بغیر کسی جذباتی ہیجان کے صبر و سکون سے ہر سوال کا جواب دیتے جاتے ہیں۔ امام کا یہ عملی استحکام اور اُن کے کردار کی استقامت بعض درباریوں میں بڑا تند و تیز ردِ عمل پیدا کرتی ہے۔

پہلا دن

قاضی احمد ابن ابی دؤاد (امام کی طرف غضب آلود نگاہیں ڈال کر) امیر المومنین! خدا کی قسم! یہ شخص گمراہ بدعتی ہے۔ اس سے بحث و استدلال فضول ہے۔

معتصم : بھئی اس سے بات کرو، مناظرے کا سلسلہ جاری رکھو۔

حضرت امام : میرے سامنے تو بس خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں سے کوئی دلیل لاؤ، کہ جس پر مجھے اعتراف کرنا پڑے۔ کوئی اور چیز مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

قاضی احمد ابن ابی دؤاد : آیا تم کوئی بات کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے علاوہ زبان سے نہیں نکالتے؟[1]

حضرت امام : تم جو کچھ تاویلیں کرتے رہتے ہو، ان کو تم خود بہتر جانتے ہو اور وہ بھی تمھاری ہی تاویل ہے جس پر لوگوں کو گرفتار اور قید کیا جا رہا ہے۔

ایک درباری عالم : اچھا فرمایئے، کیا آپ اس بات

---

[1] : امام مع دوسرے علماء کے اڑھائی برس قید میں رہے۔ خلقِ قرآن کے نظریے کا پہلا سرپرست فرمانروا مامون تو جلد فوت ہو چکا تھا مگر اپنے جانشین کو اپنی کارروائی بہ سلسلۂ خلق قرآن جاری رکھنے کی وصیت کر گیا تھا۔ یہ جانشین معتصم باللہ تھا۔ امام کے رفقائے زندان میں سے محمد بن نوح کے علاوہ نعیم بن حماد اور ابو یعقوب البویطی بھی بحالتِ اسیری وفات پا گئے اور امام امتحان و مشق میں تنہا رہ گئے۔

[1] : یہ صریحاً کٹ حجتی تھی۔ امام کا منشا کتاب و سنت کی بات سے یہ تھا کہ دلیل کتاب و سنت سے دی جائے۔ قاضی صاحب نے یہ مفہوم نکال لیا کہ سرے سے کلام ہی صرف قرآن اور حدیث کی باتوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ (راقم)

کے قائل ہیں کہ قیامت کے دن خدا کا دیدار ہوگا؟

حضرت امام: انشاء اللہ ایمان داروں اور حق پرستوں کو ضرور یہ سعادت نصیب ہوگی۔

درباری عالم: تو پھر یہ بتائیے کہ آنکھ ایک محدود چیز ہو کر خدا جیسی لامحدود ہستی کو کیونکر دیکھے گی۔ اس کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟

حضرت امام: میرے سامنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن حدیث ہے جس میں حضورؐ نے بشارت دی ہے کہ تم لوگ قیامت کے دن خدا کا دیدار اس طرح کروگے جس طرح چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو۔

معتصم: (احمد ابن ابی دؤاد کی طرف روئے سخن کرکے) بتاؤ تمھیں اس حدیث پر کوئی اعتراض ہے؟

قاضی احمد ابن ابی دؤاد: حضور! مجھے اس حدیث کی اسناد کی جانچ پرکھ کے لیے کچھ مہلت دی جائے۔

معتصم: اچھا تم کل تک جانچ پڑتال کرکے آؤ اور کوئی اعتراض ہو تو پیش کرو۔

دُوسرا دن

(اسی طرح دربار آراستہ ہے اور امام کو پیشی میں لایا جاتا ہے)

معتصم: (قاضی احمد ابن ابی دؤاد سے) ہاں تو پھر آپ نے حدیث کی جانچ پڑتال کرلی۔ کوئی اعتراض ہے؟

قاضی ابن ابی دؤاد: جی حضور! یہ حدیث پایۂ اعتبار سے ساقط ہے

وجہ؟

ج: اس حدیث کے سلسلۂ روایت میں ایک راوی قیس بن ابی حازم ہے۔ یہ شخص کھڑے ہو کر پیشاب کرتا تھا، جو علامتِ فسق ہے۔

حضرت امام: (زیرِلب) استغفراللہ۔ یہ شخص یوں جھوٹ بھی گھڑ لیتا ہے۔

معتصم: (امام احمد بن حنبل سے) قاضی صاحب کو آپ کیا جواب دیتے ہیں؟

حضرت امام: میں اِن صاحب سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔

معتصم: کیوں احمد؟ آپ ان سے کیوں بات نہیں کرتے؟

حضرت امام: میں اِن صاحب کو اہلِ علم میں شمار نہیں کرتا۔

احمد بن ابی دؤاد: (بے بسی کے لہجے میں) امیرالمومنین! اگر یہ شخص آپ کی بات مان لے تو یہ چیز مجھے سو ہزار دینار اور مزید سو ہزار دینار سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

معتصم: ہاں، اگر احمد بات مان لے تو میں اپنے ہاتھ سے ان کو آزاد کردوں گا۔ خود لشکریوں کے ساتھ سوار ہو کر اُن کے پاس جاؤں گا۔

معتصم: (امام کی طرف روئے سخن کرکے لجاجت سے) اے احمد! خدا کی قسم، میں تمھارے لیے شفیق ہوں۔ میں تم سے ایسی ہی شفقت رکھتا ہوں جیسی اپنے بیٹے ہارون کے لیے۔ پھر تم بولو کیا کہتے ہو؟

حضرت امام: مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں کہہ چکا کوئی نئی بات میرے پاس کہنے کو نہیں ہے۔

معتصم: (بے چینی محسوس کرتے ہوئے اپنے اوپر جبر کرکے) اچھا ہم سوچنے کی مہلت دیتے ہیں۔ یہ مجلس موقوف کی جاتی ہے۔ باقی کارروائی کل پر ملتوی۔

تیسرا دن

(آج دربار کا نقشہ ہی دُوسرا ہے۔ مرحلہ بہ مرحلہ تخویف کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایک دستہ امام کے راستے کے دونوں طرف ننگی تلواریں لیے کھڑا تھا، دوسرا نیزہ برداروں کا، تیسرا ایک جتھا کوڑے اور تازیانے لیے صف بستہ تھا۔ حضرت امام کو جبریت کے ان مظاہروں کے درمیان سے گزار کر لے جایا گیا۔ حضرت امام حسبِ معمول روزے سے تھے۔ امام کے پہنچنے پر معتصم نے تخت پر بیٹھے ہوئے متکبرانہ انداز میں خطاب کیا)

معتصم: (حضرت امام سے) میں تمھیں رسولؐ اللہ سے اپنی قرابت کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ میں تمھیں لازماً کوڑے لگواؤں گا۔ یا تم وہ کہو جو میں کہتا ہوں۔

ایک درباری: حضور والا جاہ! اذن ہو تو میں ایک سوال اس شخص سے پوچھوں؟

معتصم: ہاں، پوچھو

درباری: خدا نے اپنے متعلق فرمایا ہے کہ "لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ"۔ یہ بتاؤ کہ قرآن شئ کی تعریف میں داخل ہے یا نہیں؟

حضرت امام: تم اگر شئ کی تعریف میں اُسے داخل کرو بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے؟

درباری: اس سے تمھارے عقیدے کے خلاف نتیجہ بڑا سخت نکلتا ہے کیونکہ دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ سوائے ذاتِ الٰہی کے ہر شے فانی ہے۔ سو قرآن بھی صریحاً فانی ہُوا۔ فانی ہُوا تو غیر مخلوق کیسے ہُوا؟

حضرت امام: آپ یہ فرمایئے کہ مشہور آیت ہے: کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر نفس کا اطلاق یوں کیا ہے کہ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ہر نفس کے ذائقۃ الموت ہونے سے جس طرح آپ یہاں نفسِ حق تعالیٰ کو بچا نکالتے ہیں۔ اسی طرح میں ہر شے کے ہالک ہونے سے قرآن کو الگ کر لیتا ہوں۔

(چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا)

قاضی القضاۃ: (معتصم سے) حضور! اس شخص کا سر پھرا ہُوا ہے۔ اس سے بحث و مناظرہ کرنے میں وقت بھی ضائع ہو رہا ہے اور طرح طرح کے نئے نئے سوالات اٹھتے چلے جاتے ہیں۔

معتصم: (حضرت امام سے) تو بولو پھر کیا فیصلہ ہے؛ خلافت سے تعاون یا کوڑے؟

حضرت امام: مجھے جو کہنا تھا، کہہ چکا۔ میں اپنے ضمیر کو کوڑوں کے خوف سے نہیں بدل سکتا۔ مجھے اس سے پہلے جیل میں کوڑے اور دوسری عقوبتیں بھگتتے ڈھائی برس ہوگئے ہیں۔ میرے لیے یہ تجربہ نیا نہیں۔

معتصم: (جلّادِ اعظم سے) جلّاد! دیکھو، اس شخص کو کوڑے لگواؤ۔ چونکہ اس کا سر پھر گیا ہے۔ اس لیے کوڑے بھی سر پر لگواؤ اور ہر جلّاد صرف دو کوڑے مار کر ہٹ جائے۔ اس کے بعد دوسرا تازہ دم جلّاد آجائے۔ اس شخص کو ذرا نیا تجربہ بھی ہو جائے۔

جلّادِ اعظم: بسروچشم، والا جاہ!

جلادوں کی ایک قطار کوڑے لیے
آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور سلسلۂ عقوبت
کا آغاز ہوتا ہے۔)

حضرت امام: (پہلا کوڑا لگنے پر) بسم اللہ!

حضرت امام: (دوسرا کوڑا لگنے پر) لاحول ولا قوۃ الّا باللہ العلی العظیم

حضرت امام: (تیسرا کوڑا لگنے پر) قرآن اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے۔

حضرت امام: (چوتھا کوڑا لگنے پر) قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا۔ (کہہ دو کہ ہم پر کوئی مصیبت نہیں آسکتی، مگر صرف وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے۔

(ایک ایک کرکے پورے انیس کوڑے برس گئے۔ امام کے سر سے لہو چھوٹ کر کندھوں پر سے ہوتا ہوا بہ رہا ہے۔ نیم بیہوشی کے عالم میں حضرت امام نے پانی مانگا، مگر جب لایا گیا تو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں روزے سے ہوں)

معتصم: (امام کی مظلومی اور صبر سے پسیج کر) میں نے اس شخص کے معاملے میں زیادتی کی ہے۔

(اُٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگتا ہے اور جلاد کا ہاتھ رُک جاتا ہے)

احمد ابنِ ابی دوّاد: یا امیرالمومنین! خدا کی قسم! یہ شخص کافر و مشرک ہے۔ شرک بھی اس نے بلاوجہ کیا ہے اور یہ اس سے باز نہ آئے گا جب تک کہ اسے باز نہ رکھا جائیگا۔

اسحٰق بن ابراہیم: حضورِ عالی مرتبت! اگر اس شخص کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو یہ بات خلافت کے لیے باعثِ ننگ ہوگی۔ اور اس سے موجودہ اور گذشتہ دونوں خلفاء پر حرف آتا ہے۔

معتصم: (احمد ابنِ ابی دوّاد سے) اب تک احمد بن حنبل کو کتنے کوڑے لگ چکے ہیں؟

احمد ابنِ ابی دوّاد: تیس سے کچھ اوپر۔ غالباً چونتیس کے لگ بھگ۔

ابن سماعہ: حضور ایک ہی بار اس شخص کی گردن مار دیجیے، اس کا خون میری گردن پر۔

احمد ابنِ ابی دوّاد: (معتصم کے رنگِ طبع کا اندازہ کرکے) نہیں، امیرالمومنین! ایسا نہ کیجیے۔ یہ اب اگر آپ کے محل میں مرگیا تو لوگ کہیں گے مار سہتے سہتے مرگیا، پھر وہ اس کو اپنا پیشوا بنالیں گے اور جس غلط خیال پر وہ قائم ہیں، اس پر اور مضبوطی سے جم جائیں گے۔ پس بہتر یہ ہے کہ اس موقع پر اسے رہا کر دیا جائے۔ پھر اگر وہ آپ کے محل سے باہر مر بھی جائے تو لوگ اس کے معاملے میں شبہات میں رہیں گے۔

(معتصم نے سزا موقوف کرا کے امام کو بیہوشی کی حالت میں علیحدگی کا حکم دیا۔ پھر جب وہ ہوش میں آگئے تو ۲۵ رمضان کو انھیں سرکاری انتظام سے پورا لباس پہنا کر سواری پر محل سے رخصت کر دیا گیا۔ اس مرحلے پر احمد ابنِ ابی دوّاد ان کی دائیں جانب تھا اور اسحٰق بن ابراہیم بائیں جانب۔ پھر اسحٰق بن ابراہیم کے گھر سے جاکر امام کے ہمسایوں اور محلہ والوں کو بلا کر ان کی مجلس میں امام کی آزادی کا اعلان کیا گیا کہ لو یہ زندہ سلامت آگئے ہیں۔)

(۱۰)

فتنۂ خلق قرآن کا دوسرا دور

(معتصم بعد میں اپنے کیے پر سخت نادم رہا، اور امام کی خیریت پوچھوانے کے لیے قاصد بھیجتا لیکن اس کا دور بھی جلد ختم ہوگیا اور واثق مسند نشین ہوا۔ ایک بار پھر وہ گروہ ذرا سا اُبھرا جس نے خلقِ قرآن کا فتنہ اٹھایا تھا۔ اور واثق نے امام احمدؒ بن حنبل کو اُن کے گھر میں نظر بند کرکے درس و خطابت سے روک دیا۔ اس طرح مسئلہ ایک بار پھر فضا میں نمودار ہوگیا، مگر اب اس کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ لوگ اس سے تنگ آچکے تھے، اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس سلسلے میں دربار کے دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔)

پہلا واقعہ

خلیفہ کا خاص مسخرا: (دربار میں) اللہ تعالیٰ امیرالمومنین کو قرآن کے بارے میں صبرِ جمیل کی توفیق بخشے۔

واثق: خدا تمھیں سمجھے، نالائق کیا قرآن کی وفات ہوگئی؟

مسخرا: امیرالمومنین! آخر کیا چارہ ہے، ہر مخلوق پر موت واقع ہونے والی ہے اور قرآن بھی مخلوق ہے، آج نہیں تو کل یہ حادثہ ہو کر رہے گا۔

(واثق کچھ سوچ میں ڈوب جاتا ہے)

مسخرا: (بڑی سنجیدگی سے) امیرالمومنین آئندہ لوگ تراویح میں کیا پڑھا کریں گے؟

واثق: خدا تجھے غارت کرے، اپنی زبان بند کر۔

دُوسرا واقعہ

(ایک نامعلوم الاسم سفید ریش بزرگ شخصیت نے مرکزِ خلافت کی ایک مسجد میں آکر عقیدۂ خلقِ قرآن کے خلاف دانستہ تقریر کی، تاکہ کسی طرح دربار میں جاکر اپنی بات پہنچا سکیں۔ ان کو پولیس پکڑ کر لے آئی انھوں نے کمال جرأتِ حق گوئی کا مظاہرہ کیا اور استدلال کی راہ بھی خوب نکالی۔)

پولیس افسر: (سفید ریش بزرگ کو پیش کرتے ہوئے) امیرالمومنین! یہ شخص مسئلہ خلقِ قرآن کے خلاف بحث کرنا چاہتا ہے!

احمد ابنِ ابی دوّاد: بڑے میاں کہو، تم قرآن کے بارے کیا کہتے ہو؟

سفید ریش بزرگ: تم نے انصاف کی بات نہیں کی۔ سوال تو مجھے کرنا ہے۔

احمد ابنِ ابی دوّاد: اچھا تو تمھی کہو!

سفید ریش بزرگ: میں بہت ہی سادہ سی ایک بات کہتا ہوں، جس بات کی طرف نہ خدا کے رسولؐ نے دعوت دی، نہ حضرت ابوبکرؓ نے، نہ حضرت عمرؓ نے، اور نہ حضرت عثمانؓ و علیؓ نے، تم اس کی طرف لوگوں کو بلاتے ہو اور پھر منوانے کے لیے زبردستی سے کام لیتے ہو۔ اس بارے میں تم دو ہی باتیں کہہ سکتے ہو۔ ایک یہ کہ اُن جلیل القدر ہستیوں کو اس بات کا علم تھا ـــ یا وہ اس سے بے خبر تھے۔ کیا تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو؟ اور اگر تم کہو کہ علم تو تھا مگر انھوں نے سکوت اختیار کیا تو براہِ کرم تم بھی سکوت اختیار کرو۔ جس طرح انھوں نے لوگوں کو اس معاملے میں مجبور نہیں کیا تھا تم بھی نہ کرو اور دوسروں کو مجبور نہ کرو اور اگر کہو کہ ان کو سرے سے اس کی خبر بھی نہ تھی (بزرگ کا لہجہ پر جلال ہو جاتا ہے) تو

پھر اے گستاخ ابن گستاخ! ذرا سوچ کہ جس بات کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو نہ ہوا، اس کا علم تجھے ہو گیا؟

(دربار میں بزرگ کی ہیبت گوئی سے سکوت چھا گیا، قاضی صاحب بھی دم بخود رہ گئے۔ واثق مجلس سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بار بار ان الفاظ کو دہراتا رہا کہ "جس بات کا علم نبی صلعم اور خلفائے راشدین کو نہ ہوا اس کا علم تجھے حاصل ہو گیا" واثق نے سفید ریش بزرگ کو ادب واحترام سے رخصت کیا اور حضرت امام پر سے پابندیاں اُٹھا دیں۔ مسئلہ خلق قرآن پر لوگوں پر سختی کرنے کا دور ختم ہو گیا۔ قاضی ابن ابی دُواد واثق کی نظروں سے گر گیا، اور بعد میں ان کی جائداد کی ضبطی ہوئی اور خدا کی طرف سے فالج کا جان لیوا حملہ ہُوا۔ ساتھ ہی معتزلہ کی کمر ٹوٹ گئی)

(۱۱)

نئی آزمائش

(اب جب کہ واثق بھی رخصت ہو گیا، اور متوکل کا دور آیا تو اس نے پچھلے واقعات کی تلافی کی کوششیں اور امام کی دل جوئی کی تدبیریں کیں۔ کئی بار اس نے درہم و دینار بھجوائے۔ ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔)

سرکاری قاصد: امامِ محترم! حضرت خلیفہ (متوکل) نے یہ ایک لاکھ درہم کی تھیلی آپ کے نذرانے کے لیے بھجوائی ہے۔ قبول فرمائیے۔

حضرت امام: مجھے تو اس کی ضرورت نہیں، شہر میں بیشمار لوگ حاجت مند اور محروم ہیں۔ یہ اُن کا مال ہے، اُن کو ملنا چاہیئے۔

سرکاری قاصد: دیکھیے یا حضرت! خلیفہ کے دل میں آپ کا بڑا احترام ہے، اگر آپ یہ مال لوٹا دیں گے تو اس کا بُرا اثر پڑے گا۔

حضرت امام: یا اللہ! یہ معاملہ تو میرے لیے اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ وہ تو دین کا فتنہ (آزمائش) تھا اور یہ دنیا کا فتنہ ہے۔ یہ سِکّے کوڑوں سے زیادہ ضرر رساں ہیں۔

قاصد: اچھا اگر آپ اسے قبول نہیں فرماتے تو اپنے بیٹے کو قبول کرنے کی اجازت دیجیے۔

حضرت امام: لڑکا اپنی مرضی کا مختار ہے۔ اس سے بات کرلو۔

(اور لڑکے نے بھی رقم اسی طرح واپس کر دی)

(۱۲)

(دربار شاہی سے ایک مکتوب عبداللہ بن یحییٰ کے قلم سے حضرت امام کے نام جس میں قرآن کی حقیقت دریافت کی گئی تھی۔ اس کا جواب حضرت امام نے اپنے صاحبزادے سے اِملا کرایا۔ یہ خط دینی بصیرت کے لحاظ سے بھی ادبی حیثیت سے بھی ایک یادگار تاریخی خط ہے۔ اس خط نے درباری ماحول پر گہرا اثر ڈالا ——)

حضرت امامؒ کا جب انتقال ہُوا تو حالت یہ تھی کہ جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد (بہ اختلاف روایات) ۴، ۵ لاکھ سے لے کر ۸، ۱۰ لاکھ تک تھی۔ اسی منظر سے متاثر ہو کر ۲۰ ہزار غیر مسلم (یہودی، مجوسی، نصاریٰ) اسلام لائے۔

جب قرآن قوّت دیتا ہے

حجاج کے دربار میں ایک قیدی کے آخری لمحات

ادارہ

(حجاج اپنے پرہیبت جاہ وجلال کے ساتھ تخت شاہی پر متمکن ہے۔ ہر جانب موت کا سکوت طاری ہے۔ قیدی کو حاضر کیے جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ سعید بن جبیر پا بہ زنجیر حجاج کے روبرو پیش کیے جاتے ہیں۔)

حجاج: تیرا کیا نام ہے؟

سعید: میرا نام سعید ہے۔

حجاج: تیرے باپ کا کیا نام ہے؟

سعید: جبیر۔

(سعید کے معنی نیک بخت کے ہیں اور جبیر کے معنی اصطلاحاً اصلاح یافتہ چیز کے۔ حجاج نے ناموں کے اس حسین ربط کو ناگواری کے ساتھ محسوس کیا)

حجاج (چیں بجبیں ہو کر) تو شقی بن کسیر ہے (شقی کے معنی بدبخت کے ہیں اور کسیر کے معنی شکستہ چیز کے)

سعید: میری ماں میرے نام کو تجھ سے بہتر جانتی تھی۔

حجاج: تو اور تیری ماں دونوں بدبخت ہیں۔

سعید: علام الغیوب تیرے علاوہ کوئی اور ہی ہے۔

حجاج: دیکھ اب تجھے کس طرح موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔

سعید: تو پھر میری ماں نے میرا نام ٹھیک ہی رکھا ہے۔

حجاج: اب اس زندگی کے بدلے تجھے جہنم رسید کیا جائیگا۔

سعید: اگر میں تیرا اقتدار یہاں تک سمجھتا تو تجھے معبود بنا لیتا۔

حجاج: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق تیرا کیا عقیدہ ہے؟

سعید: وہ اللہ کے رسول اور رحمت کے نبی تھے جو بہترین نصیحت کے ساتھ دنیا میں بھیجے گئے۔

حجاج: خلفاء کے متعلق تو کیا کہتا ہے؟

سعید: ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ میں ان کا محافظ نہیں ہُوا۔

حجاج: تیرا خیال ان کے متعلق اچھا ہے یا بُرا؟

سعید: جس چیز سے میں لاعلم ہوں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔ اپنے حال سے بھی بے خبر ہوں

حجاج: تیرے نزدیک ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ کون ہے؟

سعید : جس نے سب سے زیادہ میرے مالک کو راضی کیا[1]

حجاج : تیرے نزدیک سب سے زیادہ (خدا کو) راضی کرنے والا کون تھا؟

سعید : اس کو تو وہی سمجھ سکتا ہے جو دل کے بھید اور رازہائے سربستہ کا جاننے والا ہے۔

حجاج : حضرت علیؓ دوزخی ہیں یا جنتی ؟

سعید : یہ تو میں دوزخ یا جنت دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں

حجاج : قیامت کے دن میں کیسا آدمی ہوں گا؟

سعید : میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ غیب پر مطلع کیا جاؤں۔

حجاج : کیا تیرا ارادہ مجھ سے سچ بولنے کا نہیں ہے ؟

سعید : میں نے اب تک کوئی بات جھوٹ نہیں کہی۔

حجاج : تو کبھی ہنستا کیوں نہیں ؟

سعید : میں کوئی بات ہنسنے کی دیکھتا ہی نہیں، اور وہ شخص کیا ہنس سکتا ہے جو دنیا کے فتنوں میں شب و روز دوچار رہتا ہو اور قیامت کے دن اُسے (جواب دہی کے لیے) پیش ہونا ہو۔

حجاج : مگر میں تو ہنستا ہوں۔

سعید : اللہ نے ایسے ہی مختلف طریقوں سے ہم کو بنایا ہے

حجاج : میں اب تجھے قتل کر دوں گا۔

سعید : میری موت کا مسبب (یعنی خدا تعالیٰ) اپنے کام سے (پہلے ہی) فارغ ہو چکا ہے۔

حجاج : اللہ کے نزدیک میں تجھ سے زیادہ محبوب ہوں ؟

سعید : علاّم الغیوب صرف خدا ہے جس کو اپنا مرتبہ معلوم ہو وہ اللہ پر ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔

حجاج : میں تو ایسی جرأت کر سکتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے جماعت کے بادشاہ کی حمایت حاصل ہے اور تجھے باغیوں کی جماعت کی۔

سعید : میں بھی خود کو جماعت سے علیٰحدہ نہیں سمجھتا لیکن میں فتنہ پردازی پسند نہیں کرتا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تقدیری امور نہیں ٹل سکتے۔

حجاج : ہم جو کچھ امیرالمومنین کے لیے جمع کر رہے ہیں اس کے متعلق تیرا کیا خیال ہے ؟

سعید : میں نہیں جانتا کہ تو کیا جمع کر رہا ہے۔ (حجاج نے سونا چاندی اور لباس فاخرہ منگا کر ان کو دکھلائے)

سعید : یہ سب اچھی چیزیں ہیں، اگر اپنی حدود کے مطابق ہوں۔

حجاج : اور وہ شرائط کیا ہیں؟

سعید : یہ کہ تو اُن سے ایسی چیزیں خریدے جن سے سخت حیرانی و پریشانی کے روز امن حاصل ہو سکے جب کہ ہر دودھ پلانے والی ماں اپنے دودھ پیتے بچے تک کو فراموش کر دے گی جبکہ حمل گر جائیں گے۔ اور آدمی کو اچھے عمل کے علاوہ کوئی بھی چیز کام نہ دے گی۔

حجاج : ہم نے جو کچھ جمع کیا یہ اچھی چیزیں نہیں ہیں؟

سعید : ان کو تو نے جمع کیا ہے تو خود تو ہی بہتر سمجھ سکتا ہے

حجاج : کیا تجھے ان میں سے اپنے لیے کوئی چیز پسند ہے؟

سعید : میں اسی چیز کو پسند کرتا ہوں جس کو میرا خدا میرے لیے پسند کرے

حجاج : تیرے لیے ہلاکت ہو۔

سعید : ہلاکت اسی کے لیے ہے جس کو جنت سے ہٹا کر جہنم میں ڈال دیا گیا ہو۔

---

[1] : بعض کتابوں میں یہ جواب یوں روایت کیا گیا ہے کہ ان کے احوال بعض کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں ؟

حجاج : (زچ ہو کر) بتا تجھے کس طرح قتل ہونا پسند ہے ؟

سعید : جس طرح تجھے اپنے لیے پسند ہو۔

حجاج : کیا میں تجھے معاف کر دوں ؟

سعید : معافی تو صرف اللہ کے یہاں کی معافی ہے۔ تیری معافی کوئی چیز نہیں۔

(اب حجاج کی آتشِ غیض و غضب پورے عروج پر پہنچ گئی۔ چنانچہ وہ جلاد کو حکم دیتا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ جب وہ قتل کے لیے باہر لائے گئے تو ہنس پڑے۔ اس سے حجاج کو مطلع کیا گیا۔ اس نے ان کو پھر طلب کیا)

حجاج : تو کیوں ہنسا ؟

سعید : اللہ کے سامنے تیری جرأت اور تیرے لیے اس کے حلم کا خیال کر کے۔

حجاج : میں اُس کو قتل کر رہا ہوں جس نے مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ پیدا کیا۔

(حجاج نے جلاد کو حکم دیا کہ اس کی گردن ہمارے سامنے اڑائی جائے۔ سعید نے دو رکعت نماز کی خواہش کی جو منظور کر لی گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ قبلہ رُخ ہوئے اور یہ پڑھا :

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ

(ترجمہ: میں نے اپنا منہ اُس پاک ذات کی طرف کیا جس نے آسمان و زمین بنائے اور میں سب طرف سے منہ موڑ کر ادھر متوجہ ہُوا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں)

حجاج : اس کا منہ قبلہ کی جانب سے پھیر دو اور نصاریٰ کے قبلہ کی طرف کر دو۔ انھوں نے بھی اپنے دین میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کیا ہے۔

(چنانچہ حکم کی فوراً تعمیل کر دی گئی)

سعید : فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ الْکَافِیْ بِالسَّرَائِرْ (جدھر بھی تم منہ پھیرو ادھر خدا ہی ہے جو بھیدوں کا جاننے والا ہے)

حجاج : اس کو زمین پر اُلٹا لٹا دو۔ ہم تو ظاہر پر عمل کے ذمہ دار ہیں۔

سعید : مِنْهَا خَلَقْنٰکُمْ وَ فِیْهَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُکُمْ تَارَةً اُخْرٰی (ہم نے زمین سے ہی تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے پھر دوبارہ اٹھائیں گے)

حجاج (غضبناک ہو کر) اس کو قتل کر ڈالو!

سعید : میں تجھے ہی اس بات کا گواہ بناتا ہوں: اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ (یہ چیز مجھ سے لو، اِس کی حفاظت کرنا، میں جب قیامت کے روز تجھ سے ملوں گا تو لے لوں گا)

(اس کے بعد ان کو شہید کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ)

قتل کے بعد آپ کے جسم سے اس قدر خون جاری ہوا کہ حجاج نے آج تک کسی مقتول کے جسم سے اتنا خون نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جس سے وہ متعجب ہوا۔ اس نے اپنے طبیب خاص کو طلب کر کے وجہ دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ ان کا قلب نہایت مطمئن تھا۔ ان کے دل میں اپنے قتل ہونے کا ذرا سا بھی خوف نہیں تھا جس کی وجہ سے ان کا خون اپنی مقدار پر بحالہ قائم رہا۔ بخلاف دوسرے لوگوں کے اُن کا خون موت سے پہلے ہی خشک ہو جاتا ہے۔

(علمائے سلف۔ کتاب الامامتہ السیاستہ)



سورہ یاسین (نامکمل) مغربی طرز کے خط کوفی میں۔

کاتب:۔ محمد تکر منشا، مکروی، نائیجیریا (بشکریہ سید محمد نجیب حسین)

کلام اللہ کی اعجاز آفرینیاں



یہاں تاریخ سے چند ایسے واقعات پیش کیے جاتے ہیں جبکہ قرآن کے چند کلمات نے ایسے حیرت انگیز نتائج پیدا کیے جو معجزانہ نوعیت رکھتے ہیں۔ وہ مشہور واقعات ان کے علاوہ ہیں جو صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے متعلق ہیں۔ کلامِ الٰہی کا صوتی جُز سُننے ہی ان ہستیوں کے دل و دماغ کی دُنیا بدل گئی۔ (ادارہ)

ضبط، عفو، احسان

حضرت امام حسنؓ کے ہاں معززینِ مکہ مدعو تھے۔ ایک لونڈی دسترخوان پر کھانا چُننے میں مصروف تھی، جب وہ شوربے کا پیالہ حضرت امام حسنؓ کے سامنے رکھنے لگی تو اچانک اس کا پاؤں پھسلا جس سے تمام شوربا حضرت امامؓ کے اُوپر گر گیا—— امام حسنؓ نے قہر آلود نظروں سے لونڈی کی طرف دیکھا۔ لونڈی تھر تھر کانپنے لگی، اس خوف کی حالت میں اُس کے منہ سے قرآن کے یہ الفاظ نکلے:۔

والکاظمین الغیظ (جو لوگ غصّے کو پی جاتے ہیں)

حضرت امامؓ نے لونڈی سے فرمایا:

"میں نے اپنے غصّے کو روک لیا"

پھر لونڈی نے کہا:

والعافین عن الناس (اور جو لوگوں کی خطائیں معاف کر دیتے ہیں)

حضرت امامؓ نے فرمایا!

"میں نے تمہاری خطا معاف کر دی"۔

اس کے بعد لونڈی نے آیت کا آخری حصّہ پڑھا:

واللّٰہ یحب المحسنین (اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے)

یہ سُن کر حضرت نے فرمایا:

"جاؤ، میں نے تمہیں آزاد کر دیا"۔

روزن سے آواز

ایک وقت تھا جب فضیل بن عیاضؒ ڈاکہ زنی کرتے تھے۔ ڈاکو بھی اس درجہ کے تھے کہ پہلے سے اعلان کر کے ڈاکہ ڈالا کرتے تھے۔ ایک رات وہ اسی نیّت سے مکانوں کی چھتوں سے گزر رہے تھے کہ کسی روزن سے ان کو کچھ آواز سنائی دی۔ انہوں نے رُک کر روزن سے کان لگا دیئے۔ کوئی شخص اپنے گھر میں قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا تھا——

فضیل بن عیاضؒ کے لمحہ سماعت کے وقت یہ آیت پڑھی گئی :

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ

ترجمہ : کیا ابھی تک ایمان لانے والوں کے لیے وہ گھڑی نہیں آئی کہ ان کے دل ذکرِ الٰہی کے لیے گداز ہو کر جھک جائیں ؟

اِن کلماتِ مبارکہ نے کیا عجیب تاثیر دکھائی، تیر کی طرح فضیل کے دل میں اُتر گئے۔ ایک دم نعرہ مارا — "ہائے میرے اللہ!" — اور پھر اُسی لمحے چوری سے توبہ کر لی بلکہ اپنی ایسی اخلاقی اصلاح کی اور رُوحانی منازل طے کیے کہ آج اُن کا شمار ذی مرتبہ صلحائے اُمت میں ہوتا ہے۔

نقشہ بدل گیا

حضرت ذوالنون مصریؒ مشہور بزرگانِ دین میں سے ہیں۔ جوانی کے دنوں میں ایک عیش پرست عرب کے ہاں ملازم تھے جہاں دورِ جام چلتا رہتا۔ ایک دن انہوں نے کسی شخص کی زبان سے ایک آیت (متذکرہ بالا واقعہ کی آیت) سنی، اور اسے سنتے ہی نہ صرف تمام مناہی سے توبہ کر لی، بلکہ زندگی کا رُخ ہی بدل دیا اور خدا کے پسندیدہ بندوں میں درجہ پایا —

حضرت ذوالنونؒ کا اثر دربارِ بغداد پر بہت تھا۔ خلیفہ متوکل آپ کی تشریف آوری پر تعظیم کے لیے خود اُٹھ کھڑا ہوتا اور وزرا اور درباری سبھی حد درجہ احترام کرتے۔ ایسی صورتِ حالات میں بالعموم حاسد بھی اُبھر آتے ہیں۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے حضرت ذوالنونؒ کے حق میں بدگوئی کی اور خلیفہ کے کان بھرے۔ باتیں ایسی تھیں کہ خلیفہ نے حضرت کو مصر سے بلوایا۔ آپ دربار میں داخل ہوئے تو سرِ مجلس اس مختصر سی آیت کی تفسیر نہایت ہی پُرسوز انداز میں بیان کی :

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

ترجمہ : بعض بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں۔

اندازِ کلام ایسا پُرسوز تھا کہ جس کے اثر سے خلیفہ کا دل پگھل گیا اور وہ بے اختیار سرِ دربار رونے لگا۔ ظاہر بات ہے کہ اس سیلِ گریہ میں وہ تمام چغلیاں بہ گئیں جو بعض لوگوں نے کان میں ڈالی تھیں۔

قیامت کے دن

سلیمان بن عبدالملک شام سے حج کے لیے مدینہ منورہ گیا تو حضرت ابوحازمؒ سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ ہے :

سلیمان : روزِ قیامت بندوں کی ملاقات پروردگار سے کس صورت میں ہوگی ؟

ابوحازم : اگر بندہ دنیا میں نیکی کر کے گیا تو اس طرح ہوگی جیسے کوئی شخص مدت کے بعد سفر کر کے اپنے گھر واپس پہنچے اور بہت سا مال و اسباب ساتھ لائے۔ اہلِ خانہ اس کی آمد سے خوش ہوں اور خوب خاطرداری کریں۔ اور اگر وہ بدی کر کے گیا تو اس کا سامنا ایسے ہوگا جیسے کسی کا غلام چوری کر کے بھاگ گیا ہو، اور آقا نے اس کی تلاش اور گرفتاری کے لیے پیادے دوڑائے ہوں اور وہ اس کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ اور گلے میں طوق ڈال کر آقا کے حضور لائیں وہ اس وقت آقا کے سامنے کتنا شرمسار اور قابلِ لعنت و نفرین ہوگا !

سلیمان : (آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے) کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اپنا حال جان لیتا کہ ان دونوں صورتوں میں سے کس صورت میں مالک کے سامنے میری پیشی ہوگی ؟

ابوحازم : یہ معلوم کرنا تو بالکل آسان ہے۔ قرآن نے اس حقیقت سے پردہ اُٹھا دیا ہے۔

سلیمان : کس آیت میں ؟

ابوحازم : اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ

ترجمہ : بے شک نیک لوگ (جنّت کی) نعمتوں میں ہوں گے اور بدکار جہنم میں۔

اب تم خود ہی اپنے اعمال کا جائزہ لے لو کہ آیا تم ابرار میں سے ہو یا فجار میں سے ؟

سلیمان : اگر انجامِ کار اعمال پر منحصر ہے تو پھر رحمت کیا ہوئی ؟

ابوحازم : یہ بات بھی قرآن مجید سے پوچھ لو۔

سلیمان : کس آیت سے ؟

ابوحازم : اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ

(ترجمہ : یقیناً اللہ کی رحمت احسان کیش لوگوں سے قریب ہے)

سلیمان : (خوف کی حالت میں روتے ہوئے بے حال ہو کر اُٹھتا ہے اور کہتا ہے) تمہاری اس قسم کی باتیں سننے کی مجھ میں تاب نہیں۔ میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔

عدالت جُھک گئی

ایک عالی مرتبہ بزرگ خاتون کو عدالت میں ایک مرد اور ایک عورت کے ہمراہ گواہی دینے کے لیے جانا پڑا۔ قاضی نے دونوں عورتوں کے بیانات جدا جدا لینے چاہے۔ بزرگ خاتون نے الگ گواہی دینے سے قرآن کی آیت[1] کی بنا پر انکار کر دیا اور عدالت سے کہا کہ خدا نے دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر اس غرض سے قرار دی ہے کہ اگر ایک کوئی بات بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔ ظاہر ہے کہ جدا جدا گواہی سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

قاضی نے اس قرآنی استدلال کو قبول کر لیا اور دونوں خواتین کی گواہی ایک ہی ساتھ لی۔

یہ بزرگ خاتون حضرت امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ تھیں۔

اَتٰٓی اَمْرُ اللّٰهِ

مامون الرشید نے وزیرِ سلطنت فضل برمکی کی بیٹی سے نکاح کیا جو دولتِ حُسن و جمال سے مالا مال تھی۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ تنہائی کی اوّلیں ملاقات کے وقت مامون کا اضطراب و شوق حد سے فزوں تھا۔ دوسری طرف وہ پیکرِ وقار تھی جس نے شرم و حیا سے نظریں نیچی کیے ہوئے یہ آیت پڑھی :

اَتٰٓی اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ

ترجمہ : اللہ کا امر آپہنچا پس اب جلدی نہ مچاؤ !

مامون یہ انتہائی برمحل اور معنی خیز آیت سنتے ہی ٹھٹک گیا اور اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ واضح رہے کہ فی الاصل یہ آیت انتباہ تھی مخالفینِ حق کے لیے کہ دیکھو اب خدا کا فیصلہ صادر ہونے والا ہے۔ اب بہت زیادہ عجلت پسندی نہ دکھاؤ۔

میرے لیے یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے

تقریباً ستر اسی برس پہلے کا واقعہ ہے کہ خواجہ احمد دین امرتسری، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا غلام اللہ ابن مولانا غلام علی قصوری (ثم امرتسری) ایک مجلس میں اکٹھے ہوئے۔ دورانِ گفتگو میں مولانا ثناء اللہ مرحوم نے خواجہ صاحب سے پوچھا کہ جن لوگوں کی زبان میں کوئی کتاب نازل ہوئی ہو، ان کا فہم سند ہے یا غیر اہلِ زبان کا ؟ خواجہ صاحب نے کہا، کہ اہلِ زبان کی زبان و لغت تو سند ہے لیکن ان کا فہم سند نہیں۔ مولانا نے اس کی دلیل طلب کی۔ خواجہ صاحب نے یہ آیت پڑھی :

---

[1] اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى
(البقرہ : ۲۸۲)

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

ترجمہ: بدوی عرب کفر و نفاق میں بہت سخت ہیں اور یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ ان احکام کو سمجھ سکیں جو رسولؐ پر نازل ہوئے ہیں۔

مولینا ثناء اللہ نے فرطِ حیرت میں فرمایا: "میرے لیے یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے۔"

مسجد بچ گئی قاضی سید علی محمد (متوفی ۱۰۰۷ ہجری مدفون بمزار بیجاپور) اہل اللہ کی صف میں مقام رکھتے تھے۔ ان کو اطلاع ملی کہ بیجاپور کے ایک دولتمند نے اپنے مکان میں متصلہ مسجد کو بھی شامل کر لیا ہے۔ عام مسلمان بیچارے اس کی دولت و قوت کی وجہ سے دم بخود ہیں۔ قاضی صاحب نے اس کو ایک خط لکھا جس میں یہ آیت درج کی:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا

ترجمہ: اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ کی مساجد میں رکاوٹ ڈالی کہ ان میں خدا کے نام کا ذکر کیا جائے، اور ان کو اجاڑنے کے درپے ہوا۔

اس آیت کا اثر یہ ہوا کہ اس دولت مند نے مسجد کو اپنے مکان سے الگ کر دیا۔

یَدُ اللہ! حکیم زاہد علی اکبر آبادی کی روایت ہے کہ نادر شاہ کے عہد میں حضرت علیؓ کا روضہ نجف میں تعمیر کیا گیا تو اس کے اوپر سونے کا پنجہ نصب کرنے کی تجویز ہوئی۔ اس پنجے پر کوئی مناسب عبارت کندہ کرانے کا مسئلہ اٹھا۔ عمارت کا منتظم "درّۂ نادرہ" کے مصنف مرزا مہدی علی خاں کے پاس آیا، اور ان سے دریافت کیا کہ کیا لکھا جائے؟ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ بادشاہ (نادر شاہ) کی سخت مزاجی کا تمہیں علم ہے۔ لہٰذا پہلے ان کے پاس جاؤ، وہ یہ کام میرے ذمے لگائیں تو غور کروں گا۔ منتظم بادشاہ کے حضور میں پہنچا، اور عرضِ مدعا کیا کہ پنجے پر کیا لکھا جائے؟ بادشاہ کی زبان سے بے اختیار یہ آیت صادر ہوئی:

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ

ترجمہ: اُن کے ہاتھوں کے اُوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔ ؎

منتظم عمارت نے یہ قصہ آکر مرزا مہدی علی خاں کو سنایا تو وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے کہ غیر عالم بادشاہ کے منہ سے ایسی بہترین چیز کا فی البدیہہ ادا ہونا ضرور کسی غیبی اثر سے ہے۔ مرزا صاحب نے منتظم سے کہا کہ دیکھو تم چند دن کے بعد پھر اس بارے میں پوچھنا کہ آپ نے کیا فرمایا تھا تو وہ لاعلمی کا اظہار کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعد میں پوچھنے پر بادشاہ کے ذہن میں وہ بات نہ آسکی اور حکم دیا کہ جاؤ جا کر مرزا مہدی سے دریافت کر لو۔

فیصلہ حضرت شیخ مجدد سرہندیؒ اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے درمیان "مکتوبات" کے سلسلے میں کچھ نزاع چل رہی تھی۔ شیخ عبدالخالق

؎ یہ آیت اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ (الخ) واقعہ حدیبیہ کے دوران میں بیعتِ رضوان کے متعلق وارد ہوئی تھی۔ نادر شاہ کی زبان سے اس کا اطلاق بے حد خوب صورت ہوا۔ یعنی ایک تو یَدُ اللہ حضرت علیؓ کے پنجۂ خیبر کشا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دوسرے جس آیت کو لیا گیا اس کا تعلق حضرت عثمانؓ سے تھا۔ اس طرح ایک ایسی آیت سامنے آئی جو دو فرقوں کے لیے بیک وقت جاذبِ عقیدت تھی۔

سرہندیؒ لکھتے ہیں کہ میں ایک دن شیخ عبدالحقؒ کی خدمت میں گیا اور گفتگو کے دوران میں یہ کہا کہ:

"بزرگانِ دین میں عداوت ٹھیک نہیں۔ ہمارا آپ کا منصف قرآن ہے۔ آیئے، وضو کریں، اور قرآن پاک کو کھولیں۔ پھر جو آیت آغازِ صفحہ میں نکل آئے، اُس کو شیخ احمد امجدؒ کے حال کی فال سمجھ لیجیے۔"

مولینا نے یہ تجویز قبول کر لی اور ہم دونوں نے وضو کر کے دوگانہ ادا کیا، اور پھر نہایت ادب و احترام سے قرآن پاک کھولا۔ صفحے کی پہلی آیت یہ نکلی:۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

ترجمہ: وہ ایسے مرد ہیں کہ جنہیں کوئی کاروبار اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔

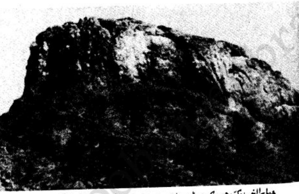
مولینا نے اس آیت کے پڑھتے ہی حضرت مجددؒ کی مخالفت سے توبہ کر لی اور آخر عمر تک اس پر قائم رہے۔

تاب ہے تو سنو! ایک ملاقات میں محمود غزنوی نے حضرت ابوالحسن خرقانیؒ سے کہا کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے احوال و اقوال میں سے کچھ فرمایئے۔

خرقانی: اچھا، تاب ہے تو سنو! وہ فرماتے ہیں جس نے مجھے دیکھا وہ بدبختی سے بے خطر ہو گیا۔

محمود: لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوجہل، ابولہب اور کتنے ہی منکروں نے دیکھا اور وہ بدبخت کے بدبخت ہی رہے۔ پھر کہا حضرت بایزید بسطامیؒ کا درجہ پیغمبر سے بھی بڑھ گیا کہ ان کو دیکھتے ہی بدبختی کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

خرقانی: محمود! قطعی طور پر سمجھ لو کہ آنحضورؐ کو ان کے چار یار اور اصحابِ کبار (یعنی ایمان لانے والی ہستیاں)



جبل النور (مکہ) جس کی چوٹی پر واقعہ غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی۔

کے سوا کسی نے حقیقی معنی میں دیکھا ہی نہیں۔ پھر خرقانی صاحب نے یہ آیت پڑھی:

وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ

ترجمہ: اور تو ان کو دیکھتا ہے کہ وہ تیری جانب دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ دیکھنے سے محروم ہیں۔

براہیمی انداز

ایک مرتبہ مغل اعظم شہنشاہ اکبر (موجد دینِ الٰہی) نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ اپنی مُہر پر "اللہ اکبر" کا کلمہ کندہ کروانا چاہتا ہے۔ درباریوں سے پوچھا کہ اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟ خوشامد پیشہ امرائنے ہاں میں ہاں ملائی لیکن ایک بزرگ حاجی ابراہیم بھی موجود تھے۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ "اللہ اکبر" کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خدا بڑا ہے، دوسرا یہ کہ اکبر خدا ہے۔ پس بہتر یہ ہے کہ اس کے بجائے فلذکر اللہ اکبر نقش کرائیں۔ یہ قرآن کی آیت ہے جس کے معنی ہیں کہ اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔ بادشاہ نے اس صاف گوئی کو پسند کیا مگر حاجی صاحب سے یہ سوال کیا کہ تم اس کے معنی دوسری طرف کیوں لے گئے؟ حاجی ابراہیم نے عرض کیا کہ میں نے دونوں امکانی معنی بیان کر دیے ہیں۔ بادشاہ نے معذرۃً کہا کہ صرف مناسبتِ لفظی ہے اور کوئی خاص بات نہیں۔ حاجی ابراہیم اس پر بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ:

"لیکن خدا کو ایسی مناسبت اور شرکت پسند نہیں۔"

آیت کی ہیبت

عبداللہ بن حنظلہؓ کے سامنے ایک شخص نے آیت پڑھی:

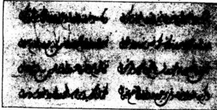
لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ

ترجمہ: اُن (یعنی کفار) کے لیے دوزخ ہی (کی آگ) کا بچھونا ہے اور اسی سے اوڑھنے کا سامان۔

حضرت عبداللہؓ پر گریہ طاری ہو گیا۔ پھر یوں معلوم ہوا کہ ان کی رُوح پرواز کرنے کو ہے۔ پھر وہ یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حاضرین نے کہا کہ آپ بیٹھ جائیں کہنے لگے کہ اس آیت کی ہیبت مجھے بیٹھنے سے روکے ہوئے ہے ——

جواب لکھنے کا ارادہ

یحییٰ بن حکم اندلس کا مشہور فصیح و بلیغ گذرا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے بطورِ امتحان سورۂ اخلاص شریف کا جواب لکھنا چاہا میں نے ارادہ کیا ہی تھا کہ میرے دل پر یکایک ہیبت طاری ہو گئی اور اچانک ایسا گداز پیدا ہو گیا کہ میری آنکھوں سے خود بخود آنسو بہنے شروع ہو گئے۔ میں نے اُسی وقت توبہ کی۔



عراق کے خطاط ھاشم محمد کے "خطِ دیوانی" کا ایک نمونہ

طوفان اُمڈ پڑا



مولانا حکیم محمد عبداللہ

سنہ ۴۶ء کے رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا میں فجر کی نماز کے بعد جامع مسجد روڑی میں بیٹھا ہوا تھا کہ چند آدمی گھبرائے ہوئے آئے اور بیان کیا کہ غضب ہو گیا۔ سُننے میں آیا ہے کہ سکھوں کے لڑکوں نے قرآن کریم پھاڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا ہے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو رہے ہیں اور تھانہ والی مسجد میں جمع ہو رہے ہیں۔"

میں فوراً بلا کسی تاخیر کے موقعۂ واردات پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ فی الواقع مسلمان مسجد کے صحن میں جمع ہو رہے ہیں۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تو اتنا معلوم ہوا کہ اسی مسجد تھانہ والی میں سے چند روز ہوئے ایک حمائل شریف (جیبی سائز قرآن مجید) چوری ہوئی تھی اسی کی بے حرمتی ہوئی ہے۔

"بے حرمتی کرنے والے کون ہیں؟" میں نے دریافت کیا معلوم ہوا پرائمری سکول کے تین سکھ طالب علم ہیں جو موضع جٹانہ کلاں ریاست پٹیالہ کے رہنے والے ہیں۔

"پرائمری سکول کے طالب علم" نے مجھے چونکا دیا میں نے ان کی عمریں دریافت کیں تو معلوم ہوا کہ بالترتیب آٹھ، نو اور بارہ سال ہیں۔ دل کو اس امر کا اسی وقت یقین ہو گیا کہ یہ بے حرمتی غالباً کسی سازش یا کسی عناد کی نیت سے نہیں ہوگی۔ مگر بہر حال اسی سلسلہ میں بہت کچھ احتیاط کی ضرورت تھی۔ تھانہ مسجد کے بالکل سامنے تھا۔ تھانیدار کو ملا تو معلوم ہوا کہ

تھانیدار ہندو ہیں اور نو وارد ہیں اور اس سانحے کی نوعیت کے پیش نظر گھبرا گئے ہیں اور تھانے کے رجسٹر میں روانگی دکھا کر روپوش ہو گئے ہیں۔ یہ اس کی انتہائی کمزوری تھی جس سے معاملہ اور بھی نازک صورت اختیار کر گیا۔ اب اس آگ کو بجھانے کے لیے سوائے حکمت عملی کے پانی کے اور کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ میں نے دو لڑکوں کو سکول کے ہیڈ ماسٹر کے پاس روانہ کیا کہ وہ فوراً پہنچیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب غالباً بروالرشیداں کے سید تھے مگر تھے اعصابی قسم کے آدمی گھبرا گئے اور آنے سے انکار کر گئے۔ میں نے دو شخصوں کو پھر روانہ کیا اور کہا کہ اس نازک موقعہ میں نہ آنا مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکا دیگا۔ نہ آئیں تو زبردستی لے آئیں۔ چنانچہ ان حالات میں میر صاحب کو نو لے بر ندش آنا پڑ گیا۔ میں نے انہیں تسلی دلا کر ان کے شاگردانِ رشید کے حالات دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ دراصل یہ تینوں طالب علم اس لڑکپن میں ہی چوری کی عادات میں گرفتار ہیں۔ سکول کی لائبریری میں سے دو ایک بار کتابیں چوری کرنے کے الزام میں استادوں سے سزا پا چکے ہیں۔ مسجدوں اور گوردواروں سے جوتیاں بھی چراتے رہتے ہیں۔ یہ حمائل بھی چھوٹے طالب علم نے ایک پوتھی سمجھ کر چوری کی اور اُسے چھپا کر اپنے گھر جٹانہ کلاں لے جا رہا تھا۔ واضح رہے کہ یہ طالب علم روزانہ سکول سے فارغ ہو کر اپنے گاؤں چلے جایا کرتے تھے جو ہمارے قصبہ سے اڑھائی میل کے فاصلہ پر تھا وہ جس روز قرآن پاک کو چرا کر گھر لے جا رہا تھا تو دوسرے دونوں لڑکے بھی ہمراہ تھے۔ بڑے لڑکے نے بغل میں دبائے قرآن مجید کو دیکھ کر کہا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے کہا ایک پوتھی ہے کہیں سے ہاتھ لگ گئی ہے۔ اس نے چھین کر دیکھا اور کہا یہ تو مسلمانوں کا قرآن ہے اور تو نے بہت بُرا کیا۔ مسلمانوں کو پتہ لگ گیا تو جان سے مار دیں گے۔ اگر خیر چاہتا ہے تو...... آگے راہ میں کنواں تھا۔ اس نے کنوئیں میں ڈال دیا اور آپس میں قسمیں اٹھالیں کہ اس کا کہیں ذکر تک نہیں کریں گے۔ مگر چند دن بعد آپس میں کسی مال مسروقہ کی تقسیم میں جھگڑ پڑے اور فریق مخالف نے یہ راز استاد اور دوسرے لوگوں کے پاس اُگل دیا۔ میں نے یہ حالات سُن کر میر صاحب سے کہہ دیا کہ بچوں کو تحویل میں رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی جوشیلا مسلمان ان کو سورگ باش کر دے۔ میرے علم میں اصل حقیقت تو آگئی تھی مگر میں اس کا اظہار ابھی نہیں کر سکتا تھا کیسی قوم کے جذبات کو قابو میں لانا آسان بات نہیں ہے۔ بہر حال میں نے اس بات کے علم میں آجانے کے بعد کہ یہ سانحہ اتفاقی ہے ارادۃً نہیں ہوا۔ اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لیا۔ الصلح خیر۔ لیکن اس کے لیے صبر اور تحمل سے موقعہ کی تلاش کر رہا تھا۔ تھانیدار کے راہِ فرار اختیار کرنے کے بعد تھانہ کے سامنے مجمع کا کھڑا رہنا فضول تھا۔ میں مجمع کو لے کر بازار کے دروازہ کے سامنے اور بڑے تالاب کے پختہ گھاٹ کے چبوترے پر آ گیا جہاں پیپل کا سایہ تھا۔ مقام سایہ دار پانی کا کنارہ تھا۔ اس لیے ٹھنڈ تھی تاکہ روزہ داروں کو زیادہ تکلیف نہ ہو۔ وہاں پہنچنے پر ہندو اور سکھ بھی آنے شروع ہو گئے اور مجمع بڑھتا گیا لیکن اس مجمع میں شرارتی عنصر نہیں تھا سب لوگ افسوس کرتے ہی نظر آتے تھے۔ اتنے میں مجھے خیال آیا کہ اب تک تو محض ہوائی بات ہوئی ہے موقع واردات پر تو جانا چاہیے لیکن اس طرح اگر پورے مجمع کو وہاں لے گئے اور اس کنوئیں میں سے قرآن مجید کے اوراق نکلے تو ممکن ہو سکتا ہے کہ مجمع بے قابو ہو جائے اس لیے مصلحت اسی میں ہے کہ میں خود نہ جاؤں ورنہ مجمع پر کنٹرول نہیں رہ سکے گا۔ میں یہیں رہوں اور دو تین اشخاص کو بھیجدوں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک مسلمان لڑکا کنوئیں میں اتارا گیا۔ اس نے احتیاط سے قرآن مجید کے اوراق نکال لیے۔ پورا قرآن مجید نہیں ملا۔ ممکن ہے حمائل غیر کامل اور بوسیدہ ہو بہر حال بھیگے ہوئے اوراق کو نکال کر مجمع میں آئے اور میرے سامنے ہتھیلیوں پر رکھ کر مجھے دکھائے۔ اس منظر کو دیکھ کر پورے مجمع پر رقت طاری ہو گئی مسلمان تو مسلمان ہندو بھی رونے لگے۔ میں نے اس صفحہ پر نظر کی تو چند آیات سامنے آئیں افسوس ہے کہ وہ آیتیں مجھے یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ اس میں حکم تھا صبر کرو۔ صبر کرنے میں بھلائی ہے۔ میں نے ان

آیات کی تلاوت کر کے مجمع کو سنائی اور پھر اس کا مفہوم بیان کیا اور کہا کہ لڑائی جھگڑے سے قرآن پاک کی ان آیات نے ہمیں روک دیا ہے اب قانونی طور پر ہی اس کا فیصلہ کریں گے۔ اس نازک موقعہ پر قرآن پاک کی ان آیات کا سامنے آنا یقیناً معنی خیز ہے اور قرآنی معجزہ۔

اتنے میں ان سکھ بچوں کے سرپرست آ گئے منتیں معافیاں اور معذرت کرتے ہوئے سامنے آئے۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے گاؤں کی پنچایت بلائیں، ہم اپنے شہر کی پنچایت کر کے فیصلہ کرتے ہیں۔

دھوپ زیادہ تیز ہو گئی تھی اور روزہ داروں کو تکلیف ہو رہی تھی میں نے انہیں کہا کہ اب سب اپنے گھروں کو جاؤ۔ پھر ٹھنڈے وقت میں سوچیں گے شام کے وقت میں جامع مسجد میں موجود تھا کہ موضع جٹانہ کی بہت بڑی پنچایت جس میں وہاں کے تمام ہندو اور سکھ معززین شامل تھے آئے۔ میں اس منظر کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ ان میں اکثریت نیلی پگڑیوں والے سفید اور سیاہ داڑھیوں والوں کی تھی۔ سب ادباً اور احتراماً ہاتھ جوڑے ہوئے کھڑے تھے اور معافی مانگ رہے تھے میں نے جواباً انہیں خوش آمدید کہا اور کہا کہ آپ کا آنا سر آنکھوں پر مجھے اس کا احساس ہے اور میں اس سے بے حد متاثر ہوں کہ آپ سب لوگ خدا سے ڈرنے والے اور صلح پسند ہیں بہر حال آپ کی آمد اسی نیک ارادہ سے ہوئی ہے۔ قصور تین پاپی اور بیوقوف بچوں کا ہے جس کی ذمہ داری آپ لوگوں پر عائد نہیں ہوتی۔ اس لیے جی تو چاہتا ہے کہ میں ابھی آپ کو پوری ذمہ داری سے معافی دیکر اور مطمئن کرا کے واپس روانہ کر دوں مگر معاملہ فقط میرا نہیں ہے بلکہ معاملہ پورے علاقہ کا ہے۔ اس طرح فقط میرے معاف کر دینے سے یہ آگ ایک بار دب تو جائے گی لیکن پھر سلگ کر بھڑک اُٹھے گی اور میرے بجھائے بھی نہیں بجھے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس آگ کو حکمت، دانش اور محبت کے پانی سے بجھایا جائے تاکہ دوبارہ سلگ اٹھنے کا اندیشہ نہ رہے۔

اس لیے میں نے یہ تدبیر سوچی ہے کہ کل صبح تک میں مسلمانوں کے بڑے بڑے گاؤں سے دس پندرہ نمائندہ حضرات کو بلوالوں اور صورت معاملہ سے آگاہی کر کے پھر دونوں پنچایتوں کے مابین گفتگو کے بعد معاملہ ختم کراؤں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ تنہا میرے فیصلہ پر مسلمان ہی مجھ سے بگڑ جائیں۔

سب نے اس رائے کو پسند کیا میں نے اس موقعہ کو غنیمت تصور کر کے اس شر میں سے ایک خیر کا پہلو نکالنے کے لیے کہا کہ "آپ صرف پانچ منٹ میری باتیں سُن لیں تاکہ آپ کو یہ معلوم ہو سکے کہ یہ حادثہ کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے"۔

اس موقع پر میں نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے ——

"میرے ہندو اور سکھ بھائیو! قرآن پاک اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم صرف مسلمانوں کی کتاب اور مسلمانوں کے ہی پیغمبر نہیں اگر مسلمان ایسا خیال کرتے ہیں تو وہ غلطی پر ہیں اگر ہندو اور سکھ بھائی ایسا سمجھتے ہیں تو انہوں نے بھی غلط سمجھا ہے۔ قرآن جس طرح مسلمانوں کے لیے کتاب ہدایت ہے اسی طرح تمام دنیا کے لیے بھی رہنمائی کا کام دیتی ہے اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی سب دنیا کے لیے ہادی ہیں دیکھئے گورو نانک دیو جی کس کشادہ دلی سے اس کا اقرار کرتے ہیں ؎

"تورات انجیل زبور ترے پڑھ سن ڈٹھے وید"
"رہے کتیب قرآن ہی کلجگ میں پردار"

اس کلجگ کے عالم میں رہنمائی کرنے والی کتاب صرف قرآن ہے اور جب گورو جی مکہ معظمہ گئے تو وہاں کے قاضی سے مخاطب ہو کے فرمایا۔

"نانک آکھے رکن دین سچے سنو جواب۔ صاحب دا فرمایا لکھیا وچ کتاب۔ وچ دوزخ ہاویہ اوہ سڑے جو کہے نہ کلمہ پاک۔ مروہ نرہیے دو جڑے روجڑے پنج نماز طلاق"۔

یہاں بھی قرآن پاک کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں ——کہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ہاویہ دوزخ میں وہ لوگ عذاب بھگتیں گے جو کلمہ نہیں پڑھتے ہوں گے۔ تیسوں روزے نہ رکھتے ہوں گے۔ پانچوں نمازوں کو طلاق دے رکھی ہوگی۔" اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں۔

"ڈٹھا نور محمدی ڈٹھا نبی رسول۔ نانک قدرت دیکھ کے خودی گیا سب بھول" ـــ یعنی جب سے نور محمدی کا جلوہ دیکھا ہے۔ نانک اپنی خودی بھول گیا۔ تو میرا اس تقریر سے یہ مطلب ہے کہ قرآن صرف ہمارا نہیں ہے تمہارا بھی ہے۔ جس کو گورو جی اللہ کی کتاب تصور کرتے ہیں۔ اس کی بے حرمتی کا مسئلہ مسلمانوں کا ہی نہیں تمہارا بھی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ کیا آپ ان تینوں بچوں کو کسی کی ضمانت پر ہمارے سپرد کر سکتے ہیں۔"

میں نے ان میں سے ایک صاحب کی ضمانت پر لے جانے کی اجازت دے دی اور وہ سکول سے لے گئے۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ وہ اپنے گھر پہنچ جائیں۔ رات کے وقت میں نے اپنے چند رفقاء کے مشورہ سے یہ طے کیا کہ اپنے پڑوس کے بڑے بڑے مواضع میں قاصد بھیج کر وہاں کے آئمہ مساجد اور نمبرداروں کو بلوالیں۔ اس طرح کم از کم دس پندرہ گاؤں کے نمائندے بلوا کر آنے والی پنچایت سے معافی منگوا دیں گے اور معاملہ رفت گزشت ہو جائے گا۔ اسی خیال کے ماتحت ہمارے ایک عزیز لڑکے محمد حنیف کو موضع علیکا ناگو کا پنہاری وغیرہ میں روانہ کر دیا گیا اور بے صبری سے صبح کا انتظار کرنے لگے۔ رات کو ہجوم افکار سے اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ کبھی خیال آتا تھا کہ بچے ہوں یا بوڑھے بہرحال قرآن پاک کی بے حرمتی ہوئی ہے اس لیے بس ان لوگوں سے بھڑ جانا چاہیے۔ بے سوچے بغیر کہ جو ہوتا ہے ہو جائے۔ آخر موت تو غیرت قرآنی پر آئے گی۔ مگر یہ خیال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا تھا۔ اسلامی عدل اور انصاف سامنے آ جاتا تھا۔ غرضکہ اسی ادھیڑ بن

میں صبح کی نماز پڑھ کر موضع علیکا کے راستے کی طرف دیوانہ وار چلا گیا کہ مولوی عبداللطیف خان صاحب آ رہے ہوں گے۔ اُن سے مل کر دریافت کروں گا کہ میرا یہ فیصلہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ کہیں عدل وانصاف کے پردے میں بزدلی تو کارفرما نہیں ہے شہر سے باہر نکل کر اس مقام پر کھڑا ہو گیا جہاں سرسہ کی شاہراہ سے موضع علیکا کو راستہ نکلتا ہے۔ ابھی اسی مقام پر کھڑے ہوئے تھوڑا سا عرصہ گزرا تھا کہ سرسہ کی طرف سے ڈھول کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی گرد وغبار کا طوفان اٹھتا ہوا نظر آیا۔ میں نے حیرانی سے دیکھا چند ثانیہ بعد ایک بپھرا ہوا ڈانگوں سے مسلح مجمع نظر پڑا۔ جو ڈھول اور نقارہ بجاتا ہوا کھیتوں کو روندتا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔

مجمع نے قریب پہنچ کر مجھے دیکھا اور زور سے سلام علیکم کہا میں نے جواب میں وعلیکم السلام کہا۔ یہ موضع ناگوکا کے مسلمان تھے۔ دیہاتی اور جذباتی مسلمانوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر میں نے ایک تقریر کی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جزاک اللہ مسلمان ہوں تو ایسے ہوں۔ غیرت ایمانی ہو تو ایسی ہو۔ قرآن کے ماننے والے ہوں تو ایسے ہوں۔ بھائیو! میں سب کو مبارک باد اور خوش آمدید کہتا ہوں۔ مگر مجھے یہ تو بتایئے کہ میں نے تو صرف مولوی صاحب اور نمبردار کو بلوایا تھا۔ آپ اتنے لوگ اور وہ بھی مسلح ہو کر کیوں آ گئے"!

وہ کہنے لگے "ہم نے تو یہ سنا تھا کہ مولوی صاحب کو شہید کر دیا گیا ہے اور قرآن پاک کی بے حرمتی کر دی گئی ہے۔"

میں نے کہا "میں تو آپ کے سامنے زندہ اور سلامت موجود ہوں۔ باقی رہا قرآن پاک کا معاملہ وہ عنقریب بیان کرتا ہوں۔ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ اس میں قصوروار چھوٹی عمر کے بچے ہیں۔ سارے مولوی جمع ہونے پر قرآن ہی سے فیصلہ چاہیں گے۔ پھر جو فیصلہ قرآن پاک کا ہوگا ہم اس پر عمل کریں گے مجھے بتایا جائے کہ کیا آپ بھی قرآن پاک کے فیصلہ کو ماننے کے لیے تیار ہیں"!

سب نے یک زبان ہو کر کہا "بالکل"!

"اچھا تو پھر یہ لاٹھیاں اور ہتھیار جو لائے ہوئے ہو ان کو یہاں ڈال دو۔"

اور انہوں نے اس کی پوری پوری تعمیل کی۔

ابھی ان سے ہتھیار رکھوائے ہی تھے کہ دوسری طرف سے ایک طوفان اٹھتا ہوا آیا اور اسی طرح ایک ہجوم ڈھول نقارے کی آواز کے ساتھ کھیتوں کو روندتا ہوا آیا وہ لوگ قریب آئے تو معلوم ہوا کہ یہ موضع پنہاری کے مجاہدین ہیں ان سے بھی پہلی سی گفتگو ہوئی اور ان کو بھی غیر مسلح کر کے پاس بٹھا لیا۔

اس دوران میں ہمارے شہر کے ہندوؤں نے بھی اس مجمع کو دیکھا تو شہر میں سناٹا چھا گیا مسلمان اتنے قلیل تھے جیسے آٹے میں نمک۔ پورے شہر میں دو صد گھر کے قریب۔ باقی تمام شہر ہندوؤں اور سکھوں سے بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ ہندو وسکھ نوجوان کہہ رہے تھے کہ جلد مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ اور ہندو آبادی کو اطلاع دے دو لیکن معمر اور سمجھدار سب کو تسلی دے رہے تھے کہ مولوی صاحب سے ہمیں پوری امید ہے کہ وہ تصادم نہیں ہونے دیگا تم بے فکر رہو۔

المختصر کتنے ہی گاؤں مسلح ہو کر اور ڈھول بجا کر آتے رہے اور جمع ہوتے رہے۔ جب مجھے تسلی ہو گئی کہ اب سب آ چکے ہیں۔ تو اس وقت ان سب سے نفس معاملہ بیان کر کے یہ عرض کر دیا گیا کہ آپ لوگ اپنے اپنے گاؤں سے ایک ایک مولوی اور دو دو نمبردار چھوڑ کر باقی سب لوگ واپس چلے جائیں۔ آپ کو نیت کا ثواب مل گیا۔ رہا قانونی فیصلہ تو وہ دونوں جانب کی پنچایتیں کر لیں گی۔

سامعین نے جواباً کہا کہ ہم تو آپ کے فرمان کے ماتحت واپس جانے کو تیار ہیں۔ مگر آپ خوب سوچ لیں کہ کہیں ایسا نہ ہو ہمارے واپس چلے جانے کے بعد معاملہ بگڑ جائے اور پھر یہ لوگ خدانخواستہ اس افواہ کو سچ کر دیں جسے سن کر ہم



لوگ آئے ہیں (یعنی آپ کو شہید کر دیں)

میں نے کہا کہ آپ مجھے اللہ کے حوالے کر دیں اور اطمینان سے واپس لوٹ جائیں۔ میں ان لوگوں کو خوب جانتا ہوں۔ یہ لوگ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔

اس پر تقریباً ستر اسی نمائندوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ واپس ہو گئے اور میں نے ان لوگوں کا درختوں کے نیچے ڈیرہ لگوا کر ان میں سے فقط علماء کو ہمراہ لے لیا کہ ان علماء کے مشورہ سے ہم قرآنی فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ مقام مجلس دواخانہ سلیمانی کی بالائی منزل قرار پائی۔

میں نے علماء کرام کے سامنے پوری صورتِ حال پیش کر کے عرض کیا کہ چونکہ ان نادان بچوں پر نہ تو کوئی تعزیر اسلام نافذ کرتا ہے اور نہ انگریزی قانون، اس لیے اگر آپ لوگ میری رائے میں کوئی وزن محسوس کریں تو ہم یہ معاملہ انہی لوگوں ہندوؤں اور سکھوں کی پنچایت کے سپرد کر دیں۔

سب علماء نے اس پر اتفاق کیا چنانچہ میں نے ہمیر سنگھ وغیرہ کو بلوا کر یہ کہہ دیا کہ ہماری پنچایت نے یہ معاملہ تمہارے ہی سپرد کر دیا گیا ہے ہر چند وہ اصرار کرتے رہے کہ آپ خود فیصلہ کریں۔ ہم بدل و جان اسے مانیں گے مگر ہم نے انہیں مجبور کر دیا اور وہ یہ اختیارات لے کر اپنی پنچایت میں چلے گئے۔ (غالباً ان کی پنچایت کا اجلاس چرنداسیوں کے ڈیرہ میں ہوا) وہ سب ایک فیصلہ پر پہنچ گئے۔

فیصلہ

مسلمان نمائندے سب خاموش تھے اور درختوں کے سایہ میں شہر سے باہر بیٹھے ہوئے اس انتظار میں تھے کہ دیکھیے ہندوؤں اور سکھوں کی پنچایت کیا فیصلہ کرتی ہے اتنے میں تقریباً سو قدم دور شہر کی جانب سے کچھ لوگ آتے ہوئے نظر آئے مگر وہاں آ کر رک گئے۔ اتنی دور سے باتیں تو سنی نہیں جا سکتی تھیں البتہ ان حرکات و سکنات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آنے میں متردد ہیں اتنے میں ایک آدمی آگے آیا اور بیان کیا کہ بعض لوگ یہاں آنے سے ڈر رہے ہیں۔ انہیں خطرہ ہے کہ کہیں یہاں آنے پر یکدم حملہ نہ ہو جائے میں نے جواباً تسلی دلائی اور کہا کہ میری ضمانت پر پوری تسلی اور بے فکری سے آ جائیں چنانچہ وہ سب آ گئے اور اس انداز سے آئے کہ سب نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے سب کے آگے ایک معمر سکھ سردار کرم سنگھ تھے (سردار سچا سنگھ ذیلدار حلقہ روڑی کے والدِ بزرگوار) انہوں نے کہا "ہم نے اس معاملہ میں اپنا فیصلہ ان بزرگوں کے سپرد کر دیا ہے انہوں نے جو فیصلہ دیا ہے وہ اب آپ کے سامنے پیش کر دیں گے"۔

میں نے کہا "سردار صاحب بچے اگرچہ پاپی ہیں۔ مگر بچے ہیں۔ اس لیے ہم ایسا ارادہ نہیں رکھتے اور اسی لیے یہ معاملہ آپ کے سپرد کیا ہے"۔

کہنے لگے: "اچھا تو میرا فیصلہ سن لیں۔ میں نے ان بچوں کے والدین پر پانچ صد روپے جرمانہ کیا ہے جو ان سے وصول بھی کر لیا ہے اور وہ یہ حاضر ہے ——— یہ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر رقم رکھ کر میرے آگے کر دی ———

میں نے کہا کہ آپ کے فیصلہ کا بہر حال ہم بھی احترام کرتے ہیں مگر ہم یہ پانچ صد تو کیا پانچ کروڑ بھی ہو تو قرآن کریم کے ایک حرف کے بدلے بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ قرآن پاک کا کوئی مول نہیں ہے۔ ہاں البتہ آپ کے فیصلہ کا احترام کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ اس روپے کو کسی ایسی جگہ خرچ کرو جو نہ صرف مسلمانوں کے کام آئے بلکہ اس سے تمام قومیں یکساں فائدہ اُٹھائیں اور میری دانست میں وہ پیاؤ و سبیل، جو روڑی اور اسٹیشن بڑا گڈھا کے درمیان واقع ہے اور جہاں میلوں تک پانی میسر نہیں ہوتا۔ وہاں اس روپے سے ایک کمرہ تعمیر کر دیا جائے تاکہ آنے جانے والے مسافر پانی پی کر آرام بھی کر سکیں۔

چونکہ اسٹیشن روڑی سے بارہ میل کے فاصلہ پر تھا اور سواری

کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ اس لیے مسافروں کو ایسے آرام دہ اور آرام بخش کمرہ کی ضرورت تھی۔ اس فیصلہ پر وہ سب لوگ بہت ہی خوش ہوئے اور پھر خود ہی کہنے لگے کہ "مسلمان بھائیو! اب سب مل کر دعا کرو کہ سچا بادشاہ خداوند کریم ہم پر راضی ہو جائے اور ہمارے قصور کو معاف کرے"۔

چنانچہ ہندو مسلم سکھ سب نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور شکریہ ادا کیا کہ خدا نے اپنی مہربانی سے ایک بہت بڑے ہونے والے فساد سے بچا لیا۔ یہ دعا مانگ کر سب نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

اب یہاں ایک بات بتانے کی رہ گئی کہ اس کا فیصلہ صادر کرنے کے لیے کرم سنگھ کو کیوں منتخب کیا گیا حالانکہ ان سے زیادہ سمجھدار اور ان سے زیادہ مؤثر شخص اور بھی موجود تھے شاید اس کو فیصلہ کرنے والے اور فیصلہ سنانے والے خود بھی نہ جانتے ہوں گے مگر الحمد للہ مجھے اس کا علم ہے۔

اس واقعہ سے سال دو سال پیشتر ایک بار سردار کرم سنگھ میرے پاس ایسی حالت میں آئے کہ ان کے سر پر قرآن مجید رکھا ہوا تھا اور وہ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے کہ "لو میاں صاحب۔ یہ غالباً قرآن مجید ہے۔ آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ میں اسے دور سے لایا ہوں"۔

انہوں نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی کہ "میں بھٹنڈہ سے چھوٹی لائن بی۔ بی۔ اینڈ سی آر کے ایک تھرڈ کلاس ڈبے میں سفر کر رہا تھا۔ اس میں چند مسافر موجود تھے۔ اور یہ کلام مجید ایک کھونٹی پر لٹکا ہوا تھا۔ بھٹنڈہ سے شیر گڑھ اور راماں منڈی اسٹیشن پر مسافر اترتے گئے حتیٰ کہ کالانوالی منڈی کے اسٹیشن پر اس ڈبے میں میرے سوا کوئی مسافر نہیں رہا۔ میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے آگے آنیوالا اسٹیشن سکھ چین المعروف لکڑی والی تھا۔ جہاں مجھے اُترنا تھا۔ گاڑی چلی اور پھر میرے اُترنے کا اسٹیشن بھی آ گیا ——— گاڑی رکی اور مجھے قرآن پاک نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مجھے یہ خیال شدت سے آیا کہ اس قرآن پاک کو اپنی تحویل میں لینے والا اب اس گاڑی میں کوئی نہیں۔ جس کی تحویل میں تھا، وہ بھول گیا۔ اس لیے اب مجھے چاہیے کہ میں اسے اپنے ہمراہ ادب سے لے جاؤں اور میاں صاحب کے سپرد کر دوں۔ چنانچہ میں نے نہایت احتیاط سے سر پر اُٹھا لیا۔ تیرہ چودہ میل کا سفر میں نے پیدل کیا ہے کہیں پیشاب وغیرہ کے لیے نہیں رکا کہ ناپاک ہاتھ قرآن پاک کو نہ لگ جائیں۔ اس لیے بس سیدھا آپ کے ہاں چلا آ رہا ہوں"۔

اللہ میاں کو غالباً یہی ادا پسند آئی جو اس سانحے کا فیصلہ بھی انہی سے کرایا۔ حقیقتاً غیر مسلموں میں ان سے زیادہ اہل اور کون ہو سکتا تھا۔ اس موقعہ پہ بیان کرنے کی ایک بات اور رہ گئی کہ اس مجمع میں مولوی شیر محمد صاحب سکنہ ناگوکا نے بھی ٹھیٹھ پنجابی زبان میں ایک مؤثر تقریر کی تھی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "آپ کے فیصلہ کے تحت پانچصد روپیہ جرمانہ وصول کرنا ہمیں صحیح معلوم نہیں ہوتا مگر اس خیال سے کہ شاید یہ جرمانہ اس گناہ کے میل کو صاف کرنے کے لیے صابن کا کام دے سکے۔ ہم اس کو قبول کرتے ہیں"۔

آپ کو یاد ہو گا کہ تھانیدار جو ہندو تھا۔ یہ شور اٹھنے پر تھانہ میں اپنی دیہات کی روانگی دکھا کر گھر میں جا چھپا تھا ہماری باہمی مفاہمت ہو جانے کے بعد ڈی ایس پی صاحب نے جو کہ ہری سنگھ نلوہ کے خاندان سے تھے تھانیدار پر سخت باز پرس شروع کی۔ اسے خطرہ ہو گیا کہ مجھے نقصان پہنچے گا تو پھر میری خوشامد شروع کی اور کہا کہ نلوہ صاحب آپ کے کردار سے بہت متاثر ہیں اگر میری سفارش کر دیں تو میرا بھلا ہو سکتا ہے۔ میں نے نلوہ صاحب کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور کہا کہ اس فساد کا ہاتھی تو نکل گیا ہے اب تھانیدار صاحب والی دم پھنسی ہوئی نہیں رہنی چاہیے۔ یہ میرے لیے قابلِ شرم ہے۔ اس پر انہوں نے اس کی گلو خلاصی کر دی۔

تاریکی سے روشنی تک

محمود بے مصری

محمود بے مصری نے فرمایا:

"میں کئی سال تک فرانس میں رہا اور اپنے ملنے والوں سے ایک فرنچ ڈاکٹر کی تعریف و توصیف سنتے سنتے اکتا گیا۔ کوئی کہتا تھا، ڈاکٹر فرشتہ ہے۔ کوئی کہتا ڈاکٹر سچائی کی مورت ہے، کوئی کہتا تھا ڈاکٹر کی انسانیت اپنا جواب نہیں رکھتی۔ شرافت، راست بازی اور روشن خیالی، عالی ظرفی، اخلاص مندی، کریم النفسی، مہمان نوازی غرضیکہ کوئی بھی انسانی وصف ایسا نہ تھا۔ جس سے میرے ملاقاتی اسے نسبت نہ دیتے ہوں۔ میں سمجھا کہ مہمانوں پر اس کی رحمت عام ہوگی۔ بلکہ تعجب یہ ہے کہ بیماروں سے بڑھ کر تندرست اس کی مداحی کے مرض کا شکار تھے۔

ڈاکٹر کا نام غربنیہ تھا۔ یہ فرانسیسی پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا اور یہ اس کی دلعزیزی کا دوسرا ثبوت ہے۔ اس لیے کہ آزاد ممالک میں پارلیمنٹ کی ممبری اور قوم کی ترجمانی ایک ایسا اعزاز ہے جو وہاں ممتاز اور منتخب اشخاص ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے متعلق لوگوں نے بیان کیا کہ ڈاکٹر کی نیک دلی اور صاف باطنی اس اعزاز سے اس قدر زیادہ بلند ہے، جس قدر زمین سے آسمان۔ وہ حمایتِ حق اور خدمتِ خلق کے خیال سے پارلیمنٹ میں داخل ہوا تھا، لیکن اُس نے وہاں دیکھا کہ تمام لوگ عدل و انصاف کی بے حرمتی کے درپے ہیں۔ حق و صدق ذبح کیا جا رہا ہے۔ غریب کا گوشت بک رہا ہے۔ مظلوموں کا خون ارزاں ہے۔ امن و آزادی کے نام سے غلامی اور فساد کے کھیت بوئے جا رہے ہیں۔ انسانیت پارلیمنٹ ہال میں حق و عدل کی موت پر ماتم کر رہی ہے لیکن کوئی نہیں جو اس کی فریاد و زاری پر رحم کھائے۔ نیک دل ڈاکٹر یہ بات دیکھ کر مبہوت ہوگیا۔ وہ پارلیمنٹ کو ترقی، عقل اور آزادیٔ فکر کی جنت سمجھ کر داخل ہوا تھا، لیکن یہ دیکھ کر کہ یہاں خوشگوار اور دلفریب تقریروں کے پردوں میں جنگ و جدل، نفرت و فساد اور حرص و ہوا کے دوزخ بھڑک رہے ہیں۔ وہ نہایت ہی بے صبری کے ساتھ اپنی کرسی سے اُٹھا، اس نے پارلیمنٹ کی عظمت کی پروا نہ کی۔ اس نے ان تمام چیزوں کو اور ساتھ ہی اپنے مال و عزت اور مستقبل کی شہرت و ترقی کو بے پروائی سے الگ پھینک دیا۔ وہ پارلیمنٹ سے کنارہ کش ہوگیا۔ صرف پارلیمنٹ سے نہیں بلکہ پیرس سے بھی کنارہ کش ہوگیا اور رونق و عزت کی کے اس جہنم سے کنارہ کش ہو کر فرانس کے ایک چھوٹے سے پُرسکون گاؤں میں اقامت اختیار کر لی اور خلقِ خدا کی خدمت میں مصروف ہوگیا۔"

محمود بے مصری نے فرمایا:

"جب مجھے اِن حالات کا علم ہوا اور ساتھ ہی یہ معلوم ہوا کہ فرانس کا یہ عظیم الشان انسان اسلام قبول کر چکا ہے تو میں نے آرزو کی کہ اس یگانۂ روزگار ڈاکٹر سے ضرور ملنا چاہیے۔ اور کم سے کم قبولِ اسلام کا سبب دریافت کرنا چاہیے۔

جونہی ملاقات نے میرے قدموں کو حرکت دی، میں پیرس سے نکلا اور اُس بستی کا رُخ کیا جہاں یہ ممتاز ترین انسان عزلت گزیں تھا۔ میں بستی میں داخل ہوا اور ڈاکٹر غربنیہ کے متعلق لوگوں سے دریافت کرنے لگا۔ میں جس شخص سے ڈاکٹر کے متعلق پوچھتا وہ ادب سے جھک جاتا اور نہایت ہی مسرت اور گرمجوشی سے میرے سوالات کا جواب دیتا۔ شہر کے تمام باشندے ڈاکٹر کے مداح تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ شہر کی تمام آبادی کو ڈاکٹر کی احسان مندیوں نے جھکا دیا ہے۔ شہر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس سے ڈاکٹر نے عزت، شرافت اور مروّت کا سلوک نہ کیا ہو۔ وہ بچّوں کے لیے سرِ بسر محبت و شفقت، فقیروں اور غریبوں کے لیے عزت و مسرت کا پیغام تھا۔ یتیم بچّوں اور بیوہ عورتوں کے لیے حفاظت کا سرمایہ تھا۔ اگرچہ شہر کی دیواروں پر اس کے نام کے اشتہار چسپاں تھے، لیکن میں نے دیکھا کہ ہر ہر پیشانی پر اس کی عزت کا سائن بورڈ آویزاں ہے اور خلقِ خدا کے قلوب اس کے خلوص و احسان کی گراں باریوں نے کمان کی طرح جھکا رکھے ہیں۔

میں بہت جلد ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ اس کی پیشانی پر محبت اور خوش اخلاقی کے معصوم ستارے کھیل رہے تھے۔ وہ مجھے بڑی گرمجوشی سے ملا۔ ایسی گرمجوشی سے جس سے اخوتِ اسلامیہ کا نام زندہ ہے۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا، تو میں نے پوچھا:

"ڈاکٹر صاحب! آپ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے اسباب کیا ہیں؟"

ڈاکٹر غربنیہ نے جواب دیا:

"قرآنِ پاک کی صرف ایک آیت"۔

"تو کیا آپ نے کسی مسلمان عالم سے قرآن پڑھا اور اس کی ایک آیت نے آپ پر اثر کیا؟" محمود بے نے پوچھا

"نہیں میں نے کسی مسلمان سے اب تک ملاقات نہیں کی۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"پھر قرآن کی کوئی تفسیر پڑھی؟" محمود بے نے پوچھا۔

"تفسیر بھی نہیں پڑھی" ڈاکٹر نے جواب دیا

"تو پھر یہ واقعہ کیونکر گزرا؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا:

"میری جوانی سمندری سفروں میں گزری ہے۔ سمندر کے نظاروں اور بحری سفروں کا شوق اس قدر دامن گیر تھا کہ گویا میں ایک آبی مخلوق ہوں۔ میں اپنے رات اور دن پانی اور آسمان کے درمیان بسر کرتا تھا، اور اس قدر مسرور تھا کہ گویا میری زندگی کا مقصد ہی یہی ہے۔ انہی ایام میں قرآن پاک کے فرانسیسی ترجمہ کا ایک نسخہ جو موسیو ساقاری کے قلم سے تھا، مجھے دستیاب ہوا۔ میں نے اُسے کھولا تو سورۂ نور کی ایک آیت میرے سامنے تھی۔ جس میں ایک سمندری نظارے کی کیفیت بیان کی گئی تھی۔ میں نے اس آیت کو نہایت ہی دلچسپی سے پڑھا۔ اس آیت میں کسی گمراہ شخص کی حالت کے متعلق ایک نہایت ہی عجیب تمثیل بیان کی گئی تھی۔ آیت میں لکھا تھا کہ گمراہ شخص حالتِ انکار میں اس طرح دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتا ہے جیسے ایک شخص اندھیری رات میں جبکہ بادل بھی چھائے ہوئے ہوں، سمندر کی لہروں کے نیچے ہاتھ پاؤں مارتا ہو۔"

ڈاکٹر غربنیہ نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا کہ اس

کا دل تمثیل کی عزت سے لبریز تھا، اور اُس کے اندازِ بیان سے ظاہر تھا کہ اس کے نزدیک اس تمثیل کی عمدگی اور دل نشینی، صداقتِ اسلام کی ایک بہت ہی کافی دلیل ہے۔ لیکن ڈاکٹر کے بیان سے میرا دل مطمئن نہ تھا۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب! "اس کے بعد کیا واقعہ پیش آیا؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا، آیت یہ تھی :۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا ؕ وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۠

ان کی مثال بڑے گہرے سمندر کے اندرونی اندھیروں کی سی ہے۔ اس طرح کہ سمندر کو لہرنے ڈھانپا ہے، لہر کے اوپر لہر ہے، اس کے اوپر بادل ہے یعنی اندھیرے پر اندھیرا۔ اس حال میں ایک شخص تہہِ دریا میں اپنا ہاتھ باہر نکالے تو توقع نہیں کہ اس کو دیکھ سکے۔ جس کو خدا نور نہ دے اس کے لیے کوئی روشنی نہیں"

جب میں نے آیت پڑھی تو میرا دل تمثیل کی عمدگی اور اندازِ بیان کی واقعیت سے بہت متاثر ہوا اور میں نے خیال کیا کہ حضرت محمدؐ ضرور ایسے شخص ہوں گے جن کے رات دن میری طرح سمندر میں گزرے ہوں گے لیکن اس خیال کے باوجود بھی مجھے حیرت تھی اور رسول اللہؐ کے اس کمال کا اعتراف تھا کہ انھوں نے گمراہوں کی آوارگی اور اُن کی جدوجہد کی بے حاصلی کو کیسے مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے، گویا کہ وہ خود رات کی سیاہی، بادلوں کی تاریکی اور موجوں کے طوفان میں ایک جہاز پر کھڑے ہیں اور ایک ڈوبتے ہُوئے شخص کی بے حواسی کو دیکھ رہے ہیں —— میں سمجھتا ہوں کہ سمندری خطرات کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر بھی اس قدر گنتی کے لفظوں میں ایسی جامعیت سے خطراتِ بحر کی صحیح کیفیت بیان نہیں کر سکتا"

"لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد مجھے معلوم ہُوا کہ محمدؐ عربی محض اُمّی تھے اور انھوں نے زندگی بھر کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا۔ اس انکشاف کے بعد میرا دل روشن ہو گیا۔ میں نے سمجھا کہ یہ محمدؐ کی آواز نہیں، بلکہ اس خدا کی آواز ہے، جو رات کی تاریکی میں، ہر ڈوبنے والے کی بے حاصلی کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ میں نے قرآن کو اپنے ہاتھ میں پکڑا اور اُس کی آیتوں پر بڑی احتیاط سے غور کرنے لگا۔ اور چند دنوں میں مسلمان ہو گیا۔

ماخوذ از اسلام زندہ باد۔ ترجمہ عبدالمجید قریشی مرحوم)



دارارقم (تعمیرِ نو کے بعد)
قرآن کی تحریکِ اسلامی کا اولین مرکز

کدھر جارہے ہو

نعیم صدیقی

وہ کس قدر عجیب و غریب ہستی نکلا۔ کتنا عظیم! کتنا جلیل! کتنا مشفق! کتنا بڑا محسن: —— کل وہ ایک اجنبی تھا، اور آج وہ ایک مستقل ساتھی اور سہارا بن گیا ہے۔

وہ عجیب بے ہنگم حالات میں یکایک ڈرامائی انداز سے نمودار ہوا۔

میں بڑی تیزی سے چلا جا رہا تھا، مجھ پر دورے کی سی کیفیت تھی۔ زندگی جس پر میں نے بہت کچھ نثار کیا تھا اس کے خلاف دل میں نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا۔ میں پورے سماج سے، پوری دنیا سے اور کائنات سے انتقام لینے کے خوفناک آتشیں جذبے میں مبتلا تھا اور چونکہ یہ اندھا جذبہ ایک احساسِ بے بسی میں بدل گیا تھا لہٰذا دنیا بھر کا بھرپور انتقام میں اپنے آپ سے لینے چلا تھا۔

میرے آس پاس سے کاریں ٹیکسیاں اور بسیں دوڑی چلی جا رہی تھیں ایک مزدور لکڑی کے تختے پر گتے کے ڈبوں کا پہاڑ اٹھائے ہانپتا ہوا پاس سے نکل گیا، بس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی ایک برقعہ پوش لڑکی پر نوجوانوں کی ایک ٹولی آوازے کس رہی تھی اور فلمی شعر پڑھے جا رہے تھے، آئس کریم والا اپنی ہانک لگا رہا تھا —— ذرا آگے درختوں کا ایک خوبصورت جھنڈ دکھائی دے رہا تھا —— معلوم نہیں از خود رفتگی کے باوجود یہ مناظر مجھے یاد کیسے رہ گئے! —— اور میرا متحرک دماغ کہہ رہا تھا کہ یہ سب لوگ کتنے بے وقوف ہیں! دوڑ رہے ہیں، ہانپ رہے ہیں، سوچ رہے ہیں، ہنستے ہیں، پریشان ہوتے ہیں، لڑتے ہیں، فتح پاتے ہیں —— اور زندگی نے ان سب کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اور انہیں وہ قدیم فراعنہ کی طرح استعمال کر رہی ہے —— استعمال بھی کرتی ہے اور پھر روما کے فرمانرواؤں کی طرح بالآخر ان کو دنگل میں لے جا کر بھوکے درندوں سے لڑاتی بھڑاتی ہے جو اس کشاکش میں ایک بار بچ نکلتے ہیں وہ پھر اگلے مرحلے میں اور زیادہ سخت صورت حالات سے دوچار کیے جاتے ہیں یہاں تک کہ ختم ہو جائیں گویا جو جیت جاتے ہیں وہ بھی دراصل ایک بڑی اور خوفناک ہار کے لیے عمِ انتظار کھینچتے ہیں پہلی ہی بار جن کا بیڑا پار ہو جاتا ہے وہ شاید زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ میرا دماغ سوچتا چلا جا رہا تھا۔ محرومیاں، ناکامیاں، غم، مایوسیاں یہ سب بھوکے شیر اور چیتے ہیں۔ جن کے گول دائرے کے درمیان ہر فردِ انسانی کو میدانِ کشاکش میں اتار دیا گیا ہے کہ لو میاں اب تمہیں جیسے پسند ہے یا جیسی ہمت ہو اس طرح مرو، لڑ کر مرو یا بغیر لڑے مرو، کئی معرکوں میں مسلسل جاں لڑا لڑا کر اپنے مقررہ انجام کو پہنچو، یا وقت اور قوتوں کو ضائع کیے بغیر پہلی ہی بار جرأت سے اُسے قبول کر لو اور یہ بے وقوف لوگ اپنے خوفناک اور بے معنی انجام کے تلخ لمحاتِ انتظار کو طول دینے کے لیے ساری تگ و دو کر رہے ہیں —— مزدور اپنی مشقت کے ذریعے، اور سرمایہ دار اپنے سکوں کے زور سے، اور

میں دل ہی دل میں ان سب سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا کہ اے بے وقوفو! میں تمہاری طرح زندگی کے اس جال میں رہنے پر تیار نہیں ہوں جس کو دل کش اور گوارا بنانے کے لیے اس نے دولت اور محبت کی سنہری اور حریری ڈوریاں بھی اس میں استعمال کی ہیں ـــــ اور کچھ خوشنما مناظر اور پیاری پیاری کیفیات کے پھول بھی اس میں چُن دیے ہیں۔ یہ دانشور پاگلوں کی دنیا ہے میں اس پاگل خانے کو ٹھکراتا ہوں۔ اپنے اسی ذہنی گرداب میں غوطے کھاتا ہوا میں جب درختوں کے گھنے سبز جھنڈ کے پاس پہنچا: تو بڑی مشفقانہ سی آواز آئی "کدھر جا رہے ہو!"

آواز ایسی تھی جیسے کوئی میرا جاننے والا' بلکہ کوئی شفیق و بے تکلف دوست کسی جھجک کے بغیر سوال کر رہا ہو۔

مگر ـــــ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں! میں کسی دوست کی دوستی کو نہیں مانتا' مجھے کسی شفیق کی شفقت نہیں چاہیے' ایسا جذبہ اگر بطور مفروضہ میرے لیے کسی میں ہو بھی تو فطرت کے فراہم کردہ ان نظر فریب عیارانہ پھندوں کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ دل ہی دل میں آناً فاناً یہ سب کچھ میں نے سوچ ڈالا اور ساتھ ہی بغیر آواز کی سمت میں دیکھے جو اس سبز جھنڈ میں سے آ رہی تھی جواب دیا:

"نہیں اس سے کیا مطلب! تم ہو کون یہ پوچھنے والے؟"

"مجھے نوجوانوں سے محبت ہے' میں تمہاری عجیب سی چال اور چہرے کا اندازہ دیکھ کر چونکہ حیرت زدہ ہوا اس لیے مجبوراً میری حیرت استفسار میں بدل گئی۔ آخر کوئی ایک بات پوچھ ہی بیٹھے تو بتا دینے میں حرج کیا ہے؟"

دھیمے اور لجاجت آمیز لہجے میں آواز آ رہی تھی جو دل میں اُتر سی گئی۔ میں چونکہ رک گیا' اور ابھی جواب نہیں دے پایا تھا' اس لیے کہنے والا کہتا گیا۔

"جوانِ عزیز! یہ تم نے کیا کہا کہ تمہیں کیا مطلب؟ جیسے تم مجھ سے اور میں تم سے الگ تھلگ ہیں حالاں کہ کوئی کسی سے الگ تھلگ نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ تم پیروں تلے پامال ہونے والے مٹی کے ایک حقیر ذرے سے اور ہوا میں اُڑتے ہوئے زرد پتے سے بھی الگ تھلگ نہیں ہو۔ جو خیالات' جو عقیدے' جو نظام انسان کو اجزائے کائنات سے یا انسان کو انسان سے الگ تھلگ کرتے ہیں یا ان میں فاصلہ بڑھاتے ہیں وہ فطرت کے تقاضوں کے خلاف جاتے ہیں اور انہیں جھوٹ اور باطل سمجھنا چاہیے' ہاں تو یہ بتانے میں تمہیں رکاوٹ کیا ہے کہ اس وقت تم کدھر جا رہے ہو۔ شاید میں کوئی مدد کر سکوں۔"

کچھ گداز کی کیفیت میں میں نے کہا:

"صاحب! اگر آپ میرے معاملے میں آڑے نہ آئیں تو میں..... میں جا رہا ہوں....."

"ہاں ہاں! میں زبردستی آڑے نہیں آنے کا ـــــ انسان کے لیے سب سے ناپسندیدہ شے دوسروں کی زبردستی مداخلت ہے۔ میں یہ مداخلتِ بے جا نہیں کروں گا ـــــ تم کہو' ضرور کہو!" یہ تھا جواب۔

آخر پوری ردِ عملی جرأت کے ساتھ میں نے دو لفظ اس طرح کہے جیسے کوئی کسی کو پتھر کھینچ مارے' کہ لو اگر تم باز نہیں آتے تو یہ ہے:

"خودکشی کرنے"!

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' جو خودکشی کرنا چاہے وہ بہرحال خودکشی کر کے رہتا ہے۔ ابھی کل ہی ایک نوجوان نے گاڑی کے نیچے گر کر یہی کارنامہ انجام دیا تھا۔ تم نے اخبار

میں خبر پڑھی ہو گی' تمہارا جذبہ مزید بھڑک گیا ہو گا۔" اجنبی نے کہا۔

"نہیں جناب"! میں نے تنک کر جواب دیا: "میں نے نہ اخبار پڑھا ہے نہ اُس سے کوئی تحریک لی ہے' میں نے اپنا فیصلہ اپنی آزاد مرضی سے کیا ہے۔"

"آزاد مرضی"؟ وہ سوالیہ ابھار اور فلسفیانہ لہجے میں کہہ رہا تھا! "آزاد مرضی تو اس زندگی میں بڑی کمیاب جنس ہے' اور برسوں کے مطالعۂ احوال اور معرفتِ نفس کے بعد اُس کا قلیل سا وہ جزو حاصل ہوتا ہے جو انسان کے لیے مقدر ہے۔" اور اجنبی مخاطب کا سلسلہ کلام جاری تھا: "سنو! کل والے نوجوان کی خودکشی کا ایک پہلو بے حد عجیب و غریب ہے۔ وہ ایف اے پاس تھا۔ اسے ڈیڑھ سو روپے کی نوکری کر رہا تھا۔ مگر اس کا معیارِ زندگی تین چار سو روپے ماہانہ کا تھا۔ وہ بیوی سمیت ہوٹلوں میں جاتا' سینما دیکھتا' بیوی کو فیشن کے معیار پر رکھنے کیلئے لباس اور سامانِ آرائش خریدتا۔ اس طرح وہ رشوت کے چکر میں پھنس گیا۔ مقدمہ چل رہا تھا ضمانت پر رہا تھا اور ملازمت سے معطل' آمدنی بند' ذلت کا سامنا' قید کا خوف سامنے' انہی حالات میں بیوی زچگی کی پیچیدہ حالت میں ہسپتال میں داخل ہوئی۔ بچہ مردہ تولد ہوا اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے' اس کے لیے خون کی دس بارہ بوتلیں خریدنے کی ضرورت پیش آئی۔ بیچارے کو کوئی راستہ نہ ملا اور آج اس کے مقدمے کی آخری پیشی بھی تھی۔"

میں نے قطع کلام کر کے کہا: "ان حالات میں اُس نے بہت اچھا کیا' میں اس جوان کو غائبانہ طور پر خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔"

"میری بات کا اگلا حصہ بھی تو سن لو ناں" بغیر کسی جذباتی ہچکولے کے اُس نے کہا: "ہوا یہ کہ رات جس لمحے وہ نوجوان مایوسی کی آخری انتہا پر پہنچ کر بیوی کو زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار چھوڑ کر خودکشی کے ارادہ سے کسی طرف نکل کھڑا ہوا تو عین اُسی وقت دو نوجوان اپنے کسی مریض کو کاز لٹی وارڈ میں داخل کرانے کے لیے لائے۔ انہیں کسی نرس سے جب نوجوان بیوی کا حالِ زار معلوم ہوا تو انہوں نے خون کی پیش کش کی جسنِ اتفاق یعنی خدا کی مرضی سے ان کا خون مریضہ کے خون کے مطابق نکلا۔ رات یہ خون دیتے ہی مریضہ کی حالت سنبھل گئی۔ اگرچہ ابھی مزید خون کی ضرورت ہے اور ابھی خطرہ بالکل نہیں ٹلا۔ اِدھر دوسرا عجوبہ یہ ہوا کہ آج جب کہ وہ نوجوان خودکشی کر چکا ہے اُس کے خلاف مقدمہ بعض قانونی کمزوریوں کی بنا پر خارج ہو گیا ہے اور اس کی بریت کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس کی رُکی ہوئی تنخواہ بھی برآمد ہو سکے گی۔ مگر...... مگر......"

"عجیب! عجیب!!" یہ کہتے ہوئے میری ذہنی فضا اپنا رنگ قدرے بدل چکی تھی۔

"جوانِ عزیز! انسان کا حال یہ ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کی جوتی کے تسمے سے آگے کیا ہے؟ وہ جب مایوسی کی تاریکی میں رو رہا ہوتا ہے تو بسا اوقات کوئی بڑی کامیابی اس کی طرف لپکی چلی آ رہی ہوتی ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ وہ جب جامِ عشرت ہاتھوں میں لیے نشۂ مسرت سے اندھا ہو رہا ہوتا تو کوئی انجانی مصیبت ایک شکاری درندے کی طرح دبے پاؤں پیچھے سے آ کر لیکا یک جھپٹنے والی ہوتی ہے۔ یہ مخلوق جس کی عقل تارے توڑتی پھرتی ہے' اتنا نہیں جان سکتی ہے کہ ذرا سے لمحۂ حال کی اوٹ میں کیا چھپا ہوا ہے ـــــ کوئی خزانہ یا سانپوں کی کوئی پٹاری! اور پھر یہ طفلکِ ناداں اندھا دھند بڑے بڑے اقدامات کے فیصلے کرتا ہے۔ خودکشی! اُف خودکشی!

"میرے محترم ناصح مشفق!" میں نے ذرا جھک کر کہا "میرا معاملہ بالکل دوسرا ہے میرے ساتھ جو بھرپور سانحہ پیش آیا ہے اس کی تلافی اب کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ لہذا میں زندگی کو ختم کرنے سے بہتر کوئی راستہ پا ہی نہیں سکتا۔ اب میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ....."

"تم کچھ نہ بتاؤ" آواز آئی "مگر ایک بات میں ضرور کہوں گا' تمہارے پاس زندگی تھی ہی کب کہ تم اُسے ختم کرنے جا رہے ہو۔ تم نے اپنے آپ کو زندگی نام کی شے سے ہمیشہ محروم رکھا ہے وہ تمہارے آس پاس پھیلی ہوئی موجود رہی۔ اس کی آیات روشن ہر طرف بکھری پڑی تھیں' وہ دوسروں کی طرح تمہیں ہر ہر آن بلاتی رہی ——— کبھی ہنس کر' کبھی رو کر' کبھی کسی روپ میں' کبھی کسی بھیس میں۔ مگر تم نے اُسے قبول نہیں کیا۔ تم صرف سانس لیتا ہوا ایک متحرک مجسمہ تھے۔ کیونکہ خودکشی وہی لوگ کرتے ہیں جو دراصل اپنی تمام عمر خودکشی ہی کرتے رہتے ہیں۔"

"نہیں مجھے زندگی نہیں چاہیے"۔ میں نے ذرا تندی سے کہا "میں نے اس منحوس فتنے کو ہر رنگ میں دیکھا' اسے سونگھا' چکھا' چھوا' اور جب بھی ایسا تجربہ ہوا' میں نے اسے اس قابل نہیں پایا کہ اسے ساتھ لوں یا اس کے ساتھ رہوں۔ میں اس فریب زندگی کو بخوبی جانتا ہوں۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں' کیوں نہیں' تم ضرور سب کچھ جانتے ہو گے" اجنبی نے کہا "تم پڑھے لکھے سمجھ دار نوجوان معلوم ہوتے ہو۔ پسند کرو تو بس اتنا اور بتا دو' تمہارا احسان ہو گا' کہ تمہیں کس تجربے نے آج اس ارادے کو جامۂ عمل پہنانے پر آمادہ کیا؟"

"اس تلخ تجربے کو دوہرانے سے فائدہ تو نہ میرا ہے نہ آپ کا" میں نے نیم دلی سے بات کی۔ "سوائے اس کے کہ میرے اذیت ناک زخم تازہ ہو جائیں۔ تاہم جو شخص موت کو زبردستی بلا کر اس کا سامنا کر سکتا ہے وہ اپنے آخری لمحوں میں اپنے زخموں کی چند مزید ٹیسیں بھی برداشت کر سکتا ہے۔ میری سرگذشت یہ ہے کہ جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تو میری عمر آٹھ دس سال تھی۔ میری والدہ بچپن میں فوت ہو چکی تھی۔ میرے والد اور میری ایک ہم عمر چچا زاد بہن اور میں ایک قافلے کے ساتھ آ رہے تھے کہ امرتسر سے آگے نئی سرحد سے کچھ دور حملہ ہو گیا۔ بھگدڑ مچی' میرے والد ایک سکھ کی برچھی کا نشانہ بن گئے۔ میں ایک لڑکے کے ساتھ سرکنڈوں میں جا چھپا۔ جب حملہ آور اپنا کارنامہ انجام دے کر واپس چلے گئے اور سناٹا چھا گیا تو قافلے کے چند بچے کھچے لوگ اِدھر اُدھر سے نمودار ہوئے میں بھی سرکنڈوں سے نکلا اور لاشوں کے انبار کی طرف رُخ کیا۔ ایک جگہ مجھے والد کی خون میں لتھڑی لاش مل گئی۔ میرے والد نہایت ہی خدا پرست اور مذہب کے دلدادہ آدمی تھے۔ وہ سب کچھ چھوڑ کے آ گئے' بس قرآن شریف کا وہ حمائلی نسخہ بغل میں لٹکا لائے جو ہمارے گھر کی روح و رواں تھا۔ ابا سے سُنا تھا کہ یہ نسخہ دادا جان مرحوم نے خریدا تھا اور اسی کو میری امی پڑھا کرتی تھیں اور اس سے ابا تلاوت کرتے تھے۔ اب اس نسخے کے غلاف پر ابا کے خون کے نقش و نگار کا بھی اضافہ ہو گیا۔ میں نے اس خاندانی امانت کو اٹھا کر اپنے گلے میں آویزاں کر لیا پھر اپنی چچا زاد بہن زینب کی تلاش کرنے لگا۔ وہ بھی پاس ہی نعشوں کے ایک ڈھیر میں دبی پڑی تھی۔ لاشیں ہٹانے پر دیکھا تو اس کے کندھے پر لگے ہوئے برچھی کے زخم سے خون رس رہا تھا' اور میرے ہمت شکن غم و اندوہ میں یہ جان کر کمی ہو گئی کہ ابھی

اس کا تنفس جاری تھا۔ ایسے میں کسی سے لے کر پانی پلوایا۔ دوسروں کی مدد سے چھاؤں میں لے گیا اور اس کا سر اپنے ہاتھوں پر رکھ کر بیٹھ گیا اور قرآن کی جو سورتیں مجھے یاد تھیں پڑھنے لگا۔ زینب نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ پھر میں نے قافلے کے دو ایک ساتھیوں کی مدد سے اپنی بنیان اور رومال پھاڑ کر پٹی وغیرہ باندھی کہ خون بند ہو۔ زخم چونکہ اوچھا لگا تھا' اس لیے زینب نہ صرف بچ نکلی بلکہ جلد ہی سنبھل گئی اور میں بچے کھچے قافلے کے ساتھ اسے لیکر آہستہ آہستہ منزل کی طرف چل پڑا۔ اتفاق سے ایک بیل گاڑی ابھی تک ساتھ تھی۔ بیل گاڑی والے دیہاتی بڈھے نے زینب کو سوار کر لیا۔ میں جب اُسے لیکر پاکستان میں پہنچا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میں ایک خزانہ بچا لایا ہوں' جیسے میں ظلم اور بدی کی طاقتوں سے بہت بڑی متاع چھین لایا ہوں۔ زینب میرے لیے والد سمیت تمام منتبد رشتہ داروں کا مجموعہ تھی۔ سارے خاندان کا حاصل۔ پھر کچھ عرصہ کیمپ میں اکٹھے رہنے کے بعد ایسا ہوا کہ زینب کے دور پار کے ایک ماموں تلاش کرتے کرتے پہنچے' اور اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔ میرے لیے بھی یہ صورت تسلی کا باعث ہوئی۔

پھر میں نے کس طرح محنت مزدوری کے تجربے کیئے' چھوٹی چھوٹی نوکریاں کیں' کس طرح تعلیم حاصل کی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس ساری کہانی میں تیز بہاؤ اس وقت سے پیدا ہوا جب زینب پیچھے سے اس کی ہیروین بن گئی۔ وہ میرا نصب العین قرار پا گئی' اور اسی نصب العین کے لیے میں نے تعلیم حاصل کرنے اور ترقی پانے کے لیے سخت محنت کی۔ پھر میں نے اُسی کی خاطر جعلی کلیم بنانے والے ایک گروہ سے مل کر ایک کوٹھی الاٹ کرا لی اور دل ہی دل میں یہ خواب ترتیب دیا کہ جیسے اس کوٹھی کی روح و رواں زینب اس میں موجود ہے۔ زینب ہی کی خاطر میں نے اسی سال ایم اے کا امتحان دیا اور فسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کر لی۔ مجھے بہت جلد ایک کالج میں پروفیسری مل گئی لیکن...... ناقابلِ فہم حادثہ ہے کہ زینب جو فی الواقع اپنے پردۂ حیا میں بڑی پاکیزگی سے مجھ سے محبت کرتی چلی آ رہی تھی اُس کے رویے میں کھچاؤ پیدا ہونے لگا اور اس کھچاؤ کا آغاز اس دن ہوا جس دن میں نے اُسے ایک ملاقات میں کوٹھی الاٹ کرا لینے کی کامیابی کا حال سنایا۔ ہنسی خوشی باتیں کرتے کرتے وہ اداس سی ہو گئی۔ تفصیلات کو چھوڑ کر میں اب ڈراپ سین کا واقعہ لیتا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ تنہائی اور مسرت کی تلاش اور قسم قسم کے دوستوں کے حلقوں سے ربط کے نتیجے میں شراب میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ کسی نہ کسی طرح زینب تک اس کی اطلاع پہنچ گئی۔ یہ اطلاع پا کر اُس نے مجھے آخری خط لکھا کہ تمہاری ناپاک کوٹھی اور تمہاری شراب نے میری اس پاکیزہ محبت کا آج قطعی خاتمہ کر دیا ہے جو اب تک سرمایۂ حیات تھی اور جس کا خلاء پُر کرنے کے لیے اب میرے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اب ہمارے درمیان ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو گئی ہے اب نہ میں تم سے ملوں گی۔ نہ تم میری طرف کبھی آؤ۔ ظالم نے تمام دروازے بند کرنے کے لیے یہ بھی لکھ ڈالا ہے کہ مجھ پر کرم ہو گا کہ مجھے خط بھی نہ لکھو' لکھو گے تو میں پڑھے بغیر اسے چولہے میں ڈال دوں گی۔ یوں سمجھو کہ میں تمہارے لیے مر چکی' اور تم میری نگاہ میں ختم ہو چکے۔ اس حادثہ کو سن کر میرے محترم

بزرگ! آپ ہی فرمائیے کہ جس زینب کی زندگی بچانے سے لیکر جس پر جان چھڑکنے اور جس کے لیے زندگی کی کٹھن منزلیں طے کرنے کی لمبی سعی میں نے کی ہے اسی زینب کا یہ جواب پاکر بھی کیا زندہ رہنا چاہیئے؟ کیا اب زندگی کے کوئی معنی ہیں؟"

"یہ تو تھا زینب کا معاملہ" اجنبی کہنے لگا: "مگر تم نے بیچ میں اس خاندانی امانت کا قصہ بالکل گول کر دیا جسے تم والد کی لاش سے الگ کر کے بغل میں لٹکا کر لاتے تھے۔ وہ کہاں ہے؟ اور اس کے ساتھ تمھارے تعلقات کیسے رہے؟"

"مجھے نہیں معلوم"! میں نے اس احساس کے تحت غصے میں پھر کہا کہ میرے مخاطب نے گویا میری ساری داستانِ درد کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

"دیکھو نا میرے عزیز" بڑے مشفقانہ لہجے میں آواز آئی، "تم دو چیزیں ساتھ لائے تھے: ایک زینب اور دوسری وہ خاندانی امانت" زینب کا معاملہ تو میں نے سن لیا اور بڑا دردناک ہے، مگر تم نے اپنے دوسرے ساتھی کا معاملہ مجھ سے چھپایا ہے۔ تم زینب سے بے وفائی کے گلہ مند ہو، لیکن تم نے خاندانی امانت کے ساتھ کس درجہ وفا کی؟"

سوال سن کر میں چکرا گیا مگر اجنبی کے لہجے نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور میں نے اسے بتایا کہ "وہ امانت میرے پاس جوں کی توں محفوظ ہے۔ میری کتابوں کی الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں پڑی ہے۔"

"تو کبھی اسے کھول کے پڑھا بھی تھا" یہ سوال سن کر ہلکے سے احساسِ ندامت کے ساتھ، مگر اپنی آواز پر مصنوعی زور دیکر میں نے صاف صاف جواب دیا "نہیں! کورس کی کتابیں، ناول، افسانے، رسالے، سبھی کچھ تم نے پڑھا ہو گا" وہ صاحب بات کو آگے بڑھاتے چلے جا رہے تھے "مگر ایک اسی کتاب کے لیے کبھی وقت نہ نکل سکا جو تمہارے دادا، تمہاری امی اور تمہارے والد کی یادگار امانت بھی تھی اور تمہارے خدا کا لکھا ہوا ایک نامۂ حیات بھی جس کے مخاطب تم تھے؟"

"جی نہیں"! میں نے زور دیکر کہا "میں نہیں مانتا کہ کوئی خدا وُدا ہے۔ خدا ہوتا تو زینب کی محبت کا مجھے یہ جواب نہ ملتا ہو سکتا ہے کہ خدا ہو مگر اُس نے جو دنیا بنائی ہے وہ ایسی بے ڈھنگی بنائی ہے کہ اس دنیا کا مزہ چکھنے کے بعد مجھے اُس کے خدا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی مجھے اب کوئی خدا نہیں چاہیئے —— نہیں چاہیئے!"

"بھئی اس میں جھنجھلاہٹ کی کوئی وجہ نہیں"! اجنبی کی آواز آ رہی تھی۔ "ہم تو محض محبت سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے تمہاری اس بات سے اُلجھن ہو رہی ہے کہ تم خدا کی کسوٹی زینب کو بنا رہے ہو لیکن دوسری طرف اگر زینب نے اپنے طرزِ عمل کے لیے خدا کی مرضی کو کسوٹی بنایا ہو تو؟ تمہیں جس درجہ زینب چاہیئے، اس درجہ میں خدا نہیں چاہیئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ تم خدا کو نہ ماننے کا بھی دعویٰ کرتے ہو، اور پھر تمہاری بات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ خدا ہے بھی، صرف تم اس سے ناراض ہو گئے ہو، لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ بھی تم سے ناراض ہو سکتا ہے —— اور کیا معلوم یہ اسی کی ناراضگی ہو جو تمہیں ایک برائی سے دوسری برائی کی طرف دھکیلتی جا رہی ہو۔ مجھے تمہارے اس ذہنی بحران کی حالت میں تم سے خدا کے وجود کو زبردستی منوانا مطلوب نہیں، مگر ایک بات ضرور تمہارے سوچنے کی ہے، یہ جو بڑے بڑے تنے کے درخت تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ کسی ہیجان میں آکر تم کہہ سکتے ہو کہ یہ درخت

موجود نہیں ہیں مگر تمہارے کہنے سے ان کا وجود حقیقتاً ختم تو نہ ہو جائے گا۔ یہ تو موجود رہیں گے اور اگر ان کا ادراک کیے بغیر تم سیدھے ان کی طرف دوڑتے ہوئے آؤ گے تو تمہارا سر ان سے ٹکرا جائے گا اور زخم آ جائیگا خدا تمہارے اندر موجود ہے تمہارے ساتھ ساتھ موجود رہا ہے تمہارے چاروں طرف وہ جلوہ گر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ نہ تم نے اسے جاننے کی کوشش کی، نہ اس سے بات چیت کرنے پر تم مائل ہوئے، نہ ملاقات کرنے کا تمہیں شوق ہوا؟"

"عجیب باتیں کر رہے ہیں آپ"! میں نے حیرت سے کہا "خدا سے باتیں اور خدا سے ملاقات کیا معنی؟"

"زینب سے باتیں اور ملاقات ہو سکتی ہے تو خدا سے کیوں نہیں؟" یہ تھا میرے محسنِ مشفق کا جواب! "خدا سے ملاقات —— خدا سے ملاقات! یہ کیا قصہ ہے؟" میں جیسے اپنے آپ سے کر رہا تھا۔

"ہاں، خالی ملاقات کیا معنی" اجنبی بولا "اصل معاملہ تو محبت سے شروع ہوتا ہے۔ تم میں زینب کے لیے تو محبت اُبھر آئی، مگر زینب سے زیادہ حسین اور زیادہ عزیز اور زیادہ مہربان ہستی کے لیے نہ اُبھری اور زینب سے بھی تو فی الحقیقت تمہیں محبت نہ تھی۔ تمہارے اندر سرے سے کسی کے لیے شمعِ محبت جلی ہی نہیں۔"

"یہ میں نہیں سن سکتا"، میں چیخ اٹھا "زینب کے معاملے میں میری محبت کا انکار میری توہین ہے۔"

"عزیزِ من! میں تمہارے جذبات کے مجروح ہونے پر معافی چاہتا ہوں"۔ بڑی گھلاوٹ کے انداز سے وہ نامعلوم بزرگ فرمانے لگے "لیکن حقائق کا تجربہ کرتے ہوئے سچی باتوں کا سامنا حوصلے سے کرنا چاہیئے۔ سچی باتوں کا سامنا نہ کر سکنا ہی زیادہ تر لوگوں کی خودکشی کا باعث ہوتا ہے، چاہے وہ خودکشی زندگی کے پیرائے میں کیوں نہ ہو اور آدمی کا یہ شیڑھ بڑا الانجیل ہے کہ وہ اپنے متعلق سچی بات نہ جاننا چاہتا ہے نہ سننا چاہتا ہے۔ وہ ریشم کے کیڑے کی طرح جھوٹ اور فریب کے تاروں سے ایک نرم و نازک خول تیار کر کے اپنی نرم و نازک خواش پذیر ہستی کو اس میں لپیٹ رکھتا ہے کوئی اس خول کو اگر اُس سے الگ کرنا چاہے تو اس میں اسے موت دکھائی دیتی ہے۔"

"اچھا آپ کہتے، میں آپ کی بات اس طرح صبر سے سنوں گا جیسے کوئی شخص بغیر منہ بنائے زہر کا پیالہ پی جائے۔" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"پیارے نوجوان! دراصل زینب کے جھوٹے پردے میں تم صرف اپنے آپ سے محبت کر رہے تھے۔ باقی ساری دنیا، بندے بھی اور خدا بھی سب کچھ تمہاری نگاہ میں ہیچ تھا۔ تمہیں صرف اپنی ذات کی خوشی اور اپنی ذات کا آرام مطلوب تھا۔ تم زینب کو بھی انہی معنوں میں چاہتے تھے جن معنوں میں تم میں کو بھی حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہوئی اور جن معنوں میں تم نے جام شراب کو اٹھا کے ہونٹوں سے لگا لیا تمہارا مرکز صرف تمہارا نفس تھا جس کے گرد تم منتیں اٹھا اٹھا کر طواف کرتے رہے اس کا نام رمز شناسوں نے ہوس رکھا ہے اور ہوس کبھی مسرت و اطمینان کا ذریعہ نہیں ہوتی۔ محبت کا تو واحد مظہر قربانی و ایثار ہے۔ اب تم خود ہی سوچ لو کہ تم نے زینب کے لیے کیا قربانی دی؟ مثلاً کیا تم نے کوشش کی کہ اس کے دل و دماغ کی کیفیتوں اور رجحانات کو معلوم کرتے اور ان کا احترام کرتے؛ اس کی پسند و ناپسند کا اندازہ کر کے اگر اُسے سچائی اور نیکی کی راہ

پر پاتے تو اپنے آپ کو تبدیل کر لیتے۔ بخلاف اس کے تم نے یہ چاہا کہ زینب تمہاری زندگی کے سانچے کو جوں کا توں قبول کرے، اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے۔ اگرچہ وہ غلط اور مکروہ کیوں نہ ہو اور یہی بات تم خدا سے بھی محبت کیے بغیر چاہتے ہو کہ وہ تمہارے نفس کے ہر تقاضے کو پورا کرے اور اس کا سارا انتظام کار تمہاری خوشنودی میں لگ جائے۔ نوجوان! تمہارا دل خدا ہی کی محبت سے نہیں انسانوں کی محبت سے بھی خالی ہے ——— اور تم نے آج تک مے محبت کا ایک قطرہ نہیں چکھا۔"

"یوں لگتا ہے" میں نے دھیمی مگر پریشان سی آواز میں کہا کہ جیسے میرا دماغ چکرا رہا ہے، دل میں ایک زلزلہ سا محسوس کر رہا ہوں۔ یہ ساری دنیا تبدیل ہو رہی ہے، معلوم نہیں یہ کیا نیا تجربہ ہے۔ مجھے ڈر سا آنے لگا ہے۔ مجھے سہارا چاہیئے!"

"بیٹے! میں تمہیں تھامتا ہوں۔ میں تمہارے لیے سہارا ہوں۔ میں دمِ آخر تک تمہارا قابلِ اعتماد دوست ثابت ہو سکتا ہوں۔ اب تم کوئی غم واندیشہ نہ کرو۔ میرا مقصد یہی زلزلۂ باطن برپا کرنا تھا، سو وہ ہو گیا۔ اب تم چاہو تو زندگی کو بھی پا سکتے ہو، خدا کو بھی ——— اور شاید زینب کو بھی ——— کیونکہ اب تم پہلی بار اپنے آپ کو پا رہے ہو۔ ویسے اگر تم خودکشی کا فیصلہ نہ بدل سکو تو میں مزاحم نہیں ہوں گا۔"

"جی! خودکشی، خودکشی، میں بھونچکے پن میں کہنے لگا۔ وہ تو واقع ہو گئی۔ اسی گفتگو کے آخری مرحلے میں میرا سابق وجود ختم ہو گیا اور ایک نئی ہستی پیدا ہو گئی۔ مگر اب اس نوزائیدہ نوجوان کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا کرے، کدھر جائے!"

"اس سلسلے میں اگر تم چاہو تو میں تمہیں تفصیلی رہنمائی اطمینان سے دوں گا" اجنبی محسن کہہ رہا تھا "فی الحال تم پہلا اقدام یہ کرو کہ سیدھے ہسپتال میں جاؤ جہاں گذشتہ رات خودکشی کرنے والے نوجوان کی بیوی زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہے۔ اگر تمہارا خون اس کے خون سے مطابقت رکھتا ہو تو جا کر اپنے خون کی پیشکش ڈاکٹر کے سامنے کر دو۔ باقی باتیں پھر ہوں گی۔"

"بہت اچھا! میں بسر و چشم اس ارشاد کی تعمیل کروں گا" میں نے ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ عرض کیا "مگر میرے عظیم محسن! مجھے یہ تو بتا دیجیے ناں کہ آپ کا تعارف کیا ہے!"

"کیا تمہاری بصیرت مجھے ابھی تک سمجھ نہیں سکی" میرا محسن مجھے سوچنے پر آمادہ کر رہا تھا: "میں وہی تمہاری خاندانی امانت ہوں جسے تم نے یوں تو غلاف میں لپیٹ کر الماری میں رکھ دیا ہے، مگر میں تمہارے سینے میں بھی موجود ہوں۔ تمہاری امی تمہاری ابتدائی نشوونما کے دوران میں میرے کلمات صبح و شام پڑھا کرتی تھی۔ پھر وہ دودھ پلاتے ہوئے بھی میری باتیں تمہارے کان میں ڈالتی رہتی تھی۔ اس نے اپنی لوریوں میں بھی مجھے حل کر دیا تھا پھر تمہارے والد جب جانماز پر رقت کے ساتھ میرا بیان پڑھتے تھے تو وہ آوازیں تمہارے تغافل کے باوجود تمہارے اندر جذب ہوتی رہی تھیں۔ میں تمہارے دل میں موجود ہوں اور درحقیقت تمہارے دل کے اندر ہی سے بول رہا ہوں، تم سے باہر اور الگ کوئی نہیں ہے جو تم سے مخاطب ہو رہا ہو۔"

اور میں نے جب پوری توجہ سے نظر اٹھا کے درختوں کے جھنڈ میں دیکھا تو وہاں کوئی متنفس موجود نہ تھا۔

کرنوں کا سفر

شیخ ابن بطوطہ کے سفرنامے کا ایک باب

مائل خیرآبادی

عصر کا وقت تھا، میں نے سوچا نماز پڑھ لینی چاہیئے۔ میں پانی کی تلاش میں ایک طرف چلا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک ندی مل گئی۔ میں اس کے کنارے ایک جگہ بیٹھ کر وضو کرنے لگا۔ اچانک پانی میں ایسا لگا جیسے کوئی جانور میری طرف آ رہا ہو۔ میں نے دیکھا وہ گھڑیال تھا۔ منہ کھولے دھیرے دھیرے میری طرف آ رہا تھا۔ اس خطرے کو اچانک سامنے دیکھ کر "یا اللہ خیر!" میری زبان سے نکلا اور میں نے جھٹ ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ میں دور جا گرا۔ ٹھیک اسی وقت جب میں نے چھلانگ لگائی تھی شیر کی گرج سنائی دی۔ اب جو دیکھا تو ٹھیک اسی جگہ جہاں بیٹھا ہوا میں وضو کر رہا تھا ایک شیر گھڑیال کے جبڑوں میں پھنسا ہوا تھا اور اس کے منہ سے بچ نکلنے کیلئے تڑپ رہا تھا لیکن شیر کے بنائے کچھ نہ بن سکا۔ گھڑیال شیر کو پانی میں گھسیٹ لے گیا اور پھر نہ ابھرا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ کیسے ہو گیا؟ شیر گھڑیال کے منہ میں کیسے آ پھنسا؟ میری سمجھ میں آیا کہ میرے آگے پانی میں سے تو گھڑیال نے مجھے دیکھا، پیچھے سے شیر نے۔ پھر ٹھیک اس وقت جب کہ گھڑیال منہ کھول کر مجھ پر جھپٹا، ٹھیک اسی وقت شیر نے مجھ پر چھلانگ لگا دی اور ٹھیک اسی وقت میں دوسری طرف کود گیا۔ تو پھر ہوا یہ کہ میں تو گھڑیال سے بچ گیا اور میرے بدلے شیر گھڑیال کے منہ میں آ گرا۔ میں تھوڑی دیر تک ہکا بکا سا رہا۔ پھر میں نے سوچا کہ میرے اللہ نے اچانک مجھے بچا لیا۔ شاید ابھی زندگی باقی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ موت تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔ تو بھلا گھڑیال مجھے کیسے پکڑ سکتا تھا۔

میں یہی سوچ رہا تھا اور اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی دلدلی زمین میں آ پھنسا۔ سچ مچ میں دلدل میں تھا اور میرے پیر پنڈلیوں تک اس کے اندر۔ اب تو میں گھبرایا۔ وہی بات ہوئی جو کسی نے کہی ہے کہ ؎

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
اور کیسی پڑی سر پر میرے اللہ! غنی!

میں نے دلدل سے پیر نکالنے کی کوشش کی تو پیر نکلنے کے بدلے گھٹنوں تک دلدل میں چلے گئے۔ اب تو میں پریشان ہونے لگا۔ میں نے اور زور لگایا تو ایک بالشت اور اندر چلا گیا۔ یہ دیکھ کر میری پریشانی اور بڑھی اور یہی سچ پوچھئے تو تھی بھی پریشان کر دینے والی بات۔ میں جتنا ہی دلدل سے نکلنے کے لیے زور لگاتا تھا اتنا ہی اندر دھنستا جا رہا تھا یہاں تک کہ کمر تک اندر چلا گیا۔ اب میں نے چیخنا شروع کر دیا "بچاؤ بچاؤ خدا کے لیے بچاؤ! مجھے یہ زمین نگلے جا رہی ہے۔" میں پوری طاقت سے چلا رہا تھا دیر تک چلانے کے بعد میری مدد کو کوئی نہ آیا تو میں نے یقین کر لیا کہ میری موت گھڑیال کے منہ میں نہیں بلکہ اس دلدل میں تھی اور اب گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں میرا پتہ بھی نہ چلے گا کہ میں کہاں گیا ———

موت کا یقین ہو گیا تو میں نے خدا کو یاد کیا اور کلمہ پڑھنے لگا۔ ابھی میں نے پانچ چھ بار ہی کلمہ پڑھا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں آواز آئی: "زور نہ لگاؤ۔ زور نہ لگاؤ۔"

میں اس طرف دیکھنے لگا جدھر سے آواز آرہی تھی۔ میں نے دیکھا سترہ اٹھارہ سال کی ایک لڑکی شیر کی کھال پہنے ایک موٹا سا رسّہ کاندھے پر ڈالے ندی کی طرف دوڑی چلی آرہی تھی: "زور نہ لگاؤ۔ زور نہ لگاؤ" اسی کی آواز تھی۔

اسے دیکھ کر میں خوش ہوگیا وہ ایک پیڑ کے پاس آکر رکی اس نے رسّے کا ایک سرا پیڑ سے باندھا دوسرا سرا میری طرف پھینکا۔ رسّے کا دوسرا سرا ٹھیک میرے اوپر آکر گرا۔ میں نے پکڑ لیا۔ اب وہ بولی شاباش جوان چھوڑنا نہیں دیکھو میں تمہیں کھینچتی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے زور لگایا لیکن میں پھنسا کا پھنسا رہا۔ اس نے زور لگایا میں اب بھی اوپر نہ آسکا۔ اب اس نے اور زور لگایا۔ "ارے بھئی" اس نے بھرپور زور لگا دیا اس کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن میں تو کمر تک دلدل کے اندر تھا مجھے کھینچنے کے لیے ہاتھی کی طاقت چاہیے۔ جی ہاں' ہاتھی کی طاقت۔ وہ تھک کر چور ہوگئی اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لکڑی کا ایک لٹھا پاس ہی پڑا تھا اس نے رسّے کو پیڑ سے کس دیا پھر بڑھ کر لٹھا اٹھایا۔ یہ دیکھ کر میں نے دل میں کہا بڑی طاقت ور ہے یہ لڑکی۔ لٹھا اٹھا کر اس نے مجھ سے کہا جوان! رسّہ پکڑ کر تم خود زور لگاؤ تو آؤ رسّہ پیڑ سے تو بندھا ہوا تھا ہی۔ میں نے مضبوطی سے پکڑا اور زور لگایا تو کچھ اوپر آگیا۔ ٹھیک اسی وقت لڑکی نے لٹھا میری طرف پھینکا۔ لٹھا میرے پاس ہی دو تین ہاتھ کی دوری پر گرا اور اندر چلا گیا اس کے اندر جانے سے مجھے ایسا لگا جیسے دو چار انگل میں آپ سے آپ اوپر آگیا اب میں نے پکارا "کوئی لٹھا اور پھینکو خدا تمہاری مدد کرے" یہ سن کر لڑکی خوش ہو گئی لیکن مشکل یہ تھی کہ آس پاس کوئی اور لٹھا نہیں تھا اس نے کچھ سوچ کر پھر رسّہ پکڑا اور مجھے کھینچنے کی ایک کوشش اور کی۔ کامیابی نہ ہوئی تو اب اس نے جنگل کی طرف رخ کر کے فرمایا "بالپو، بالپو، او بالپو، بالپو.....!"

جنگلی لڑکی پوری طاقت سے بالپو کو پکار رہی تھی۔ اسے پکارتے زیادہ دیر نہ لگی تھی کہ جنگل سے ادھیڑ عمر کا ایک آدمی نکلا۔ وہ بھی شیر کی کھال پہنے ہوئے تھا۔ اس کے پاس بلم تھا اور تیر کمان بھی۔ چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں اور گھنی داڑھی تھی۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا دیکھتے ہی دوڑ پڑا۔ لڑکی کے پاس آیا لڑکی نے میری طرف دیکھا اشارہ کیا اور اشارہ کرتے ہی رسّہ پکڑ کر کھینچا! اس آدمی نے بھی رسّہ پکڑا اور اب دونوں نے مل جل کر زور لگایا تو میں اوپر آگیا اور پھر دونوں نے اپنی طرف مجھے کھینچ لیا۔

مجھ کو دلدل سے نکال کر دونوں بہت خوش ہوئے۔ جنگلی لڑکی تو اتنی خوش تھی جیسے اس نے کسی اپنے گھر کے آدمی کی جان بچائی ہو۔ خوشی کے مارے وہ پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس کا بالپو پچاس کے لگ بھگ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "جوان! خدا نے تم کو بچایا۔ میں اس وقت بہت خوش ہوں لیکن میں نہیں جانتا کہ اس خدا کا شکر کیسے ادا کروں جس نے تمہاری مدد کے لیے مجھے بھیج دیا۔"

یہ کہہ کر اس نے لڑکی سے کچھ کہا اور اسی طرف کو چل دیا جدھر سے آیا تھا۔ لڑکی کی مدد سے میں نے اپنے کپڑے کچھ نہ کچھ صاف کر لیے کہ پہن کر چل سکتا اس کے بعد لڑکی مجھے لے کر چلی۔ آگے آگے وہ تھی اس کے پیچھے میں۔ دھوپ اب پیلی پڑ چکی تھی سورج کے ڈوبنے میں دیر نہیں تھی جنگلی لڑکی تیز تیز چلنے لگی میں بھی جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگا۔ میرا دل بہلانے کے لیے لڑکی مجھ سے باتیں کرتی جاتی تھی بڑی ہی باتونی تھی وہ لڑکی۔ زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

میں بالکل خاموش اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ سورج اب نظر نہیں آرہا تھا پچھم کی طرف لالی چھائی ہوئی تھی۔ مغرب کے وقت جنگلی لڑکی مجھے لے کر اپنے گھر پہنچی۔ "گھر" کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں کوئی محل کھڑا تھا یا جھونپڑا پڑا تھا کچھ جھاڑیوں کو چھانٹ چھانٹ کر تراش تراش کر کوٹھری سی بنا لی تھی۔

اس کے سامنے زمین صاف کرالی تھی اور اس کے چاروں طرف جس طرح باڑہ بنا لیا جاتا ہے اس طرح لکڑیوں کو کھڑا کر کے آپس میں باندھ دیا تھا۔ بس یہ تھا اس کا گھر۔ اس کا بالپو پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اُس نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں نے جاتے ہی کہا "میرے مددگار دوستو میں نماز پڑھوں گا۔"

"نماز! نماز کسے کہتے ہیں ہم نہیں سمجھے جوان تم کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے پانی چاہیئے"

لڑکی نے مجھے پانی دیا میں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے لگا۔ دونوں بہت تعجب کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔ جب میں نماز پڑھ چکا تو دونوں نے ایک ساتھ مجھ سے پوچھا۔

"جوان! تم نے یہ کیا کیا؟"

"میں نے خدا کا شکر ادا کیا"

"تم نے خدا کا شکر ادا کیا' تم نے خدا کا شکر ادا کیا" یہی تو میں جاننا چاہتا تھا۔ جنگل کا وہ آدمی جو تنہا وہاں رہ رہا تھا کئی جملے بول گیا اور جواب سننے کے لیے بے چین ہونے لگا۔

"بتاؤ جوان! بالپو یہی تو دن رات سوچتے رہتے ہیں" جنگلی لڑکی مجھ سے کہہ رہی تھی "اور دیکھو تم یہ بھی بتانا کہ خدا کہاں ملے گا۔ میں جانتی ہوں جوان! تم کو سب معلوم ہے۔"

"دیکھو للّی! ٹھہرو۔ جوان بھوکا ہوگا۔ اسے پہلے کھانا کھلاؤ۔ تم بھی کھاؤ۔ میں بھی کھاؤں۔ اس کے بعد اس جوان سے باتیں کریں۔ یہ جوان ضرور جانتا ہے یہ ہمیں ضرور بتائے گا لیکن جوان! مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ تم اس دیس کے باسی نہیں ہو۔"

للّی سے کہتے کہتے آدمی نے مجھ سے کہا اور میں نے اقرار کیا کہ میں عرب کا رہنے والا ہوں۔

"عرب دیس! عرب دیس! میں نہیں جانتا عرب دیس کہاں ہے؟"

آدمی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ للّی ڈلیا میں جنگلی پھل لے آئی۔ زمین پر اُس نے چٹائی بچھا دی تھی۔ ہم سب اس چٹائی پر بیٹھ گئے کسی جانور کی کھال بچھا کر للّی نے پھل اس پر چن دیئے پھر چاند کی روشنی میں ہم سب پھل کھانے لگے۔

میں پھل کھاتا جاتا اور سوچتا جاتا کہ یہ دونوں کون ہیں؟ جنگل میں کیوں رہ رہے ہیں؟ وہ دونوں بار بار میرا چہرہ دیکھتے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس وقت تک چپ رہے جب تک کھاتے رہے۔ کھا کر اُٹھے تو اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے پوچھیں میں نے ان سے کہا "پہلے آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں اور اس بھیانک جنگل میں کیوں بس گئے؟"

یہ سن کر للّی بالپو کا منہ تکنے لگی۔

"پہلے میں بتاؤں، پہلے میں بتاؤں؟" بالپو نے دو بار کہا اس کے بعد بولا "اچھا لو پہلے میری ہی رام کہانی سن لو۔

"اب سے بیس برس پہلے کی بات ہے اس وقت میری عمر پچیس تیس سال کے بیچ تھی۔ میں بچپن ہی سے دیکھا کرتا کہ لوگ مورتیوں کو پوجتے ہیں ان پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ ان سے مرادیں مانگتے ہیں ان سے ڈرتے اور آس لگاتے ہیں مورتی پوجا کے علاوہ میں دیکھا کرتا کہ لوگ دیوی دیوتاؤں اور بھوت پریتوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ میں سوچا کرتا کہ یہ مورتیاں تو پتھر کی ہیں یہ تو خود بے بس ہیں۔ انسان انہیں خود گھڑ لیتا ہے۔ پھر ان کو کیوں پوجتا ہے؟ یہ مورتیاں تو اپنے اوپر بیٹھی ہوئی مکھی تک نہیں اڑا سکتیں تو ہمیں کیا نفع اور نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ میں نے یہی بات اپنے باپ سے کہی باپ مجھ پر بہت خفا ہوا۔ خفا ہو کر بولا کہ اگر ایسی باتیں کرو گے تو تم کو گھر سے نکال دوں گا۔ میرا باپ مورتیاں بنا بنا کر بیچا کرتا تھا۔ اس لیے وہ اور بھی ناراض ہوا لیکن میں برابر یہی سوچتا رہا۔

پھر جب میں ذرا اور بڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ لوگ طرح طرح کے رواجوں میں پھنسے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے اور بڑی بڑی رقمیں فضول کاموں میں اڑا دیتے، پھر چوریاں کرتے ہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں جوا کھیلتے ہیں ہو دکھاتے ہیں آپس میں لڑتے ہیں عورتوں کی بے عزتی کرتے ہیں۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ یہ باتیں بُری ہیں انہیں چھوڑ دو۔

"میرا خیال تھا کہ بُری باتوں پر ٹوکوں گا تو لوگ میرے طرفدار ہو جائیں گے مگر ان پر اُلٹا اثر ہوا۔ لوگ اُلٹے مجھ سے ناراض ہو گئے۔ پھر جب میں جوان ہوا تو باپ نے میری شادی کر دی۔ لوگوں نے بتایا تھا کہ شادی کر دو تو لڑکا آپ سے آپ ٹھیک ہو جائے گا لیکن شادی کے بعد بھی میں اسی طرح سوچا کرتا۔ میں نے یہی باتیں بیوی کے سامنے رکھیں۔ میری بیوی بھی میری طرح سوچنے لگی اس طرح کئی برس ہو گئے۔ یہ للی پیدا ہوئی تو نہ جانے کیسی بُری بُری رسمیں گھر میں ہونے لگیں۔ میں نے ساری رسمیں روک دیں۔ تو محلے ٹولے کے لوگ بہت بگڑ گئے میں جوان تو تھا ہی، میں نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔

پھر جب ایک دن میرے باپ نے مجھے ڈانٹا تو مجھے غصہ آگیا میں نے رات کے وقت گھر کی ساری مورتیاں ایک گندے گڑھے میں ڈال دیں صبح کو لوگوں نے دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ کام کس نے کیا ہے؟ مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے جواب دیا کہ جب تم ان کو خدا بناتے ہو ان سے پوچھ لو۔ یہ مورتیاں بتا دیں گی کہ کس نے انہیں پھینکا ہے؟ پھر ان سے کہو کہ گڑھے سے نکل آئیں۔

میں نے ذرا زور دے کر کہا کہ یہ بے بس ہیں یہ گڑھے سے نہیں نکل سکتیں جب یہ کچھ نہیں کر سکتیں تو تم لوگ کدھر بہکے جا رہے ہو؟

"اچھا پھر تم ہی بتاؤ، ہم خدا کو کس طرح پوجیں؟ مجھ سے سب نے پوچھا" جوان! تم سے سچ کہوں۔ یہ بات مجھے بھی نہیں معلوم تھی۔ میں نے برائی کو تو پہچان لیا لیکن خدا کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا تو لوگوں نے مجھے پیٹنا شروع۔ میری بیوی اس وقت للی کو لیے لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے سُنا تو دوڑی ہوئی آئی۔ مجھے بچانے لگی۔ لوگ اسے بھی مارنے لگے۔ اب تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بھی لات گھونسے چلائے مگر میں اکیلا کر ہی کیا سکتا تھا۔ للی کی ماں کے چوٹیں زیادہ آئیں اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ میں نے اُسے بے ہوش دیکھ کر ہاتھ روکا اس کی طرف لپکا۔ لوگوں نے بھی مار پیٹ بند کر دی وہ سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میں نے بیوی کو اٹھایا اس میں دم نہیں تھا وہ مر چکی تھی۔ میں اسے اُٹھا کر گھر لے گیا تو میرے باپ نے گھر میں نہیں آنے دیا میری اس للی کو میری گود میں دیکر کہا: اب اس گھر میں قدم مت رکھنا اپنے اس خدا کے پاس جاؤ جسے تم پہچانتے بھی نہیں۔

جوان! سچ جانو مجھے بہت پیٹا گیا تھا لیکن اس مار پیٹ سے مجھے اتنا دکھ نہیں ہوا جتنا دکھ باپ کی اس بات سے ہوا۔ میں اپنی بیوی کی لاش لیے اور للی کو کاندھے سے لگائے گھر سے چل دیا۔ بستی بھر میں کسی نے میری مدد نہیں کی۔ میں نے ایک صاف گڑھے میں بیوی کی لاش رکھ دی اوپر سے کچھ لٹھے رکھ دیئے اور جھاڑیاں لا کر اسے بند کر دیا اوپر سے مٹی ڈال دی۔ میری سمجھ میں اس وقت یہی آیا۔ پھر میں للی کو لیے لیے گاؤں گاؤں گھوما پھرا۔ میں جہاں گیا لوگوں نے مجھے ستایا، ہر جگہ مجھ سے یہی پوچھا گیا جب تم مورتیاں پوجنے سے منع کرتے ہو ان رسموں سے روکتے ہو تو پھر بتاؤ کہ خدا کو کیسے پوجیں اور ان رسموں کے بدلے کس طرح زندگی بسر کریں؟

یہ کہہ کر بابو خاموش ہو گیا میری طرف دیکھنے لگا۔ للی بھی مجھے تک رہی تھی۔ میں نے کہا:۔

"بابو! میں تم کو بتاؤں گا شاید خدا نے اسی لیے مجھے

یہاں بھیجدیا، تم خدا کا شکر ادا کرو۔"

"جوان! میں یہی تو پوچھتا ہوں کہ خدا کا شکر کیسے ادا کروں؟" بابو نے جھٹ پوچھا۔ میں نے کہنا شروع کیا: "بابو سنو! بالکل ایسے ہی لوگ جیسے تم نے اپنی بستی میں دیکھے عرب میں بھی تھے۔ اس وقت بھی تمہارے جیسے کچھ لوگ موجود تھے وہ بھی یہ سمجھ گئے تھے کہ مورتیاں پوجنا بُری بات ہے خدا کو پوجنا چاہیئے جس نے ہم کو پیدا کیا جس نے ہمارے لیے ہوا بنائی۔ پانی برسایا اور ہمارے لیے طرح طرح کے پھل پھلواری اور اناج پیدا کیے جس نے ہمیں جانور دیئے ان جانوروں سے ہم کام لیتے ہیں۔ ہے نا ٹھیک بات؟!"

"ہاں جوان! بالکل ٹھیک یہی میں بھی سوچتا ہوں۔ اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ خدا نے مکہ شہر میں ایک شخص کو پیدا کیا۔ وہ بچپن سے بڑا نیک اور سچا آدمی تھا۔ اس کا پیارا نام محمد تھا، صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خدا نے اپنا فرشتہ بھیجا۔ خدا نے ان پر اپنی کتاب اتاری۔"

"کتاب اتاری! جوان، سچ مچ!؟"

"میں آپ سے بالکل سچ کہتا ہوں، اس کتاب سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جانا کہ خدا کو کیسے پوجیں اور کیا کام کریں کہ وہ پیدا کرنیوالا خوش ہو جائے۔"

"ہاں اے جوان! بس یہی بتاؤ۔"

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ وہ خدا ایک ہی خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی پوجنے کے لائق نہیں ہے پھر بتایا کہ نماز پڑھو تم نے دیکھا بابو! میں نے ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے نماز ہی تو پڑھی تھی۔ میں نے نماز میں خدا سے کہا اے خدا تو ہی ہم سب کا رب ہے ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد چاہتے ہیں۔"

"جوان! سنو سنو! میں بھی یہی چاہتا ہوں"

"بابو! ہر سمجھدار آدمی یہی چاہتا ہے! اچھا تو پھر سمجھدار آدمیوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مان لی، بُرے لوگوں نے نہیں مانا اور جھگڑے کرنے لگے۔"

"اف خدا! بُرے آدمی سچ مچ بُرے ہوتے ہیں خدا اُن سے بچائے۔"

"ہاں بابو! تو پھر بُرے آدمیوں نے حضرت کو بہت ستایا۔ انہیں بھی ستایا جو مسلمان ہو گئے تھے۔"

"کیا ہو گئے تھے مسلمان۔ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ جوان!"

"بابو! مسلمان اس کو کہتے ہیں جو خدا کو ایک مانتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ مانے کہ انہوں نے جو کچھ کہا خدا کی طرف سے کہا۔"

"اچھا تو سنو جوان! میرا دل کہتا ہے کہ حضرت محمد صلعم نے خدا ہی کی طرف سے باتیں کہیں تو کیا مسلمان ہوا؟"

"بے شک"

"اور میں بھی تو مسلمان ہوئی نوجوان! میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔"

"ہاں للی! تم بھی مسلمان ہوئی اور دیکھو ایک بات کیسی اچھی بتائی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد اللہ سب کو زندہ کرے گا۔ سب کے کاموں کی جانچ کرے گا جس سے خوش ہو گا اسے جنت دیگا اور بُرے لوگوں کو جہنم میں جھونک دیگا۔ پورا پورا بدلہ ملے گا سب کو"

"جوان! مجھے بھی بدلہ ملے گا نا!"

"بے شک آپ کو اچھا بدلہ ملے گا۔"

"واہ کیسی سچی بات کہی تم نے جوان! اس دنیا میں تو اچھوں کے لیے بڑی آزمائش ہے۔ اچھا ہاں! اب یہ بتاؤ کہ جس کتاب کے بارے میں تم نے بتایا کہ خدا نے اسے اتارا وہ

کہاں ہے؟"

"وہ کتاب میرے دل میں ہے باپو"

"یعنی تم کو یاد ہے سب؟"

"ہاں باپو!"

"اچھا تو سناؤ"

میں نے باپو کو جگہ جگہ سے قرآن سنایا اس کا مطلب سمجھایا۔ باپو اور للی دونوں بہت خوش ہوئے۔ وہ روز روز مجھ سے قرآن سنتے۔ جو سنتے اس پر عمل کرتے اس طرح ہم تینوں جنگل میں رہتے رہے ایک دن میں نے کہا "باپو! یہاں جنگل میں کب تک پڑے رہیں گے۔ آؤ چلیں بستی بستی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی بات لوگوں کو سنائیں۔"

"نہ جوان! مت جاؤ۔ بُرے لوگ ستائیں گے۔"

"باپو! ایک بات اور بتاؤں، لوگوں کے ستانے سے مت گھبراؤ، اگر اس کام میں ہم مار بھی ڈالے جائیں تو یہ سودا سستا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"یہ پوچھنے پر میں نے قرآن کی وہ آیتیں سنائیں اور سمجھائیں جن میں شہیدوں کے لیے خوش خبری ہے اور یہ ہے کہ ایسے لوگ بے حساب کتاب جنت میں داخل کیے جائیں گے۔"

یہ خوش خبری سننا تھی کہ باپو بہت خوش ہوا، للی بھی خوش ہوگئی اور ہم سب جنگل سے بستی کی طرف جانے کے لیے سامان کرنے لگے۔ پھر ایک دن باپو نے مجھے اور للی کو ساتھ لیا۔ راستے وہ جانتا ہی تھا سب کو لے کر ایک طرف چل دیا۔

باپو کے ساتھ ہم دونوں دن بھر چلتے رہے شام کو ایک جگہ ٹھہرے باپو نے بتایا کہ اللہ نے چاہا تو ہم کل صبح کے وقت جنگل پار کرلیں گے۔ یہ سُن کر میں بہت خوش ہوا، للی بھی خوش ہوئی۔ صبح ہوئی تو پھر چلے۔ ابھی تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ ایک درخت کے نیچے ایک شخص کو بیہوش پڑے دیکھا ہم جھٹ اس کے پاس گئے ہم نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اس کے ہونٹوں پر پانی ٹپکایا کچھ دیر کے بعد اس نے منہ کھول دیا ہم نے اسے پانی پلایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور ہمیں دیکھنے لگا۔ پھر ہم نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ میں نے کہا:

"شاید آپ بھوکے پیاسے ہیں" وہ کچھ نہ بولا، للی نے جھٹ اپنی ڈلیا سے کچھ پھل نکالے انہیں کاٹا اس آدمی کو کھلایا۔ ہم سب نے بھی کھایا۔ کچھ کھا پی کر وہ شخص مسکرایا اب ہم نے اس کا حال پوچھا تو وہ اپنی کتھا اس طرح سنانے لگا۔

"اے آنے والو! میں اس دیس کا راجہ ہوں۔ پرسوں میں اپنے لاؤ لشکر کو لے کر اس جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے ایک جگہ دیکھا ایک اپاہج لومڑی پڑی تھی وہ گہرے گڑھے میں تھی اور اس سے کسی طرح بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ اسے دیکھ کر اچانک میرے دل میں یہ بات آئی کہ اس گڑھے میں اسے کھانا کہاں سے مل سکے گا میں یہی سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا ایک اونچی جگہ بیٹھ گیا میری نظر گڑھے کی طرف رہی۔ میں نے دیکھا کہ تھوڑی ہی دیر میں جنگل سے ایک شیر نکلا اس کے منہ میں ایک ہرن دبا ہوا تھا شیر نے ایک جگہ ہرن کو کھانا شروع کیا جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس نے باقی حصہ اٹھا کر پھینک دیا وہ گرا جا کر لومڑی کے گڑھے میں۔"

"یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ خدا سب کو روزی دینے والا ہے۔ وہ راجہ کو بھی دیتا ہے جو دن رات راج کاج کے چکر میں جان کھپاتا ہے۔ دشمنوں سے لڑتا ہے۔ ہر وقت ایک کھٹکے میں رہتا ہے اور مجبور و لاچار لوگوں کو بھی خدا ہی

روزی پہنچاتا ہے، آخر اس نے اس لومڑی کو اس کی روزی پہنچادی۔"

"میں نے یہی بات اپنے لشکر کے لوگوں سے کہی۔ اس کے بعد میں نے کہا "جب یہ بات ٹھیک ہے تو پھر دنیا کے جھنجٹوں اور زندگی کے جھمیلوں میں پھنسنے سے فائدہ؟ کیوں نہ چپکے سے ایک کونے میں بیٹھ جاؤں۔ خدا تو روزی پہنچانے والا ہے ہی۔ تو اے آنے والو بھائیو! میں نے لشکریوں سے کہا۔ تم سب جاؤ۔ اب میں یہیں جنگل میں رہوں گا۔ اب میں راج کاج کے جھگڑوں میں جان نہیں کھپاؤں گا۔ لوگ مجھے سمجھانے لگے۔ میں نہیں مانا۔ سب کو واپس کر دیا اکیلا اس پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا اور خدا کو یاد کرنے لگا۔ شام ہوگئی لیکن خدا نے میرے لیے میری روزی نہیں بھیجی۔ میں نے سوچا شاید خدا میرا امتحان لے رہا ہے، میں بھوکا ہی پڑا رہا۔ صبح کو مجھے بڑی بھوک لگی تھی، میرا خیال تھا کہ آج ساری دنیا کا خدا روزی ضرور بھیجے گا کل کا دن بھی بیت گیا۔ تم جانو! میں راجہ آدمی۔ میں بھوک کو کیا جانوں، اب جو بھوک لگی تو میں پریشان ہونے لگا لیکن اپنی بات پر اڑا رہا، مجھے پورا پورا یقین تھا کہ خدا روزی ضرور بھیجے گا۔ وہ میرا امتحان لے رہا ہے۔ آخر آج جب میں بھوک کے مارے بے ہوش ہو گیا تو خدا نے تم کو بھیج دیا اور اس طرح میری روزی مجھے مل گئی۔ کتنی ٹھیک ہے میری بات! تو پھر میں کیوں زندگی کے جھمیلوں میں پھنسوں۔ کیوں بھائیو! میں نے ٹھیک کہا نا؟"

راجہ نے بات کرتے کرتے ہم سے پوچھا۔ تو للی جھٹ بول پڑی۔ "بالکل غلط کیا راجہ صاحب آپ نے!"

"وہ کیسے؟"

راجہ للی کی طرف دیکھنے لگا۔ ہم سب بھی للی کی طرف دیکھنے لگے کہ دیکھیں للی اس کی بات کا کیا جواب دیتی ہے۔

للی نے کہا:

"راجہ ہو کر آپ سے یہ نہ ہوا کہ شیر کی طرح زندگی بسر کرتے جس طرح شیر نے شکار کر کے لومڑی تک کھانا پہنچایا۔ اسی طرح خود دوسروں تک کھانا پہنچاتے، اُلٹے لومڑی بن گئے "اپاہج لومڑی" اور دوسروں کی کمائی کی طرف دیکھنے لگے۔"

للی کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن ہم نے اسے روک دیا۔ میں نے سوچا کہ للی الھڑ ہے پھر جنگلی بھی۔ نہ جانے کیا کہہ دے میرا اشارہ پا کر وہ خاموش رہی اب میں نے کہا کہ:۔

"راجہ صاحب! خدا نے ہم کو انسانوں کے اندر پیدا کیا ہمیں انسانوں کے ساتھ ہی رہنا چاہیئے۔ یہی انسانیت ہے یہ ٹھیک نہیں ہے کہ دنیا کو چھوڑ دیں۔ سب سے الگ تھلگ رہیں۔ ہمیں دنیا میں ہی رہ کر دین کا کام کرتے رہنا چاہیئے اللہ اسی طرح خوش ہوگا۔"

راجہ میری بات سُن کر بولا "اے جوان تم نے کیا بات کہی؟ دنیا میں رہ کر ہم کس طرح خدا کو خوش کر سکتے ہیں جبکہ زندگی میں نہ جانے کتنی رکاوٹیں ہمارے سامنے آتی ہیں کبھی کبھی ہمارا پاپی من ہم سے کہتا ہے کہ ہم دوسرے کا مال چھین لیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں کے کہنے سننے سے دوسروں کو ستانا پڑتا ہے۔ پھر لڑائیاں چھڑتی ہیں تو ہمارا یہ پاپی من ہی سب سے پہلے ہمیں برائیوں پر ابھارتا ہے پھر دنیا کے بُرے لوگ ہیں کہ ان کی وجہ سے ہم سے بُرائیاں ہو جاتی ہیں۔"

"راجہ صاحب! مرد کا کام یہی ہے کہ ہر اس طاقت کو ٹھکرا دے جو برائی کی طرف لے جانے والی ہو۔"

میں نے یہ کہا تو للی بول پڑی "جوان! تم نے تو ہمیں یہ بتایا تھا کہ یہ کام تو مسلمانوں کا ہے اگر مسلمان اپنے پاپی من کا کہنا نہ مانے بُروں کا کہنا نہ مانے بلکہ اللہ کے حکموں پر چلے تو اللہ اسے جنت دیگا۔ تو یہ تو مسلمان ہی کر سکتا ہے"

"للی تم ٹھیک کہتی ہو لیکن راجہ صاحب مسلمان تو نہیں

نہیں! اسی لیے میں نے راجہ صاحب کو اس طرح سمجھایا۔"

راجہ نے میری اور للی کی بات بڑے دھیان سے سنی پھر بولا "یہ مسلمان کی بات کیسی؟ بتاؤ مسلمان کیا کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے؟"

راجہ نے یہ جو پوچھا تو میں نے جس طرح جنگل میں باپو کو اسلام کے بارے میں سمجھایا تھا اسی طرح راجہ سے کہا' بات سچی اور صاف تھی۔ راجہ کی سمجھ میں پوری بات آگئی۔ وہ بھی مسلمان ہوگیا۔ اس کے مسلمان ہونے سے ہم سب بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد راجہ اٹھا، اس نے ہم سب سے کہا، "آپ لوگ میرے ساتھ راجدھانی چلیں اور یہی بات سب کو سمجھائیں"

راجہ ہمیں لے کر راجدھانی کی طرف چلا' راستے میں اس نے ہم سے کہا' راجدھانی یہاں سے دور ہے' زیادہ اچھا ہے کہ آپ اپنا اپنا حال کہتے چلیں۔ اس طرح راستہ آسانی سے کٹے گا۔

میں نے اپنا حال بتایا کہ میں ایک عرب سیاح ہوں دنیا کی سیر کرنے گھر سے نکلا اور گھومتا پھرتا اس جنگل میں آ نکلا۔ میں نے اپنے سفر کے بہت سے حالات راجہ کو سنائے۔ راجہ بہت خوش ہوا۔ پھر باپو نے اپنی آپ بیتی سنائی۔ باپو کی آپ بیتی سن کر راجہ پر بڑا اثر ہوا۔ اس نے کہا باپو! خدا تم کو اس کا اچھا بدلہ دے۔"

"اور مجھے" للی اچانک بول پڑی اور ہم سب ہنسنے لگے۔

"تمھیں بھی" راجہ نے کہا۔

اس طرح چلتے چلتے ہم سب راجدھانی پہنچے۔ وہاں لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ راجہ واپس آیا وہ سب خوش ہوگئے ہاتھوں ہاتھ ہم سب کو لیا۔ راجہ ہم سب کو لے کر محل میں چلا گیا۔

میں راجہ کے ساتھ کچھ دنوں اس کی راجدھانی میں رہا راجہ نے سمجھا بجھا کر لوگوں کو مسلمان بنالیا۔ اس کا وزیر اس کا دشمن ہوگیا وہ راجہ سے ناراض ہوکر دوسرے راج میں چلا گیا اور وہاں کے راجہ کو اکسایا کہ مسلمان ہونے والے راجہ پر چڑھائی کرے پھر وہ اسے لاؤ لشکر کے ساتھ چڑھا لایا۔ مسلمان راجہ نے بھی اپنی فوج کو ساتھ لیا۔ میں بھی اس لشکر کے ساتھ تھا۔ باپو بھی ساتھ تھا اور للی بھی بلم لیے لڑنے مرنے کو تیار تھی۔

راجدھانی کے باہر بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ راجہ بڑی بہادری سے لڑا باپو کو شہادت کا شوق تھا وہ تو بڑی بے جگری سے لڑا، للی بھی تڑپ تڑپ کر لڑ رہی تھی ایک بار تو ایسا ہوا کہ دشمن کے سپاہیوں نے پیچھے سے راجہ پر حملہ کردیا۔ دشمن کا ایک سپاہی راجہ کے بالکل پیچھے آگیا وہ پیچھے سے حملہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ للی نے دیکھ لیا وہ جھپٹ کر آئی اور بلم دشمن سپاہی کی پیٹھ میں بھونک دیا سپاہی بے دم ہوکر گرا' راجہ نے مڑ کر دیکھا للی کھڑی تھی راجہ بہت خوش ہوا اس نے للی کی پیٹھ ٹھونکی اور پھر بڑھ کر لڑنے لگا شام تک لڑائی ہوتی رہی شام کو دشمن ہار کر بھاگا اس لڑائی میں مسلمان راجہ کی جیت ہوئی لیکن ہمارا باپو کسی کے بلم سے شہید ہوگیا باپو کی شہادت کا ہمیں بڑا افسوس ہوا مگر للی نے سمجھایا۔

"جوان! اس میں افسوس کی کیا بات ہے باپو تو شہید ہو لیے اب وہ بے حساب کتاب جنت میں جائیں گے۔ یہی تو وہ چاہتے تھے تو آؤ جوان! اللہ سے دعا کریں۔"

ہم سب نے باپو کے لیے دعا کی اس کے بعد تیسرے دن راجہ نے مجھ سے رائے لے کر للی سے شادی کرلی۔ میں بہت خوش ہوا۔ میں کچھ دن اور راجہ کے ہاں رہا اس کے بعد جیسی کہ میری عادت تھی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ راجہ اور للی دونوں دور تک میرے ساتھ آئے پھر لوٹ گئے میں نے ان کے لیے دعا کی کہ خدا انہیں اسلام پر قائم اور خوش و خرم رکھے۔

آمین! ○○

قرآن ایک نظر میں

— ادارہ —

ذیل میں ہم اپنے محترم اسلاف رحمہم اللہ اجمعین کی محنتوں کے ایسے کچھ ثمرات پیش کر رہے ہیں، جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ قرآنی حقائق کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جسے انہوں نے چھان نہ ڈالا ہو۔

پہلی وحی

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ

سورۂ علق — ۶۱۰ء — آیت ۱تا۵

کل تعداد کلمات ———— ۸۶۴۳۰

چھیاسی ہزار چار سو تیس

کل تعداد حروف ———— ۳۲۳۷۶۰

تین لاکھ تئیس ہزار سات سو ساٹھ

آخری وحی

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (البقرہ آیت ۲۸۱)

یا

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ۔۳)

جملہ کاتبانِ وحی ———— ۴۰ صحابہؓ

قرآن کی کُل مدتِ نزول

تقریباً

۲۲ سال — ۵ ماہ

پارے	۳۰
منزلیں	۷
سورتیں	۱۱۴
رکوع	۵۴۰
کُل آیات	۶۶۶۶

۷ منازل کی تقسیم

۱— سورۂ فاتحہ تا سورۂ نساء

۲— سورۂ مائدہ تا سورۂ توبہ

۳— سورۂ یونس تا سورۂ نحل

۴— سورۂ بنی اسرائیل تا سورۂ فرقان

۵— سورۂ شعراء تا سورۂ یٰسین

۶— سورۂ والصّٰفّٰت تا سورۂ حجرات

۷— سورۂ قٓ تا سورۂ الناس

اقسامِ آیات

آیاتِ وعدہ	۱۰۰۰
آیاتِ وعید	۱۰۰۰
آیاتِ نہی	۱۰۰۰
آیاتِ امر	۱۰۰۰
آیاتِ مثال	۱۰۰۰
آیاتِ قصص	۱۰۰۰
آیاتِ تحلیل	۲۵۰
آیاتِ تحریم	۲۵۰
آیاتِ تسبیح	۱۰۰
آیاتِ متفرقہ	۶۶
(جملہ	۶۶۶۶)

تفصیلِ حروفِ قرآن

ا	۴۸۸۷۲	ب	۱۱۴۲۸	ت	۱۱۹۹
ث	۱۲۷۶	ج	۳۲۷۳	ح	۹۷۳
خ	۲۴۱۶	د	۵۶۰۲	ذ	۴۶۷۷
ر	۱۱۷۹۳	ز	۱۵۹۰	س	۵۹۹۱
ش	۲۱۱۵	ص	۲۰۱۲	ض	۱۳۰۷
ط	۱۲۷۷	ظ	۸۴۲	ع	۹۲۲۰
غ	۲۲۰۸	ف	۸۴۹۹	ق	۶۸۱۳
ک	۹۵۰۰	ل	۳۴۳۲	م	۳۶۵۳۵
ن	۴۰۱۹۰	و	۲۵۵۳۶	ہ	۱۹۰۷۰
لا	۳۷۲۰			ی	۴۵۹۱۹

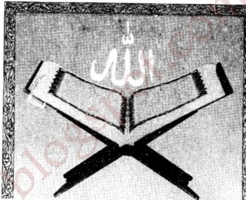
کُل حرکات (اعراب)

۱	فتحات (زَبَر)	َ	۵۳۲۲۳
۲	کسرات (زیر)	ِ	۳۹۵۸۲
۳	ضمات (پیش)	ُ	۸۸۰۴
۴	مدات (~)		۱۷۷۱
۵	تشدید (شدّ)	ّ	۱۲۷۴
۶	نقاط (نقطے)		۱۰۵۶۸۴

سجدہ ہائے تلاوت

متفق علیہ — ۱۴ مقامات

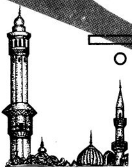
اختلافی — ۱ مقام



قرآن اور آپ کا گھر

کیا آپ کے گھر میں قرآن پڑھا جاتا ہے ؟
بالغ افراد میں سے کتنے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں ؟
بچوں میں سے کتنے قرآن پڑھتے ہیں ؟
کیا بچوں کو قرآنی قصص و واقعات سنائے جاتے ہیں ؟
کیا گھر میں قرآن کی آیات اور احکام پر باتیں ہوتی ہیں ؟
بڑوں اور بچوں کو قرآن میں سے کیا کچھ یاد ہے ؟
بڑوں یا بچوں میں سے قرآن کا مفہوم سمجھنے یا ترجمہ جاننے والا بھی کوئی ہے ؟
کیا گھر میں قرآن کو سمجھنے کے لیے کچھ کتابیں موجود ہیں ؟
(مثلاً ترجمے ، تفسیریں ، قرآنی مضامین و مقالات)
کیا قرآنی آیات یا اُن کے تراجم کے کتبے دیواروں پر آویزاں ہیں ؟
کیا گھر کے مرد یا خواتین کسی حلقۂ درسِ قرآن میں حصہ لیتی ہیں ؟

محض آپ کے غوروخوض کے لیے



تبویب

ادارہ

ہر وہ شخص جو قرآن سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے بارے میں کچھ ضروری معلومات اُسے حاصل ہوں۔ کچھ الفاظ ہیں جو بار بار استعمال ہوتے ہیں۔ کچھ اہم باتیں ہیں جن کے بارے میں یہ متصوّر کیا جاتا ہے کہ ہر طالب علم اُن سے واقف ہے۔ ہم افادۂ عام کے لیے اِس سلسلہ کی ضروری معلومات کو یہاں پیش کرتے ہیں۔

سُورت

سورت کا لفظ "سور" سے ماخوذ ہے جس کے معنی فصیل اور شہر پناہ کے ہیں۔ فصیل کے ساتھ ذہن میں رفعت و بلندی کا تصور خود بخود آتا ہے۔ عربی زبان میں سورۃ کے معنی رفعت و عظمت کے ہیں۔ السوار کنگن کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع اساور جنّت کے مکینوں کے ذکر میں قرآن میں آئی ہے:

جَنّٰتُ عَدۡنٍ يَّدۡخُلُوۡنَهَا يُحَلَّوۡنَ فِيۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّلُـؤۡلُـؤًا‌ ۚ وَلِبَاسُهُمۡ فِيۡهَا حَرِيۡرٌ

(فاطر - ۳۳)

اور اُن لوگوں کے لیے جاودانی جنتیں ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے۔ وہاں اُن کو

سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے۔
اور اُن کا لباس ریشمی ہو گا۔

اس معنی کے لحاظ سے سورت کو "سورت" اس لیے کہا گیا ہے کہ جس طرح فصیل کی وجہ سے ایک شہر زمین کے دوسرے حصّوں سے ممتاز اور علیحدہ ہو جاتا ہے اس طرح ایک سورت بھی قرآن کے ایک حصّے کو دوسرے حصّوں سے ممتاز اور علیحدہ کرتی ہے۔ نیز اس میں یہ مفہوم بھی پنہاں ہے کہ جس طرح شہر پناہ سے شہر محفوظ ہو جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹ کر اُس کے الفاظ و مضامین کو محفوظ فرما دیا ہے اور کتابِ مبین کو اس ترتیب کی وجہ سے سہل الحفظ بھی بنا دیا ہے۔

علامہ زمخشری نے ایک اور وجہ بھی لکھی ہے۔ کہتے ہیں "یہ لفظ اس "سورت" سے لیا گیا ہے، جس کے معنی رُتبے اور درجے کے ہوتے ہیں"۔

دو لحاظ سے یہ نام رکھا گیا ہے کہ سورتیں قرآن میں درجوں اور منزلوں کی طرح ہیں اور قاری پڑھتے ہوئے منزل بہ منزل اور درجہ بدرجہ ترقی کرتا جاتا ہے۔

نیز سورتیں لمبائی اور چھوٹائی میں مختلف درجوں پر ہیں۔ یا یہ کہ ہر سورت کا ایک درجہ ہے اور دین میں اُس کی وقعت و شان مسلّم ہے [1]

ہمارے خیال میں پہلی وجہ ہی زیادہ معقول اور اقرب ہے۔

لفظ سورت کا استعمال قرآنِ مجید میں سات دفعہ ہوا ہے [2]۔ البقرہ سے الناس تک قرآن مجید کی سورتوں کی تعداد ایک سو چودہ ہے اور اُن کی ترتیب اس طور پر ہے کہ اس سے قرآنِ حکیم میں ایک آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔ سورتوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایتِ ربّانی کے مطابق ترتیب دیا ہے، یعنی یہ ترتیب توقیفی ہے اور جس طرح ہر سورت اور ہر آیت کی ترتیب حضورؐ کی خاص ہدایات کے مطابق عمل میں آئی ہے اسی طرح پورے قرآن مجید کی ترتیب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق کی گئی ہے۔ تمام علما اس پر متفق ہیں کہ سورتوں کے نام بھی خود حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق مقرر کیے ہیں۔ سورتوں کے نام بعض اوقات محض سورت کے پہلے لفظ ہی سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً طٰہٰ، یٰسین اور "ق" وغیرہ، بعض اوقات سورت کے اندر سے کوئی نمایاں لفظ لے کر سورت کا نام تجویز ہوا ہے۔ مثلاً بقرہ، عنکبوت، زخرف، نمل وغیرہ اور بعض اوقات سورت کے اندر بیان کردہ کسی اہم بحث کا نام لیا گیا ہے۔ مثلاً آلِ عمران، نور وغیرہ۔

قرآن مجید کی بعض سورتیں طویل ہیں، بعض متوسط ہیں اور بعض مختصر ہیں، لیکن جو لوگ قرآنی علوم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی ہر مختصر سورت بھی اپنے مفہوم اور مدعا کے لحاظ سے اپنے دامن میں بے پناہ وسعتیں لیے ہوئے ہے۔ مختصر ترین سورتیں کوثر، العصر اور اخلاص ہیں۔

مکّی سورتیں مختصر اور جامع ہیں اور پُرشکوہ الفاظ اور دلنشین اسلوب پر مشتمل ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

"جب آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے
جھڑ جائیں گے۔ جب دریا بہ کر ایک
دوسرے سے مل، جائیں گے اور جب
قبریں اکھیڑ دی جائیں گی۔ اُس وقت ہر
شخص اپنے اگلے اور پچھلے اعمال کو جان لیگا۔
اے انسان تجھے اپنے کرم گستر پروردگار
کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا۔ وہی
تو ہے جس نے تجھے پیدا کیا تیرے اعضا کو
بنایا اور (تیرے قامت کو) اعتدال بخشا،
اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا
(سورۃ انفطار، آیت ۱-۸)

سورۂ تکویر کی آیات کا مفہوم ملاحظہ ہو:
جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب
تارے بے نور ہو جائیں گے،
جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب
بیانے والی اونٹنیاں بے کار ہو جائیں گی
اور جب وحشی جانور جمع کیے جائیں گے۔
اور جب سمندر آگ ہو جائیں گے اور جب
روحیں (بدنوں سے دوبارہ) ملا دی جائیں
گی اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنا دی
گئی تھی، پوچھا جائیگا کہ وہ کس گناہ میں ماری
گئی اور جب اعمال کے دفتر کھول دیے جائیں گے
اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائیں گی اور
جب دوزخ کی آگ بھڑکائی جاتے گی اور
جنّت بہت قریب لائی جائے گی۔ تب ہر
کسی کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا
ہے۔ ہمیں اِن ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ
جاتے ہیں، اور جو سیر کرتے اور غائب ہو
جاتے ہیں اور رات کی قسم جو ختم ہونے
لگتی ہے اور صبح کی قسم جو نمودار ہوتی ہے
کہ بیشک یہ (قرآن) فرشتۂ عالی مقام کی
زبان کا پیغام ہے جو صاحبِ قوت مالکِ
عرش کے ہاں اونچے درجے والا، سردار
امانت دار ہے۔ (سورۃ تکویر آیت ۱-۲۱)

اس کے مقابلے میں اکثر و بیشتر مدنی سورتیں طویل اور معاشرے کی تمدنی و سیاسی ضروریات کے مطابق مفصّل ہدایات پر مشتمل ہیں لیکن ان میں بھی وہی زورِ فصاحت و بلاغت اور جوشِ کلام پایا جاتا ہے جو مکّی سورتوں کا خاصہ ہے۔

طول اور اختصار کے لحاظ سے بھی سورتوں کے مختلف درجے ہیں۔ علاّمہ سیوطی فرماتے ہیں:

"پہلی سات سورتیں "بقرہ" "تا برأۃ" "(توبہ)" کو "طوال" کہا جاتا ہے کیونکہ یہ لمبی ہیں۔ اُن کے بعد سورتیں "مئین" کے ساتھ موسوم ہیں۔ کیونکہ اِن سورتوں میں آیات سو سے زیادہ یا قریب قریب ہیں، پھر اُن کے بعد جو سورتیں آتی ہیں اُن کو "مثانی" کہا جاتا ہے کیونکہ "مئین" کے بعد آتی ہیں۔ اور مئین اوائل اور یہ درمیانی ہیں اور یا اس لیے کہ اُن کے مضامین مکرر ہیں اور پہلی سورتوں میں سب بیان ہو چکے ہیں۔ اس قسم کی سورتوں میں آیات کی تعداد سو سے کم ہے۔ مثانی کے بعد چھوٹی سورتیں ہیں۔ انھیں مفصّل کہتے ہیں، اس لیے کہ مفصّل کے معنی ہیں محکم کے اور یہ بھی اپنے اختصار کے باوجود محکم اور واضح ہیں [3]"

آیات

اللہ تعالیٰ نے سورتوں کی شکل میں پورے قرآن مجید کو تقسیم کر کے قرآن مجید کے حفظ اور مطالعہ کو ہمارے لیے آسان کر دیا ہے اور پھر ہماری سہولت اور مضامین کی وضاحت کے لیے سورتوں کی مزید تقسیم کر کے ہر سورت میں آیات کی حد بندی کر دی ہے۔

آیت کے لغوی معنی نشانی کے ہوتے ہیں یعنی واضح علامت اور نشانی۔ راستے کے نشانات جو سفر کی سہولت کے لیے قائم کیے جاتے ہیں۔ انھیں بھی آیات کہتے ہیں۔

---

[1]: کشاف طبع مصر ۱۳۵۴ - ج۔ ۱ ص - ۴۸

[2]: لغات القرآن مولانا عبدالرشید (لفظ سورت)

[3]: الاتقان فی علوم القرآن۔ از علامہ سیوطی۔ ج ۱ ص ۶۳ طبع مصر ۱۹۰۱ء

قرآن کی آیات ہماری منزلِ مقصود (یعنی اللہ) تک ہماری راہنمائی کرتی ہیں۔ ہم انھیں کے سہارے لقائے رب کی منازل طے کرتے ہیں۔ اس لیے کائنات کی نشانیوں کو بھی آیات اللہ کہا گیا ہے۔ قرآن نے تو حضرت صالحؑ کی اونٹنی اور کشتی نوحؑ کو بھی آیت کہا ہے۔ اسی مفہوم کی دوسری قرآن مجید کی سورتوں کے ٹکڑوں کو آیات کہا گیا ہے کہ یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ پوری کتاب اللہ ہی کا کلام ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا ایک مختصر سے مختصر ٹکڑا بھی اس بات کی طرف ہماری کھلی رہنمائی کرتا ہے۔ یا یہ کہ یہ آیات عام انسانوں کے لیے رہنما ہیں اور اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات اس سے معلوم ہوتی ہیں۔ قرآن مجید پر جن لوگوں نے تدبر کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ابتدا سے لے کر انتہا تک قرآن مجید ذہن انسانی سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس کلام میں، اس کائنات میں اور خود اپنے نفس میں غور و فکر کرے تو اس کو خالقِ فطرت کی ذات کے متعلق بیشمار نشانیاں اور آیات نظر آسکتی ہیں۔

آیت کی بناوٹ میں جملوں کی بناوٹ اور تکمیل پیش نظر نہیں رہی۔ قرآن کریم کے بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ ایک جملہ کئی آیات کے بعد مکمل ہوتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی آیت میں کئی مکمل جملے آجاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت کی حد بندی زورِ کلام اور آہنگ کو مدِ نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ آہنگ کی تخلیق کا ایک موثر ذریعہ قافیہ ہے۔

عربوں کی خصوصاً اور عام انسانوں کی عموماً یہ فطرت ہے کہ وہ مسجع اور مقفیٰ کلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ عربی زبان اور ادب میں اس وقت قافیہ اور سجع کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس لحاظ سے پوری دنیا کی شاعری سے عربی شاعری ممتاز ہے۔ نیز عربوں کے یہاں مذہبی زبان میں قافیہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اس لیے وزنِ شعری نہ ہونے کے باوجود آیات کے اختتام پر قافیہ اور آہنگ کا ایک عجیب پر لطف احساس ہوتا ہے۔ اس سے آیات کے حفظ میں بھی بڑی سہولت ہو جاتی ہے۔ قرآن ہی وہ واحد کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے[1] سب سے زیادہ سہولت سے یاد کر لی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی عمر کے بچے بھی قرآن مجید کو حفظ کر لیتے ہیں بلکہ وہ کچھ زیادہ ہی آسانی سے حفظ کر لیتے ہیں۔

آیات اور حروف کی تعداد

حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت کے مطابق قرآن مجید کی آیات کی تعداد چھ ہزار چھ سو سولہ (۶۶۱۶) اور حروف کی تعداد تین لاکھ تیئس ہزار چھ سو اکہتر ہے[2] (۳۲۳۶۷۱)

پارے اور رکوع

سورتوں اور آیات کی تقسیم تو خود منجانب اللہ تھی لیکن

لہ: اس کا اعتراف غیروں کے یہاں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ مضمون بر "قرآن"

ٹہ: ملاحظہ ہو الاتقان۔ آیات کی تعداد اور حروف کی تعداد میں بعض اوقات اختلاف نظر آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کچھ حضرات بعض کلمات مثلاً بسم اللہ کو ہر جگہ آیت شمار کرتے ہیں۔ بعض پورے قرآن مجید میں صرف ایک دفعہ۔ اسی طرح دوسری سورتوں کے متعلق بھی اختلاف منقول ہے۔ مثلاً بعض لوگ چند جملوں کو ایک آیت تصور کرتے ہیں اور بعض لوگوں نے بعض کو حروف شمار کیا ہے اور بعض کو نہیں۔ بہر حال قرآن مجید کی عبارت پر پوری امت کا اجماع ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کلمات اور حروف کی تعداد اور اُن کے شمار میں اپنے اپنے ذاتی خیال کی بنا پر اختلاف ہو۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

بعد میں اہلِ علم نے قرآن مجید کو پورے تیس حصّوں میں تقسیم کر دیا جس کو پارہ یا جُز کہا جاتا ہے۔ پھر ہر پارے کو مزید تقسیم کرکے رکوع بنا دیے گئے۔ ایک پارہ میں پندرہ سے بیس تک رکوع ہوتے ہیں اور ایک رکوع میں کم و بیش دس آیات ہوتی ہیں۔ پورے قرآن میں رکوع کی تعداد پانچ سو چالیس (۵۴۰) ہے۔ قرآن مجید کی یہ تقسیم چونکہ بعد میں اہلِ علم نے کی ہے، لہٰذا پارہ اور رکوع کی علامت کو باہر حاشیہ میں لکھا جاتا ہے متن کے اندر یہ علامات درج نہیں ہوتیں۔ قرآن مجید کو تیس پاروں میں تقسیم کرنے میں جو مقصد کار فرما ہے وہ یہ کہ ہر مسلمان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کریگا۔ عام لوگ چونکہ متعین نہ کر سکتے تھے اس لیے اہلِ علم نے قرآن مجید کو تیس حصّوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ایک مسلمان قرآن مجید کے تمام مضامین کو ہر ماہ میں کم از کم ایک بار ذہن نشین کر لے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا۔ اقرالقرآن فی شہر (قرآن مجید کو ایک ماہ میں پڑھا کرو) نیز بخاری شریف کی روایت ہے "حضرت جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پورے رمضان میں ہر رات آکر ملتے تھے اور اس ملاقات میں آپ انھیں قرآن مجید سنایا کرتے تھے۔ ان دونوں احادیث کا منشا یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ کے لیے کم از کم مدت ایک ماہ ہے

یہ صرف حسابی مسئلہ ہے۔ اور یہی اس خاص طریقہ سے متعلق ہے، جو اختیار کیا جائے۔ تمام علماء اور محققین اس امر پر متفق ہیں کہ قرآن میں نہ اس متن سے ایک حرف زیادہ ہے جو حضورؐ نے امت کو دیا تھا، اور نہ اس میں ایک حرف یا ایک شوشہ کی کمی ہوئی ہے۔ یہاں ہدایت مکمل بھی ہے اور اس کی ہر چیز محفوظ بھی۔

اس لیے اہلِ علم نے قرآن مجید کو مقدار کے لحاظ سے تیس حصّوں میں تقسیم کیا۔ اس تقسیم میں معنی اور مضمون کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

لیکن رکوع کی تقسیم میں معنی، تعدادِ آیات اور مضمون تینوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر آیات لمبی ہیں تو ایک رکوع کم آیتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

رکوعات کی تقسیم کے وقت یہ بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ ایک مسلمان عام طور پر نماز میں کس قدر تلاوت کرتا ہے۔ ایک ٹکڑے کا نام غالباً اس لیے بھی رکوع رکھا گیا ہے کہ نماز میں قیام کے بعد رکوع آتا ہے اور یہ مناسب ہے کہ اس مقدار کے بعد رکوع ہو۔

کہا جاتا ہے کہ یہ تقسیم خلافتِ راشدہ کے بعد حجاج بن یوسف کے زمانہ میں ہوئی لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے بعض اہلِ علم کو ایک ہفتہ میں نہ صرف قرآن مجید کی تلاوت کی اجازت دے دی تھی بلکہ یہ منزلیں خود حضورؐ نے متعین فرما دی تھیں اور سارے صحابہ کو معلوم تھیں۔

پہلی منزل سورہ فاتحہ تا آخر سورہ نساء ہے۔ دوسری از ابتدا سورۂ مائدہ تا انتہائے سورۂ توبہ۔ تیسری منزل از ابتدائے سورۂ یونس تا انتہائے سورۃ النحل۔ چوتھی منزل ابتدائے سورہ بنی اسرائیل سے سورہ فرقان تک۔ پانچویں منزل سورۃ الشعرا تا انتہائے سورہ یٰسین۔ چھٹی منزل از ابتدائے سورہ والصٰفٰت تا انتہائے الحجرات اور ساتویں منزل از ابتدائے سورۂ قٓ تا آخر قرآن۔

یہ ہے قرآن کے بارے میں استعمال ہونے والے کچھ اہم الفاظ اور اصطلاحات کا مفہوم۔

غارِ حرا کی تنہائیوں میں انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد اور شفیق ترین انسان ملول و غمگین بیٹھا ہے۔ ملال اور غم اس بات کا کہ انسانیت نے اپنی ساری عظمت اور سارا شرف غارت کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ اپنے دشمن آپ بن گئے ہیں۔ وہ آبادیوں میں انسانوں کو دیکھتا، اُن کی نفس پرستیوں کا مشاہدہ کرتا، اُن کی خود غرضیوں اور ہوسناکیوں کا نظارہ کرتا۔ اُن کی ذلتوں اور خواریوں کو محسوس کرتا، دیکھتا اور بے چین ہو جاتا، تڑپ اُٹھتا، وہ انسانوں کو بچا لینا چاہتا تھا۔ قبل اس کے کہ انسانیت کے پرخچے اُڑ جائیں، وہ اس کے لیے چاروں طرف



صُبحِ تہذیب کا ظہُور

نظر سی دوڑاتا۔ لیکن کوئی نہ تھا جو انسانیت کی اس تباہ حالی پر کڑھتا ہو اور جس کے سامنے وہ دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ اس کے دل میں ہوک اُٹھتی اور پھر اسی تڑپ اور ہوک کے عالم میں وہ غارِ حرا کی تنہائیوں میں جا پہنچتا وہ اکثر اسی طرح مضطرب دل اور بے چین رُوح کے ساتھ وہاں جاتا تھا اور دو چار دن بلکہ ایک ایک ہفتہ اسی کرب اور بے چینی کے ساتھ اس غار میں گزار دیتا تھا۔ غور و فکر میں، ذکر و عبادت میں!

پھر ایسا ہوا کہ بد اخلاقیوں کے گرداب میں پھنسی ہوئی انسانیت پر کڑھنے والا انسانیت کا یہ واحد مونس و غم خوار اسی غار میں حسبِ معمول ایک دن گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب "۔ متفکر بیٹھا تھا کہ سکوتِ حرا کے سنّاٹے میں ایک انجانی آواز اُبھری:۔

" اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ "[1]

یہ جبریلِ امین کے واسطہ سے خدا کی کتاب کا آغاز تھا۔ اور جو سینہ مہبطِ وحی بنا، وہ آمنہ کے نورِ نظر اور عبداللہ کے بیٹے محمدؐ کا سینہ تھا۔ مکہ کے "امین" اور "صادق" کا سینہ تھا صلی اللہ علیہ وسلم!

چھٹی صدی عیسوی تاریخ کا وہ دور ہے جب انسانیت پر ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ " کا نقشہ تھا۔ مصر کے اہرام اپنے تابناک

[1] پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا (سورۃ العلق)

تمدن کے ملیا میٹ ہو جانے پر حیران و ششدر، سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔ حمورابی کے قوانین داستانِ پارینہ بن چکے تھے۔ رومی تہذیب جو یونانی علم و دانش کی وارث بھی تھی، دم توڑ رہی تھی۔ عیسائیت روم کے زوال پر ماتم کناں تھی۔ ہندوستان میں مذہب اور سماج کا نچوڑ " برہمنوں کی غلامی " کے سوا کچھ نہ تھا۔ دُنیا کے دُوسرے خطوں پر بھی جہالت اور تاریکی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور جس طرح مردہ زمین اپنی زندگی کے لیے بارش کی دعائیں کرتی ہے اسی طرح انسانیت ایک نئے پیغام، نئی تہذیب اور ایک حیات بخش نظام کے لیے آسمانوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خطہ میں جسے قلبِ زمین کہا جا سکتا ہے، ایک ایسی قوم کے فرد کو منتخب فرمایا، جو قوم کسی بیرونی تہذیب کے قدموں سے پامال نہ ہوئی تھی۔ اس کے تمام قوائے فطری کسی بادِ سموم کا شکار نہ ہوئے تھے اور اس قوم کا وہ فرد کائنات کا کامل ترین فرد تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے حاملِ وحی بنایا۔

(۳)

جس ہستی کو آگے چل کر دنیا کی قیادت کا بوجھ اٹھانا تھا، جسے پورے عالم کی رہنمائی کرنا تھی، اور جس کے "جگر میں سارے جہاں کا درد" پنہاں تھا۔ وہ اپنے وقت کو لااُبالی طور پر سیر و تفریح اور بے مقصد اور بیکار کاموں اور بے فائدہ مصروفیتوں کی نذر نہ کر سکتا تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ سونے اور چاندی سے زیادہ قیمتی، ہیرے اور جواہرات سے زیادہ بیش بہا۔ اُس نے اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کیا۔ مکہ کے قمار خانے، بدکاری کے اڈے، داستان گوئی کے چوپال، لہو و لعب کی مجلسیں، بازار، میلے اور تماشہ گاہیں، عام قریشی نوجوانوں کی راہیں تکا کرتی تھیں مگر وہ جسے انسانیت کا تزکیہ کرنا تھا اُس کی پرچھائیں بھی اِن پست مقامات پر نہ دکھائی دی۔

پھر کچھ عمر گزری تو آپ گھر کی دیکھ بھال، تجارت اور دنیاوی معاملات کی مصروفیات سے فارغ ہو کر اکثر حرا کی خلوتوں میں چلے جاتے اور مہینوں وہیں رہتے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ ہوتا تھا جب وہ ختم ہو جاتا تب آپ واپس آتے۔ حرا کسی کاخ و ایوان کا نام نہیں۔ جس سے کوئی یہ سمجھے کہ شاید آپ کے لیے مسند و تکیہ کا عمدہ انتظام ہو گا۔ نہ ہی وہ کوئی گوشۂ چمن تھا کہ سبز مخمل کا فرش زیرِ پا ہو حضورؐ کا مرکزِ تحنث جبل نور کی چوٹی پر ایک خشک[1]

[1] غار میں آپ کیا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں جو تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا کہ آپ وہاں "تحنث" یعنی عبادت کیا کرتے تھے۔ عبادت کی شکل کیا تھی۔ یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں علما کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ذکر فرماتے تھے۔ اور بعض (مثلاً علامہ عینی) کے نزدیک یہ غور و فکر اور عبرت پذیری کے انداز کی ایک چیز تھی۔ علامہ ابن حجر عسقلانی کے بقول بخاری کی ایک روایت میں "تحنف" بھی آیا ہے (اور عربی زبان میں ث اور ف ایک دُوسرے سے بدلتے رہتے ہیں، تحنف کے معنی ہیں دینِ حنیف یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کرنا۔ یعنی آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے مطابق عبادت کرتے تھے۔ اور اگر تحنث کے معنی "حنث" یعنی گناہ سے بچنے کے لیے جائیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ گناہ آلود معاشرہ سے دور رہ کر تنہائی اختیار فرما لیتے تھے تاکہ اِن برائیوں کے دیکھنے سے بھی محفوظ ہو جائیں۔ خلوت کی طرف آپ کے دل کا یہ میلان شاید خود اللہ تعالیٰ نے اس لیے پیدا کیا ہو کہ تحملِ وحی کے لیے خاص کیفیت پیدا ہو جائے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تحملِ وحی کی استعداد پیدا کروانے کے لیے روزے رکھوائے گئے تھے۔

تنگ غار تھا[1]۔ اور اسی تنگ و تاریک غار میں انسانیت کا غمخوار دن ہی نہیں، ڈراؤنی اور بھیانک راتیں بھی گزارتا تھا۔ ایسی جگہوں پر اور ایسے ماحول میں ہفتوں عشروں رہنا معمولی دل گردے کا کام نہیں۔ یہ سب کچھ ایک ایسا صاحبِ عزیمت ہی کر سکتا تھا۔ جس کے اکیلے ہاتھوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں طوفانوں کا رُخ پلٹ۔

(۴)

حرا میں ذکر و فکر کی اگلی منزل آئی تو روشن ضمیر آقا نور کی جھلک دیکھنے لگا۔ رویائے صادقہ صاف الہام نظر آنے لگے۔ کوئی پانچ برس یہی کیفیت رہی۔ اس کی روح کچھ اور رفعت چاہتی تھی۔ وہ جوہرِ قابل براہِ راست اکتسابِ علم کی صلاحیت پاچکا تھا۔ اس لیے عمر کے اکتالیسویں سال اُسے وہ منصب حاصل ہُوا جس کا اہل اِس رُوئے زمین پر اُس کے سوا کوئی نہ تھا۔ ایک دن خدا کا فرشتہ "قاصد" سامنے آکھڑا ہُوا۔ وہ کہہ رہا تھا "اِقْرَاْ۔ اِقْرَاْ" "پڑھ! پڑھ!" اور حضور کا جواب یہ تھا کہ "میں تو پڑھنا نہیں جانتا" اس لیے فرشتہ اس کے بالکل قریب ہوگیا اور تین مرتبہ اس نے اس زور سے بھینچا کہ دل و زبان کے سارے قفل کھل گئے اور اللہ کا برگزیدہ نبی پڑھنے لگا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ خَلَقَ
الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ
الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ
الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ (سورۃ العلق ۱-۵)

اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو خون کے لوتھڑے سے تخلیق کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم سے تعلیم دی اور انسان کو وہ کچھ سکھا دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

پھر فرشتہ غائب ہوگیا۔ یہ سب سے پہلی وحی تھی۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ ایک اُمّی کو سارے عالم کی تعلیم اور ہر زمانے کی پیشوائی کے لیے مبعوث کیا جارہا ہے۔ یہ بھی پتا چل گیا کہ حرا کی خلوت نشینی میں ایک بڑا مقصد مضمر تھا۔ یہ محض انفرادی تزکیۂ نفس کے لیے کوئی رہبانی سلسلہ نہ تھا بلکہ

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

اور خدا کا یہ آخری پیغامبر صرف "درویش" بن کر ہی نہ رہ گیا بلکہ ؎

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

(۵)

حرا میں نزولِ وحی کا یہ واقعہ اپنی نوعیت کا بالکل منفرد اور ایک ایسا واقعہ تھا جو اس سے پہلے کبھی پیش نہ آیا تھا۔ سب کچھ اچانک ہوگیا۔ اس سے آپؐ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ ذمہ داری کا بار روح اور جسم کو توڑے ڈال رہا تھا[2]۔ سر سے پاؤں تک پسینہ ہی پسینہ تھا۔ آپ کانپتے تھرتھراتے گھر پہنچے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا "خدیجہ مجھے چادر اڑھادو۔ مجھے چادر اڑھادو۔ خدیجہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔" اور خدیجہؓ تسلی دیتے ہُوئے کہ رہی

[1] غارِ حرا مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ میں واقع ہے۔ اس غار کی لمبائی ۱۲ فٹ۔ چوڑائی چھ فٹ اور اونچائی بھی تقریباً چھ فٹ ہے۔ اب اس پہاڑ کو "جبلِ نور" کہتے ہیں۔

[2]: واضح رہے کہ آپ کو اس بارے میں کوئی شک نہ تھا کہ خدا کا فرشتہ آپ کی طرف وحی لے کر آیا ہے بلکہ گھبراہٹ اس

تھیں کہ:

"اے محمدؐ! آپ بالکل نہ ڈریں۔ خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ آپ تو اُمّت کے نبی بنائے گئے ہیں۔ اپنا دل ذرا مضبوط کیجیے۔ بھلا اللہ آپ کو کیونکر رُسوا کرے گا، اور تنہا چھوڑ دیگا؟ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ آپ تو رشتوں کو جوڑنے والے ہیں۔ سچ بولتے ہیں، دوسروں کی غمخواری میں تکلیفیں اُٹھاتے ہیں اور حق و انصاف کا ساتھ دیتے ہیں۔ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اللہ آپ کو کبھی رُسوا نہ کریگا"

مزید تسکینِ خاطر کے لیے حضرت خدیجہؓ آپ کو عیسائی عالم ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ انھوں نے آپ سے واقعہ حرا سنا تو کہنے لگے:

"یہ آنے والا وہی ناموسِ ربانی (جبریل) ہے جو مُوسےٰ علیہ السلام پر اُترا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا اور اُس وقت تک زندہ رہتا جب تمھاری قوم تمھیں اس شہر سے نکال دے گی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "میری قوم مجھے نکال دے گی؟"

ورقہ بولے "ہاں! اس دُنیا میں جس کسی نے ایسی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲

عظیم ذمہ داری کے احساس کی وجہ سے تھی جو نبوت کے ساتھ ہی آپ کے شانوں پر اچانک آگئی اور جس کی وجہ سے خدا کے ایک بندے کو پوری دُنیائے باطل سے بغاوت کرنی تھی اور تنِ تنہا ساری خدائی سے نبرد آزما ہونا تھا۔ نبی کے ذہن میں شک کا کیا سوال؟ وہاں یقین ہی یقین تھا! ایمان ہی ایمان! اعتماد ہی اعتماد!! وہ تو سب سے پہلے وحی کو مانتا ہے (انا اول المومنین) اور اس پر سب سے پہلے عمل کرتا ہے۔ (انا اول المسلمین)

تعلیم پیش کی ہے۔ جس کے پاس بھی یہ ناموس آیا ہے، اس کے ساتھ ہمیشہ یہی برتاؤ کیا گیا ہے۔ کاش میں ہجرت تک زندہ رہوں اور آپ کی کچھ خدمت کرسکوں!"

ورقہ کی بات ٹھیک نکلی۔ جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نہ آئی تھی اور آپ نے اپنی نبوت و رسالت کا اعلان نہ کیا تھا اس وقت تک مکّہ کے در و دیوار بھی آپ کی امانت و دیانت، صداقت و عدالت اور اخلاق و مروت کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اہلِ مکّہ کے نزدیک آپ سے زیادہ محبوب شخصیت کوئی دوسری نہ تھی۔ لیکن آپ نے اعلانِ نبوت کیا کیا کہ بس جیسے آسمان و زمین بدل گئے۔ عزیز و اقارب، اہلِ خاندان، اہلِ محلّہ، اہلِ شہر غرض سب جانے پہچانے اجنبی بن گئے۔ اپنے پرائے ہوگئے۔ پوری قوم مخالفت پر کمربستہ ہوگئی۔ پھر اس مخالفت میں اخلاق و مروت کی ساری حدیں توڑ دی گئیں۔ آپ کو ستایا گیا، آپ کو روحانی و جسمانی تکالیف دی گئیں۔ یہاں تک کہ تیرہ سال ہی کے مختصر عرصہ میں مکہ کی زمین آپ پر تنگ ہوگئی اور ہجرت کا وہ موقع آگیا، جس کی پیش گوئی ورقہ نے کی تھی۔ اس دوران میں جو لوگ حضورؐ کی دعوت کو قبول کرکے آپؐ پر ایمان لا چکے تھے ان میں آپؐ کی زوجۂ محترمہ (حضرت خدیجہؓ) آپ کے قریب ترین دوست (حضرت ابوبکرؓ) آپ کے خادمِ خاص (حضرت زیدؓ بن حارثہ) اور قریب ترین عزیز حضرت علیؓ شامل ہیں۔ بہرحال اس وقت مسلمانوں کی یہی مختصر سی تعداد تھی جو ساری دُنیا سے ٹکر لینے چلی تھی۔

غارِ حرا میں نزولِ وحی پہلی وحی کے بعد کوئی ڈھائی تین سال تک منقطع رہا۔ اس کو "دورِ فترت" کہتے ہیں۔ یہ عرصہ سخت تھا۔ آپ ایک گھٹن سی محسوس فرماتے اور ہر وقت مضطرب رہتے۔ پہاڑوں، وادیوں

ہیں جانا اور بے اندازہ گھبراہٹ اسی کا مظہر تھی۔ آپ کی یہ بے چینی بے موقع نہ تھی۔ حراء میں کام و دہن کو جو لذت مل چکی تھی اُسے بھلایا نہ جا سکتا تھا۔ وحی الٰہی کا اس طرح رُک جانا بہرحال باعثِ تشویش تھا اور ایک ایسے نبی کے لیے تو اس کا انقطاع یقیناً پریشان کن تھا، جسے قیادتِ امم کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ نبوت و عبودیت کا احساسِ ذمہ داری یہ اندیشہ پیدا کرنے کا باعث تھا کہ کہیں خدا تعالیٰ کو کوئی بات ناپسند نہ ہوئی ہو!

اس "دورِ فترت" کو حکمتوں سے خالی نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ وقفہ بڑا معنی خیز تھا۔ چنانچہ اس کے بعض گوشے قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

(الف) کفار، خصوصاً اہلِ مکہ نے رحمتِ عالم کے خلاف جو محاذ قائم کیا تھا اور آپ کے مقابلہ میں انھوں نے جو گھٹیا سے گھٹیا ہتھکنڈے اور اوچھے سے اوچھے ہتھیار استعمال کیے اُن میں جھوٹے الزامات کے تیر بھی تھے۔ اور انھیں کے بل بوتے پر یہ سمجھتے تھے کہ ہماری فتح ہوگی اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مشن (نعوذ باللہ) ناکام ہو جائیگا۔ ان جھوٹے الزاموں میں اُن کے نزدیک ایک بڑا وزنی الزام یہ تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فی الحقیقت وحی نازل نہیں ہوتی۔ بلکہ جو کچھ وہ وحی کے نام سے پیش کرتے ہیں وہ (نعوذ باللہ) من گھڑت اور خود اُن کی تصنیف کردہ چیز ہے۔ اس قسم کے الزامات کے ذریعہ وہ ایک طرف تو اُن لوگوں کو ورغلانے کی کوشش کرتے تھے جو نئے نئے داخلِ اسلام ہوتے تھے اور دوسری طرف ان لوگوں کو جنھوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ "بطور حفظِ ماتقدم" قرآن کی طرف مائل ہونے سے روکتے تھے کہ کہیں اس کو سُن کر وہ واقعی متاثر نہ ہو جائیں۔

یہ دورِ فترت اُن کے الزامات کی تردید کرتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بطورِ وحی پیش کر رہے ہیں وہ منجانب اللہ ہے اور نزولِ وحی آپ کے اختیار میں نہیں ہے کیونکہ یہ اگر آپ کی اختیاری چیز ہوتی تو یہ وقفہ بے معنی تھا۔ کفار ہی کے بقول "جو شخص رات کے رات وحی گھڑ سکتا ہے" (نعوذ باللہ) وہ اتنے عرصہ تک اپنے "کارخانے" کو کس طرح سرد رکھ سکتا تھا۔ بہرحال اللہ کے سوا یہ وحی کسی اور کی طرف سے ہوتی یا آپ خود اُسے بنا لیا کرتے تو اُس زمانے میں اپنے ذہن سے کوئی پارۂ کلام مرتب کر لینا کیا مشکل تھا اور اس سے مستشرقین Orientalists کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ وحی کی شکل میں آپ کو جو ہدایات دی جاتی تھیں وہ (نعوذ باللہ) محض آپ ہی کے شعور سے اُبھرتی تھیں۔ کسی خارجہ ذریعہ سے نہ آتی تھیں۔

(ب) غارِ حراء میں وحی کا نزول جس کیفیت کے ساتھ ہُوا تھا اُس سے بھی اور پھر بعد میں وحی کے سلسلے میں جو کیفیات آپ پر طاری ہوتی تھیں اُن سب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وحی کا نزول آپ پر بڑا سخت اور شاق گزرتا تھا۔ چنانچہ اس بات کا اظہار آپ نے بعض مواقع پر خود بھی فرمایا ہے۔ دورِ فترت کے ذریعہ وحی کے جامِ چشیدہ کی تشنگی اُبھار کر گویا آپ کے اندر مزید قوتِ برداشت اور تحمل کی صلاحیت پیدا کی جا رہی تھی تاکہ اس بار کو اٹھانے اور اس کیفیت کو برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں۔

(ج) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیثیت محض ایک پیغامبر کی نہ تھی کہ آپ بندوں تک پیغامِ الٰہی پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ آپ کی اصل ذمہ داری یہ تھی کہ پیغامِ الٰہی کو بندوں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ اُن کے سامنے نمونۂ عمل بھی پیش کریں۔ آپ انقلاب کے داعی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ کو دنیا سے کفر و ظلم اور شرک و بدعت کی ہر

شاخ کو اکھاڑ کر توحید کا پودا لگانا تھا اور پوری انسانیت کو ہر ایک کی غلامی سے نکال کر صرف ایک اللہ کے حلقۂ غلامی میں لانا تھا۔ یہ سارا کام آپ تنہا انجام نہ دے سکتے تھے۔ اس کے لیے ساتھیوں اور رفقائے کار کی ضرورت تھی۔ فترت کا یہ ڈھائی تین سالہ دَور اس بات کے لیے نہایت موزوں تھا۔ کہ آپ اتنے عظیم الشان کام کی نقشہ کشی کریں اور رفقائے کار کو فراہم کر کے اُن کی ایک اچھی ٹیم تیار کر لیں، جو انقلاب کے ہراول دستہ کا کام دے۔ چنانچہ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دَور میں پوری تندہی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا اور دورِ فترت کا صحیح ترین استعمال فرمایا۔

(۷)

عام روایات کے مطابق دورِ فترت کے بعد جو سب سے پہلی وحی نازل ہوئی وہ سورۂ مدثر کی ابتدائی پانچ آیات تھیں۔

يَآ اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ

(آیت ۱ تا ۵)

اے مدثر اُٹھو اور (کافروں کو) ڈراؤ۔ اور اپنے رب کی بڑائیاں بیان کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور بتوں سے دُور رہو (جس طرح کہ اب تک الگ رہے ہو)

کہنے کو تو یہ چند الفاظ ہیں۔ لیکن اپنی تہ میں مضامین کے سمندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ بعض نکات لائقِ توجہ ہیں:۔

(۱) اس وحی کے نازل ہونے تک آپ پر نبوت کے تین سال گزر چکے تھے۔ اس دوران میں تبلیغِ رسالت خفیہ طور پر ہو رہی تھی۔ صاحبانِ ایمان کا ایک چھوٹا سا قافلہ تیار ہو چکا تھا کہ دعوتِ حق کو علانیہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن جس عالمگیر انقلاب کا داعی بنا کر آپ کو مبعوث کیا گیا تھا اُسے برپا کرنے کے لیے تنظیم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس وحی میں اِس عالمگیر انقلاب کے لیے تنظیم کے مرحلے کی ہدایات دی گئی ہیں اور اجتماعی دعوت کا مرحلہ پیش کیا گیا ہے۔

(۲) وحی میں پہلا لفظ "المدثر" استعمال ہوا ہے۔ اس کے عام معنی کپڑا اوڑھنے والے (کملی پوش) کے لیے جاتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی "نبوت کا لباس اوڑھنے" کے بھی لیے ہیں۔ لیکن بعض علماء[1] کے نزدیک یہاں "مدثر" کے معنی ہیں مٹانے اور ہلاک کرنے والا (کیونکہ "مدثر" کے ایک لغوی اور بنیادی معنی مٹانے کے بھی ہیں[2]) مطلب یہ ہے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفر و شرک کے مٹانے والے اور جاہلیت کو ہر شعبۂ زندگی سے ختم کرنے والے تھے۔ اس لیے لفظ "مدثر" سے آپ کو مخاطب کیا گیا۔ اس کی مزید تائید اس حدیث سے بھی ہو جاتی ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"میرے بہت سے نام ہیں۔ میں محمد ہوں۔ میں احمد ہُوں۔ میں ماحی (محو کرنے والا) ہوں۔ یعنی میرے ذریعہ خداوند تعالیٰ کفر کو مٹاتا ہے اور میں حاشر ہوں کہ (قیامت کے دن) لوگ میرے قدم پر اٹھائے جائیں گے اور میں عاقب ہوں اور عاقب وہ نبی ہوتا ہے جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہوتا[3]۔ اِن ناموں میں آپ کا نام "ماحی" قابلِ ذکر ہے جس کے معنی محو کرنے والے اور مٹانے والے ہیں۔ اس طرح "مدثر" اور "ماحی" دونوں ہم معنی ہو کر گویا ایک دُوسرے

---

[1]: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔

[2]: دثر دثورا نشان کا محو ہونا۔ مٹنا (صفت۔ داثرہ) ہلاک کرنا۔ الداثر۔ ہلاک ہونے والا (مدثر۔ ہلاک کرنے والا ـــــ مٹانے والا۔

[3]: مشکوٰۃ

کے لیے مفسر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس دور میں مبعوث ہوئے اُس زمانے میں روم و فارس کی سلطنتیں جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں تھیں اور جنگ کا یہ کھیل عرب کی سرحدوں پر ہو رہا تھا۔ چنانچہ اہلِ عرب خاموش تماشائی بن کر اس کھیل کو نہیں دیکھ سکتے تھے اور پھر ایسی صورت میں اُن کا حصہ لینا اور بھی فطری ہو جاتا ہے۔ جبکہ یہ دونوں عظیم الشان سلطنتیں جزیرہ نمائے عرب کو ہڑپ کرنا چاہتی تھیں اور اس کے لیے اپنے اثرات اس کے مختلف حصوں پر مسلسل ڈال رہی تھیں اور بعض علاقوں پر اُن کا عمل دخل بھی ہو گیا تھا۔ مزید براں عرب سے اِن دونوں کے تجارتی تعلقات بھی بہت دیرینہ تھے۔ بہرطور اس بنا پر عرب کے بعض سمجھ دار طبقے تو قیصر کی طرف مائل تھے اور کچھ کسریٰ کی طرف۔ ایسے لوگ بہت کم تھے جو دونوں سے الگ اپنی راہ رکھتے تھے۔ یہ وہ حالات تھے جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گویا اس وحی کے ذریعہ یہ حکم ملا کہ قیصریت و کسرویت کو مٹانے اور انسانیت کو عالمگیر اسلامی انقلاب اٹھانے کی طرف دعوت دیں۔

(۴) اوپر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو "مدثر" کے لفظ سے خطاب کر کے دنیائے انسانیت سے ہر قسم کے کفر و ظلم کو مٹانے کا حکم دیا تھا۔ اب پوری صراحت کے ساتھ "قُم" کہا گیا یعنی "آپ اٹھ کھڑے ہوں" مراد یہ ہو گی کہ اب آپ اپنے فرائض کی انجام دہی میں پورے انہماک سے لگ جائیں اور میدان میں اُتریں اور اللہ کی ہدایت کے تحت جہاں تک آواز پہنچا سکتے ہوں پہنچائیں اور جس حد تک پیغام بھیجا جا سکتا ہو اُس حد تک اس کو بھیجیں۔ واضح رہے کہ "اِنذار" (ڈرانے) کا کام بھی آپ کے فرائضِ منصبی میں داخل تھا تاکہ انسانیت جس تباہی کی طرف جا رہی تھی اس سے اس کو روکا جائے۔

(۵) کام جتنا عظیم الشان ہوتا ہے اسی درجہ احتیاط و تیاری چاہتا ہے۔ اس لیے سب سے اولین شرط تعلق باللہ ہے۔ اس کو استوار رکھنے کے لیے اللہ کی کبریائی (فکبّر) کا اظہار و اعتراف اور اُس کی طرف پوری توجہ پہلی منزل ہے اور اس کی بارگاہ میں مقبول ہونے کے لیے ظاہری و باطنی، جسمانی و روحانی و قلب و لباس کی طہارت اور پاکیزگی (فطہّر) کا مطالبہ سب سے مقدّم ہے۔ "وَثِیَابَکَ فَطَہِّرْ" میں مذہب اور تقدس کے اُن مروجہ تصورات کی تردید کر دی گئی جن کے مطابق میلا کچیلا رہنا ذریعہ تقرب الٰہی شمار ہوتا تھا۔ خدا کا سچا دین قلب و روح کی طہارت کے ساتھ جسم و لباس کی پاکیزگی و صفائی بھی چاہتا ہے۔

سورۂ مدثر کی اِن آیات کے بعد حضورؐ کی وفات سے کچھ دن پہلے تک نزولِ وحی کا سلسلہ جاری رہا۔ جیسی ضرورت ہوتی، جیسا موقع ہوتا، اُس ضرورت اور موقع کے اعتبار سے وحی نازل ہوتی۔ حالات کے لحاظ سے جس قسم کی ہدایات درکار ہوتیں، وحی کے ذریعہ اُن سے مطلع کر دیا جاتا۔ اس طرح تیرہ سال تک مکہ[1] میں، پھر ہجرت کے بعد[2] دس سال تک مدینہ میں قرآن نجماً نجماً نازل ہوتا رہا اور یوں ۲۳ سال کے عرصہ میں نزولِ وحی کی تکمیل ہو گئی۔

قرآن کے بعض حصے چونکہ مکہ میں اور مدینہ میں نازل ہوئے اِس بنا پر سورتوں کی مکی و مدنی تقسیم معروف ہے۔

---

[1]: روایات کے مطابق مکی دور دوشنبہ ۱۷ رمضان ۱۳ ق ھ سے شروع ہوتا ہے اور یک شنبہ ۱۱ ربیع الاول ۱ھ پر ختم ہوتا ہے۔ چار ہزار چار سو چوبیس (۴۴۲۴) دن ہوئے جن میں ہجرت کے گیارہ دن بھی شامل ہیں۔

[2]: مدنی دور دوشنبہ بارہ ربیع الاول ۱ھ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ زمانہ تین ہزار چار سو پینتیس (۳۴۳۵) دنوں پر مشتمل ہے

ظاہر اور عام تعریف کے مطابق جو حصہ مکے میں نازل ہوا[1] وہ مکی ہے اور جو مدینہ میں اُترا وہ مدنی ہے لیکن صحیح تعریف اور واضح تعین یہ ہے کہ ہجرتِ مدینہ سے پہلے جو وحی الٰہی (قرآن) نازل ہوئی وہ مکی[2] ہے خواہ اس کا محلِ نزول (جس جگہ وہ نازل ہوئی) کچھ ہی رہا ہو اور ہجرتِ مدینہ کے بعد قرآن کا جو حصہ نازل ہوا وہ مدنی ہے خواہ اس کا محلِ نزول بھی کچھ ہی رہا ہو۔ ذیل کے نقشے میں مکی و مدنی سورتوں کی تفصیل دی جا رہی ہے:—

مکی سورتیں

۱	الفاتحہ	۱۵	مومنون	۲۹	مومن
۲	انعام	۱۶	فرقان	۳۰	حٰم سجدہ
۳	اعراف	۱۷	شعراء	۳۱	شوریٰ
۴	یونس	۱۸	نمل	۳۲	زخرف
۵	ہود	۱۹	قصص	۳۳	دخان
۶	یوسف	۲۰	عنکبوت	۳۴	جاثیہ
۷	ابراہیم	۲۱	روم	۳۵	احقاف
۸	حجر	۲۲	لقمان	۳۶	ق
۹	نحل	۲۳	سبا	۳۷	ذاریات
۱۰	بنی اسرائیل	۲۴	فاطر	۳۸	طور
۱۱	کہف	۲۵	یٰسین	۳۹	نجم
۱۲	مریم	۲۶	صافات	۴۰	قمر
۱۳	طٰہٰ	۲۷	ص	۴۱	واقعہ
۱۴	انبیاء	۲۸	زمر	۴۲	طلاق

۴۳	ملک	۵۸	مطففین	۷۲	بینہ
۴۴	قلم	۵۹	انشقاق	۷۳	قارعۃ
۴۵	حاقّہ	۶۰	بروج	۷۴	تکاثر
۴۶	معارج	۶۱	طارق	۷۵	عصر
۴۷	نوح	۶۲	اعلیٰ	۷۶	ہمزہ
۴۸	جن	۶۳	فجر	۷۷	فیل
۴۹	مزمل	۶۴	بلد	۷۸	قریش
۵۰	مدثر	۶۵	شمس	۷۹	ماعون
۵۱	قیامہ	۶۶	لیل	۸۰	کوثر
۵۲	مرسلات	۶۷	ضحیٰ	۸۱	کافرون
۵۳	نباء	۶۸	الم نشرح	۸۲	لہب
۵۴	نازعات	۶۹	تین	۸۳	اخلاص
۵۴	عبس	۷۰	علق	۸۴	فلق
۵۶	تکویر	۷۱	قدر	۸۵	ناس
۵۷	انفطار				

مدنی سورتیں

۱	بقرہ	۱۰	احزاب	۱۹	صف
۲	آل عمران	۱۱	محمد	۲۰	جمعہ
۳	نساء	۱۲	فتح	۲۱	منافقون
۴	مائدہ	۱۳	حجرات	۲۲	تغابن
۵	انفال	۱۴	رحمان	۲۳	تحریم
۶	توبہ	۱۵	حدید	۲۴	دہر
۷	رعد	۱۶	مجادلۃ	۲۵	زلزال
۸	حج	۱۷	الحشر	۲۶	نصر
۹	نور	۱۸	ممتحنہ		

جو سورتیں بالاتفاق مکہ میں نازل ہوئی ہیں اُن کی تعداد ۸۵ ہے اور جو بالاتفاق مدینہ میں نازل ہوئیں ان کی

---

[1]: پورا زمانہ نزول تقریباً ۲۲ سال ۵ ماہ اور ۱۴ دن ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ مختلف روایات کی بنا پر مدت کا یہ تعین قطعی نہیں تخمینی ہے۔

[2]: مکی و مدنی سورتوں کی تفصیل آگے ملاحظہ ہو۔

تعداد ۱۸ ہے اور جن سورتوں کے مقامِ نزول کے بارے میں اختلاف ہے اُن کی تعداد ۳۱ ہے۔

مکّی	(متفق علیہ)	۶۵
مدنی	(")	۱۸
مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف		۳۱
	کل :	۱۱۴

اصولی طور پر مکّی اور مدنی سورتوں کا پسِ منظر، اسلوب، طرزِ بیان، اور آہنگ ایک دُوسرے سے مختلف ہے۔

جہاں تک مکّہ کے دَور کا تعلق ہے، وہاں بعثت کے بعد چار پانچ سال کی تبلیغ کے نتیجہ میں آخر چار پانچ آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرکے امتِ مسلمہ بننے کو تیار ہو گئے لیکن چونکہ مکہ کی کثیر تعداد جہالت یا خود غرضی یا آبائی طریقہ کی اندھی تقلید و عصبیت کے سبب مخالفت پر آمادہ ہوگئی تھی اسلیے اسلامی تحریک کی جاہلیت سے جلد ہی جان گسل کشمکش شروع ہو گئی جس کا سلسلہ کوئی آٹھ نو سال تک چلتا رہا۔ لیکن کفار کی شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ مکہ میں کوئی خاندان اور گھر ایسا نہ رہا جس کے کسی فرد نے اسلام نہ قبول کرلیا ہو۔ اس طویل اور شدید کش مکش کے دوران اللہ تعالیٰ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت اپنے نبی پر وحی نازل فرماتا رہا اور دعوت کو ہر منزل اور اُس کی وسعت و تنوع کے ساتھ ساتھ اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں بھی مضامین کا تنوع بڑھتا گیا۔ یہ ہے قرآن کی مکی سورتوں کا پس منظر[1]

تمام مکی سورتیں عموماً اصولی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ زیادہ زور عقائد اور اخلاق پر دیا گیا ہے چنانچہ اُن میں توحید، رسالت، معاد یا آخرت، تقویٰ، فضیلتِ اخلاق، تبلیغ کے طریقے، صبر و ثبات، فداکاری، انفاق فی سبیل اللہ، راہِ حق سے منہ موڑنے والوں کا انجام اور اُس کی مثالیں، کفار اور مشرکین کے شبہات و الزامات اور اُن کے جوابات وغیرہ بڑی خوبی سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سورتیں مختصر ہیں۔ پُر جوش خطبوں کی شکل میں ہیں جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تند و تیز آگ کی سی تاثیر ہے۔ چھوٹے چھوٹے بلیغ فقروں میں مطالب کو ادا کیا گیا ہے۔ خطاب کے لحاظ سے عموم پایا جاتا ہے اور اکثر پوری انسانیت کو مخاطب کیا گیا ہے۔

> ## حرفِ تسکین
>
> "آپ تو رشتوں کو جوڑنے والے ہیں۔ سچ بولتے ہیں۔ دوسروں کی غمخواری میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور حق و انصاف کا ساتھ دیتے ہیں۔ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اللہ آپ کو کبھی رُسوا نہ کرے گا۔
>
> حضرتِ خدیجہ رضی اللہ عنہا

مدینہ پہنچ کر اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوچکی تھی۔ مکہ میں تو معاملہ صرف اصولِ دین کی تبلیغ اور دین قبول کرنے والوں کی اخلاقی تربیت تک محدود تھا۔ مگر جب ہجرت کے بعد عرب کے مختلف قبائل کے وہ سب لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہونے لگے اور انصار کی مدد سے ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے تمدن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست کے متعلق ہدایات دینی شروع کیں اور یہ بتایا کہ اسلام کی اساس پر یہ نیا نظامِ زندگی کس طرح تعمیر کیا جائے۔

مدنی سورتیں عموماً طویل ہیں، اخلاق، تہذیب، تمدّن اور ریاست کے عظیم مسائل سے بحث کرتی ہیں۔ جزئی اور تفصیلی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ فصاحت و بلاغت کی وہی شان ہے جو مکی سورتوں میں پائی جاتی ہے۔ تہذیب و تمدّن اور عبادات و معاملات کے مباحث زیادہ ہیں عقائد کا بیان بہت کم ہے۔ خطاب میں بھی عموم کم ہے، خصوص زیادہ ہے۔

(۹)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئس سال کے عرصہ میں پورے حسن اور خوبی کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل کی۔ یہاں تک کہ وہ تاریخی دن آیا جب کہ آپ نے لوگوں سے گواہی لی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے مبارک صحرا میں انسانوں کا موجیں مارتا ہُوا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا:

وَاَنْتُمْ تُسْاَلُوْنَ عَنِّیْ فَمَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ؟

لوگو! قیامت کے دن تم سے میری بابت بھی دریافت کیا جائے گا۔ ذرا بتاؤ کہ تم کیا جواب دو گے؟

سب نے بیک آواز کہا:

"ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کے احکام ہم کو پہنچا دیے۔ آپ نے رسالت اور نبوت کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے ہم کو کھوٹے اور کھرے کی بابت اچھی طرح بتا دیا۔"

اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشتِ شہادت کو اٹھایا، آسمان کی طرف انگلی کو اٹھاتے تھے اور پھر لوگوں کی طرف جھکاتے تھے۔ فرماتے تھے "اے خدا سن لے۔ اے خدا گواہ رہنا۔ اے اللہ شاہد رہ۔ یہ سب کیا صاف اقرار کر رہے ہیں"

اسی جگہ اس آیت کا نزول ہُوا:-

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدۃ - ۳)

آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور میں نے تمھارے لیے اسلام کا دین ہونا پسند فرمایا ہے۔

علماء کے ایک حلقے کے نزدیک یہ آخری وحی ہے جو آپ پر نازل ہوئی اس کے بعد نزولِ وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ بعض کا خیال ہے کہ سورۃ بقرہ کی یہ آیت آخری وحی تھی:

وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ

(آیت - ۲۸۱)

اس سلسلے کی روایت کے مطابق اس کے بعد حضوؐر صرف اکیاسی یا اکیس یا سات دن زندہ رہے۔ اس کو آخری مان لیجیے تب بھی معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقصدِ بعثت کو پوری طرح مکمل کر دیا اور انسان کو مذہب و اخلاق کے زیور سے آراستہ کرکے اس قابل بنا دیا کہ قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے جا کر سرخرو ہوسکیں۔

اور اس طرح حرا سے جس داستانِ ہدایت کا آغاز ہُوا تھا اُس کا آخری باب مکمل ہوا۔

قرآن کریم کے تدریجی نزول کا پورا زمانہ تقریباً ۲۲ سال ۵ ماہ ۱۴ دن ہوتا ہے۔

---

[1] : تفہیم القرآن۔ ج ۱ ص ۲۲، ۲۳ ملخصاً

وحی کیا ہے؟

نثار احمد



قرآن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتاب اس کا کلام اور وحی ہے۔ لغت میں لفظ "وحی" متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً اشارہ کرنا' ارسال یعنی پیغام بھیجنا یا بتانا' چپکے سے کسی سے کچھ کہہ دینا اور فطرتاً کسی حکم پر مامور و مقرر کر دینا وغیرہ [1] لیکن شریعتِ اسلامی کی اصطلاح میں جو کلام یا اشارہ الٰہی نبیوں اور رسولوں کی طرف بھیجا جاتا ہے اسے "وحی" کہتے ہیں۔ اسے ہم متعین الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وحی خاص اس ذریعۂ غیبی کا نام ہے جس کے ذریعہ غور و فکر' کسب و نظر' اور تجربہ و استدلال کے بغیر خاص اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے فضل و لطفِ خاص سے کسی نبی کو کوئی علم حاصل ہوتا ہے [2] یہ وحی نبیوں یا رسولوں کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ خود رسول کی ذہنی اُپج یا کسی نامعلوم ہستی کی طرف سے مبہم اشارہ کرنا اور صرف الہام والقا [3] سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی جس پر آتی ہے اسے پورا شعور ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آرہی ہے اس کے منجانب اللہ ہونے کا پورا یقین حاصل ہوتا ہے۔ وہ عقائد' احکام اور قوانین و ہدایت پر مشتمل ہوتی ہے اور

---

[1] ملاحظہ ہو جمہرۃ اللغۃ۔ ابن درید۔ ج ا ص ا، ۱۷۱-۱۷۲' ج ا ص ۱۹۸' ج ۳ ص ۲۳۶۔ تہذیب الصحاح ج ۳' صراح ص ۵۹۴۔

[2] وحی الٰہی۔ سعید احمد اکبر آبادی ص ۲۵

[3] الہام اور وحی میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں علم کا ذریعہ غیبی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ الہام ایسا وجدان ہے جو ہر نفس کو حاصل ہو سکتا ہے اور حس کے ذریعہ کسی چیز کا علم تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا مبدا۔ کیا ہے جبکہ وحی میں علم کا مبدا۔ پوری وضاحت کے ساتھ معلوم رہتا ہے۔ جزوی اشاراتی الہام نبی اور غیر نبی سب پر ہو سکتا ہے جبکہ وحی نبی کے ساتھ خاص ہے اور نبوت محمدیہ کے بعد ایک یہ فرق بھی ہے کہ اب سلسلۂ وحی منقطع ہو چکا ہے' اب نہ کوئی نبی ہوگا اور نہ کسی نبی پر وحی آسکتی ہے۔ البتہ جزوی امور میں اشاراتی الہام کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔

اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی اس کے ذریعہ نوعِ انسانی کی رہنمائی کرے [1]۔

وحی کے ان مذکورہ لفظی اور اصطلاحی معنی کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ ذیل میں ہم ان کی چند مثالیں پیش کریں گے :

۱۔ اشارہ کرنا

سورۂ مریم میں ہے :۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا

پس وہ حضرت (زکریاؑ) محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آئے اور اشاروں سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو۔

۲۔ القا کرنا (دل میں کوئی بات ڈالنا)

سورۂ قصص میں ہے :۔

اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ

اور ہم نے موسیٰؑ کی والدہ کو القا کیا کہ تم ان کو دودھ پلاؤ' پھر جب تم کو ان کی نسبت (جاسوسوں کے مطلع ہونے کا) اندیشہ ہو تو (بے خوف و خطر) ان کو دریا (نیل) میں ڈال دینا اور نہ تو (غرق سے) اندیشہ کرنا اور نہ (مفارقت پر) غم کرنا۔

۳۔ حکم دینا

سورہ مائدہ میں ہے :۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِىْ وَبِرَسُوْلِىْ

اور جب کہ میں (اللہ) نے حواریوں کو حکم دیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔

اسی طرح سورۂ زلزال میں ارشاد ہے :۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا

اس روز زمین سب چیزیں بیان کرنے لگے گی کیونکہ آپ کے رب کا اس کو یہی حکم ہوگا۔

۴۔ فطری تعلیم

سورہ نحل میں آتا ہے :۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۙ ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ

اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔

۵۔ وحیِ اصطلاحی یا وحیِ نبوت

سورۂ نساء میں ہے :۔

اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ

---

[1] تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۵۲

[2] بعض مفسرین نے یہاں کتابت (لکھنے) کے معنی بھی لیے ہیں ملاحظہ ہو المفردات۔ راغب اصفہانی

یقیناً ہم نے تیری طرف اسی طرح کی وحی کی ہے جیسی کہ نوحؑ اور ان کے بعد آنیوالے نبیوں کی طرف کی تھی اور ہم نے وحی کی ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اُن کی اولادوں پر اور عیسٰیؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف اور ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا فرمائی۔

سورۃ شوریٰ میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا. مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا.

اور اسی طرح ہم نے (اے محمدؐ) آپ کے پاس بھی وحی میں اپنا حکم بھیجا ہے۔ آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان (کا انتہائی کمال) کیا چیز ہے لیکن ہم نے اس وحی (یعنی قرآن) کو ایک نُور بنایا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں۔

سورۃ کہف میں ارشاد ہے:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ

(اے محمدؐ) کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ البتہ میری طرف وحی آتی ہے۔

متذکرہ تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ:۔

(۱) وحی انتہائی لطیف تعلیم اور سریع اشارہ ہے جسے معلم اور متعلم (اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے) کے سوا کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔

(۲) وحی کی حقیقت اخفاء (پوشیدگی) اور سرعت (تیزی) ہے۔

(۳) اپنے وسیع معنی میں وحی کی مختلف شکلیں ہیں اور بعض شکلوں میں وحی کا نزول نبی اور غیر نبی دونوں پر (بلکہ حیوانات تک پر) ہوا ہے۔ البتہ اپنے خاص اصطلاحی معنی میں اس کا نزول صرف انبیاء علیہم اسلام ہی کی طرف ہوا ہے۔

(۴) وحی اللہ تعالیٰ کا عطیۂ خاص اور اس کی دین ہے جسے کسب یا مشق وغیرہ سے حاصل نہیں کیا جاسکتا[1]

نزولِ وحی کی کیفیات

بہرحال جس طرح وحی کی مختلف نوعیتیں ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے نزول کے طریقے مختلف اختیار فرمائے ہیں۔ خود قرآن میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ، اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ

ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے سے کلام کرے مگر بطور وحی (قلبی القاء) کے، یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کسی فرشتہ کو بھیجے اور وہ (فرشتہ) حکم خدا جیسا کہ وہ (یعنی اللہ) چاہے وحی کرے۔ بیشک وہ (اللہ) بزرگ ہے حکمت والا ہے۔

ان آیات میں مجملاً تین طریقے بتائے گئے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں کوئی بات بغیر کسی واسطے کے ڈال دی جائے اور وہ قطعی ہو۔ اس کو حدیث میں "القاء فی القلب" اور "نفث فی الروح" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ پسِ پردہ کلام کرے جس طرح وادیٔ مقدس "طویٰ" میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے تھے اور جس طرح معراج کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلام ہوئے۔

(۳) فرشتہ کے ذریعے کلام (بذریعہ قاصد) جو ظاہری آنکھوں سے نظر آسکتا ہے۔ بالمشافہ گفتگو ہو سکتی ہے اور جس کا کلام سنا جا سکتا ہے اسکی دو صورتیں تھی ہیں۔ ایک یہ کہ فرشتہ بشکل انسانی آکر کلامِ الٰہی سنائے[1] جیسا کہ حدیثِ جبریلؑ میں تعلیم دین کے لیے ایک اعرابی کا حضورؐ کے پاس آنا منقول ہے جو دراصل حضرت جبریل علیہ السلام تھے کبھی کبھی جبریلؑ ایک خاص صحابی دحیہ کلبی کی شکل میں بھی آ جاتے تھے[2] دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ اپنی اصل شکل میں آتا اور اللہ کا پیغام آپ تک پہنچاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریلؑ کو اصلی شکل میں دو مرتبہ دیکھا ہے ایک مرتبہ واقعۂ معراج میں سدرۃ المنتہٰی کے پاس اور ایک دفعہ کسی اور مقام پر[3]

فرشتے کے ذریعہ جو وحی آپ پر آتی تھی وہ اپنی کیفیت کے اعتبار سے نہایت سخت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی فرشتہ کے کلام سے پہلے گھنٹی کی سی آواز آتی تھی۔ جب وہ آواز ختم ہو جاتی تو فرشتہ جو کچھ کہتا تھا یاد ہو جاتا تھا۔ اس کی سختی اور شدّت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بقول حضرت عائشہؓ سخت سردی کے موسم میں بھی وحی آپ پر نازل ہوتی تو اس کے شاید بار سے آپ کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلتا تھا اور اگر آپ کسی سواری پر ہوتے تھے تو سواری بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ جاتی تھی۔ حضرت

---

[1] فلاسفہ اور بعض متکلمینِ اسلام کے نزدیک وحی کی حقیقت یہ ہے کہ نفسِ ناطقہ جب اس قدر قوی ہوتا ہے کہ بدن کے ساتھ مشغول ہونے کے باوجود مبادیٔ قدسیہ سے متصل ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ قوت متخیلہ اس قدر قوی ہوتی ہے کہ حسِ مشترک کو حواسِ ظاہری سے نجات دے سکتی ہے تو نفسِ ناطقہ بیداری کی حالت میں بھی عقولِ مجردہ اور نفوس سماویہ سے متصل ہو جاتا ہے اور اس کو غیب کی باتوں کا ادراک کلی طور پر ہوتا ہے اور پھر قوتِ متخیلہ اس کے مشابہ ایک جزئی صورت پیدا کر لیتی ہے۔ یہ صورت حسِ مشترک میں اتر کر مشاہد اور محسوس ہو جاتی ہے گویا ان کے نزدیک وحی قوت متخیلہ کی معراج اور قوائے باطنہ وقدسیہ کی انتہائی استعداد و کمال ہے۔ مختصراً وحی انسان کی باطنی شخصیت کا نام ہے۔ حالانکہ وہ جوہرِ مجردہ قائم بالذات اور پیغام الٰہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فلسفیانہ توجیہات صرف موشگافیاں ہیں۔ اگر یہ حقیقت سامنے رکھی جائے کہ زمین و آسمان کے خالق نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے یہ خاص انتظام کیا ہے تو کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اس کے لیے ہدایت کا یہ انتظام کچھ بھی مشکل نہیں۔

[1] فرشتہ کے انسانی شکل میں آنے کے جتنے واقعات بھی صحیح روایات میں ملتے ہیں (خود قرآن میں بھی ایسے واقعات مذکور ہیں) سے یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر اللہ کے فرشتے انسانی صورت میں آئے اور تعلیم دین کے سلسلہ میں مفید خدمت انجام دی لیکن یہ ثابت نہیں ہے کہ ان میں سے کسی موقع پر قرآنِ پاک کے کسی حصہ کی وحی انہوں نے پہنچائی۔ اس وجہ سے اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ قرآن پاک کی ترسیل فرشتۂ امین نے اپنی اصل شکل ہی میں کی۔ یہ چیز قرآن کے معتبر اور یقینی ہونے کو اور بھی بڑھا دیتی ہے۔

[2] صحیح بخاری۔ کیف نزل الوحی۔

[3] بعض علماء کے نزدیک سورہ نجم کی آیات ۵ تا ۱۴ میں اس کا ذکر ہے۔

عبادہ بن صامت رضؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ پر سخت کیفیتِ اضطراب پیدا ہو جاتی تھی اور چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ لہ آپؐ اس وقت سر جھکا لیتے اور جو صحابہؓ آپؐ کے پاس بیٹھے ہوتے تھے وہ بھی سر نیچا کر لیتے تھے۔ وحی کے بعد آپؐ سر اٹھا لیتے تھے۔

فرشتۂ امین حضرت جبریل علیہ السلام قرآن کے علاوہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے پیغامات بھی لے کر آتے تھے جو قرآن کا حصہ نہیں ہیں؟ اس بنا پر علماء اسلام نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں۔ ایک مُتلُو (تلاوت کی جانے والی وحی جو بہ مع الفاظ آتی ہے) اور دوسری غیر مُتلُو (غیر لفظی وحی جس میں صرف مدعا القا ہوتا ہے) وحی متلو وہ ہے جو قرآن کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہے۔ دوسری قسم یعنی وحی غیر متلو وہ ہے جو احادیثِ صحیحہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ خود قرآن کی تصریح وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ لہ کے مطابق وہ بھی وحی ہے اور ہمارے لیے سرچشمۂ سعادت و فلاح ہے۔ لہ جہاں تک وحی متلو کا تعلق ہے اس کا نزول تھوڑا تھوڑا کر کے تیئس سال کے عرصہ میں ہوا اور سب کا سب بواسطۂ رسول (قاصد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ وہ اس طرح کہ یا تو فرشتہ آ کر آپ کے سامنے آیاتِ الٰہی تلاوت کرتا آپ اس کو سُن کر یاد فرما لیتے تھے اور یہ وحی کاتبانِ وحی کو املا کرا دی جاتی یا وہ کلماتِ الٰہی کو آپ کے قلبِ مبارک پر القاء کرتا اور آپ اسے محفوظ فرما لیتے تھے قرآن کی مندرجہ ذیل آیات میں ان ہی باتوں کا ثبوت ملتا ہے:-

سورۃ البقرہ میں ہے:-

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ

کہو (یہودیوں سے) کہ جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہو۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ جبریل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے۔ (یا پہنچایا ہے)۔

سورۂ نحل میں ارشاد ہے:-

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ۝

ان سے کہو کہ اسے روح القدس (جبریل) نے ٹھیک ٹھیک تیرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے تاکہ ایمان لانیوالوں کے ایمان کو پختہ کرے اور فرمانبرداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں فلاح و سعادت کی خوشخبری دے۔

سورۂ شعراء میں ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝

اس قرآن کو امانتدار فرشتہ لیکر آیا ہے آپ کے قلب پر تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے

لہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ کا رنگ خاکستری ہو جاتا تھا (مسلم)

لہ اور نہ خواہشِ نفس سے کوئی بات زبان پر لاتے ہیں۔ یہ (قرآن) تو حکمِ خدا ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے ——— سورۃ النجم ۳-۴

لہ وحی الٰہی ص ۱۵۵

والوں میں سے ہوں۔

سورۂ قیامہ میں صاف ارشاد ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝

اے نبی آپ قرآن کو پڑھتے ہوئے (اسے یاد کرنے کے لیے) اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھنا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے پس ہم جب اسے پڑھیں



نمونہ خطاطی

تو تم اس کی پیروی کرو۔

مندرجہ بالا آیات سے بھی چند اہم باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

(۱) حضرت جبریلؑ وحی (قرآن) کو آپؐ کے قلبِ مبارک پر نازل فرماتے تھے۔

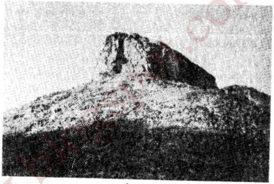
(۲) وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے حکم و اجازت سے آتی تھی۔

(۳) حضرت جبریلؑ نے قرآن کو "حق" کے ساتھ آپ تک پہنچایا ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کی۔ اس سلسلے میں حضرت جبریلؑ کے لیے "امین" کی صفت خصوصاً ذکر گئی ہے۔

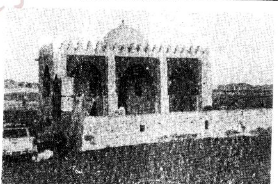
(۴) قرآن تدریج کے ساتھ نازل ہوا ہے تاکہ ایک طرف حضورؐ اس کو پوری آسانی کے ساتھ محفوظ رکھ سکیں اور دوسری طرف ایمان والے اس سے روحانی غذا حاصل کریں اور اس پر باقاعدگی سے عمل کر سکیں۔

(۵) قرآن کے (ایک جگہ) جمع کرنے کی اصل ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی اور حضورؐ نے اسے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں مکمل جمع کرایا اور آخر میں دوبارہ عام لوگوں کے سامنے پورا قرآن سنا کر ہر قسم کے شک و شبہ کو دور کر دیا اور وحی کو تکمیلی شکل دیدی۔

(۶) قرآن کو حق تعالیٰ نے نازل فرمایا اس کا پہنچانے والا فرشتہ طاقتور اور امین (ذو القوۃ المتین) ہے اور اس کو حاصل کرنے والا بھی "امین" ہے۔ پھر اس کے پڑھانے اور جمع کرنے کی ذمہ دار وہ ہستی ہے جو قادرِ مطلق اور فرمانروائے کائنات ہے۔ اس وجہ سے قرآن کے سندِ آخر اور مکمل آسمانی کتاب ہونے میں ذرہ برابر شک باقی نہیں رہتا۔ ●●



جبلِ نور۔ وہ چوٹی جہاں غارِ حرا واقع ہے



مقام بیعتِ رضوان

قرآن اور اُمّتِ مُسلمہ

مولانا محمد یوسف اصلاحی

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام نے تعمیرِ کعبہ کے وقت یہ دعا کی تھی کہ:

"ہمارے پروردگار مجھے اور اسماعیل کو اپنا تابعِ فرمان اور مسلم بنا اور ہماری اولاد سے ایسی امت کو اٹھا جو تیری تابعِ فرمان اور مسلم ہو" (بقرہ : ۱۲۸)

اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کی یہ دعا قبول فرمائی اور آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ایک ایسی امت کو برپا کیا جو قیامت تک کے لیے تبلیغِ دین اور شہادتِ حق کا وہ فریضہ انجام دیتی رہے گی جو ختمِ نبوت سے پہلے اپنے اپنے زمانے میں خدا کے پیغمبر انجام دیتے رہے ہیں۔

"اس نے تمہیں منتخب فرما لیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی گئی ہے۔ پیروی کرو اس دین کی جو تمہارے اپنے باپ ابراہیم کا دین ہے۔ اس نے پہلے ہی سے تمہیں مسلم کے نام سے نوازا تھا اور اسی سلسلے میں کہ رسول تمہارے لیے دینِ حق کی شہادت دیں اور تم دنیا کے سارے انسانوں کے سامنے دینِ حق کی شہادت دو۔" (الحج : ۷۸)

اس سے معلوم ہوا کہ امتِ مسلمہ اصطلاحی طور پر پیغمبر تو نہیں ہے لیکن پیغمبرانہ شان ضرور رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اپنے پیغمبر کے جانشین کی حیثیت سے وہی پیغمبرانہ فریضہ انجام دیتی ہے۔ پھر جس طرح آخری رسول کی آمد کی بشارت مدتوں پہلے دی جا رہی تھی، اسی طرح اس امت کو بھی اس کے ظہور سے بہت پہلے مسلم کے نام سے نوازا گیا تھا۔ یہ گویا امت کے ظہور سے سینکڑوں سال پہلے ایک بشارت تھی کہ ایک ایسی امت برپا کی جانے والی ہے جو اسلام اور بندگیٔ رب کا زندہ نمونہ ہوگی۔ یہ انتخاب ایک عظیم مقصد کے لیے ہوا ہے اور ... کی اصل حیثیت کا یہ اظہار کہ وہ رسول کی جانشین ہے اور اسے وہی کام انجام دینا ہے جو رسول نے انجام دیا۔ اور جس طرح آخری رسول نے اپنے قول و عمل اور شب و روز کی زندگی سے خدا کے دین کو واضح کرنے کا حق ادا کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح امت کو بھی دنیا کے سارے ہی انسانوں کے سامنے خدا کے دین کو واضح کرنا ہے اور دینِ حق زندہ شہادت بن کر رہنا ہے۔ امتِ مسلمہ کی اس امتیازی حیثیت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

"اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم سارے انسانوں کے لیے دینِ حق کے گواہ بنو اور ہمارے رسول تمہارے

گواہ ہوں۔" (بقرہ : ۱۴۳)

یعنی تمھاری حیثیت عام امتوں کی طرح نہیں، تمھیں خدا نے 'امتِ وسط' بنایا ہے۔ اور ایک امتیازی شان بخشی ہے:

"تم انسانوں میں وہ اعلیٰ و اشرف امت ہو جسے دنیا کی تمام قوموں میں صدر کی طرح رہنمائی کی مرکزی حیثیت حاصل ہے اور تم ہر افراط و تفریط سے محفوظ خدا کی سیدھی راہ پر اعتدال کے ساتھ قائم ہو۔ تمھیں خدا نے "شہداء علی الناس" کے امتیازی مقام پر سرفراز فرمایا ہے اور تمھیں قیامت تک اسی شانِ امتیازی کے ساتھ دنیا میں رہنا ہے۔"

ایک اور جگہ امت کا حقیقی منصب قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا:

"تم بہترین امت ہو جو سارے انسانوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر کامل ایمان رکھتے ہو۔" (آل عمران)

یعنی امتِ مسلمہ فکر و عمل کی امتیازی خوبیوں میں دنیا کی تمام قوموں اور جماعتوں میں ایک بہترین امت ہے۔ یہ زندگی کے میدان میں یوں ہی معمول کے مطابق نہیں آنکلی ہے، بلکہ اسے ایک عظیم مقصد کی خاطر نہایت اہتمام سے برپا کیا گیا ہے:

"اسے سارے انسانوں کے لیے وجود میں لایا گیا ہے"

یعنی اسے سارے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اٹھایا گیا ہے اور اب رہتی زندگی تک تمام انسانی جماعتوں کی پیشوائی اور امامت کا فریضہ اسی کو انجام دینا ہے:

"تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔"

یعنی تمھارا کام محض وعظ و نصیحت اور انذار و تبشیر نہیں ہے بلکہ تم نیکی کے آمر اور حاکم بنائے گئے ہو۔ تمھارا حقیقی منصب یہ ہے کہ تم ایک غالب جماعت بن کر رہو اور اپنی سیاسی قوت کے ذریعہ نیکی کو پروان چڑھاؤ اور برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔

قرآن میں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ:

"مسلمانو! خدا نے تمھارے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اس نے نوحؑ کو کی تھی۔ اور جس کی وحی اے رسولؐ ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے اور جس کی ہدایت ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں کہ اس دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو" (شوریٰ-۱۳)

اس آیت پر غور کیجیے۔ آیت میں جن جلیل القدر پیغمبروں کا ذکر ہے اُن میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ ہیں، جو طوفان کے بعد انسانیت کے اولین پیغمبر تھے۔ ان کے بعد سب سے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے۔ پھر درمیان کے سلسلۂ نبوت میں سے تین اہم ترین پیغمبروں کا ذکر ہے۔ جن میں حضرت ابراہیمؑ تو وہ ہیں جن کی عظمت و پیشوائی پر سب ہی متفق ہیں اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی اہمیت یہ ہے کہ دنیا کی دو عظیم ملتیں یہود و نصاریٰ ان کی طرف خود کو منسوب کرتی ہیں۔

سلسلۂ نبوت کے ان پانچ اہم ترین پیغمبروں کے ذکر سے بتانا یہ مقصود ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے بھی رسول

آئے ان سب کا نصب العین یہی تھا کہ خدا کے دین کو قائم کریں۔ سب سے پہلے رسول کو بھی اس کی وصیت کی گئی تھی اور سب سے آخری رسول کو بھی اس کی وحی بھیجی گئی اور درمیان کے ان تین عظیم پیغمبروں کو بھی اس کی وصیت کی گئی جن کی رہنمائی اور نبوت کو تقریباً پوری دنیا تسلیم کرتی ہے۔ لہٰذا امت کا فرض ہے کہ وہ پورے یقین اور شرح صدر کے ساتھ اس نصب العین کو اپنا فریضۂ حیات سمجھے۔

آیت میں خطاب مسلمان امت سے ہے اور کہا گیا ہے کہ تمھارے لیے وہی طریقہ مقرر کیا گیا ہے جس کی تاکید تمام پیغمبروں کو کی گئی تھی کہ دین کو قائم کرو، لہٰذا امت کا نصب العین قرآن قطعی طور پر یہ قرار دیتا ہے کہ وہ کامل یکسوئی اور اخلاص کے ساتھ پورے دین کی پیروی کرے۔ اسے نافذ اور قائم کرے، جو بنیادی عقائد، اصول اخلاق اور انسانی زندگی سے متعلق تمام ہی آسمانی ہدایات پر مشتمل ہے۔ اس حقیقت کی فیصلہ کن دلیل جو فدا کارانِ اسلام کے دلوں میں یقین کی ٹھنڈک پیدا کرتی ہے وہ آخری رسول کا ۲۳ سالہ روشن دور ہے۔ اس دورِ سعادت میں آپ نے عقائد و اخلاق کی تعلیم بھی دی۔ عبادت کے طریقے بھی سکھلائے۔ قرآنی ہدایات کے مطابق انسانی سماج کی تعمیر بھی کی اور انسانی زندگی کو منظم کرنے والی ایک بابرکت ریاست بھی قائم کی۔

پوری عبارت اتری!

ایک مرتبہ فارمن کرسچین کالج کے سالانہ اجلاس میں علامہ اقبال مدعو تھے۔ علامہ خود ہی بیان کرتے ہیں پروگرام ختم ہونے پر ڈاکٹر لوکس (پرنسپل کالج) مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور فرمایا:۔

"اقبال! تمہارے پیغمبر پر قرآن کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی انہوں نے اس کو عربی میں منتقل کر دیا ـــــ یا یہ عبارت اسی طرح اتری تھی؟"

مَیں نے کہا:۔

"یہ عبارت ہی اُتری تھی":

لوکس نے بڑی حیرانی سے کہا:۔

"اقبال! تم جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے...."

مَیں نے کہا:

"یقین کیا میرا تجربہ ہے مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبر پر یہ عبارت کیوں نہیں اُتری ہوگی۔ جب شعر کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو سمجھو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف آرہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہے کہ کسے پکڑ دں۔ کسے چھوڑ دں۔"

(تلخیص از روزگار فقیر)

قرآن کا پس منظر

سید معروف شاہ شیرازی

قرآن کی دعوت پوری انسانیت کے لیے قیامت تک کے لیے ذریعۂ ہدایت ہے لیکن اس عموم کے باوجود قرآن کے مطالب کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر پر نگاہ ڈال لینا ضروری ہے جس میں یہ دعوت اٹھی اور جس کے مختلف عناصر کو اس نے اپنا اولین مخاطب بنایا۔ بلاشبہ انسانیت کے وہ گروہ ایک حیثیت سے اپنے بعد آنیوالوں کے بھی نمائندہ تھے لیکن جس مخصوص صورتحال سے نزول قرآن کے وقت وہ گزر رہے تھے اس کا مطالعہ فہم قرآن کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اس وقت دنیا میں مختلف گروہوں کے کیا عقائد تھے؟ کون سے مذاہب سے قرآن کو اول اول سابقہ پیش آیا؟ کن لوگوں سے اس نے خطاب کیا۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے سوالوں کو ہم پس منظر قرار دے سکتے ہیں۔

(۱) مشرکین مکہ

مشرکین مکہ کا دعویٰ تھا کہ وہ دینِ ابراہیمیؑ کے پیرو ہیں لیکن درحقیقت وہ دینِ ابراہیمیؑ سے بہت دور تھے ان کے ہاں دینِ ابراہیمؑ کے صرف چند شعار کسی نہ کسی حالت میں باقی رہ گئے تھے مثلاً حج (جس کے آداب و شعائر کو انہوں نے بگاڑ دیا تھا) قبلہ، اشہرِ حرام، ختنہ وغیرہ لیکن خدا، رسالت اور آخرت کے متعلق ان کے خیالات دینِ ابراہیمیؑ سے کوسوں دور تھے۔ وہ شرک میں مبتلا تھے۔ قیامت کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد زندہ ہونا کیسے ممکن ہے؟ اسی طرح رسول کی بشریت ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔



خدا کے بارے میں قرآن مجید نے ان کے اعتقادات کی تردید کی۔ قرآن نے بتایا کہ اللہ تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ زمین اور آسمان کے امور براہ راست چلاتا ہے۔ حی اور قیوم ہے اور پھر یہ کام اسے تھکا نہیں سکتے اور نہ ہی وہ سوتا ہے۔ وہ نہایت ہی عظیم طاقتوں کا مالک ہے کسی معاملہ میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ چنانچہ قرآن میں بار بار یہ آتا ہے ھُوَ الْقَادِرُ (وہی قدرت رکھتا ہے) ھُوَ الْعَلِیْمُ (وہی جانتا ہے) ھُوَ رَبُّکُمْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (وہی تمہارا رب ہے اسکے سوا کوئی اللہ نہیں) اُن کے اس غلط خیال کے ابطال میں کہ جس طرح ایک بادشاہ کو خاص امور میں اپنے قریبی درباریوں اور دوستوں کی سفارشات تسلیم کرنی پڑتی ہیں اسی طرح اللہ کے ہاں بھی سفارشات کا اعتبار ہے۔ قرآن مجید نے بتایا کہ لَا یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (اسکی اجازت کے بغیر اس کے ہاں کوئی بھی سفارش نہیں کر سکے گا) علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے نہایت حکیمانہ انداز میں ان کے خود ساختہ معبودوں اور بتوں کے بارے میں کہا کہ محض پتھروں کو پکارتے ہو جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور یہ بھی بتایا کہ تمہارے یہ من گھڑت سفارشی اور معبود قیامت میں خود ہی سب سے

پہلے تم سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔

رسالت کے بارے میں وہ کہتے کہ رسول انسان کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن نے کہا تمام رسول انسان ہی گزرے ہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو اور اگر فرشتہ بھیجا جاتا تو لوگ کہتے یہ تو فرشتہ ہے ہم انسانوں کے لیے نمونۂ عمل کیسے بن سکتا ہے۔

قیامت کے بارے میں قرآن کا بیان ہے کہ دوبارہ پیدا کرنا مشکل ہے یا پہلی تخلیق؟ جس نے عدم سے وجود بخشا اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ پھر وہ ان کو یاد دلاتا ہے کہ موسم بہار و خزاں قیامت کے شاہدِ عادل ہیں۔ نیز خود تمہارے جسم و جان اس پر شاہد ہیں۔

(۲) اہلِ کتاب

مشرکین کے علاوہ قرآن مجید کے ابتدائی مخاطبین میں یہود و نصاریٰ سرِفہرست ہیں۔ عرب کے اندر جو یہودی اور عیسائی آباد تھے ان کے بارے میں قرآن نے بڑی تفصیلی معلومات دی ہیں۔ ان میں سے اہم مباحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(الف) یہود

یہودی اللہ تعالیٰ کو درحقیقت صرف بنی اسرائیل کا خدا سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو برگزیدہ قوم جن سے وہ محبت کرتا ہے اور صرف انہی کے لیے جنت ہے۔ وہ اگر انہیں سزا بھی دیگا تو چند دنوں کے لیے، پھر سب کے سب جنت میں چلے جائیں گے۔ نبوت کو تو انہوں نے اپنی جاگیر سمجھ رکھا تھا اور یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ بنو اسمٰعیلؑ میں بھی کوئی نبی آ سکتا ہے۔ وہ شرک میں بھی مبتلا تھے اور حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے۔

قرآن نے تفصیل سے بتایا ہے کہ یہود کس طرح آیات میں تحریف کرتے تھے۔ انہیں چھپاتے تھے اور کس طرح ان کو اپنے صحیح مدلول سے پھیر کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتے تھے۔

غرض قرآن مجید نے یہودیوں کی پوری تاریخ پر مفصل تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ قوم کس طرح خدا اور رسولوں کے مقابلہ میں نافرمان اور بغاوت پر مصر رہی ہے۔

یہ صورتِ واقعہ بہت عبرت انگیز ہے کہ مدینہ کے یہود نبی آخر الزماںؐ کے منتظر تھے اور غیر یہودی حریفوں کے سامنے فخر اور دھمکی کے طور پر بیان کیا کرتے تھے کہ آنیوالا جب آئیگا تو پھر تم لوگ دیکھنا کہ کیا ہوتا ہے۔[1] پس آنیوالا جب آ گیا اور انہوں نے اسے خوب پہچان بھی لیا،[2] تو سب سے اول کر اسی کی مخالفت پر اتر آئے۔[3]

(ب) نصاریٰ

عیسائیوں نے عقیدۂ توحید ہی بدل دیا تھا۔ اقانیم ثلاثہ کے عقیدے کی رو سے وہ ایک خدا میں تین ذاتوں کے قائل تھے۔ رسالت کے بارے میں بھی وہ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ پر رسالت ختم ہو گئی ہے اور "فارقلیط" کے متعلق جو پیشین گوئی کی گئی ہے اس کا مصداق خود حضرت عیسیٰؑ ہیں اور وہ دوبارہ آ گئے تھے اور انہوں نے اپنی امت کو انجیل کی پیروی کا حکم دیا ہے حالانکہ اس پیشین گوئی میں خود یہ صراحت تھی کہ آنیوالا عیسیٰؑ کا نام لے گا۔ اس طرح اس کا صحیح مصداق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں چنانچہ قرآن مجید نے ان کے تمام عقائد باطلہ کی بتفصیل تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ خدا ایک ہے۔ حضرت مسیحؑ اس کے بندے اور رسول ہیں اور تمام رسول انسان اور بشر ہوتے ہیں۔

عیسائیوں کا خیال تھا کہ حضرت مسیحؑ کو سولی دیدی گئی ہے قرآن مجید نے اس کی بھی تردید کی ہے۔ نیز قرآن مجید نے اس

---

[1] ملاحظہ ہو آیت وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ (بقرہ: ۸۹)

[2] ملاحظہ ہو آیت یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (بقرہ: ۱۴۶)

[3] نیز آیت وَلَا تَکُوْنُوْآ اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ (بقرہ: ۴۱)

نیز آیت مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ (بقرہ: ۸۹)

بارے میں بڑے شدومد سے حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کو ان تمام معاندانہ الزامات سے بری قرار دیا ہے جو یہودی ان پر لگاتے تھے۔

قرآن نے حضرت مسیحؑ کے معجزات پر بھی بحث کر کے بتایا ہے کہ یہ تمام معجزات محض اللہ کی مرضی سے سرزد ہوئے ورنہ بذات خود ان کے دکھانے کی حضرت مسیحؑ میں طاقت نہ تھی۔

یہ بات بہت قابلِ توجہ ہے کہ عیسائیوں میں رُہبان و قسیسین کا جو عنصر جھگڑوں سے کنارہ کش تھا اور جس کے قلب و ضمیر میں حق پسندی اور خدا خوفی کا گداز باقی تھا قرآن نے اس کا ذکر ایک گونہ تعریفی انداز سے کیا ہے۔

(۳) صابی گروہ

نزولِ قرآن کے وقت ایک مختصر گروہ "صابیون" کا بھی تھا جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے کہ "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ" یہ گروہ چونکہ جلد ہی مٹ مٹا گیا اس لیے اس کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ اس کے متعلق جہاں ایک رائے یہ ہے کہ یہ تورات خواں لوگ تھے، دوسری رائے یہ بھی ہے کہ یہ نصاریٰ کا ایک فرقہ تھے (بحوالہ جامع الرموز) ان کی متفق علیہ مشترک بات ستارہ پرستی ہے (بحوالہ کتاب عزر) مگر ستاروں سے ان کو جو عقیدت تھی اس کے متعلق بھی تعبیر کا اختلاف علماء میں ہے جامع الرموز میں بھی اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کی رائے میں بھی (بحوالہ فتح القدیر) یہ لوگ ستاروں کی پوجا (اصطلاحی معنوں میں) نہیں کرتے تھے، تعظیم کرتے تھے۔ کم سے کم یہ واضح ہے کہ ان کی تعظیم بوجہ غلو پرستش اور شرک تک منتہی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں ان کے متعلق فرشتوں کی پرستش کرنے کا بھی ذکر آتا ہے۔

اس قلیل التعداد گروہ کا مسلک چونکہ مروجہ مذہبی گروہوں سے مختلف تھا اس لیے شروع شروع میں اسلام لانے والوں پر بھی یہ پھبتی کسی جاتی تھی کہ یہ لوگ "صابی" ہو گئے ہیں۔ جیسے موجودہ دور میں ہمارے فرقے کہتے ہیں کہ فلاں وہابی ہو گیا ہے۔ اور فلاں بدعتی۔

(۴) متلاشیانِ حق

ان گروہوں کے علاوہ ماحول سے بیزار اور مضطرب افراد پر مشتمل ایک عنصر بھی زیرِ سطح نمودار ہو چکا تھا۔ یہ لوگ خصوصیت سے مشرکین مکہ کے شرک سے غیر مطمئن تھے۔ یہ ایک دھیمی سی بے آواز صدائے احتجاج معاشرے کے کچلے ہوئے ضمیر سے بلند ہو رہی تھی۔ تاریخ کے بیان کے مطابق عین اس لمحے جبکہ کفارِ مکہ اپنے ایک بت کے گرد جمع ہو کر عید یا جشن کی مشرکانہ تقریب منا رہے تھے اور بت کا طواف کر کے چڑھاوے چڑھا رہے تھے، چار آدمی اس تقریب سے الگ تھلگ بیٹھے اس ہنگامۂ لایعنی سے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ ایک طرح کی خفیہ میٹنگ تھی جس میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے اور رازداری کا پیمان باندھنے کے بعد یوں اظہار رائے کر رہے تھے کہ:

"ہماری قوم ایک بے بنیاد مسلک پر چل رہی ہے۔ اپنے دادا ابراہیمؑ کے دین کو ان لوگوں نے ضائع کر دیا ہے، یہ پتھر کہ جس بُت کا طواف کر رہے ہیں وہ نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے، نہ نقصان پہنچا سکتا ہے، نہ نفع دے سکتا ہے۔ ساتھیو! اپنے دلوں کو ٹٹولو تو خدا کی قسم تم محسوس کرو گے کہ تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ملک ملک گھومو اور دینِ ابراہیمؑ کے سچے پیرووں کا کھوج لگاؤ۔" (سیرت ابن ہشام۔ ج ۱ ص ۲۴۲)

ورقہ بن نوفل اور زید بن عمرو کے اشعار بھی محفوظ ہیں جن سے تشنگیٔ دینِ حق کا اظہار ہوتا ہے۔ ان میں بعض نے تلاشِ حق کے لیے بڑی تگ و دو کی۔

دنیا کے دوسرے گوشوں میں بھی خال خال ایسی بے چین روحیں نمودار ہوئیں جو راہِ ہدایت کی تلاش کے لیے آوارۂ شوق ہوئیں اور ان میں سے بعض نبی آخر الزماںؐ کا کھوج لگانے نکلے۔ انہی روحوں میں سے خوش نصیبوں کو داعیٔ حق تک پہنچنے اور ایمان لانے کی سعادت بھی ملی۔

مدعا یہ کہ نزولِ قرآن کے پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے اس قلیل عنصر کو بڑی اہمیت دینی پڑتی ہے جو فی الحقیقت دنیا اور معاشرے کی تشنگیٔ حق کی علامت تھا۔ جو لوگ عملاً شرک یا کسی دوسرے غلط مسلک میں مبتلا تھے، ان کے دلوں میں بھی کوئی وجہ نہیں کہ دبے ہوئے سوالات اور الجھنیں اور شکوک موجود نہ ہوں اور ان میں اتنی خود شعوری یا اتنی جرأت نہ ہو کہ وہ اپنی دبی ہوئی تشنگیٔ حق کو ظاہر کر سکیں۔ ہماری رائے میں دعوتِ حق کے ظہور کے لیے کسی تاریخی دور میں اس قسم کے اضطراب اور تشنگی کا ہونا ایک فطری ضرورت ہے۔

(۵) منافقین

یہود و نصاریٰ کے علاوہ قرآن نے منافقین کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ یہ گروہ نزولِ قرآن سے پہلے کے پس منظر میں موجود نہ تھا بلکہ مکی دور میں بھی اس کا وجود نہ تھا یہ ہجرت کے بعد مدینہ کے پیش منظر میں ابھرا۔ یہ ایک ایسا گروہ ہے جو ہر امت، ہر قوم اور ہر ملت میں رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے مخصوص اغراض و مقاصد کے تحت بظاہر اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض تو اپنے مفروضہ اندیشوں کی وجہ سے اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ کچھ دوسرے جاسوسی اور ریشہ دوانی کی غرض سے مسلمانوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو جہاد کی سختیوں سے بچ کر غنیمت میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو محض دینِ اسلام میں داخل ہونے اور پھر نکل بھاگنے سے اسلام کے ساتھ تمسخر کرنا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے کہ اسلام میں داخل ہو کر اور چند دنوں کے بعد پھر اسلام کو چھوڑ دینے سے اسلام کی شوکت اور عظمت میں فرق آ جائیگا اور لوگ سمجھیں گے کہ یہ کوئی پائیدار مذہب نہیں ہے۔ کچھ ایسے تھے جو اجتماعات میں حضورؐ کی تقریروں میں مداخلت کرتے اور صحیح بات کو بگاڑتے مثلاً "رَاعِنَا" کی جگہ "رَاعِیْنَا" کہتے اور دل میں خوش ہوتے کہ انہوں نے کوئی بڑا کارنامہ کر دکھایا ہے۔ قرآن مجید نے بار بار ان کا ذکر کر کے ان کے اعمال و افعال کو دنیا و آخرت میں بے نتیجہ ثابت کیا ہے اور یہ تنبیہ کی ہے کہ ان کا انجام کافروں سے بھی بدتر ہو گا اور یہ دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں رکھے جائیں گے۔

اِس عنصر کی مختلف اقسام کے کردار اور نفسیات کا بڑا تفصیلی تجزیہ قرآن میں ملتا ہے جس کی مدد سے نہ صرف یہ کہ ہر دور میں اس عنصر کو پہچانا جا سکتا ہے بلکہ نفس و کردار کے تجزیہ کے اصول و اسالیب بھی قرآن سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔



قرآن کا طریقِ دعوت

ابو سلیم محمد عبدالحی

قرآن کریم ایک دعوت کی کتاب ہے اور ایک دعوت اور تحریک کے ساتھ ساتھ نازل کی گئی ہے۔ پورے تئیس سال کی مدّت میں اسلامی دعوت کو جن جن مرحلوں سے ہو کر گزرنا پڑا۔ ان تمام مرحلوں میں اس کتاب نے بروقت رہنمائی کی ہے۔ ہر موقع پر ضرورت کے لحاظ سے اس کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے ہیں۔ ضرورت کے تقاضوں کے ماتحت انداز بدل بدل کر ایک بات کو بار بار دھرایا گیا ہے اور ہر موقع پر کسی ضروری پہلو کو زیادہ ابھارا گیا ہے۔

ایسی کتاب کو اگر آپ دوسری کتابوں کی طرح پڑھیں گے تو ظاہر ہے کہ آپ پورا فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے جو باتیں کسی خاص موقع اور کسی خاص محل پر کہی جاتی ہیں۔ اگر آپ انھیں موقع اور محل کے تصور سے الگ کر کے دیکھیں تو ان میں نہ اثر باقی رہتا ہے اور نہ سننے والے اس سے وہ لطف محسوس کر سکتے ہیں۔ آپ نے خود تجربہ کیا ہوگا۔ کبھی کسی نازک موقع پر خاص حالات کے تحت کسی شاعر کا ایک مصرع یا کسی شخص کا کوئی مقولہ سننے والوں کو تڑپا دیتا ہے لیکن وہی مصرع اور وہی مقولہ اگر ان حالات سے الگ ہو کر دھرایا جائے تو اس میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔

قرآن ایک دعوت کی کتاب ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ قرآن آپ کی آنکھوں کو پُرنم اور آپ کی قوتوں کو متحرک کرے تو آپ پہلے اس دعوت کو اپنائیں جو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ آپ اس دعوت کو عملاً دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اگر آپ سچ مچ اسلامی دعوت کو لیکر اٹھیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ کو قدم قدم پر رہنمائی کی ضرورت ہے اور جب آپ کے حسب ضرورت وہ رہنمائی براہِ راست مالک کائنات کے الفاظ میں آپ کے سامنے آئے گی تو ممکن نہیں کہ آپ کے جذبات میں ابھار پیدا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی آنکھیں پُرنم ہو جائیں۔ اور آپ اپنے اندر ایسی قوت محسوس کرنے لگیں کہ آپ کو دنیا کی ساری قوتیں ہیچ نظر آئیں

ایک ایسا شخص جو پیاسا نہ ہوا اور جسے پانی کی ضرورت بھی نہ ہو وہ پانی کے اوصاف بہت کچھ بیان کر سکتا ہے۔ وہ اچھی طرح بتا سکتا ہے کہ پانی کن گیسوں سے مل کر بنا ہے، کیا خاصیتیں رکھتا ہے۔ کتنے درجے گرمی پا کر اُبلتا ہے، کس درجے پر جم جاتا ہے۔ غرض یہ کہ آپ اُس کی باتیں سُن کر محسوس کریں گے کہ وہ پانی کا مکمل عالم ہے اور پانی کے بارے میں اُس کی معلومات انتہائی قابل قدر ہیں لیکن اگر پانی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ہو تو آپ اُس پیاسے سے پوچھئے جو کسی ریگستان میں کئی دن تک ... کی تلاش

میں گھوم چکا ہو، اور آخر میں کہیں سے ایک پیالہ بھر پانی پا جائے۔

اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے غور کیجیے کہ قرآن پاک کے ابتدائی دور میں اللہ تعالیٰ نے داعیٔ حق (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کچھ ایسی ہدایات دی ہیں جن میں انھیں اس مشکل کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے کی تاکید ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس اونچے کام کے لیے آپ کو منتخب فرمایا تھا۔ اس کے لیے ضروری صلاحیتیں آپ میں پہلے ہی پیدا ہو چکی تھیں۔ آپ دنیا کے تمام انسانوں میں بہتر انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد آپ کو حاصل تھی۔ لہٰذا اپنے آپ کو تیار کرنے والی ہدایات کی ضرورت آپ کو اتنی نہ تھی جتنی کہ آپ کے بعد آنے والے ان لوگوں کو تھی جو آپ کی ہدایات کے تحت اللہ کے دین کو قائم کرنے کا کام کرنے والے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ آپ کی امت میں سے قیامت تک جو لوگ دعوتِ اسلامی کا کام کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ اللہ کے دین کو دنیا میں قائم کرنے کا ارادہ کریں گے اور اس راہ میں کوئی قدم بڑھائیں گے۔ وہ کتنی سخت ضرورت محسوس کریں گے کہ دنیا کے اس سب سے دشوار کام کے لیے انھیں کچھ ہدایات ملیں اور ان کی بروقت رہنمائی ہو۔ ایسے لوگوں کے سامنے جب اس دور کا نازل شدہ قرآن آئے گا، تو انھیں وہی چیز ملے گی جس کو ان کے دل ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ سورہ مزمل جس میں نماز، ذکر اور تہجد سے قوت حاصل کرنے کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات دی گئی ہیں۔ ایک جملہ یہ بھی ہے کہ:

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا

بلاشبہ تمھیں دن میں بڑا لمبا کام کرنا پڑتا

(دعوتِ اسلامی کا کام)

اس لمبے کام کے لیے قوّت کی ضرورت ہے۔ اس خدمت کے لیے تیاری لازمی ہے اور اس قوت اور اس تیاری کے لیے یہ نسخہ موجود ہے۔ بات بالکل کھلی ہوئی ہے۔ جسے کوئی لمبا کام کرنا ہی نہ ہو۔ اس کے لیے ان ہدایات میں کیا رکھا ہے۔ نسخہ اور دوا تو بیمار کو عزیز ہوتا ہے۔

اس طرح آگے بڑھیے۔ مکی دَور کے پورے قرآن میں کفارِ مکّہ کی وہ کش مکش جس نے اہلِ ایمان کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ بطور پس منظر کے موجود ہے۔ اللہ کا نام لینا جرم ہے۔ اپنے پرائے ہوتے جا رہے ہیں۔ دوست دشمنی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ اوچھے اور کمین لوگ با اخلاق اور شریف لوگوں پر قسم قسم کی بیہودہ گندگیاں اچھال رہے ہیں۔ پھر اہلِ ایمان جو کچھ کہہ رہے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں ان میں کوئی مادی غرض چھپی ہوئی نہیں ہے وہ خود سیدھی راہ پر چلنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو خود ان کے ہی بھلے کے لیے سیدھی راہ چلانا چاہتے ہیں۔ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بڑی سیدھی اور سچی بات ہے۔ پھر اُسے زبردستی منوانا نہیں چاہتے۔ مان لینے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ سوچنے اور سمجھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ مگر مخالفین ضد اور ہٹ دھرمی پر اڑے ہوئے ہیں۔ ہر بات کو سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ کسی بات کو معقولیت کے ساتھ سنتے ہی نہیں۔ غور اور فکر کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔

اب ذرا سوچیے اگر کوئی گروہ یا کوئی شخص حق کی دعوت لے کر اُٹھے، اپنی حد تک دنیا میں اللہ کے دین کا پیغام دوسروں تک پہنچانا چاہیے۔ اور اللہ کے دین کو قائم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کوشش شروع کر دے اور اس کے نتیجہ میں اُسے بھی کچھ ایسے ہی حالات پیش آنے

لگیں۔ جن کا کچھ مختصر ذکر اوپر ہوا ہے۔ وہ بھی مخالفتوں کا نشانہ بن جائے اسے بھی اپنے پرایا سمجھنے لگیں۔ اس کے لیے بھی صرف ایک اللہ کا اپنا حاکم و مالک مان لینا جرم ہو جائے اس کی بات کو بھی لوگ سننے اور غور کرنے کے بدلے یوں ہی ہوا میں اڑانے لگیں۔ تو ایسے شخص کو ان نازک حالات میں مناسب اور بروقت ہدایت کی کیسی سخت ضرورت محسوس ہوگی۔

جس اللہ نے امتِ مسلمہ پر قیامت تک کے لیے اقامتِ دین کا فرض عاید کیا ہے اس کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اس مشکل خدمت انجام دینے کے لیے ہدایات بھی دے دی ہیں۔ لیکن ان ہدایات کی صحیح قدر و قیمت جب ہی محسوس ہو سکتی ہے جب اس خدمت اور فرض کو ادا کرنے کے لیے عملاً میدان میں اترا جائے جس کے سلسلہ میں یہ ہدایات دی گئی ہیں۔

اسی انداز پہ آپ ان تمام مضامین پہ غور کرتے جائیے۔

اور پھر فیصلہ کیجیے کہ جب تک واقعی کوئی متحرک دعوتی کام لوگوں کے سامنے نہ ہوں ان کے لیے اس سرمایہ میں سے کتنا تھوڑا حصہ آسکتا ہے۔

═ صبر کی تلقین تو اسی شخص کے لیے موزوں ہے جو مخالفتوں کا شکار ہو رہا ہو اور مشکل حالات میں گھرا ہوا ہو

═ دنیا کو مقصود نہ بنانے کی نصیحت تو اسی کو کی جا سکتی ہے جو دنیا کو جیتنے اور حاصل کرنے کے لیے نکلا ہو۔ توحید و آخرت کی دلیلیں تو اسی شخص کو کو توحید پر لا سکتی ہیں جو پہلے تو خود منکرِ توحید و آخرت رہ ہو یا جسے منکرینِ توحید و آخرت کو بات پہنچانے کی تڑپ ہو

═ شرک کے خلاف قرآن کی پیش کردہ مہم تو اسی کے لیے سبق بن سکتی ہے جو شرک اور توحید کے فرق کو سمجھنے کا اور سمجھانے کا ارادہ رکھتا ہو۔

═ اسلام کے خلاف قسم قسم کے شبہوں کا جواب اور مخالفین کی ڈالی ہوئی الجھنوں کی صفائی کا لطف تو وہی اٹھا سکتا ہے جس نے ان شبہوں کو دور کرنے اور ان الجھنوں کو صاف کرنے کا دردِ سر اپنے ذمہ لیا ہو۔

═ کسی صالح جماعت کے بننے کی ضرورت اور اس کے اصولوں کا ذکر تو اسی شخص کے لیے مفید ہو سکتا ہے جو اسلام کو بحیثیت ایک اجتماعی دین کے خود تسلیم کر چکا ہو۔ اور دوسروں پر اس کی اس حیثیت کو واضح کرنا چاہتا ہو۔

═ اسلامی ریاست کی تعمیر کے لیے بنیادی اصول تو اسی شخص کی دلچسپی کا موجب ہو سکتے ہیں جس کے سامنے کسی اسلامی نظام کو واقعی برپا کرنے کا سوال ہو

═ اسلامی تمدن اور اسلامی رہن سہن کے اصول و ضوابط کو سمجھنے کی کوشش تو وہ کرے جسے واقعی کوئی اسلامی معاشرہ تیار کرنا ہو اور ایسے معاشرے کو دنیا کے سامنے ایک جیتے جاگتے اسلامی نمونے کی حیثیت سے پیش کرنا ہو۔

═ زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی ہدایات کا علم تو اس کے لیے ضروری ہے جس نے اپنی زندگی کے لیے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ اُسے بہر حال اسلامی اصولوں پر قائم رہنا ہے اور دنیا کے تمام دوسرے اصولوں پر ان اصولوں کی برتری کو اپنے قول اور اپنے عمل سے ثابت کرنا ہے۔

═ منافقوں کے ذکر میں تو اسی کے لیے نصیحت ہے جو ہر آن اس بات سے ڈرتا ہو کہ کہیں کوئی منافقوں جیسی بات اس میں پیدا نہ ہو جائے اور جو اس بات کا درد رکھتا ہو کہ اپنی حد تک امتِ مسلمہ سے اس

روگ کو دور کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔

═ جنگ کی ہدایات، جنگ کے اخلاق اور جنگ کی پابندیوں کا تذکرہ تو اسی کے لیے مفید ہو سکتا ہے جس نے کسی ایسے کام کی ابتدا کی ہو جس کے نتیجے میں کبھی ایسا خطرناک وقت آنے کا بھی کوئی امکان ہو۔ لیکن جن لوگوں نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے خیال میں بے ضرر راستے اختیار کر لیے ہوں اور جو ہر قدم کو نہ صرف پھونک پھونک کر رکھتے ہوں بلکہ ہر دم اس بات کے لیے تیار ہوں کہ جب اور جیسی ضرورت پڑے قدم فوراً واپس ہٹالیا جائے تو ان کے لیے یہ ساری باتیں پچھلے واقعات سے زیادہ کیا اہمیت رکھ سکتی ہیں۔

غرض یہ کہ پورے قرآن پر نظر ڈالی جائے۔ اس کا ہر مضمون مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی منظم تحریک، کسی مستقل دعوت کا پروگرام اور کسی عملی جدوجہد کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ اس کے بغیر یہ سارے مضامین تقریباً بے روح ہوتے ہیں اور اس بات کا سب سے بڑا زندہ ثبوت خود آج امتِ مسلمہ ہے۔

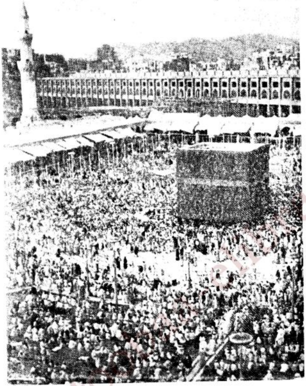
اب بھی مسلمانوں کا ایمان ہے کہ ان کی بگڑی ہوئی حالت کا صحیح علاج صرف قرآن پاک ہے لیکن یہ علاج ان ہی لوگوں کے لیے کارگر ہو سکتا ہے جو یہ طے کر لیں کہ وہ اس پروگرام کو لے کر اٹھیں گے جو قرآن پیش کرتا ہے اور اس دعوت کو عملاً پیش کرنے کی جدوجہد کریں گے جس کی ہدایات قرآن کے ہر صفحے پر مل سکتی ہیں۔ سب سے پہلے مسلمانوں کا حصہ ہے کہ وہ اس خدائی ہدایت کو سچے معنوں میں قبول کریں اور اس دنیا کے سامنے پیش کریں لیکن اگر خدانخواستہ انھوں نے اس خدمت کو انجام نہ دیا تو اللہ کا یہ نورِ ہدایت تو پھیل کر رہے گا۔

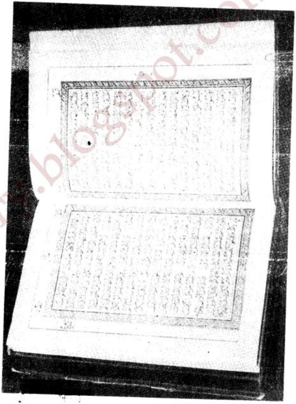
اللہ تعالیٰ کچھ اور لوگوں کو اٹھائے گا۔ اور وہ اُن کی طرح ناکارہ نہ ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو محرومی سے بچائے اور اپنے دین کو قائم کرنے کی ہمیں سعادت نصیب فرمائے۔ یہی اس زندگی کی سب سے بڑی کمائی ہے۔



حج بیت اللہ کا منظر





حضرت علامہ اقبال کا زیرِ مطالعہ قرآن مجید

علامہ شبلی نعمانی



احکامِ قرآنی کا طریقِ نزول

یہ علامہ شبلی مرحوم کے ایک طویل مضمون کا خلاصہ ہے، اور ایک ابتدائی بحث چھوڑ دینے کی وجہ سے عبارت کا آغاز بہ طریقِ معروف نہیں ہے۔

یہ تمام انتظامات اور نظم و نسق، اسلام کا حقیقی نصب العین نہ تھا بلکہ یہ اس لیے تھا کہ ملک میں امن و امان پیدا ہو اور ایک منظم اور باقاعدہ حکومت کا وجود ہو، تاکہ مسلمان بے روک ٹوک اور بلا مزاحمت اپنے مذہبی فرائض انجام دے سکیں۔ ہجرت سے آٹھ برس تک کا زمانہ تمامتر ان فتنوں کی دار و گیر، مخالفوں کی شورشوں اور ہنگاموں کی مدافعت اور ملک میں امن و امان قائم کرنے میں گزرا۔ اسی لیے آٹھ برس کی وسیع مدت میں فرائضِ اسلام سے پہلے جو چیز ہر جگہ اور ہر موقع پر نمایاں نظر آتی ہے وہ صرف جہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایک ایک غزوہ کی

تفصیل سینکڑوں صفحات میں ہے۔ لیکن نماز، روزہ، زکوٰۃ کے متعلق دو دو چار چار سطروں سے زیادہ واقعات نہیں ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ جب کوئی سنہ ختم ہوتا ہے تو اس قدر لکھ دیتے ہیں کہ اسی سال فرض نماز کی رکعتیں دو سے چار ہو گئیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدانخواستہ اربابِ سیر دیگر فرائض کی اہمیت اور عظمت پیشِ نظر نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غزوات کی مصروفیت (اور ملک کی بدامنی) کی وجہ سے اکثر فرائض دیر میں فرض ہوئے، اور جو پہلے فرض ہو چکے تھے اُن کی تکمیل بھی بتدریج اسی زمانہ میں ہوتی رہی جس کے لیل و نہار زیادہ تر مخالفین کے تیرباران کے روکنے میں بسر ہو گئے۔ جن احکام کا تعلق قانونِ ملکی سے تھا وہ اس وجہ سے نازل نہ ہو سکے کہ اب تک اسلام کوئی حکمران طاقت نہ تھا۔ خالص مذہبی فرائض اور احکام بھی رفتہ رفتہ اسی زمانہ میں نازل ہوتے رہے اور بتدریج جیسے جیسے اُن کے مناسب حالات پیدا ہوتے جاتے تھے، وہ تکمیل کو پہنچ رہے تھے۔ سب سے بڑا نکتہ احکام کے تدریجی نزول میں یہ تھا کہ اُن سے مقصود محض عربوں کو اُن کا بتا دینا نہیں بلکہ عملاً اُن کی زندگی کو اُن پر کاربند بنا دینا تھا۔ اس لیے نہایت آہستہ آہستہ بتدریج ترتیب کے ساتھ اُن کو آگے بڑھایا گیا۔ الغرض ان مختلف اسباب کی بنا پر اسلام کے اکثر فرائض اور احکام اُس وقت تکمیل کو پہنچے جب تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔ مکۂ معظمہ کے قیام تک روزہ سرے سے فرض نہیں ہُوا۔ مدینہ منورہ میں روزے فرض ہُوئے، لیکن زکوٰۃ کی فرضیت سات آٹھ سال کے بعد ہوئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ رات دن کی معرکہ آرائیوں سے مالی حالت اس حد تک پہنچنے کہاں پائی تھی کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا موقع آئے۔ فتحِ مکّہ سے پہلے مسلمان اس سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس لیے اس وقت تک حج بھی فرض نہ ہُوا۔ نماز روزانہ کا فرض ہے اور یہ فرض اسلام کے وجُود کے ساتھ آیا۔ لیکن اس کی تکمیل تدریج ہجرت کے چھ سات برس کے بعد ہوئی۔

غرض فتحِ مکّہ کے بعد جب کفر کا زور ٹوٹ گیا اور تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا تو مذہبی احکام کی تفصیل اور نظامِ شریعت کی تکمیل کا موقع آیا۔

مکۂ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ بیشتر عقائد کے متعلق تھیں، شرک اور بت پرستی کی بُرائی، خدا کی عظمت و جلال کا اظہار، قیامت کے ہولناک سماں اور جنت و دوزخ کا پُراثر بیان، رسالت کے خواص اور اس کی ضرورت کے دلائل، مکّہ میں تیرہ برس تک زیادہ تر یہی مطالب ادا ہوتے رہے۔ غرض عقائد کے تمام اجزا اگرچہ آغازِ اسلام میں لوگوں کو سنائے جا چکے تھے۔ لیکن مکّی آیتوں کے استقصا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کا بیان الگ الگ ہوتا تھا۔ عقائد کا مسلسل بیان سورۂ بقرہ اور سورۂ نسا میں ہے اور یہ سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں۔ مکّی سورتوں میں زیادہ تر زور توحید، قیامت کے اعتقاد اور رسول کی صداقت پر صرف ہُوا ہے لیکن مدینہ میں آکر اسلام کے تمام عقاید اور اصولِ اولین کی مجموعی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔

اس کی تفصیل سورۂ بقرہ کے آخر میں کی گئی ہے۔ یہ آیتیں غالباً ہجرت کے چند سال بعد نازل ہوئی تھیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ اور ابنِ عباسؓ کی روایتوں سے ثابت ہے۔

رفتہ رفتہ ایمان اور اسلام کے اصولِ کلیہ کی جب تکمیل ہو چکی تو اس کے جزئیات اور دیگر لوازم کی بھی تعلیم دی گئی۔ آپ نے فرمایا کہ "ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں، جن میں ایک شاخ حیا ہے"۔ ایک دفعہ فرمایا کہ "بہترین اسلام یہ ہے کہ مسلمان مسلمان کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ

رہیں ۔ایک اور صاحب کے جواب میں فرمایا کہ "بہترین اسلام یہ ہے کہ محتاجوں کو کھانا کھلاؤ اور کسی سے جان پہچان ہو یا نہ ہو مگر اس کو سلام کرو"۔ یہ بھی فرمایا کہ "اس وقت تک تم مومن نہیں جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو"۔ غرض اسلام کے تمام اصول و فروع کی تعلیم اسی طرح بتدریج تکمیل کو پہنچتی گئی اور آخر ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ جمعہ کے روز وہ ساعت آئی جب خدا نے فرمایا:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

یعنی آج ہم نے تمہارا مذہب مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

احکام کا تدریجی نزول کس طرح ہوا۔ اس کا مکمل بیان تو ایک دفتر کا طالب ہے۔ البتہ اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہم عبادات کی مثال لے سکتے ہیں۔ پھر اس پر معاملات اور دوسرے احکام کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔

نماز

نماز روزہ، حج، زکوٰۃ عبادات میں داخل ہیں۔ ان میں سب سے اوّل نماز ہے۔ نماز کی صحت کے لیے متعدد شرطیں ہیں۔ اوّل اور ضروری شرط طہارت ہے۔

طہارت کے معنی یہ ہیں کہ جسم اور لباس ظاہری اور معنوی ہر قسم کی نجاستوں سے پاک ہو۔ طہارت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اُس کا اندازہ اس سے کرو کہ دوسری ہی وحی سے جب احکام اور فرائض کا آغاز ہُوا تو توحید کے بعد دُوسرا حکم طہارت ہی کا دیا گیا[1] نماز سے پہلے وضو کرنا فرض ہے۔ اس فرضیت کا ثبوت ابتدائے اسلام سے ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ و سیر اور بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ وضو کا طریقہ آغازِ وحی ہی میں حضرت جبرئیلؑ نے آپؐ کو سکھایا تھا۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت ابنِ عباسؓ سے ایک روایت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہجرت سے پہلے بھی وضو فرماتے تھے لیکن قرآن میں وضو کا حکم باتفاق محدثین ۵ھ میں مدینہ میں نازل ہُوا۔

اس بنا پر اکثر علما کی رائے یہ ہے کہ وضو پر عمل تو پہلے سے تھا۔ لیکن قرآن میں اس کی فرضیت ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد نازل ہوئی۔ اسی طرح ابتداءً وضو ٹوٹے یا نہ ٹوٹے۔ ہر نماز کے وقت تازہ وضو کرتے تھے۔ لیکن آخر اس حکم کے عام مسلمانوں پر سخت ہونے کے خیال سے ہر بار تازہ وضو کرنا ضروری نہ رہا۔ اور اس کا اعلان آپؐ نے عملاً فتح مکّہ کے وقت فرمایا۔

وضو کے لیے پانی کی ضرورت ہے لیکن سفر میں اس کا ہر وقت ملنا مشکل ہے۔ نیز بیماری کی حالت میں پانی کا استعمال کبھی مضر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے ۵ھ میں تیمم کی آیت نازل ہوئی۔

بہرحال جہاں تک نماز کا تعلق ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ فرض ہوئی۔ چنانچہ دوسری ہی وحی میں حکم ہُوا:

وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (مدثر - ۳)

اپنے پروردگار کی بڑائی (تکبیر) بیان کرو

اس تکبیر سے مقصود بجز نماز کے کیا ہوسکتا ہے؟ چونکہ تین برس تک دعوتِ نماز مخفی رہی اور کفار کے ڈر سے علانیہ نماز پڑھنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے صرف رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا۔ دن میں کوئی نماز فرض نہیں ہوئی۔ اس کے بعد صبح و شام کی دو دو

---

[1] : سورۃ المدثر۔

رکعتیں اور فرض ہوئیں۔

رات کو دیر تک نماز پڑھنے کا جو حکم تھا ایک سال تک قائم رہا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آپؐ کا اور اکثر صحابہؓ کا ایک سال تک اس پر عمل رہا۔ نماز پڑھتے پڑھتے اُن کے پاؤں سوج جاتے تھے۔ ایک سال کے بعد فرضیت منسوخ ہوگئی۔ پھر فجر، مغرب اور عشاء، تین وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ

(ہود - ۱۱۴)

دن کے دونوں ابتدائی اور انتہائی کناروں میں (یعنی فجر و مغرب) اور رات تھوڑی گزرنے کے بعد نماز پڑھا کرو۔

معراج میں جو نبوّت کے پانچویں سال ہوئی، پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں اور سورۃ اسراء میں، جو معراج کے بیان پر مشتمل ہے، یہ آیت اُتری:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ، اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا ۝ وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ

(سورہ بنی اسرائیل ۷۸-۷۹)

نماز کے اوقات زوالِ آفتاب سے لیکر ظلمتِ شب تک ہیں (ظہر، عصر، مغرب عشا) اور صبح کی نماز کہ صبح کی نماز میں سب جمع ہوتے ہیں۔ اور رات کو تہجد پڑھ (یہ تیرے لیے مزید ہے)۔

ہجرت سے قبل رکعتیں دو ہی فرض تھیں۔ مدینہ منوّرہ میں آکر جب قدرے اطمینان ہُوا تو چار رکعتیں فرض ہوگئیں۔

مکّہ میں چار شخصوں کا یکجا ہو کر نماز ادا کرنا ناممکن تھا۔ اس لیے جمعہ کی نماز فرض نہ تھی (کیونکہ جمعہ کی پہلی شرط جماعت ہے)، لیکن مدینہ منورہ میں انصار کی ایک بڑی جماعت اسلام لا چکی تھی اور کوئی شخص ادائے نماز میں خلل انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے آنحضرتؐ کی تشریف آوری سے قبل جو مسلمان مدینہ آ چکے تھے، اسعد بن زراۃ کی تحریک سے بنی بیاضہ کے محلے میں انھوں نے جمعہ کی سب سے پہلی نماز ادا کی۔ مصعب بن عمیر امام تھے۔ اور کل چالیس مسلمان نمازی تھے۔ اس کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے قبا میں قیام فرمایا۔ یہاں سے روانگی کے لیے آپ نے قصداً جمعہ کا دن متعین فرمایا۔ بنی سالم کے محلے میں پہنچے تو نماز کا وقت آگیا۔ چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سب سے پہلے نمازِ جمعہ یہیں ادا فرمائی۔ یہ آواخرِ ربیع الاوّل ۱ھ کا واقعہ ہے۔

روزہ

اسلام سے پہلے قریش عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے۔ اس دن خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اس دن روزہ رکھتے تھے اور عجب نہیں کہ آپؐ کی پیروی میں دوسرے صحابہؓ بھی روزہ رکھتے ہوں۔ ۵ نبوی میں، یعنی ہجرت سے آٹھ برس پہلے حضرت جعفرؓ نے حبش کے نجاشی کے سامنے اسلام پر جو تقریر کی تھی اس میں روزہ کا ذکر بھی موجود ہے۔ غالباً اسی دن کا روزہ ہوگا۔ اُس کے بعد جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود بھی اُس دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے لوگوں سے وجہ پوچھی۔ لوگوں نے بیان کیا کہ حضرت موسیٰؑ نے اسی روز فرعون کے ہاتھ سے نجات پائی تھی۔ آپؐ نے فرمایا "تو ہم کو موسےٰؑ کی تقلید کا زیادہ حق ہے"، چنانچہ آپ نے یہاں بھی، عاشورہ

کا روزہ رکھا۔ (اور صحابہؓ کو بھی رکھنے کا حکم دیا)، پھر ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کا روزہ مستحب ہو گیا۔ یعنی جس کا جی چاہتا تھا رکھتا تھا اور جو نہیں چاہتا تھا نہیں رکھتا تھا۔

اہلِ عرب روزہ کے بہت کم خوگر تھے۔ اوّل اوّل روزہ اُن پر شاق ہوا۔ اس لیے نہایت تدریج کے ساتھ روزہ کی تکمیل کی گئی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)، جب مدینہ میں تشریف لائے تو سال میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ پھر روزے کی فرضیت نازل ہوئی اور یہ اختیار رہا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھے، اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلا دے۔ رفتہ رفتہ جب لوگ روزے کے خوگر ہو چلے تو یہ آیت اُتری:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ

یعنی جو رمضان کا مہینہ پائے وہ روزہ رکھے۔

اب روزہ فرض ہو گیا اور فدیہ کی اجازت جاتی رہی البتہ جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو، اُس کے لیے یہ حکم ہوا کہ اُس وقت روزہ توڑ دے اور اُس کے بدلے کسی اور وقت قضا کر دے۔

زکوٰۃ

خیرات اور زکوٰۃ کی ترغیب اور تحریص اسلام میں ابتدا سے موجود تھی۔ مکہ میں جو سورتیں اُتریں اُن میں زکوٰۃ کا لفظ تصریحاً مذکور ہے اور خیرات نہ دینے والے پر عتاب ہے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ

(الماعون۔ ۱-۳)

یعنی تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے، یہی وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور مسکین کے کھانا کھلانے کی لوگوں کو ترغیب نہیں کرتا۔

مدینۂ منورہ میں زیادہ تاکیدی آیتیں نازل ہوئیں ۲ھ میں عید کے دن صدقۂ فطر دینا واجب قرار پایا۔ ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان اور خصوصاً مہاجرین سخت فقر و فاقہ میں مبتلا تھے۔ حدیثوں میں صحابہ کے فقر و تنگ دستی کے جو واقعات کثرت کے ساتھ مذکور ہیں، اسی زمانہ کے ہیں۔ اس بنا پر یہ حکم ہوا کہ جس کے پاس مصارف سے جو کچھ بچے سب کو خیرات کر دینا چاہیئے ورنہ عذاب ہوگا۔

اب صدقہ اور خیرات کی طرف یہ عام رغبت پیدا ہوئی کہ جو لوگ نادار تھے وہ صرف اس لیے بازار میں جا کر مزدوری کرتے اور کندھوں پر بوجھ لاد کر لوگوں کے پاس پہنچاتے تھے کہ مزدوری ملے تو خیرات کریں۔ بایں ہمہ ۸ھ تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی۔ فتح مکّہ کے بعد اس کی فرضیت ہوئی تو اس کے مصارف بیان کیے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ممالکِ مقبوضہ میں زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے محرم ۹ھ میں محصلین مقرر فرمائے۔

حج

دنیا میں سب سے پہلے کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ نے خدا پرستی کی عبادت گاہِ عام بنایا اور دنیا کو وہاں آکر عبادت کرنے کی دعوت دی۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعوتِ عام پر دنیا نے لبیک کہا اور ہر سال عرب کے دور دراز اطراف کے لوگ حج کو آتے تھے۔ لیکن ایک طرف تو یہ افسوسناک انقلاب ہوا کہ جو گھر خالص توحید کے لیے تعمیر ہوا تھا وہ تین سو ساٹھ بتوں کی تماشہ گاہ بن گیا۔ دوسری طرف اس گھر کی تولیت

کا سب سے زیادہ جس کو حق تھا وہ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا۔ اور پورے آٹھ برس تک ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا۔ بالآخر ظہورِ حق کا وقت آیا۔ مکہ فتح ہوا اور جانشینِ ابراہیمؑ اور اُن کے متبعین کو موقع ملا کہ شعارِ ابراہیمی کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ چنانچہ ۹ھ میں حج فرض ہوا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال یہ فرض ادا نہیں کیا کہ عرب ننگے ہو کر طوافِ کعبہ کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بے حیائی کا منظر آنکھ سے دیکھنا گوارا نہیں فرما سکتے تھے۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ ایامِ حج میں روانہ کیے گئے کہ کعبہ میں جا کر منادی کر دیں کہ آئندہ سے کوئی شخص عریاں ہو کر کعبہ کا طواف نہ کرنے پائے گا۔

ایک اور وجہ یہ تھی کہ نسی کے قاعدہ سے حج کا مہینہ ہٹتے ہٹتے ذیقعد میں آ گیا تھا۔ چنانچہ ۹ھ کا حج اسی مہینہ میں ادا ہوا۔ لیکن حج کا اصلی مہینہ ذوالحجہ تھا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال کا انتظار فرمایا۔ اور اُس وقت حج ادا کیا جب وہ اپنے اصلی مرکز پر آ گیا۔

اسی طرح حج کی رسم اگرچہ کفار نے قائم کر رکھی تھی لیکن اس کی صورت بالکل بدل دی تھی اور اس میں اس قدر بدعات اضافہ کر دیے تھے کہ ثواب کے بجائے عذاب کا کام بن گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رفتہ رفتہ ان تمام بدعات کو دور کیا۔ اور اصلاحات کا حکم دیا۔ جسے خدا کے رسولؐ نے بتدریج نافذ کیا۔

یہ ہے وہ تدریجی طریقہ جس کے ذریعہ وحیِ الٰہی نے عبادات کے نظام کو مکمل کیا۔ زندگی کے باقی تمام شعبوں کی ہدایت کے لیے بھی اسی طریقہ کو اختیار کیا گیا اور ۲۳ سال کی مدت میں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے دین کو قائم کر دیا اور مکمل ہدایت انسانیت کے لیے چھوڑ گئے۔



حافظ نذر احمد



باب السعود
حرم کعبہ
مکہ مکرمہ

چند مقاماتِ نزول

غارِ حرا

(مکہ مکرمہ سے تین میل شارعِ عرفات پر جبل النور کی بلندیوں میں)

وہ بابرکت غار جس کی تنہائیوں میں ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے قبل خلوت گزینی، عبادت اور غور و فکر کے کئی دور گزارے اور جس کی خلوتوں میں اللہ تعالیٰ کے آخری کلام کی پہلی وحی نازل ہوئی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

پڑھ اپنے رب کے نام سے، جس نے پیدا کیا، انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب بڑی عزت والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔ (العلق ۹۶ - ۱تا۵)

کوہ صفا

(بیت اللہ کے سامنے وہ پہاڑی جہاں حجاج کرام سعی کرتے ہیں)

وہ پہاڑی جس کے دامن میں حضرت ہاجرہ اپنے لختِ جگر ننھے اسماعیل (علیہ السلام) کے لیے پانی کی تلاش میں بار بار دوڑی تھیں۔ تا آنکہ انھیں حضرت اسماعیلؑ کے قدموں میں زم زم کا چشمہ اُبلتا نظر آیا۔ یہ پہاڑی "اللہ کا نشان" بنی اور ہر زائرِ حرم کے لیے حضرت ہاجرہ کی یاد تازہ کرنے لیے یہاں سعی کرنا (دوڑنا) لازم قرار پایا۔ ارشادِ ربانی ہے:۔

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِیْمٌ

"بیشک صفا و مروہ اللہ کے نشانات ہیں" پس جو کوئی خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ اُن کے درمیان طواف کرے۔ اور جو کوئی خوشی سے کوئی نیکی کرے، سو اللہ قدردان اور جاننے والا ہے۔

(البقرہ ۲ : ۱۵۸)

دارِ ارقم

(مکہ مکرمہ میں بیت اللہ سے متصل حضرت ارقم کا مکان)

دعوتِ اسلامی کا مرکزِ اولین، جہاں حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والے اولین صحابہؓ جمع ہوتے۔ داعیٔ برحق سے اسلام کی تعلیم حاصل کرتے اور چھپ چھپ کر بحضورِ حق سجدہ ریز ہوتے۔ اس مختصر سے گھر میں حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا تھا۔ اور اُن کی شمشیرِ برہنہ جو خاکم بدہن داعیٔ اسلام کو ختم کرنے کے لیے اُٹھی تھی یہیں آ کر جہادِ حق کے لیے وقف ہو گئی۔

مسجد جنّ

(مکہ مکرمہ کی ایک تاریخی مسجد)

قرآن مجید کے انتیسویں پارہ میں ایک مشہور سورۃ "الجن" ہے۔ جس کا نمبر ۷۲ ہے۔ "عامل" حضرات اس کے ورد وظیفے کرتے ہیں۔ مگر تعلیماتِ قرآنی کے دلدادہ اس میں عبرت



صفا و مروہ — یہاں حاجی سعی کرتے ہیں — (بشکریہ ڈاکٹر محمد الیاس مسعود)

اور موعظت کے بے پایاں خزانے پاتے ہیں سورۃ جن نزول کے اعتبار سے مکی سورۃ ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کا نزول جس مقام سے منسوب تھا وہاں مسجدِ جن تعمیر کردی گئی ہے۔ سورت کی ابتدا اِن الفاظ سے ہوتی ہے۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا

"کہہ دیجیے مجھے وحی ہوئی ہے کہ جنوں میں سے کتنے ہی لوگ تھے جنھوں نے توجہ سے بات سُنی۔ پھر کہنے لگے ہم نے سنا ہے ایک قرآن عجیب کہ سمجھاتا ہے۔ نیک راہ۔ سو ہم اس پر ایمان لائے اور ہم ہرگز کسی کو اپنے رب کا شریک نہ کریں گے (الجن ۷۲: ۱، ۲)

داعیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جان نثار صحابہؓ اپنا گھر بار اور سب کچھ چھوڑ کر مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ نکل کھڑے ہوتے۔ شہر سے ایک منزل پہلے قبا کی بستی والوں نے اس خانماں برباد قافلہ کو اپنا مہمان بنایا اس چند روزہ قیام میں قافلہ سالارؐ نے یہاں عباداتِ الٰہی کے لیے پہلی مسجد کی بنیاد رکھی۔ اس کے بارے میں ارشادِ الٰہی ملاحظہ ہو۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ

"البتہ وہ مسجد اوّل دن سے جس کی بنیاد پرہیزگاری پر رکھی گئی۔ وہ زیادہ لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں۔ اور اللہ پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

(التوبہ ۹: ۱۰۸)



وہ مقام جہاں جنوں کی ایک جماعت حضورؐ کی رسالت پر ایمان لائی۔

مسجدِ قبا

(مدینہ منورہ سے چار میل دور تاریخِ اسلام کی اولین مسجد)

وادئ بدر

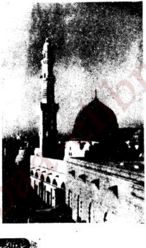
(مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان)

اولین معرکۂ حق و باطل کا میدانِ کارزار جہاں تین سو تیرہ بے سرو سامان مجاہدینِ حق ایک ہزار کیل کانٹے سے لیس کفار سے بھڑ گئے۔ فتح و نصرتِ الٰہی نے اہلِ ایمان و صبر کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس بارے میں قرآن حکیم کا بیان ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

"اور تحقیق اللہ نے بدر میں تمھاری مدد کی جبکہ تم کمزور تھے۔ سو اللہ سے ڈرو۔ تاکہ تم شکرگزار ہو جاؤ"

(اٰل عمران ۳: ۱۲۳)



مزید تفاصیل قرآن میں ملاحظہ ہوں

جبلِ اُحد

(مدینہ منورہ کے شمال میں تاریخی پہاڑ)

وہ تاریخی پہاڑ جس کے دامن میں تاریخِ اسلام کا دوسرا بڑا معرکہ ہُوا۔ جس کے درمیان تصویر میں آپ ایک درّہ دیکھ رہے ہیں۔ اس درّہ پر مامور تیر اندازوں سے مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں مجتہدانہ غلطی سرزد ہوئی۔ جس کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ دامنِ اُحد میں رحمتِ عالمؐ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے۔ عمِ رسولؐ حضرت امیر حمزہؓ اور دُوسرے متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شمعِ رسالتؐ پر قربان ہو گئے۔ دشمنوں نے افواہ اڑا دی خاکم بدہن سرورِ کائناتؐ شہید ہو گئے ہیں۔ اس سے ساتھیوں کے دل بیٹھنے لگے۔ ارشادِ الٰہی ہُوا۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ

"اور محمدؐ تو رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول ہو گزرے ہیں۔ وہ اگر مر گئے یا قتل کر دیے گئے تو کیا تم اپنے الٹے پاؤں لوٹ جاؤ گے، اور جو اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ گیا اُس نے اللہ کا ہرگز کچھ نہیں بگاڑا اور اللہ عنقریب شکرگزاروں کو جزا عطا کرے گا"

(آل عمران ۳: ۱۴۴)

مقامِ خندق

(مدینہ منورہ میں غزوۂ احزاب کا مقام)

۵ھ میں قریشِ مکہ اور کفارِ عرب کے متعدد عساکر چاروں طرف سے جمع ہوئے۔ اس طوفانی حملہ کو روکنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے ساتھ مل کر بیس دن کی قلیل مدت میں مدینہ منورہ کے گرد وسیع و عریض خندق کھود دی۔ کم و بیش مزید بیس دن کفار کا محاصرہ جاری رہا۔ صحابہ کرامؓ نے اس موقع پر بڑی پامردی کا مظاہرہ کیا۔ قرآنِ کریم میں اس کی تصویر کشی اِن الفاظ میں ہوئی ہے :۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا

"اور جب مومنوں نے (کفارِ عرب کے) لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے۔ یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم سے اللہ اور اُس کے رسول نے —— کیا تھا اور سچ کر دکھایا اللہ اور اُس کے رسول نے۔ اور اُن کے اندر یقین و جذبۂ اطاعت اور بڑھ گیا۔"

(الاحزاب ۳۳ : ۲۲)

مسجد قبلتین

(مدینہ منورہ)

مکی زندگی میں ۱۳ سال اور ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بھی ۱۶ ماہ تک نمازیں قبلۂ اوّل مسجدِ اقصٰی کی طرف منہ کر کے ادا کی جاتی تھیں۔ رجب ۲ھ میں "مسجدِ قبلتین" کے اندر عین دورانِ نماز مسجدِ اقصٰی کے بجائے بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم نازل ہوا۔ سب کے رُخ قیامت تک کے لیے خانہ کعبہ کی طرف پھر گئے :



مسجد قبلتین جہاں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا (بشکریہ ڈاکٹر محمد الیاس مسعود)

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ

"سو اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف پھیر لیں۔ اور تم جہاں کہیں ہو اپنا رُخ اُس کی طرف پھیر لیا کرو" (البقرة ۲ : ۱۴۴)

مسجد سیّدنا امیر حمزہؓ

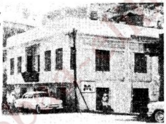
(مدینہ منورہ - جبل احد کے دامن میں)

۳ھ میں کفر و اسلام کی دوسری آویزش احد کے دامن میں ہوئی۔ اس معرکہ میں عمِ رسول سیّد الشہدا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت نے جامِ شہادت نوش کیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ غم بڑا غم تھا۔ جس کی طرف کلام اللہ نے یوں ارشاد کیا :

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ :

"(احد کے معرکہ میں) اگر تمہیں زخم لگا ہے، تو (اس سے قبل میدانِ بدر میں) انھیں بھی ایسا ہی زخمِ کاری لگ چکا ہے اور ہم اس سلسلۂ ایام کو لوگوں میں باری باری گردش دیتے رہتے ہیں" (آل عمران ۳ : ۱۴۰)

(دامن کوہ میں بائیں طرف شہدائے احد مدفون ہیں اور دائیں طرف حضرت امیر حمزہؓ کی آخری آرام گاہ ہے' اور مسجد سیّدنا امیر حمزہؓ !



مولد النبیؐ (مکّہ مکرمہ) وہ مقام جہاں حضورؐ کی ولادت ہوئی

وادیٔ عرفات

(مقامِ حج —— جبل الرحمت کی وادی)

اس مقدس وادی میں حج کے دن ذوالحجہ کی ۹ تاریخ کو خدائے واحد کے پرستار آتے ہیں۔ مشرق و مغرب سے، شمال و جنوب سے، دور دراز سے آتے ہیں۔ کالے گورے، سُرخ و سفید، ہر رنگ اور ہر نسل کے مرد و زن، چھوٹے بڑے، امیر و غریب حاضر ہوتے ہیں۔ یہ جواب ہے اُس پکار کا جو تقریباً پانچ ہزار سال قبل حضرت ابراہیمؑ جدالانبیاء کی زبان سے بلند ہوئی تھی :۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ

"اور لوگوں کے درمیان حج کے لیے منادی کر دے کہ تیری طرف آئیں پیدل چل کر، دُبلے پتلے اونٹوں پر سوار ہو کر' دور دراز کی راہوں سے" (الحج ۲۲ : ۲۷)

مشعر الحرام

(مزدلفہ کی وادی میں)

مقاماتِ حج میں سرفروشانِ وادیٔ عشق کی ایک مختصر منزل' جہاں دو چادروں کے احرام میں لپٹے ہوئے پرستارانِ حق میدانِ عرفات سے واپسی پر ۹ و ۱۰ ذی الحجہ کی

درمیانی شب میں مختصر قیام کرتے ہیں۔ اور اس ارشادِ خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں کہ :۔

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ

"پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو اللہ کو یاد کرو "مشعر الحرام" کے نزدیک۔ اور اللہ کو یاد کرو جیسے تمھیں سکھایا ہے"

(البقرۃ ۲ : ۱۹۸)

وادیٔ منیٰ

(قافلۂ حجاج کی پہلی اور آخری منزل)

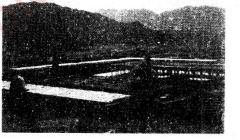
وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ

"ان ایام میں اللہ کا نام لیں۔ ان جانوروں کو ذبح کرنے لیے جو اللہ نے ان کو عطا کیے ہیں، سو ان میں سے خود بھی کھائیں اور محتاجوں کو بھی کھلائیں"

(الحج ۲۲ : ۲۸)

مسجدِ فتح

(بہ مقامِ غزوۂ خندق۔ مدینہ منورہ)



مسجدِ خیف (منیٰ)

(بشکریہ ڈاکٹر محمد الیاس مسعود)

عرفات جاتے ہوئے ایک دن کے لیے اور واپسی پر ۱۰ سے ۱۲ ذوالحجہ تک اہلِ ایمان کے قافلے اس وسیع و عریض وادی میں فروکش رہتے ہیں۔ یہیں "رمی جمرات" کرتے ہیں، جسے عرفِ عام میں شیطان پر کنکریاں مارنا کہا جاتا ہے۔ یہیں سنتِ ابراہیمیؑ کو زندہ رکھنے کے لیے جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔ جس کا حکم کتابِ الٰہی میں یوں آیا ہے :۔

غزوۂ خندق کے موقع پر کفّار کا محاصرہ بیس دن جاری رہا۔ یہ طویل عرصہ صحابۂ کرامؓ نے شب و روز کفار کے متوقع حملہ اور خندق کی حفاظت میں خندق پر گزارا۔ اس دوران جہاں جہاں نمازیں ادا کی گئیں وہاں خندق کے ساتھ ساتھ مساجد بن گئیں جو "مساجدِ فتح" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان میں سے ایک ممتاز مسجد کی تصویر پیش کی جا رہی ہے۔

مسجد قبا



(بشکریہ ڈاکٹر محمد الیاس مسعود)

قرآن مجید کے پارہ نمبر ۲۱، ۲۲ کی مشہور سورۃ نمبر ۳۳ "الاحزاب" اس غزوہ سے منسوب ہے۔

بیعتِ رضوان

سنہ ۶ ھ میں رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ مدینہ منورہ سے عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ دو منزل پہلے ہی حدیبیہ کے مقام پر کفار نے اُن کا راستہ روک لیا۔ صلح کی گفت و شنید کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سفیر بن کر گئے کہ اُن کی شہادت کی افواہ اُڑ گئی۔ اس موقع پر صحابہ کرامؓ نے حضرت عثمانؓ کے انتقام کے لیے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی جسے "بیعتِ رضوان" کہا گیا۔ ارشادِ خداوندی ہے :

"بیشک درخت کے نیچے جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے"

(الفتح ۴۸ : ۱۰)

مسجد اقصیٰ

(فلسطین کے شہر بیت المقدس میں)

مسلمانوں کا قبلۂ اول۔ بہت سے جلیل القدر انبیاء حضرت موسیٰ، داؤد اور سلیمان علیہ السلام کی یادگار نبی اکرمؐ کے سفرِ معراج کی پہلی منزل اور نشاناتِ خداوندی کا مرکز جس کے بارے میں خالقِ ارض و سما نے فرمایا :

"پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ کو راتوں رات سیر کرائی۔ مسجد حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک، جس کے اردگرد کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اُسے اپنی نشانیاں دکھا دیں۔ بیشک وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔"

(بنی اسرائیل ۱۷ : ۱)

مدائن صالحؑ

(قومِ ثمود کے آثار)

مدائن کا وہ تاریخی کنواں جہاں سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی نے پانی پیا تھا۔ اس اونٹنی کو اللہ تعالیٰ نے "ناقۃ اللہ" کا نام دیا اور اپنا نشان قرار دیا۔ اس کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے؛

"سو اُن سے اللہ کے نبی نے کہا یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ اس کی پانی پینے کی باری ہے۔"

الطور

(ارضِ مقدس کا تاریخی پہاڑ سینا)

اس بابرکت پہاڑ کو الطور، جبل الطور، طورِ سینا کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کلام اللہ میں اسے طورِ امین بھی کہا گیا ہے۔ (سورۃ طٰہٰ ۲۰ : ۸۰) اور اس کی وادی کو وادی الایمن کا بھی نام دیا گیا ہے (سورۃ القصص ۲۸ : ۳۰)۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہاں جلوۂ خداوندی دیکھا۔ اور اللہ جل شانہ سے ہمکلامی کی، اور یہیں انھوں نے یہ پُرجلال تقریر سنی۔

اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى

"بیشک میں تیرا رب ہوں۔ اپنی جوتیاں اُتار دے۔ تو طویٰ کی وادی میں ہے۔"

(سورہ طٰہٰ ۲۰ : ۱۲)

یہیں سے فرعون کے سامنے جاکر کلمۂ حق کہنے کا فرمان ملا اور دو بیّن معجزات عطا کیے گئے۔

جبلِ زیتون

ارضِ مقدس فلسطین کا مشہور پہاڑ۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے مولد سے قریب ہے۔ یہیں اُن کے شب و روز گزرے۔ اُن کے اکثر مواعظ میں کوہِ زیتون کا ذکر آتا ہے۔ قرآن مجید میں اس نام سے ایک مستقل سورۃ "والتین" ہے۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ، وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ، وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ

"قسم ہے تین۔ زیتون۔ طورِ سینا اور اس شہرِ امن کی" (سورۃ والتین ۹۵ : ۱)

مدین کا کنواں

شہرِ مدین حضرت شعیب علیہ السلام کا مسکن تھا۔ مصر میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں غیر ارادی طور پر ایک قتل ہوگیا تو وہ اپنا وطن چھوڑ کر اس طرف آگئے۔ سب سے پہلے وہ اس کنوئیں پر پہونچے۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے:

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ، وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ

"اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہونچے، تو وہاں لوگوں کی ایک جماعت کو پانی پلاتے دیکھا۔ اُن کے ورے اس نے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنی بکریاں روکے کھڑی تھیں"

(سورۃ القصص ۲۸ : ۲۳)

یہیں سے وہ حضرت شعیب علیہ السلام کے خانوادہ سے منسلک ہوئے۔

حضرت مسیحؑ یہود کی عدالت میں

بیت المقدس کی وہ "عدالت" جس میں یہود کی ایک جیوری نے نقیبِ امن حضرت مسیح علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) 'مجرم' قرار دیا اور مصلوب کرنے کا حکم جاری کیا مگر وہ اپنے عزائم پورے نہ کر سکے۔ قرآن مجید نے اعلان کیا ہے:

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ

"اور ان کا یہ کہنا کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح ابن مریم کو قتل کر دیا ....."

(سورۃ النساء ۴ : ۱۵۷)

حضرت مسیحؑ بیت المقدس کی گلیوں میں

بیت المقدس کی وہ گلی جس کے باب میں کہا جاتا ہے کہ یہودی انھیں اس راہ سے صلیب پر چڑھانے کے لیے لے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی تردید میں فرمایا:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ، وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ، مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ، وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا

"اور انھوں نے نہ اُسے قتل کیا۔ نہ اُسے سُولی پر چڑھا۔ بلکہ معاملہ اُن کے لیے مشتبہ کر دیا گیا (یعنی وہ غلط فہمی کا شکار ہوگئے)، اور وہ جو اُس کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ بھی شک میں مبتلا ہیں۔ اُن کے پاس کوئی یقینی خبر نہیں۔ وہ تو صرف اٹکل پر چل رہے ہیں۔ اور انھوں نے بالیقین اُسے قتل نہیں کیا" (سورۃ النساء ۴ : ۱۵۷)



"ایوانِ کتابت" محسن علی آفندی روڈ، کراچی

تلاوتِ قرآن کے آداب

(ادارہ)



قرآن مجید ایک پُرعظمت کتاب ہے۔ یہ کسی معمولی شخص کی نہیں' زمین و آسمان کے خالق' مالک اور رب کی کتاب ہے۔ یہ وہ قولِ ثقیل ہے (سورۃ المزمل ——— ۵) جس کے متحمل زمین و آسمان نہ ہو سکے اور جو اگر خارا صفت اور فلک بوس پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ لرز اُٹھتے (سورۃ الحشر ——— ۲۱) اتنی پُرعظمت ہونے کے ساتھ ساتھ یہ وہ کتاب ہے جس کا ہر بول شیریں اور مسحور کُن ہے' جسے سُن کر دل و دماغ مسخر ہو جاتے ہیں' آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور ایمان بڑھ جاتا ہے (سورۃ الانفال ——— ۲)

پھر یہ کتاب محض ایک متبرک کتاب نہیں' بلکہ کتابِ ہدایت ہے۔ وہ ضابطۂ حیات جس پر ہماری دنیا کی کامیابی اور آخرت کی فلاح کا انحصار ہے۔ اس کا ہم پر کم سے کم حق یہ ہے کہ اس کی عظمت کا پورا پورا اعتراف کریں' اُسے کثرت سے پڑھیں ——— مداومت کے ساتھ پڑھیں' اُن آداب کو ملحوظ رکھ کر پڑھیں جن کی یہ مستحق ہے' سمجھ کر اور غور و فکر کے ساتھ پڑھیں اور اس جذبہ کے ساتھ پڑھیں کہ اس کتاب کی روشنی میں ہمیں اپنی زندگی کو بدلنا اور سنوارنا ہے۔

قرآن کو اس شعور و احساس سے پڑھنا چاہیئے کہ یہ ایک ہستیٔ برتر کا کلامِ عظیم' ہمارے مالک کا نوشتہ' ہمارے فرمانروا کا فرمان نامہ اور ہمارے محبوب کا مکتوبِ مقدس ہے۔

اِسے کھولتے ہی تعوذ کے ساتھ حسبِ ذیل باتیں ذہن میں تازہ کر لی جائیں تو قرآنی رحمت کے دروازے ضرور کُھلیں گے:——

ایک یہ کہ مجھے اپنی زندگی کے لیے صرف اسی کتاب سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنی ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ باطل ہے۔

دوم یہ کہ مجھے اس میں سے اپنے مطلب کی باتیں تلاش کر کے خواہشاتِ نفس کے راستے نہیں بنانے ہیں بلکہ ان پابندیوں کو معلوم کرنا ہے جو اللہ نے میرے لیے لازم کی ہیں۔

سوم یہ کہ قرآنی حقائق اور اوامر و نواحی کو مجھے سیدھی طرح اُن کے سادہ و عام فہم مفہوم کے ساتھ بسر و چشم قبول کرنا ہے اور اُن کو تاویلاتِ باطلہ کا ہدف نہیں بنانا ہے۔

چہارم یہ کہ اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی میں جو چیزیں قرآنی ہدایت کے خلاف پائی جاتی ہیں ان کو غلط اور خلافِ حق تسلیم کرنا ہے ——— اُن کے لیے قرآن سے زبردستی سندِ جواز نہیں نکالنی ہے۔

اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کے کچھ ظاہری آداب ہیں اور کچھ باطنی کیفیات ——— ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سے اچھی طرح واقف ہو اور ان پر اخلاص کے ساتھ عمل کرے۔ اس مضمون میں ہم ان ہی آداب کو مختصراً بیان کریں گے۔ قرآن مجید کا ہم پر کم سے کم حق یہ ہے کہ اسے کثرت سے پڑھا جائے' مداومت کے ساتھ پڑھا جائے اور سمجھ کر پڑھا جائے تلاوت کے اوقات میں رات کو اور صبح کے وقت کو خصوصی فضیلت حاصل ہے ——— بلاشبہ ان اوقات میں دل و دماغ قرآن کے پیغام کو سُننے کے لیے زیادہ سے زیادہ مستعد ہوتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے کہ

یتلون آیات اللہ اناء اللیل

یعنی جو اللہ کی آیات کی تلاوت راتوں کے وقت کرتے رہتے ہیں۔ فجر کے وقت تلاوت کی فضیلت قرآن حکیم میں آئی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ظہر' عصر' مغرب اور عشاء کی نمازوں کے علاوہ صبح کو قرآن پڑھنے کی ربانی ہدایت کی گئی ہے کیونکہ ان قرآن الفجر کان مشہودا ۱ (سورۂ بنی اسرائیل - ۷۸)

حدیث شریف میں ہے کہ جو قرآن مجید کا ایک حرف تلاوت کرے گا اسے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ (حدیث)

○ دو چیزوں میں رشک جائز ہے جن میں سے ایک یہ کہ کسی کو اللہ تعالےٰ نے قرآنی علوم سے نوازا ہو اور وہ رات دن اس میں غرق رہے (حدیث)

○ "جس طرح مجھے تمام مخلوق پر فضیلت ہے اسی طرح قاریٔ قرآن کو دوسرے لوگوں پر فضیلت ہے" (حدیث)

○ "اپنے گھروں کو قرآن کی تلاوت اور نماز سے روشن رکھو" (حدیث)

○ "میری اُمت کی سب سے افضل عبادت تلاوتِ قرآن مجید ہے" (حدیث)

○ "تلاوت اللہ کا دسترخوان ہے اسے نہ چھوڑو" (حدیث)

○ "قرآن والو قرآن کو اس طرح پڑھو جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے رات دن پڑھو اسے پھیلاؤ۔ اس کے مضامین پر غور کرو تاکہ تم کامیاب رہو" (حدیث)

مقدارِ تلاوت

"جو قرآن مجید کو تین دن سے کم میں ختم کرے گا وہ کچھ نہ سمجھے گا" (حدیث) "تین دن سے کم میں قرآن مجید ختم نہ کرو" (ابن مسعودؓ۔ معاذ بن جبلؓ)

درج بالا حدیث شریف اور حضرت ابن مسعودؓ اور معاذ بن جبلؓ کے اثر سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ تین دن کے ختم کی اجازت ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ آپ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا تھا آپ نے فرمایا کہ "ایک ماہ میں ختم کرو" حضرت عبداللہ بن عمرو نے فرمایا کہ "حضورؐ میں اس سے بھی زیادہ کی قوت اپنے اندر پاتا ہوں۔" تو آپؐ نے فرمایا کہ "دس دنوں میں ختم کرو"۔ آپ نے مزید کمی کا مطالبہ کیا تو آپؐ نے فرمایا سات دنوں میں ختم کرو۔ اس سے کم میں نہیں۔ اسی طرح ابو صعصعہ کی روایت میں بھی ہے کہ ان کو حضورؐ نے آخری حد سات دن (ایک ہفتہ) بتائی۔

○ "حضورؐ کے قوی و تندرست ساتھی سات دن میں ختم قرآن کرتے تھے بعض ایک ماہ میں بعض دو ماہ میں اور بعض اس سے بھی زیادہ میں" (مکحول) حضرت لیثؒ کہتے ہیں کہ سال میں دو

---

۱ بے شک صبح کی تلاوت میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

دفعہ ختم کرو۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر سال میں دو دفعہ ختم ہوگیا تو حق ادا ہوگیا کیونکہ جبرئیلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آخری سال میں دو دفعہ دہرایا تھا۔

○ امام نوویؒ فرماتے ہیں جو لوگ دوسرے دینی کاموں میں مصروف ہوتے ہیں انہیں اپنی فرصت کے مطابق کچھ حصہ سمجھ کر پڑھنا چاہیے لیکن جو لوگ فارغ ہوتے ہیں انہیں زیادہ سے زیادہ پڑھنا چاہیے۔

یاد کر کے بھلا دینا قرآن مجید کو یاد کر کے بھول جانا گناہ کبیرہ ہے حضورؐ فرماتے ہیں کہ مجھ پر میری اُمت کے گناہ پیش کئے گئے ان میں سب سے بڑا گناہ قرآن مجید کو بھول جانے کا گناہ تھا۔ سہو سے مراد صرف لفظوں کا بھول جانا ہی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید کی تعلیمات کو بھول جانا بھی اس میں شامل ہے۔

ایسا شخص قیامت کے دن کوڑھی ہو کر اُٹھے گا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت کرو اور بار بار پڑھو۔ ورنہ تم بھول جاؤ گے۔

پاکیزگی اور طہارت قرآن کہتا ہے لایمسہ الا المطھرون (اِسے صرف پاک وصاف لوگ چھو سکتے ہیں)

○ عورتوں کو ناپاکی کے دنوں میں پڑھنا جائز نہیں ہے۔ البتہ وہ قرآن مجید کے مطالب پر غور کریں اور ان کو دماغ میں لائیں یہ جائز ہے۔ نیز پڑھتے وقت جگہ کی صفائی کا بھی لحاظ رکھا جائے۔

○ جب بھی تلاوتِ قرآن مجید شروع کی جائے تو اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ضرور پڑھی جائے اور ہر سورت کو شروع کرتے وقت بسم اللہ کی تلاوت کی جائے (سورہ توبہ) اگر کسی سورت کے درمیان سے تلاوت شروع کرنی ہو تو بھی اعوذ باللہ اور بسم اللہ سے آغاز کیا جائے۔

○ قرآن مجید کو جلد جلد نہیں بلکہ ٹھہر ٹھہر کر اور ترتیل سے پڑھنا ضروری ہے کہ ایک ایک حرف اپنے مخرج سے ادا ہوجائے۔ خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے ورتل القرآن ترتیلا (اور قرآن مجید کو صاف صاف پڑھو) یعنی اس طرح کہ ایک ایک حرف واضح ہو۔

○ قرآن کا یہ طریقۂ تلاوت محض اس لیے رکھا ہے کہ لوگ قرآن مجید کو خوب سمجھ کر پڑھیں اور ویسے ہی محض سرسری طور پر نہ گذر جائیں۔

تدبر فی الآیات قرآن مجید میں بار بار "تدبر فی القرآن" کی تاکید کی گئی ہے قرآن وحدیث کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں غور وفکر کرنا نہایت ضروری ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ لوگ قرآن مجید کو پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قرآن مجید کو اتارا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس کی آیات میں تدبر کیا جائے۔

کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ یہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر اتارا۔ بابرکت کتاب تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں۔

افلا یتدبرون القرآن (کیا یہ لوگ قرآن مجید پر غور نہیں کرتے؟) علماء نے کہا ہے کہ قرآن مجید کو غور سے پڑھنا چاہیے اور اس کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا جائزہ لینا چاہیے۔ قرآنی تعلیمات پڑھ کر اپنی کوتاہیوں پر رونا کارِ ثواب ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو رونا نہ آئے تو وہ بہ تکلف روئے اور اپنے آپ کو قرآن سے متاثر کرے۔

خوش الحانی قرآن مجید کو خوش آوازی سے پڑھنا جائز ہے لیکن اگر خوش آوازی ایسی ہو کہ وہ گانے یا موسیقی سے قریب تر ہوجائے اور قرأت کے حدود وقیود

پامال ہوں اور قرآن کی عظمت اور اس کی تقدیس مجروح ہوں تو یہ سخت ناپسندیدہ ہے۔

جہر واخفا تلاوت جہر واخفاء دونوں صورتوں میں کی جاسکتی ہے۔

قرآن مجید جہر یعنی اونچی آواز سے پڑھنا بالاتفاق جائز ہے لیکن اس پر کچھ قیود بھی ہیں مثلاً اگر کوئی پاس سو رہا ہو یا کوئی نماز پڑھ رہا ہو۔ یا کسی ایسے کام میں مصروف ہو جسے وہ چھوڑ کر قرآن کی طرف ہمہ تن متوجہ نہیں ہوسکتا تو پھر اونچی آواز سے پڑھنا جائز نہیں ہے کیونکہ قریب والا شخص قرآن کی اس ہدایت وتاکید پر عمل نہیں کرسکتا کہ:

اذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا۔ جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔

"حضرت ابوسعید فرماتے ہیں کہ حضورؐ اعتکاف میں تھے، لوگ مسجد میں جہراً قرآن مجید پڑھنے لگے آپؐ نے پردے سے اپنا سر مبارک باہر نکال کر فرمایا ——— "آپ لوگ اپنے رب سے مناجات کر رہے ہیں لہذا ایک دوسرے کو تکلیف نہ دیں اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں اونچی آواز سے بھی نہ پڑھیں"۔

ہاں کوئی مانع نہ ہو اور دوسرے لوگ سننے کے لیے آمادہ ہوں تو بلند آواز سے پڑھنا کارِ ثواب ہے کیونکہ یہ بھی دائرہ تبلیغ اور اشاعتِ قرآنی میں شامل ہے۔

سلسلۂ تلاوت منقطع کرنا کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ سلسلۂ تلاوتِ قرآن مجید کو بغیر کسی ضرورت کے قطع کر دے بعض صحابہ کرامؓ جب تلاوتِ قرآن شروع کر دیتے تھے تو پھر کسی سے بات نہ کرتے تھے البتہ ضرورت ہو تو بات کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے انسان کی عقلِ سلیم اور ضرورت ہی معیار ہے البتہ دوسرے حضرات کو بھی چاہیے کہ وہ کسی معمولی بات کی وجہ سے تلاوت کرنے والے کو پریشان نہ کریں۔

ترجمہ کی تلاوت قرآن مجید کے مضامین کو سمجھنے کے لیے بالاتفاق ترجمہ پڑھنا جائز ہے اور کارِ ثواب بھی ہے لیکن ثواب کی غرض سے محض ترجمہ کی تلاوت میں اختلاف ہے۔ بہرحال بہتر یہی ہے کہ ترجمہ پڑھتے وقت بھی اصل عبارت کی تلاوت ضرور کی جائے۔ اگر کوئی عربی پڑھ ہی نہ سکتا ہو تو وہ اس وقت تک ترجمہ پڑھے جب تک کہ عربی پڑھنے پر قادر نہیں ہوجاتا۔

مسنون باتیں قرآن پاک ختم کرنے کے بعد دعا کرنا مسنون ہے جہاں جہاں سجدۂ تلاوت آتا ہے وہاں سجدہ کرے۔ ختم کے بعد اپنے اہل وعیال کو جمع کر کے دعا کرے جس میں اپنے گناہوں سے بخشش طلب کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے۔

ذریعۂ معاش بنانا تلاوتِ قرآن مجید کو ذریعۂ معاش بنانا ممنوع ہے۔ امام بخاریؒ اپنی تاریخ میں روایت کرتے ہیں۔

"جس شخص نے کسی ظالم کے سامنے اس لیے قرآن پڑھا کہ اس سے کچھ مالی منفعت حاصل کرے تو ایسے شخص کو ہر حرف کے عوض دس لعنتیں ملیں گی"

ایک دوسری حدیث کا مضمون ہے۔

"جو شخص قرآن پڑھے اسے چاہیے کہ وہ قرآن کے واسطے سے اللہ سے اپنی حاجت مانگے کیونکہ آئندہ کچھ لوگ ایسے بھی آنے والے ہیں جو قرآن کو پڑھ کر لوگوں سے بھیک مانگیں گے"۔

رموز واوقاف قرآن قرآن حکیم عام انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا گیا ہے اس لیے اس کے اسلوب میں گفتگو کا پیرایہ ملتا ہے اسی کے پیش نظر علماء اسلام نے قرآن کے رموز واوقاف وغیرہ مقرر کرنے کا عظیم الشان کام انجام دیا ہے۔ اب ایک عام آدمی

قرآن کی تلاوت صحت کے ساتھ کرسکتا ہے۔

چند اہم نشانات

○ —— وقفِ تام اور آیت کی علامت اس پر ٹھہرنا چاہیئے۔

م —— وقفِ لازم کی علامت ہے اس پر ضرور ٹھہرنا چاہیئے ورنہ معانی میں ابہام پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔

ط —— وقفِ مطلق کی علامت اس پر ٹھہرنا چاہیئے البتہ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اس علامت کے بعد موضوعِ گفتگو جاری رہتا ہے اور ابھی اس سلسلہ کی کچھ بات باقی رہتی ہے۔

ج —— اختیاری وقف کی علامت ہے یہاں ٹھہرنا بہتر ہے اور آگے تلاوت رکھنا جائز ہے۔

ز —— ایسے مقامات پر نہ ٹھہرنا مناسب ہے یہ وقف مجوز کی علامت ہے۔

ق —— "قِیْلَ عَلَیْهِ الْوَقْفُ" کا خلاصہ ہے یہاں ٹھہرنا نہیں چاہیئے۔

ص —— یہ وقفِ مرخص کی علامت ہے یہاں ملا کر پڑھنا چاہیئے لیکن اگر کسی وجہ سے پڑھنے والا ٹھہر جائے تو رخصت ہے۔

صلے —— یہ علامت "اَلْوَصْلُ اَوْلٰی" کا اختصار ہے یعنی عبارت اگلے ٹکڑے کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے۔

وقف —— اس کے معنی ہیں ٹھہر جاؤ۔ یہ علامت ان مقامات پر استعمال ہوتی ہے جہاں ملا کر پڑھنے کا احتمال ہو۔ اس لیے متوجہ کیا جاتا ہے کہ یہاں ٹھہرو۔

س —— یہ علامت سکتہ کا اختصار ہے یعنی ایسا مختصر وقفہ کر سانس نہ ٹوٹے۔

لا اس علامت کے معنی لغوی تو نہیں کے ہیں۔ اگر آیت کے اوپر یہ علامت درج ہو تو ٹھہرنے کے باب میں اختلاف ہے۔ ٹھہرنے اور نہ ٹھہرنے کی دونوں صورتوں میں معنی متاثر نہیں ہوتے۔ کچھ علماء ٹھہرنے کو بہتر سمجھتے ہیں اور کچھ نہ ٹھہرنے کو۔ البتہ جب یہ عبارت کے اندر لکھی ہو تو اس مقام پر نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔

مقاماتِ احتیاط

قرآنِ پاک میں ۱۷ مقام ایسے ہیں کہ جہاں اعراب وحرکات (زیر، زبر، پیش) کی تبدیلی سے آیات کے معانی اس حد تک بدل جاتے ہیں کہ نوبت کلمۂ کفر و شرک تک پہنچتی ہے۔ ان مقامات کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے۔ ذیل میں اُن کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

مقام	آیت	خطرہ کی صورت
۱ - پارہ ۱ - سورۂ فاتحہ	اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ	"ت" پر زبر (ـَ) کی بجائے پیش (ـُ) پڑھنا[1]
۲ - پارہ ۱ - سورۂ بقرہ - رکوع ۱۵	وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ	رَبُّهٗ کی "ب" پر پیش (ـُ) کی جگہ زبر (ـَ) پڑھنا
۳ - پارہ ۲ - سورۂ بقرہ - رکوع ۳۲	وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ	داؤدُ کے آخری دال پر پیش (ـُ) کے بجائے زبر (ـَ) پڑھنا۔
۴ - پارہ ۳ - 〃 〃 رکوع ۳۵	وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ	حرفِ "ع" کی زیر (ـِ) کی جگہ زبر (ـَ) پڑھنا
۵ - پارہ ۶ - سورۂ نساء - رکوع ۲۴	رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ	مُنْذِرِيْنَ کی "ذ" پر زبر (ـَ) پڑھنا۔

[1] یہاں "زیر" پڑھنا بھی شدید گناہ (قریب بکفر) ہے۔

مقام	آیت	خطرہ کی صورت
۶ - پارہ ۱۰ - سورۂ توبہ - رکوع ۱	اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ	رَسُوْلُهٗ کی "لام" پر زبر (ـَ) پڑھنا۔
۷ - پارہ ۱۵ - سورۂ بنی اسرائیل - رکوع ۲	وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ	حرف "ذ" پر زبر (ـَ) پڑھنا۔
۸ - پارہ ۱۶ - سورۂ طٰہٰ - رکوع ۷	وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ	رَبَّهٗ کے حرف "ب" پر پیش (ـُ) پڑھنا۔
۹ - پارہ ۱۷ - سورۂ انبیاء - رکوع ۶	اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ	كُنْتُ کے حرف "ت" پر زبر (ـَ) پڑھنا
۱۰ - پارہ ۱۹ - سورۂ الشعراء - رکوع ۱۱	لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ	حرف "ذ" پر زبر (ـَ) پڑھنا۔
۱۱ - پارہ ۲۲ - سورۂ فاطر - رکوع ۴	اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا	لفظ "اللّٰہ" کے حرف "لام" پر پیش (ـُ) پڑھنا
۱۲ - پارہ ۲۳ - سورۂ صٰفّٰت - رکوع ۲	وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ	مُنْذِرِيْن کے حرف "ذ" پر زبر (ـَ) پڑھنا۔
۱۳ - پارہ ۲۸ - سورۂ حشر - رکوع ۳	اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ	المصوِّر کے حرفِ "و" پر زبر (ـَ) پڑھنا
۱۴ - پارہ ۲۹ - سورۂ حاقہ - رکوع ۱	لَا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ	دوسرے ہمزہ (ء) پر زبر (ـَ) پڑھنا۔
۱۵ - پارہ ۲۹ - سورۂ مزمل - رکوع ۱	فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ	فرعون کے حرف "ن" پر زبر (ـَ) پڑھنا۔
۱۶ - پارہ ۲۹ - سورۂ مرسلات - رکوع ۲	فِیْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ	ظِلٰلٍ کے حرف "ظ" پر زبر (ـَ) پڑھنا۔
۱۷ - پارہ ۳۰ - سورۂ النازعات - رکوع ۲	اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا	"منذرُ" کے حرف "ذ" پر زبر (ـَ) پڑھنا



صحیفۂ ہدایت

مولانا ماہر القادری

سائنس کے
نظریے ہوں یا دواؤں کے خواص،
اِن میں سے بعض انسان کی اپنی تحقیق کوشش اور
تجربے کا نتیجہ اور ماحصل ہیں لیکن بعض نظریے اور خواص ایسے بھی ہیں جن
کی طرف انسان کا ذہن کسی کوشش کے بغیر ایکا ایکی منتقل ہوگیا۔ اِسی چیز کا نام "القا"
ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بعض اوقات انسان کے دل میں ایک بات ڈال دیتا ہے، دنیوی معاملات میں کتنی بہت سی تدبیریں ہیں، جو ذہنوں میں القا کی جاتی ہیں اور آدمی خود حیران رہ جاتا ہے کہ یہ تدبیر یا فلاں بات تو وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ تو اُسے سجھائی گئی ہے، کتنے بہت سے علوم ہیں جن کی ابتدا "القا" اور "الہام" سے ہوئی ہے۔ قرآن کریم اس پر شاہد ہے کہ کرۂ ارضی کے پہلے انسان کو اشیا کے نام کا الہام ہُوا۔ اِس حقیقت کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ انسانی علم کی اوّلین بنیاد وحی، الہام اور القا ہے۔ جس اللہ نے کائنات کو خلق فرمایا اُسی نے اپنے فضل سے انسان کو کائنات کی اشیاء کا علم بھی عطا فرمایا۔[1]

---

[1] یہ مختصر سی گفتگو نہایت ہی اہم ہے۔ یہیں سے ہماری راہ اہلِ مغرب سے دو معاملات میں الگ ہو جاتی ہے۔ ایک یہ کہ اُن کے نزدیک انسان کا سارا سرمایۂ علم حسّی و تجربی ذرائع سے حاصل شدہ ہے جسے قیاس و استدلال کی قوتیں ترتیب دے کر فلسفیانہ نتائج نکالتی ہیں، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے (جس پر وسیع انسانی تجربات شاہد ہیں) الہام و القا نہ صرف ایک اہم ذریعۂ علم ہے بلکہ علمِ انسانی کا بالکل ابتدائی سرمایہ الہامی و القائی ہی تھا۔ دُوسرے یہ کہ اہلِ مغرب کے نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کا آغاز کامل حیوانی وحشت و جہالت سے ہُوا۔ حالانکہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ انسانِ اول کی فطرت میں جہاں اخلاقی احساسِ خیر و شر موجود تھا اور یہی چیز انسان کو حیوانات سے جُدا کرتی ہے، وہاں اُسے ابتدا ہی سے رُوحانی و اخلاقی ہدایت کی روشنی الہامی طور پر فراہم کر دی گئی تھی، اِن دو حقیقتوں کی روشنی میں ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم مسلمان اپنا جداگانہ نظریۂ علم (Theory of Knowledge) پیش کریں نیز تہذیبِ انسانی کے آغاز کا بھی اسلامی فلسفہ از سرِ نو مرتب کریں۔ (ن۔ص)

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے انسانوں ہی میں سے ایسے مقدس نفوس کو منتخب فرمایا جو ہر اعتبار سے مکمل انسان تھے، جن کی دیانت و صداقت اور سیرت پر معاشرہ اعتماد رکھتا تھا۔ اِن مقدس نفوس کو دین کی اِصلاح میں نبی اور رسُول کہتے ہیں اور اِن کو جس ذریعہ سے ہدایت دی گئی اُس کا نام "وحی" ہے۔ وحی میں نبی اور رسُول کی اپنی کوشش اور تجربے کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ وہ مہبطِ وحی ہوتا ہے یعنی وحی اُس پر نازل ہوتی ہے، وہ خود "وحی ساز" نہیں ہوتا۔

ہر دَور میں اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور مشیتِ کاملہ کے تحت انبیا و رُسل آتے رہے۔ اُن میں سے بعض پر صحیفے اور کتابیں بھی نازل ہوئیں۔ یہاں تک کہ ؎

جب اپنی پُوری جوانی پہ آگئی دُنیا
جہاں کے واسطے اِک آخری نظام آیا

اللہ تعالیٰ نے حضرت سیّدنا عیسٰی علیہ السلام کے کئی سَو سال بعد اُس "انسانِ کامل" کو مبعوث فرمایا جس پر دین کا اِتمام کر دیا گیا اور نبوّت اور رسالت کے عہدے کو ختم کر کے اعلان فرمایا کہ یہ نبی —— احمدؐ، محمدؐ مصطفےٰ —— خاتم النبیین ہے، یعنی اب کسی قسم اور کسی نوع کا کوئی نبی، ظلی یا بروزی قیامت تک نازل نہیں ہوگا۔ نبوّت اور رسالت کا منصب اب کسی اور کے لیے باقی نہیں رہا۔ قیامت تک کے لیے اِسی نبیؐ آخر کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت ہر اعتبار سے کافی و وافی ہے۔ اس میں نہ کوئی اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ترمیم۔ حضور خاتم النبیین پر جو کتاب نازل ہوئی اُس کا نام "قرآن" ہے۔

جب تمام انبیا آچکے اور کتابیں بھی نازل ہو چکیں اور چشمِ فلک اِن کتابوں میں تحریف کا تماشا بھی دیکھ چکی، تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس نبی کو بھیجا جو آخری نبیؐ تھا۔ جس کی ذاتِ گرامی پر نبوت و رسالت کا اختتام کر دیا گیا۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی اور رسول آنے والا نہ تھا۔ اس لیے جو کتاب (القرآن) آپ پر نازل فرمائی گئی اُس کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اللہ تعالیٰ کا قول اور وعدہ سچا ہی ہُوا کرتا ہے۔

کلامِ محفوظ

سب سے پہلی بات غور کرنے کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی جن حروف و الفاظ کے ساتھ نازل ہُوئی آپ نے حرفاً حرفاً اور لفظاً لفظاً ہو بہو اسی طرح اُس کی تلاوت فرمائی۔ ساتھ ہی اس کو لکھوا بھی دیا اور بہت سے صحابہ نے اُسے زبانی یاد بھی کر لیا۔ جب حضورؐ کی وفات ہوئی تو پورے کا پورا قرآن سفینوں اور سینوں میں محفوظ تھا۔ قرآن کریم میں ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں کسی ترکِ اولیٰ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے۔ حضورؐ نے اس قسم کی آیتوں کو بھی بلفظہٖ تلاوت فرمایا۔ وہ انسانِ کامل جسے اُس کے دشمن "الامین" کہتے تھے۔ اُس نے کمال امانت کے ساتھ خالق کا کلام مخلوق تک پہنچا دیا۔

قرآن کریم سُورتوں کی جس ترتیب کے ساتھ آج دنیا میں پایا جاتا ہے، یہ ترتیب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ بتائی گئی تھی۔

اُمت نے نہ صرف قرآن کو سفینوں اور سینوں میں محفوظ رکھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس لب و لہجہ میں قرآنی آیات تلاوت فرماتے تھے اُس لب و لہجہ کو بھی محفوظ کیا گیا۔

دُنیا میں کوئی کتاب، صحیفہ، بیاض اور مخطوطہ قرآن کریم کی برابری تو کیا اِس سے سینکڑوں درجہ کم تعداد میں بھی نہیں پڑھا جاتا۔ تنہا یہی وہ کتاب ہے جو دن رات میں پانچوں وقت کی نمازوں کے علاوہ دُوسرے اوقات میں بھی تلاوت کی جاتی ہے، جس کی معنوی تعلیم کے علاوہ اس کی قرأت و تجوید کی تعلیم کے لیے ہزاروں مدرسے دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ تنہا یہی وہ کتاب ہے جو تمام سے زیادہ مضامین، تحریروں

تقریروں میں نقل و بیان کی جاتی ہے اور سال کے سال رمضان کے مہینہ میں کروڑوں مسلمان پُورے قرآن کو حفاظ کی زبان سے سُنتے ہیں۔

اعجاز در اعجاز

عربوں کو اپنی زبان دانی، شاعری اور فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے علاوہ ساری دُنیا کو گونگا (عجمی) کہتے تھے۔ قرآن کریم نے ان عربوں کو چیلنج کیا کہ تم قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سی جیسی ایک سورہ تصنیف کر کے پیش کر دو، عربوں کی قومی اور آبائی غیرت کو یہ سب سے بڑا چیلنج تھا مگر اس چیلنج کے جواب میں انہیں سکوت اختیار کرنا پڑا۔

دنیا میں نظم و نثر کی کوئی ایسی قدیم و جدید کتاب نہیں ملتی جس کے کچھ محاورے، اصطلاحیں اور الفاظ متروک نہ ہوگئے ہوں، اور اُن میں فرسودگی اور غرابت پیدا نہ ہوگئی ہو۔ ہاں، صرف قرآن کریم ہی وہ تنہا مقدس کتاب ہے، جس کا ایک لفظ بھی چودہ سو سال کی طویل مدّت میں متروک نہیں ہُوا عربی زبان و ادب کا یہ وہ بلند ترین معیار ہے جس کے سامنے عربی ادب کی تمام شاہکار اور شہرہ آفاق کتابیں کم درجہ اور فروتر نظر آتی ہیں قرآن کریم جس طرح اب سے چودہ سو سال پہلے لغت، الفاظ، طرزِ بیان اور مفہوم و معنی کے اعتبار سے تر و تازہ تھا، آج بھی وہ اسی طرح تر و تازہ اور سدا بہار ہے اس گلکدہ کا ایک پتہ بھی خزاں رسیدہ نہیں ہُوا اور اس کی ایک آیت اور ایک لفظ کو کروڑوں بار دہرانے کے بعد بھی وجدان ذرا سی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

تقریر و تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شعریت پیدا ہو جائے۔ شاعری کا زبان و ادب میں بہت بلند مقام ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِس نبیؐ کو نہ تو ہم نے شاعری سکھائی ہے اور نہ شاعری اُس کے شان کے شایان ہی ہے۔ یہ بھی قرآنِ کریم کا اعجاز ہے کہ وہ شاعری نہ ہونے کے باوجود کمال درجہ کا حسین و دلکش، فصیح و سادہ بلکہ سہلِ ممتنع کلام ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اس مصرع میں :

آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

مردِ مومن کی تعریف کرتے ہُوئے قرآنِ کریم کی معجزانہ نغمگی کی طرف بھی لطیف اشارہ کر دیا ہے۔ قرآن کریم میں وہ مقدس نغمگی اور ایسا پاکیزہ آہنگ پایا جاتا ہے "جو شریفانہ جذبات کو حرکت میں لاتا ہے" قرآن کی نغمگی کے سامنے وہ راگ راگنیاں کوئی وزن نہیں رکھتیں جنھیں سُن کر آدمی کے اندر سفلی جذبات اور ہوسناک خیالات حرکت میں آتے ہیں۔

> **قرآن کو اپنا مخالف نہ بنالو**
>
> اے مسلمانو!
> اس (قرآن) کی عزت کرو
> اپنے آپ کو بُرے اعمال سے بچاؤ
> ہر وقت ادب سے رہو۔
>
> **ورنہ**
>
> قرآن مجید تمھارا مخالف ہو جائے گا۔
>
> (کیمیائے سعادت - امام غزالی - باب القرآن)

قرآنِ کریم کی تلاوت و سماعت آنکھوں کو اشکبار بھی کرتی ہے اور لبوں پر موجِ تبسّم بھی اُبھار دیتی ہے۔ خشیت و محبت کی ملی جُلی کیفیت! اس مقدس کتاب میں وہ توازن پایا جاتا ہے جو آدمی کو رحمت و غفاریت کے سہارے غیر ذمہ دار اور فرض ناشناس نہیں ہونے دیتا اور قہاریت اور انتقام کا تصور آدمی کو مایوس نہیں بناتا۔ قرآنِ کریم کا یہ بیان کس قدر نشاط انگیز ہے کہ بہشت کے قصر و ایوان میں غلمان سونے کے تھال لیے ہُوئے گردش کر رہے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی قرآن

پاک میں یہ ہولناک منظر بھی ملتا ہے کہ دوزخ کی غضب ناک آگ میں لوگوں کے جسموں کی کھالیں بدلی جا رہی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے اُمید بھی، اُس کا خوف بھی۔ بیم کے ساتھ رجا بھی۔ قرآنِ کریم انسان کو اس عالم میں رکھنا چاہتا ہے کہ جنت کی نشاط و شادمانی اور مغفرت کی امید اُسے فرض ناشناس، ناشکرا، غافل اور کاہل نہ بنا دے اور انتقام و عقوبت، دار و گیر و احتساب اور جہنم کے عذاب کا ذکر سُن کر آدمی ناامید نہ ہو جائے اور وہ ہاتھ پیر توڑ کر اور جی چھوڑ کر نہ بیٹھ جائے۔

مکمل نظامِ زندگی

قرآنِ کریم صرف دعاؤں اور مقدس زمزموں کی کتاب نہیں ہے کہ خلوصِ نیت و عقیدت کے ساتھ تلاوت کر کے جس کا حق ادا ہو جاتا ہے، یہ "الکتاب" ہے، جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے، اور حکومت کے ایوان سے لے کر فقیر کی جھونپڑی تک زندگی کا کوئی مرحلہ اس سے باہر اور آزاد نہیں ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، جن پر قرآن نازل ہُوا تھا، کم و بیش بائیس سال کی مدت تک جنگ ہو، صلح ہو، حکومت ہو، تجارت ہو، عائلی زندگی ہو، قرآنی احکام کو عملاً برت کر دکھایا۔

قرآنِ کریم کوئی خیالی کتاب نہیں ہے جس کے الفاظ کاغذ پر تو بھلے معلوم ہوتے ہیں مگر عملی دنیا میں ان الفاظ کی معنویت ساتھ نہیں دیتی۔ قرآن کریم مکمل ترین دستورِ حیات اور اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہُوا آخری اور قطعی منشورِ زندگی ہے، یہ زندگی کے تجربوں کے مرحلوں سے گزرا ہے اور زندگی کے سفر میں قدم قدم پر قرآن زندگی اور فطرت سے انتہائی مربوط ثابت ہُوا ہے۔ قرآنِ کریم میں زندگی سے گریز و فرار کا کوئی چور دروازہ یا پوشیدہ سرنگ نہیں ملتا۔ ترکِ دنیا اور رہبانیت کے علی الرغم قرآنِ کریم نے تو اس دعا کی تعلیم دی ہے جس میں اللہ تعالیٰ سے اس مادّی دنیا کو حسین و خوبصورت۔ یعنی صالح بنانے کی تمنا کی گئی ہے (ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ)

اللہ تعالیٰ نے دنیا کا کارخانہ بچوں کے گھروندوں کی مانند کھیل کے لیے نہیں بنایا۔ یہ تو شعور و بصیرت کی تمام قوتوں اور توانائیوں کے ساتھ برتنے کے لیے خلق کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مقدس میں قرآنی اخلاق کی بنیادوں پر معاشرہ استوار کیا گیا اور اس طرح قرآنی تعلیمات کو متشکل کر دیا گیا۔ معاشرہ راہبوں اور جوگیوں کا معاشرہ نہیں، فاتحوں اور کشور کشاؤں کا معاشرہ تھا۔ اس معاشرے میں صفّہ کے فقرا اور مسکینوں سے زیادہ فاتحینِ بدر و حنین پائے جاتے تھے۔ قرآنِ کریم نے اِن نفوسِ قدسیہ میں اس قدر جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا کہ مٹھی بھر انسان قریش کے لشکر سے ٹکرا گئے اور چشمِ فلک نے دیکھ لیا کہ فتح اُن بے سرو سامان اور بوریا نشینوں ہی کی ہُوئی۔

اس کے بعد خلافتِ راشدہ کے مبارک دَور میں حاملینِ قرآن نے روم و مدائن کی پُرشکوہ سلطنتوں کے دھوئیں اڑا دیے۔ فتح مندی قرآنِ کریم کے اُن عملی مفسرین کے قدم چومتی تھی اور شوکت و اقبال اُن کے گھوڑوں کی رکابیں تھام کر چلتے تھے۔ دنیا میں صداقت و امانت اُن کے نام اور کام سے پہچانی جاتی تھی۔ صحابہ کرام کو تمدّن و معیشت کے کیسے کیسے نئے نئے اور پیچیدہ مسائل سے سابقہ پڑا مگر کتاب و سنت کی رہنمائی میں انھوں نے ہر مسئلہ کا حل تلاش کر لیا اور جنگ کے میدانوں ہی میں نہیں تمدّن و تہذیب اور سیاست و معیشت کے محاذوں پر بھی غالب اور فتح مند رہے۔

صحیفۂ ہدایت

قرآنِ کریم کی تنزیل کی اصل غایت ہدایت ہے۔ اس لیے اس مقدس کتاب کو رحمت اور نور بھی کہا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی ہر آیت نورِ ہدایت ہے۔ اس لیے قرآن کریم میں جہاں کہیں چاند ستاروں اور افلاک کا ذکر آ گیا ہے اُس سے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ قرآن علمِ ہیئت پر کوئی مقالہ پیش کر رہا ہے۔ اسی

طرح ہوا اور پانی کے ذکر کا علمِ موسمیات سے پیوند جوڑ دینا، زمین کے بیان کو علمِ طبقات الارض سے نسبت دینا، ہریالی کھیتی پھول، پتوں اور درختوں کی تفصیل کو فنِ باغبانی اور فنِ زراعت کا ضمیمہ سمجھنا، علمِ قرآن میں غلط اندیشی کی دلیل ہے۔ جو لوگ قرآن کی ہمہ گیری اور جامعیت دنیا کے سامنے پیش کرنے کی نیت سے سائنسی علوم سے قرآن کریم کو مطابقت دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ قرآن کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اسی طرح بعض دوسرے علوم کے نظریے اور کلیے بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اگر آج کسی علم و فن کا کوئی نظریہ اور کلیہ کھینچ تان کر قرآنِ کریم کی کسی آیت پر فٹ کر دیا گیا مگر کچھ زمانہ یا زیادہ مدت گزرنے کے بعد وہ نظریہ اور کلیہ اُنھی علوم کے ماہرین نے اپنے تجربہ اور تحقیق کی بنا پر رد کر دیا۔ اُس وقت قرآنِ کریم کو مجروح ہونے سے بچانے کے لیے فنِ تاویل کی پناہ لی جائے گی؟ زمانہ کی ایجادات اور نت نئے تجربوں کا قرآن کریم سے جوڑ ملا دینا بڑا خطرناک کھیل ہے جسے وہی لوگ کھیلتے رہتے ہیں جو قرآنی بصیرت سے بڑی حد تک محروم ہیں۔

قرآن کریم میں جہاں بُت تراشی کا ذکر آتا ہے یا اُن لوگوں کا ذکر ہے جو پہاڑ کو تراش کر مکانات بنایا کرتے تھے تو اس اجمال سے یہ نکتہ پیدا کرنا کہ قرآنِ کریم کی ان آیتوں میں فنِ تعمیر سمویا ہوا ہے۔ قرآن فہمی کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے۔ قرآن کریم کو تمام علوم و فنون کی انسائیکلو پیڈیا ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے قرآن کو سخت امتحان میں ڈال رہے ہیں اور نکتہ چینوں کے لیے زمین ہموار کر رہے ہیں۔

قرآن کریم کی جامعیت اس اعتبار سے مسلّم ہے کہ اس میں ہدایت کا ہر جامع عنوان پایا جاتا ہے اور جو وجوہات و اصُول ہدایت کے ہو سکتے ہیں وہ قرآن کریم میں موجُود ہیں۔ اخلاق و تقویٰ کی مکمل ترین تعلیم اس مقدس صحیفہ میں ملتی ہے۔ اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے

ایک رُومی کا بیان
اپنے سردار کے سامنے

"رات کو وہ (مسلمان) راہب معلوم ہوتے ہیں، دن کو شہسواری کرتے ہیں اور اپنے نیزے بھالے درست کرتے ہیں۔ قرآن خوانی اور ذکر و تسبیح کی وجہ سے اُن کی مجلس میں ایسا شور رہتا ہے کہ اگر آپ اپنے ہم نشیں سے کوئی بات کریں تو وہ سن نہ سکے۔"

سردار نے یہ سُن کر اپنے ساتھیوں سے کہا:۔

"یہ جن کے ایسے حالات بتاتا ہے، ہم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

فرمایا تھا کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ ——— ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

قرآن کریم صرف صلواۃ، زکوٰۃ، روزہ اور حج ہی کے مسائل نہیں بتاتا بلکہ وہ حکومت، تجارت، معاشرہ، عائلی زندگی اور اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں کو بھی اصول اور قوانین دیتا ہے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح تکوینی رب ہے۔ اُسی طرح تشریعی رب بھی ہے۔ جس طرح عالم تکوین میں اُس کا حکم چلتا ہے۔ اُسی طرح شریعت میں بھی اُس کے حکم کو قطعیت حاصل ہے۔ جس طرح نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور مسلمان کا سر جھکتا ہے۔ اسی طرح پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ ع

اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ وَ الْمُلْکُ لِلّٰہِ

یہ ہے قرآن کے منشورِ حکومت و سیاست کی وہ پہلی دفعہ جو اس بات کو واضح کرتی ہے کہ اصل حاکمیت اور حکومت اللہ تعالیٰ کی ہے اور انسانوں کی حکمرانی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تابع ہونی چاہیے۔ پھر قرآن کریم نے "مشاورت" کی ہدایت دے کر دنیا کو "شورائیت" کا رہنما اصول دیا۔ پھر مسلمان حکمرانوں کی یہ صفت بتائی کہ:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

جس ملک میں بھی مسلمانوں کو غلبہ، اقتدار اور حاکمیت حاصل ہو اور وہاں کا حکمران طبقہ اقامتِ صلوٰۃ اور تنظیم زکوٰۃ سے غافل ہو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہ دیا جا رہا ہو، اس جگہ حکومت صحیح ہاتھوں میں نہیں ہے۔ وہ جو ہر عہدہ اور منصب کے لیے کچھ صفات ضروری ہوتی ہیں، مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلم حکمرانوں کی صفات بیان فرمائی ہیں ——— پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ کی زمین صالحین کا ورثہ ہے، اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیا کے جن خطوں پر بھی غیر صالحین یعنی فساق و فجار کا قبضہ اور عمل دخل ہے وہ لوگ دراصل غاصب ہیں، اس لیے اس بات کی مسلسل جدوجہد ہوتی رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی زمین غاصبوں کے قبضہ سے نکل کر زمین کے جائز وارثوں یعنی صالحین کے قبضہ میں آجائے۔

قرآنِ کریم نے انسان کی عزت و تکریم کا معیار "تقویٰ" مقرر فرما کر حسب نسب، حکومت، دولت، ظاہری حسن و وجاہت اور دُوسری تمام اضافی خوبیوں کو پست اور فروتر قرار دے دیا "تقویٰ" کو ہر عز و شرف اور حسن و خوبی سے برتر اور بلند تر ٹھہرایا گیا۔ حاکمیت، صالحیت اور تقویٰ کی یہی وہ قرآنی تعلیم تھی، جس کے تحت حضرت سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت سے انکار فرما کر اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے، حق گوئی، سرفروشی اور باطل کے مقابلہ میں استقامت و عزیمت کی ایک روشن مثال قائم فرما دی۔

قرآنِ کریم نے سُود اور قمار کو حرام قرار دے کر سرمایہ داری اور ہوسِ زر کا مٹھ مار دیا۔ 'شراب' جو "ام الخبائث" ہے، قرآن نے اُسے "رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ" کہا۔ عورت جو معاشرے میں آزادانہ اختلاط کے سبب بہت بڑے فتنہ کا باعث بن جاتی ہے، اس کی عصمت و عفت کے لیے جلباب و خمار کے حصار قائم کیے۔ اس کو مقامِ زینت کی نمود و نمائش اور تبرّجِ جاہلیت سے روکا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج یعنی امہات المومنین کو براہِ راست اور تمام مسلم خواتین کو تبعاً حکم دیا کہ وقار کے ساتھ گھروں میں بیٹھیں اور کسی نامحرم سے گفتگو کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو دو بدو اور رو برو، نہیں، پردے کی آڑ میں گفتگو کریں اور بات کرنے میں ایسا لہجہ پیدا نہ ہونے دیں جس سے سننے والا غلط قسم کی کوئی اُمید اپنے دل میں قائم کر لے۔

تفہیم و تاویل

قرآنِ کریم میں بار بار عقل و بصیرت سے کام لینے اور ذہن و فکر کی توانائی کو صرف کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ قرآن میں کسی مقام پر بھی عقل کی اہمیت کی نفی نہیں فرمائی گئی۔ عقل اللہ تعالیٰ کا عظیم عطیہ ہے اس کو معطل و بیکار کس طرح رکھا جا سکتا ہے۔ مگر اس نقطہ کو ذہن میں رکھیے کہ قرآن میں غور و فکر کی دعوت اس لیے دی گئی ہے کہ قرآن جن حقائق اور اصُول و احکام کو پیش کرتا ہے اُن پر ایمان پختہ سے پختہ تر ہو جائے۔ عقل کو دراصل وحیِ الٰہی کا تابع ہونا چاہیے۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ کے اِلٰہ ہونے سے انکار نہیں کیا تھا، بلکہ اُس

کا سارا قصور یہ تھا کہ اُس ظالم نے عقل کو حکمِ الٰہی کے تابع کرنے کی بجائے عقل کو حکمِ الٰہی پر ترجیح دے کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں عقلی قیاس سے کام لیا اور حکمِ الٰہی کی نافرمانی کرنے کے جرم میں اُسے ملعون و مطرود قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کے آگے بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دینا عقل و دانائی کی بات ہے۔ جو عقل صحیح اور متوازن ہوگی اُسے قرآن کے کسی لفظ اور حرف میں کسی قسم کا کوئی شک دکھائی نہیں دے سکتا۔

قرآنی فکر

قرآن کریم میں دو طرح کی آیات ملتی ہیں: ایک وہ جن کو "محکمات" فرمایا گیا ہے اور یہی "ام الکتاب" یعنی کتاب اللہ کی اصل بنیاد ہیں۔ دُوسری آیات "متشابہات" ہیں۔ اُن کے بارے میں خود قرآن کہتا ہے:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ (آل عمران: ۷)

(جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ کی تلاش میں متشابہات کے پیچھے سدا پڑے رہتے ہیں اور اُن کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اِس کے جو لوگ علم (دین) میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا ان پر ایمان ہے۔ یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے)

کائنات کا آغاز کس طرح ہُوا، اس کا اختتام کس طرح ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی کیا صفات ہیں، اُن کے بارے میں قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں اُن پر ایمان لانا اور اُن کا سادہ تصور کافی ہے۔ اُن کی ماہیت جاننے کی کوشش سے روکا گیا ہے۔ دُنیا سائنس میں کہاں تک ترقی کر گئی ہے مگر آج تک اس کا پتا نہیں لگ سکا کہ دُنیا میں سب سے پہلے مرغی پیدا ہُوئی تھی یا انڈا۔ اسی طرح یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ گندم کا پودا سب سے پہلے خلق ہُوا تھا یا اُس کا بیج، یعنی دانۂ گندم، لیکن اِن حقائق اور ماہیتوں کے نہ جاننے سے انسانی معیشت کا کوئی کام رُکا ہُوا نہیں ہے۔ اسی طرح متشابہات پر ایمان رکھتے ہُوئے اُن کا مکمل اور واقعی علم نہ ہونے سے دین و شریعت اور اخلاق و ایمان میں کوئی کمی واقع نہیں ہو جاتی۔

قرآنِ کریم کا مطالعہ جو ذہن بناتا ہے اُس میں بڑا سلجھاؤ اور سادگی پائی جاتی ہے۔ اس قسم کا قرآنی ذہن کلامی نکتہ آفرینیوں اور فلسفیانہ موشگافیوں اور متصوفانہ لطائف میں دلچسپی نہیں لیتا۔

ربط و نظم

قرآنِ کریم مصنفوں کی لکھی ہُوئی کتابوں اور اہلِ قلم کے مرتب کیے ہُوئے مجموعوں کی طرح کوئی کتاب نہیں ہے جن میں عنوانات ہوں اور ہر عنوان کے تحت ذیلی ابواب اور حواشی ہوں اور جب ایک مضمون ختم ہو جائے تو پھر دُوسرا شروع کیا جائے۔ قرآن کا اندازِ بیان تحریری و تصنیفی نہیں تقریری ہے۔ جو لوگ عام تصانیف و تالیف پر قرآنِ کریم کا قیاس کر کے اُس کا مطالعہ کرتے ہیں، انھیں قرآنِ کریم کی آیتوں اور مضامین میں بے ربطی محسوس ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم اس قسم کی تصنیف سرے سے ہے ہی نہیں۔

نظمِ قرآن کا محور یہ ہے کہ اس کتابِ بے مثال میں بار بار اور جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور شانِ خلاقیت کا ذکر ہے۔ قرآن بار بار آخرت کے محاسبہ کی یاد دلاتا ہے، وہ اُن لوگوں کا بھی ذکر کرتا ہے جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے اور اُن کا بھی جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہُوا۔ کسی فرد یا قوم کا ذکر ہو، آثار و مشاہدات کی تفصیل ہو، معاشرے کے لیے کسی قانون و حکم کی تنفیذ کا اعلان ہو، ہر موقع پر قرآن کریم ذہنِ

انسانی کو یاد دلاتا اور چونکاتا رہتا ہے کہ۔

- اللہ تعالیٰ اُس کا خالق اور رب ہے۔
- انسان کو دُنیا میں وہ زندگی گزارنی چاہیے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔
- اس دنیوی زندگی کے اعمال کی بنا پر آخرت میں سزا و جزا ملے گی۔

قرآنِ کریم کا ہر مضمون اسی دعوت کے ارد گرد گردش کرتا ہے، اسی کی جگہ جگہ تکرار کی گئی ہے اور یہی "تذکیر" اس دعوت کا عمود اور مرکزی نقطہ ہے۔

قرآن اور معلمِ قرآن

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم لکھا لکھایا مکہ کی کسی پہاڑی پر یا درخت پر نہیں رکھوا دیا تھا، بلکہ اُسے نجماً نجماً حضرت سیدنا محمد (ابن عبداللہ) علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر نازل فرمایا، اور اس نزول کے ساتھ صاحبِ قرآن اور مہبطِ وحیِ الٰہی کا جو منصب تھا۔ اُس کا ذکر بھی قرآن ہی میں کر دیا گیا۔ یہ کہ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (آل عمران: ۱۶۴)

(درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انھی میں سے ایسا پیغمبر اٹھایا جو اُس کی آیات انھیں سناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے)

دُنیا کے قدیم و جدید طریقۂ تعلیم میں ہر معلم جس کسی کتاب کی تعلیم دیتا ہے تو وہ یہ نہیں کرتا کہ اپنی طرف سے کتاب کی شرح و تفصیل میں کچھ نہ کہے، بلکہ کتاب کی اصل عبارت کو دُہراتا ہے۔ کتاب کی تعلیم کے معنی ہی یہ ہیں اور یہی تعلیم کی غرض و غایت ہے کہ معلم جن مقامات کی مناسب سمجھتا ہے شرح کرتا جاتا ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ طلبا اور شاگرد بھی کتاب کے بارے میں اُستاد سے سوال کرتے ہیں وہ اُن کے جواب دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "کتاب و حکمت" کی تعلیم کے منصب پر مامور فرمایا تھا۔ اس منصب کی ذمہ داریوں کو حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کی حیثیت سے انجام دیا۔ حضور کے اس منصب کو ذہن میں رکھ کر، نطقِ رسول کے بارے میں قرآن کا فیصلہ سُنیے:۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۞ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۞

(النجم: ۳، ۴)

(یہ نبی) اپنے (نفس کی) خواہش سے کلام نہیں کرتا۔ اس کا کلام تو وحی ہوتا ہے۔

(۱) تلاوتِ قرآن (۲) تزکیہ نفس اور (۳) کتاب و حکمت کی تعلیم۔۔ وہ فرائض اور ذمہ داریاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ علیہ وسلم کو تفویض کی گئی تھیں اور قرآنِ کریم نطقِ رسول کو وحی کہتا ہے، یعنی جو زبان کتاب اللہ کی تلاوت کرتی تھی وہی زبان کتاب اللہ کی تعلیم بھی دیتی تھی اور قدیم اور جدید طریقِ تعلیم میں کتاب کی تعلیم سے مراد کتاب کے مضامین کی شرح و تفصیل ہی ہوتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب و حکمت کی جو تعلیم دی وہ بھی وحیِ الٰہی ہے اور چونکہ کتاب و حکمت کی تعلیم کا فریضہ حضورؐ نے نبی ہونے کی حیثیت سے انجام دیا ہے اس لیے وہ منصوص ہے، اور اس کی اطاعت اُمت پر فرض ہے۔

جس اللہ نے قرآن کو نازل فرمایا اور جس ذاتِ گرامی پر نازل فرمایا، اُسی اللہ نے رسول اللہ کے نطق کو وحیِ الٰہی کہا، کتاب و حکمت کی تعلیم اُس کو تفویض کی گئی۔ اُس کے اسوۂ حسنہ کو معیارِ حق اور انسانیت کے لیے نمونۂ عمل قرار دیا اور اُس کی اطاعت کو منصوص ٹھیرایا (اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ)

قرآن ہی واضح ہدایات کے بعد جو کوئی سنتِ رسول کو دین میں حجت نہیں مانتا وہ دراصل منصبِ نبوت کا انکار کرتا ہے اور منصبِ نبوت کا انکار کفر ہے۔[1]

اس صورتِ حال کو سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کریم جن لفظوں میں نازل ہوا ہے، یہ الفاظ اگرچہ نطقِ رسول سے ادا ہوئے ہیں، مگر اس میں حضورؐ کی کوشش اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ایک ایک لفظ وحی (متلو) ہے مگر احادیث کا معاملہ یہ ہے کہ معانی اللہ کی طرف سے وحی ہوئے ہیں۔ لیکن ان وحی شدہ معانی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لفظوں میں ادا فرمایا ہے۔ اس لیے احادیث کو "وحیِ غیر متلو" کہا جاتا ہے مگر وحیِ متلو اور وحیِ غیر متلو دونوں دین میں حجت ہیں۔

قرآن کے ساتھ سلوک

کوئی شک نہیں، قرآن کریم ایک مقدس قانون اور متبرک دستور ہے جس پر عمل کرنا تو منصوص ہے ہی، اس کا پڑھنا اور سننا بھی ثواب ہے۔ جو اہلِ ایمان قرآن کے معنی جانے بغیر یا ناظرہ اُسے پڑھتے اور سنتے ہیں وہ بھی ثواب کے مستحق ہیں، مگر قرآن کریم اللہ تعالیٰ نے سمجھ کر پڑھنے، غور کرنے اور عمل کرنے کے لیے نازل فرمایا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے دردمندی کے لہجہ میں فرمایا تھا کہ "دُنیا میں سب سے زیادہ مظلوم کتاب "قرآن" ہے کہ مسلمان اُسے بے سمجھے پڑھتے ہیں"

قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ کی عظمت اور اُس کے کلام کی تقدیس کا تصور ذہن و فکر میں جمانا چاہیے، قرآن مجید کی آیتیں ٹھہر ٹھہر کر پڑھنی چاہئیں۔ پورے قرآن کو ایک دن میں بغیر سمجھے ختم کر دینے کے مقابلہ میں ایک رکوع سمجھ کر اور عمل کرنے کی نیت سے پڑھنا زیادہ فائدہ مند ہے۔ جن آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مغفرت کی اور جنت کی بشارت دی ہے اُن کو تلاوت کرتے ہوئے زبان سے یا دل ہی دل میں اللہ سے دُعا مانگنی اور تمنا کرنی چاہیئے کہ اس بشارت کی سعادت ہمیں بھی میسّر آجائے۔ جن آیتوں میں عذاب آخرت سے ڈرایا گیا ہے اور عذابِ جہنم کا ذکر آیا ہے۔ اُن کو پڑھتے وقت خوف و اندیشہ کی کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہیے۔ دل میں تڑپ، گداز، خلوص، لگن، سوز و درد اور خشیتِ الٰہی ہو تو قرآن کی تلاوت کے دوران آنکھیں ضرور اشکبار ہو جاتی ہیں ؎

سرابے کہ رخشد بہ ویرانہ خوشتر
زچشمے کہ پیرایۂ نم نہ دارد

اللہ تعالیٰ نے جن آیتوں میں اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے اُن کی تلاوت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور رات کو سوتے وقت اپنی زندگی کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ قرآن کریم نے اخلاق و نیکوکاری کا جو معیار پیش کیا ہے، اُس معیار سے ہماری اپنی زندگی کس کس جزئیہ اور مرحلہ میں مطابقت نہیں کرتی، اس جائزے اور احتساب کے بعد اس کی پوری پوری جد و جہد کرنی چاہیے کہ ہماری زندگی میں قرآنی اخلاق زیادہ سے زیادہ جھلکنے لگیں —— یہاں تک کہ ہم: ——

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

کا مصداق بن جائیں۔



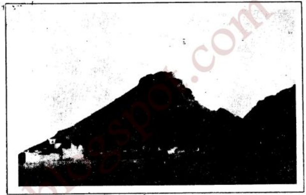
---

[1] بلکہ سنت بسا اوقات براہِ راست جامۂ عمل پہن کر سامنے آتی رہی اور اُسے صحابہ کرام نے جامۂ الفاظ پہنایا (ن ص)

قرآن کی فریاد

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں، آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں
تعویز بنایا جاتا ہوں، دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں
جزدان حریر و ریشم کے، اور پھول ستارے چاندی کے
پھر عطر کی بارش ہوتی ہے، خوشبو میں بسایا جاتا ہوں
جس طرح سے طوطا مینا کو کچھ بول سکھائے جاتے ہیں
اس طرح پڑھایا جاتا ہوں، اس طرح سکھایا جاتا ہوں
جب قول و قسم لینے کے لیے تکرار کی نوبت آتی ہے
پھر میری ضرورت پڑتی ہے ہاتھوں پہ اُٹھایا جاتا ہوں
دل سوز سے خالی رہتے ہیں آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں
کہنے کو میں اِک اِک جلسہ میں پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں
نیکی پہ بدی کا غلبہ ہے سچائی سے بڑھ کر دھوکا ہے
اک بار ہنسایا جاتا ہوں سو بار رُلایا جاتا ہوں
یہ مجھ سے عقیدت کے دعوے قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں ایسے بھی ستایا جاتا ہوں
کس بزم میں مجھ کو بار نہیں کس عرس میں میری دھوم نہیں
پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں

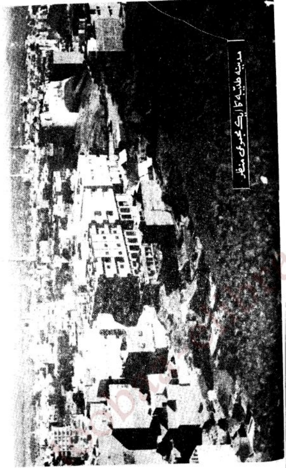
مولانا
ماہر القادری



میدانِ اُحد



قبر والی حلیمہ — جنت البقیع، مدینہ منورہ





قرآن کا امتیازی خصوصیات

نعیم صدیقی

"چیزے دیگر است"!

قرآن کو جس کسی نے بھی توجہ سے پڑھا ہو، وہ اُس کی ایک خصوصیت سے ضرور حیرت زدہ ہوگا اور یہی خصوصیت اُسے دُنیا بھر کی لاکھوں کروڑوں کتابوں سے الگ ایک مقام امتیازی عطا کرتی ہے۔

ہمارے سامنے یہ واحد کتاب ایسی ہے جس میں کہیں کسی مقام پر کوئی بات شبہ کے انداز میں نہیں کہی گئی۔ کوئی اصول، کوئی حکم، کوئی تجزیہ اور کوئی تبصرہ اس میں ایسا دکھائی نہ دیگا جس کے پیچھے تذبذب کارفرما ہو۔ ہر بات یقین و تحدی کے ساتھ کہی گئی ہے۔ اس کا ایک ایک فقرہ یہ بتاتا ہے کہ اس کے مصنف کو اس بات کا قطعاً کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہے کہ اس کی کسی بات کو جھٹلایا بھی جا سکتا ہے۔ اندازِ گفتگو میں کسی مقام پہ ذرا سا شائبہ بھی کسی احساسِ کمتری کا نہیں ہے۔ کہیں کسی سطر میں کوئی ایسی کمزوری نہیں جھلکتی، جیسی بالعموم انسانی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ کوئی ایسا موقع نہیں آتا، جہاں یہ محسوس ہو کہ مصنف نے خوبصورت لفظوں اور نگارش کا پردہ ڈال کر اپنی کسی کوتاہی کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب، کتابِ حق اور کتابِ یقین ہے "انہ لحق الیقین" اور آغاز ہی میں کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہہ دیا گیا ہے کہ لَارَیْبَ فِیْہِ

اس میں کہیں کوئی تضاد نہیں ملتا۔ ہر بات جو اس میں درج ہے وہ دوسری باتوں کی مؤید ہے اور دُوسری باتیں اس کی مؤید ہیں۔ حالانکہ بہترین مفکرین و محققین اور ادبا و شعرا کے مرتب کردہ جو دفتر ہمارے سامنے ہیں ان میں سے کوئی اعلیٰ ترین نگارش بھی اس عیب سے پوری طرح منزہ و مبرا نہیں ہے کہیں نہ کہیں کوئی مقامِ تضاد ضرور آئے گا۔ جب کہ قرآن میں کہیں ایسی ذہنی اُلجھنیں منعکس نہیں ہوتیں۔ کہیں کوئی ابہام نہیں ملتا، کسی مقام پر

قراریت کا رجحان نہیں پایا جاتا۔

یہ کتاب تفریحی لٹریچر سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ زندگی کے ٹھوس حقائق و معاملات سے بحث کرتی ہے اور وہ بھی سنجیدہ اور باوقار انداز سے، مگر اس کے باوجود یہ ادب پارہ اور انتہائی مؤثر و دلنشیں کلام بھی ہے جو اپنے نفسِ مضمون کے لحاظ سے تمام تر نصیحت ہونے کے باوجود اس یبوست سے مبرا ہے جو ناصحین کی تحریر و تقریر کا خاصہ ہے۔ ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح جڑا ہوا ہے۔ ایک ایک سطر شاخِ گل ہے اور ایک ایک سورت خیابانِ بہار! مگر حسنِ بیاں کے اتنے ضخیم مجموعے میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ نگارش اصل مقصد کی راہ سے ذرہ برابر اِدھر اُدھر ہو جائے اور آرٹ کی لذت و کشش قاری کتاب کو اپنی رو میں بہالے جائے۔ کوئی ایک جملہ تو کجا، ایک لفظ بھی ایسا نہیں جسے "ادب برائے ادب" قرار دے کر مقصدی ضرورت سے زائد قرار دیا جا سکے۔

اس کتاب کی شان یہ بھی ہے کہ اگرچہ اس کا مرکزی موضوع اور اس کے تفصیلی مباحث نہایت سنجیدہ نوعیت رکھتے ہیں اور انہی مباحث پر جب کبھی انسانی قلم حرکت میں آتا ہے تو وہ اندازِ بیان پیدا ہوتا ہے جو فلسفہ و قانون کی کتابوں میں پایا جاتا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ اس کتاب کے اسلوب میں ایسی حلاوت ہے کہ اُسے پڑھتے ہُوئے آدمی پر سوز و گداز اور رقت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ قاری نے اگر دل کے دروازے بند نہ کر رکھے ہوں تو وہ اس کلام کی مرعوبیت اپنے اُوپر طاری ہوتی محسوس کرتا ہے۔ بالآخر اُس کی روح بالکل سربسجود ہو کر رہ جاتی ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کے معانی کو سمجھے بغیر پڑھتے ہیں، وہ بھی اس کی نثر کا حسن، عبارت کی موزونیت، الفاظ کی نشست اور صوتی نغمگی میں ڈوب کر بے اختیار گریاں ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں معانی و مطالب کے ساتھ مرتب الفاظ و اصوات کا ایسا معجزانہ امتزاج ہے جس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔

چنانچہ اس کتاب نے اپنے مخالفین و منکرین کو ایک سے زیادہ بار چیلنج کیا کہ ایسی کوئی سورت یا چند آیتیں ہی مرتب کر کے دکھا دو۔ ایک آدمی نہیں تو بہت سے آدمی مل کر اپنی کاوشیں مجتمع کر لیں اور قرآنی ادب کا جواب پیش کر دکھائیں۔ یہ چیلنج جس کو چودہ سو سال میں کوئی بھی قبول نہ کر سکا آج بھی اپنی جگہ پہ قائم ہے اور آج بھی دنیا بھر کے انسان اپنی مجموعی قابلیتوں اور تخلیقی قوتوں کو جمع کر کے قرآنی اندازِ نگارش اور معیارِ کلام کا جواب نہیں دے سکتے۔

اس کتاب کی یہ ایسی خصوصیات ہیں جو اس کے دعوے کو برحق ماننے پر ہر معقول اور خوش ذوق آدمی کو مجبور کر دیتی ہیں، کہ اس کتاب کا مصنف کوئی انسان نہیں بلکہ خداوند تبارک و تعالیٰ ہے۔

(۲)

مرقعِ علم و ہدایت

قرآن اِن معنوں میں مسلمانوں کی مذہبی کتاب نہیں ہے جن معنوں میں عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں اور دُوسرے مذہبی گروہوں نے مذہب کی اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ فی الحقیقت قرآن ایک مکمل دین پیش کرتا ہے۔ یہ گویا زندگی کی کتاب ہدایت Guide Book ہے۔ اس میں ایک نظامِ تہذیب کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اس نظامِ تہذیب کو چلانے کے لیے جیسی حکومت کی، اور اُسے قائم کرنے کے لیے جیسی تحریک کی ضرورت ہے، اُس کی رہنمائی موجود

ہے۔ پھر مطلوبہ ریاست اور تحریک کے لیے جیسی جماعت و تنظیم اور جیسے انسانوں کی ضرورت ہے اُن کا معیار پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا موضوع انسان ہے اور یہ انسان کی زندگی کے ہر پہلو سے بحث کرتی ہے۔ اس میں زندگی کو ایک وحدت اور ایک کُل مان کر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ایک مخصوص طرز کی سوشیالوجی (سماجیات) کی کتاب ہے اور ایک مکمل سوشل سسٹم یا نظامِ اجتماعی ہمارے سامنے رکھتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قرآن عدلِ اجتماعی کا ایک جامع فارمولا ہے۔ ایسی کتاب میں قدرتی طور پر ہر شعبۂ زندگی اور ہر علم کے بارے میں بحث ہونی چاہیے، لیکن یہ کتاب ہماری مروجہ تقسیم علوم کے مطابق کسی خاص جزوی علم کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اس میں تمام علوم پر حاوی ہو جانے والا اور تمام علوم کو چند اٹل بنیادی حقائق اور اصولوں کے ذریعے منضبط اور ہم آہنگ کرنے والا علم پیش کیا گیا ہے، جسے اس کتاب نے اصطلاحاً "العلم" The Knowledge قرار دیا ہے۔ یعنی وہ علمِ ہدایت جو انسانی زندگی کی مجموعی فلاح کے لیے ناگزیر بنیادی علم ہے۔ وہ رہنما علم جو تمام علوم کو اور انسانی "قافلہ ہائے افکار" کو درستی پر قائم رکھتا اور انھیں بھٹکنے سے روکتا ہے۔

اور قرآن جس "العلم" پر مشتمل ہے اس میں ایک تو وہ اساسی صداقتیں شامل ہیں جن پر یہ کائنات چل رہی ہے اور جن کے تحت زندگی کا ظہور اور نشوونما ہوا ہے، دوسرے وہ تاریخی اصول ہیں جن کے تحت قوموں کا عروج و زوال واقع ہوتا ہے، اور تیسرے وہ اخلاقی ضابطے ہیں جن سے فرد اور معاشرہ کی زندگی سنورتی ہے اور جن کو ترک کرنے سے اس میں فساد واقع ہوتا ہے۔ وہ ضابطے جو اُس کی زندگی کو کائنات کے حقائق سے ہم آہنگ اور اُسے خدا کی رضا اور خوشنودی کا سزاوار بناتے ہیں۔

(۳)

حق و باطل کی فرقان

اس کتاب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حق و باطل، خیر و شر اور اچھے اور بُرے کے درمیان تمیز قائم کرنے والی ہے۔ چنانچہ خود اُس نے اپنے آپ کو "الفرقان" کہا ہے۔ سورۃ فرقان میں ارشاد ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ
لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا

(خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے
جس نے اپنے بندۂ خاص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم)
پر فیصلہ کی کتاب (قرآن) نازل کی تا کہ اہلِ
عالم کو متنبہ کرے (ڈرائے)

اسی حقیقت کو اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (الطارق - ۱۳)

وہ بات کو نتھار دینے والا کلام ہے

ایک اور جگہ ارشاد ہوا

قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (البقرہ ۲۵۶)

یعنی ہدایت کی راہ ضلالت کے راستے سے الگ واضح ہو چکی۔ قرآن اپنے دلائل کو اسی لیے "بینہ" اور "بینات" اور اپنے مندرجات کو "آیاتِ بینات" کہتا ہے اور "تبیین" کو اپنی غایت اور فریضۂ نبوت قرار دیتا ہے۔ وہ طریقۂ "تلبیس" کا سخت مخالف ہے۔ قرآن حق و باطل اور نیکی اور بدی کے درمیان کسی سمجھوتے اور سودے بازی کا قائل نہیں۔ وہ اضداد کے مرکبات سے کوئی نظامِ علم و حکمت یا ضابطۂ مذہب و اخلاق مرتب نہیں کرتا۔

انسان کم ہی خالص جھوٹ، ظلم اور بدیٔ محض کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور کم ہی ایسا ہوگا کہ وہ خالص جھوٹ اور ظلم و شر

کی دعوت قبول کرے۔ وہ ہمیشہ مرکبات بناتا ہے۔ مرکبات کی طرف بلاتا ہے، اور مرکبات ہی سے مغالطہ کھا کر انھیں دوسروں سے قبول کرتا ہے

قرآن کا جب نزول ہوا تو اُس نے اپنے دور کے رائج الوقت فکری، اعتقادی اور اخلاقی مرکبات و اضداد کا تجزیہ کر کے خیر و شر کو الگ الگ نتھار دیا۔ مثلاً یہود کی مذہبی و اخلاقی زندگی کے ہر گوشے میں اجتماعِ ضدین کے جو تجربات معمول بن چکے تھے۔ اُن کا اُس نے بڑا تفصیلی تجزیہ کیا اور اُن سے صاف صاف کہا تھا کہ ____

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (البقرہ: ۴۲) حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو۔

الغرض قرآن حقائق کو نتھار دینے والی اور اضداد کو چھانٹ کر الگ کر دینے والی کتابِ مبین اور کتابِ مہیمن ہے۔ اس مقصد کے لیے اُس نے جا بجا تقابلی اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ ایمان اور کفر کو، توحید اور شرک کو، خلوص اور نفاق کو، شکر اور ناشکری کو، صبر اور تھڑدلے پن کو، شجاعت اور بزدلی کو، آخرت پسندی اور دنیا پرستی کو، حق اور باطل کو، عدل اور ظلم کو، اطاعت اور انحراف کو، فحاشی اور حیا کو، سخاوت اور بخل کو، اسراف اور انفاق کو، نفسانیت اور ایثار کو، ایک دوسرے کے آمنے سامنے رکھ کر اُن کے اثرات و نتائج پر بحث کی ہے۔

اعتقادی اور اخلاقی مسلکوں کے ساتھ ساتھ اُس نے اُن سے آراستہ تاریخی کرداروں کو بھی تقابلی انداز سے پیش کیا ہے اور پچھلی ساری انسانی تاریخ کا مطالعہ اسی انداز سے کرایا ہے کہ متضاد کردار ایک دوسرے کے آمنے سامنے نمایاں ہوں اور اچھے اور بُرے کو پہچانا جائے۔ آدمؑ و ابلیس، ہابیل و قابیل، نوحؑ اور فرزندِ نوحؑ ابراہیمؑ اور نمرود، حضرت یوسفؑ اور برادرانِ یوسفؑ (اور ساتھ ہی عزیزِ مصر اور اس کی بیوی)، حضرت لوطؑ اور اُن کی بیوی، حضرت موسیٰؑ اور فرعون، حضرت عیسیٰؑ اور فقیہوں اور فریسیوں کے کردار تقابلی انداز سے لائے گئے ہیں۔ قرآن نے پسرِ نوح کے بالمقابل پسرِ ابراہیم اور امراۃِ لوط کے بالمقابل امراۃِ فرعون کا نمونہ اس طرح رکھا ہے کہ قاری کا دل اُدھر بے اختیار جھک جاتا ہے جدھر خیر و خوبی پائی جاتی ہے۔ رشد و غیّ کی راہیں سامنے آجاتی ہیں، جن میں سے ایک کی لوح پر اسلام لکھا ہے اور دوسرے پر جاہلیت کا تختہ آویزاں ہے۔

اپنے اس اسلوب سے قرآن قاری کو اپنے انسانِ مطلوب سے متعارف کراتا ہے۔ اپنے انسانِ مطلوب کو مخالف عنصر کے بالمقابل مختلف زمانوں میں ایک مخصوص تاریخی پارٹ ادا کرتے ہوئے دکھاتا ہے۔ پھر وہ اُن تمام اوصافِ حسنہ کے ایجابی خاکے جگہ جگہ بیان کرتا ہے جن سے اُس کا انسانِ مطلوب بنتا ہے اور اُن سیّات کے خاکے بھی متقابلاً پیش کرتا ہے۔ جن سے انسانیت کے نامطلوب کردار تیار ہوتے ہیں۔

(۴)

آسمانی ادب

قرآن کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ دنیا کی بہترین ادبی کتاب ہے اس کا بالکل جداگانہ اور نرالا اسلوب ہے۔ جسے "آسمانی ادب" یا "الہامی ادب" کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ قرآن کی ادبیت کا کمال یہ ہے کہ کلام کرنے والا خدا ہے اور حرفِ مدعا اُسی کی طرف سے صادر ہوا ہے، مگر اندازِ کلام وہ ہے جو انسانی ذوق اور انسانی حسیاتِ جمال اور انسانی معیارِ لطافت کے لحاظ سے ایسی بلندیوں کو چھو رہا ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ الفاظ اور اصطلاحات روایت کے دائرے سے لیے گئے ہیں۔ تشبیہیں اور استعارے

جانے پہچانے ماحول سے اُٹھائے گئے ہیں۔ انسانی لٹریچر میں بلاغت و فصاحت کے جو راستے نکالے گئے ہیں اُن کو مدِنظر رکھا گیا ہے، لیکن بحیثیتِ مجموعی جو ادب پارہ تیار ہُوا ہے وہ منفرد اور یکتا ہے۔

> حضرت سعد بن جبیرؓ نے پوری ایک رات اس آیت کو پڑھتے پڑھتے گذار دی :—
>
> وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ
>
> (کیمیائے سعادت' باب القرآن)

قرآن اگرچہ اصلاً ایک کتاب اور ایک نوشتہ ہے، مگر اس میں لطفِ خطابت بھی شامل ہے جو اُسے دوہرا حسن بخشتا ہے اور اس میں ذہنی نفوذ اور دل میں سرایت کر جانے کی کیفیت بڑھا دیتا ہے۔ پھر اسی مناسبت سے اس کی ایک شان تصریف و تکرار ہے، یعنی ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھا جاتا ہے۔ تصریف و تکرار میں اگر یکسانی ہو تو کلام دلنشین ہونے کے بجائے اکتاہٹ پیدا کرتا ہے مگر قرآن کا کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں جہاں قاری اکتاہٹ

> اَلَّذِيْنَ
> اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ
> حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۔ اُولٰٓئِكَ
> يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۔

محسوس کرے۔ کہیں بات اجمال میں چھوڑ دی گئی کہیں اجمال کے کیسۂ گُہر کے تسمے کھول کر موتی بکھیرے جاتے ہیں۔ کہیں ذہن کو حرکت دلانے کے لیے محض ہلکی سی اشاریت سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں تمثیل و استعارہ سے اور کہیں واشگاف انداز سے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے جملوں اور دھیمے دھیمے الفاظ میں معانی کا بہاؤ چمن کی جُوئے سبکگوں ہے، اور کہیں پُر زور الفاظ اور پُرشکوہ جملوں کی صورت میں حرفِ مدعا ایک طوفانی ریلا بن جاتا ہے جو جامد پتھروں کو اُن کی جگہ سے اکھیڑ کر بہالے جاتا ہے۔ کہیں نصیحت ہے کہ نکہتِ گل کی مانند غیر محسوس سا اثر ڈالتی ہے۔ کہیں زجر و توبیخ ہے کہ تیغِ براں کی مانند کاٹ کرتی ہے۔ کہیں اپیل ہے دلسوزی کے ساتھ، اور کہیں تنقید ہے دلدوزی کے ساتھ۔ پھر بار بار عبارت کا مزاج اور قوافی کا نظام بدلتا ہے، ترنم کے پیرائے بدلتے ہیں اور اس ادل بدل سے ذوق کی لطیف سطح پر خوشگوار نقوش ثبت ہوتے ہیں۔

قرآنی ادب میں سارا استدلال اگرچہ عقلی ہے مگر جذبات کی قوتِ محرکہ کی اہمیت کو کسی مقام پر نظر انداز نہیں کیا گیا۔ خالی عقل، بے جان تفلسف اور جامد تصورات کی طرف لے جاتی ہے۔ عملی انسان بنانے اور تاریخ کو حرکت میں رکھنے کے لیے جذبہ کی قوت ناگزیر ہے۔ عقل اور جذبہ دونوں

> ایک بزرگ کا مقولہ ——
> "میں قرآن شریف کی تلاوت تو کرتا تھا لیکن اس سے محظوظ نہ ہوتا تھا۔
> اس کے بعد میں نے یوں محسوس کیا کہ میں حضرت جبریلؑ سے قرآن سُن رہا ہوں تو میری لذّت بڑھ گئی۔
> اور اب تو میں یہ سوچ کر پڑھتا ہوں کہ جیسے خداوندِ عالم سے اس کی باتیں سُن رہا ہوں سو اب ایسا کیف ملتا ہے کہ جیسا پہلے کبھی نہ ملا تھا۔
> (کیمیائے سعادت، باب القرآن)

کے امتزاج ہی سے وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ رُلا دینے والی، حیرت میں ڈال دینے والی، مبہوت کر دینے والی، خوف طاری کرنے والی، اطمینان دلانے والی، عزم و یقین اُبھارنے

> قرآن دُنیا کی بہترین ادبی کتاب ہے۔ قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ رُلا دینے والی، حیرت میں ڈال دینے والی، مبہوت کر دینے والی، خوف طاری کر دینے والی، اطمینان دلانے والی، عزم و یقین اُبھارنے والی، جوش میں لانے والی۔ آمادۂ پیکار کر دینے والی اور ایثار کی اسپرٹ پیدا کرنے والی عبارتوں کی رنگا رنگ کیاریاں جا بجا پھیلی ہوئی ہیں۔

والی، جوش میں لانے والی، آمادۂ پیکار کر دینے والی اور ایثار کی اسپرٹ پیدا کرنے والی عبارتوں کی رنگا رنگ کیاریاں جا بجا پھیلی ہوئی ہیں۔ انسانی فطرت کا ہر شعبہ اُن سے اثر لیتا ہے اور انسانی نفسیات کا ہر گوشہ اُن سے زندگی پاتا ہے۔ تمام کے تمام جذبات و حسّیات اس ایک کتاب کے مطالعہ سے حرکت میں آتے ہیں اور ایک ہی مرکزی نصب العین کے گرد مجتمع ہو جاتے ہیں۔ قرآن پورے کے پورے انسان کو حرکت میں لے آتا ہے۔ اس کے شعور کو بھی، اُس کے جذبات کو بھی (جائز حدود میں)، اس کی دنیوی خواہشوں کو بھی اور اُس کے اخلاقی میلانات کو بھی۔ دُنیا بھر کے لٹریچر میں کوئی کتاب بھی یہ کرشمہ نہیں دکھا سکتی۔

اس کتاب کی ایک عظیم الشان خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے قاری کو خدا سے قریب کر دیتی ہے اور خدا اس کے قریب آجاتا ہے۔

خدا کا یہ تصور کہ وہ الگ تھلگ وجود ہے، جس سے انسان کا برائے نام سا تعلق ہے وہ بھی بس دور پار کا!

> قرآن قاری کو اپنے انسانِ مطلوب سے متعارف کراتا ہے۔ اپنے انسانِ مطلوب کو مخالف عنصر کے بالمقابل مختلف زمانوں میں ایک مخصوص تاریخی پارٹ ادا کرتے ہوئے دکھاتا ہے۔

قرآن پڑھتے ہی اس قسم کا محدود کمزور اور باطل تصور مٹ جاتا ہے۔ قرآن کا خدا ایسا ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے آدمی کو وہ بالکل اپنے سامنے، اپنے آس پاس بلکہ عین اپنے دل میں محسوس ہونے لگتا ہے۔ جہاں قرآن میں داخل ہوتے ہی قاری محسوس کرتا ہے کہ خدا کو اس سے گہرا تعلق ہے۔ اس سے گہری محبت ہے، خدا کو اس سے دلچسپی اور ہمدردی

> قرآن کا قاری اگر قرآن کی دعوت پر لبیک کہہ کر بدی اور ظلم کی طاقتوں کے خلاف درستی اور نیکی کی جنگ لڑنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ اس جنگ میں خود خدا اس کا ساتھی ہے۔ وہ اُس کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں۔ سر پر اور سینے کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ وہ اُس کا خنجرِ جہاد ہے وہ اُس کے بچاؤ کی ڈھال ہے۔ وہ اُس کے بازوؤں کی قوت ہے۔

ہے، وہ اس کے ہر خیال کے ساتھ ساتھ ہے۔ اس کے ہر کام میں حصّہ لے رہا ہے۔ وہ اس کی دعائیں سنتا، اس کی

> اس کتاب کے اسلوب میں ایسی حلاوت ہے کہ اِسے پڑھتے ہُوئے آدمی پر سوز و گداز اور رقت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ قاری نے اگر دل کے دروازے بند نہ کر رکھے ہوں تو وہ اس کلام کی مرعوبیّت اپنے اوپر طاری ہوتی محسوس کرتا ہے اور بالآخر اس کی رُوح سربسجود ہوکر رہ جاتی ہے۔

پکاروں کا جواب دیتا، اُس کے کام سنوارتا، اُسے خیر سے بہرہ ور کرتا اور شر سے بچاتا ہے۔ قرآن کا قاری اگر قرآن کی دعوت پر لبیک کہہ کر بدی اور ظلم کی طاقتوں کے خلاف راستی اور نیکی کی جنگ لڑنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ اس جنگ میں خدا خود اس کا ساتھی ہے، وہ اُس کے آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں اور سر پر اور سینے کی گہرائیوں میں موجود ہے، وہ اُس کا خنجر جہاد ہے، وہ

> ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح جڑا ہوا ہے۔ ایک ایک سطر شاخِ گل ہے اور ایک ایک سورت خیابانِ بہار!

اس کے بچاؤ کی ڈھال ہے، وہ اُس کے بازوؤں کی قوت ہے۔

پھر قرآن کا قاری جب موسیٰؑ اور یوسفؑ کی داستانیں پڑھتا ہے، نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جدوجہد کا ریکارڈ دیکھتا ہے تو اس میں یہ ایمانِ محکم پیدا ہوتا ہے، کہ تاریخ کی جنگاہ میں خیر و شر کا جو معرکہ مسلسل برپا رہا ہے خدا اُس سے بے تعلق نہیں ہے، بلکہ پس پردہ بیٹھا وہ اپنے تصرفِ خاص سے ہر دور میں ایک خاص طرح کے نتائج پیدا کرتا ہے۔ مخالف طاقتوں کو ایک خاص انجام سے دوچار کرتا ہے۔

پھر قرآن کی نگارش کا کمال ہے کہ اس کے قاری کے سامنے حشر و نشر کا نقشہ ایسی وضاحت سے آتا ہے۔ کہ کوئی بڑے سے بڑا عرصہ غفلت گزار کر اور فراریت کے صدہا تجربے کرکے بھی اُس کا انکار نہیں کرسکتا۔ اُسے آخرت کی عدالت دکھائی دینے لگتی ہے اور اُس تک پہنچنے کے لیے موت کا دروازہ سامنے کُھلا نظر آتا ہے۔ وہ عدالت جہاں

> قرآن پُورے کے پُورے انسان کو حرکت میں لے آتا ہے۔ اس کے شعور کو بھی، اس کے جذبات کو بھی (جائز حدود میں)، اُس کی دنیوی خواہشوں کو بھی اور اس کے اخلاقی معاملات کو بھی

نہ رشوت چلے گی، نہ سفارش کے زور سے اہلکاروں سے سازباز کی جاسکے گی۔ نہ کوئی کسی کا فدیہ دے گا۔ نہ وکیلوں کی چرب زبانی کام آئے گی، نہ دوست اور رشتہ دار سہارا دے سکیں گے۔ اور نہ رونا چیخنا ہی سودمند ہوگا بلکہ وہاں کا قانون تو بس یہ ہے کہ :-

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال - ۷-۸)

جس کسی نے رتی بھر بھی نیکی کی ہوگی وہ اُسے وہاں دیکھ لے گا۔ اور جس کسی نے رتی بھر بھی بدی کی ہوگی وہ بھی اُسے وہاں دیکھ لے گا۔



سید ابوالاعلیٰ مودودی



اس حقیقت کو نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اس موضوع سے متعلق بیشتر آیات میں فقط اس اعلان پر اکتفا کیا گیا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے نازل کردہ ہے۔ لیکن بعض آیات ایسے داخلی شواہد و دلائل پر بھی مشتمل ہیں جن سے قرآن کا کلامِ الٰہی ہونا قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے۔

ان دلائل میں سرِ فہرست قرآن مجید کا وہ چیلنج ہے جو معترضین کو دیا گیا ہے، اور اُن سے کہا گیا ہے کہ "اگر تم اس قرآن کو کسی انسان کی تصنیف سمجھتے ہو تو اس کی مانند کوئی کلام تصنیف کر کے دکھاؤ"۔

بعض لوگ اس چیلنج کی حقیقی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ایک قرآن ہی کیا، کسی شخص کے اسٹائل میں بھی دوسرا کوئی شخص نثر یا نظم لکھنے پر قادر نہیں ہوتا، ہومر، رومی، شیکسپیئر، گوئٹے، غالب، ٹیگور، اقبال سب ہی اس لحاظ سے بے مثل ہیں کہ ان کی نقل اُتار کر انھی جیسا کلام بنا لانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ قرآن کے چیلنج کا یہ جواب دینے والے دراصل غلط فہمی میں ہیں کہ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ ۔۔۔۔ کا مطلب قرآن کے اسٹائل میں اس جیسی کوئی کتاب لکھ دینا ہے۔ حالانکہ اس سے مراد محض اسٹائل میں مماثلت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس پائے اور اس شان اور اس مرتبے کی کوئی کتاب لے آؤ جو صرف عربی ہی میں نہیں، دنیا کی کسی زبان میں خصوصیات کے لحاظ سے قرآن کی مدِ مقابل قرار پا سکے۔ جن کی بنا پر قرآن ایک معجزہ ہے۔ مختصراً چند بڑی بڑی خصوصیات حسب ذیل ہیں جن کی بنا پر قرآن پہلے بھی معجزہ تھا اور آج بھی معجزہ ہے:

۱۔ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اس کے ادب کا وہ بلند ترین اور مکمل ترین نمونہ ہے۔ پوری کتاب میں ایک لفظ اور ایک جملہ بھی معیار سے گرا ہوا نہیں ہے۔ جس مضمون

کو بھی ادا کیا گیا ہے موزوں ترین الفاظ اور مناسب ترین اندازِ بیان میں کیا گیا ہے۔ ایک ہی مضمون بار بار بیان ہوا ہے اور ہر مرتبہ پیرایۂ بیان نیا ہے جس سے تکرار کی بدنمائی کہیں پیدا نہیں ہوتی۔ اوّل سے لے کر آخر تک ساری کتاب میں الفاظ کی نشست ایسی ہے جیسے نگینے تراش تراش کر جوڑے گئے ہوں۔ کلام اتنا موثر ہے کہ کوئی زبان دان آدمی اسے سن کر سر دُھنے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ منکر اور مخالف کی روح بھی وجد کرنے لگتی ہے۔ ۱۴۰۰ برس گزرنے کے بعد بھی آج تک یہ کتاب اپنی زبان کے ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے۔ جس کے برابر تو درکنار، جس کے قریب بھی اس زبان کی کوئی کتاب اپنی ادبی قدر و قیمت میں نہیں پہنچتی یہی نہیں بلکہ یہ کتاب عربی زبان کو اس طرح پکڑ کر بیٹھ گئی ہے کہ ۱۴ صدیاں گزر جانے پر بھی اس زبان کا معیارِ فصاحت وہی ہے جو اس کتاب نے قائم کر دیا تھا۔ حالانکہ اتنی مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ دُنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو اتنی طویل مدت تک املا، انشا، محاورے، قواعدِ زبان اور استعمالِ الفاظ میں ایک ہی شان پر باقی رہ گئی ہو، لیکن یہ صرف قرآن کی طاقت ہے جس نے عربی زبان کو اپنے مقام سے ہلنے نہ دیا۔ اس کا ایک لفظ بھی آج تک متروک نہیں ہوا ہے۔ اس کا ہر محاورہ آج تک عربی ادب میں مستعمل ہے۔ اس کا ادب آج بھی عربی کا معیاری ادب ہے، اور تقریر و تحریر میں آج فصیح زبان وہی مانی جاتی ہے۔ جو ۱۴ سو سال پہلے قرآن میں استعمال ہوئی تھی۔ کیا دنیا کی کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف اس شان کی ہے؟

۲۔ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر اتنی وسعت اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے جس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ پہلے اس کی تاثیر نے ایک قوم کو بدلا اور پھر اس قوم نے اُٹھ کر دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو بدل ڈالا۔ کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو، یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی نہیں رہ گئی ہے بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ ۱۴ سو برس سے اس کے ان اثرات کا سلسلہ جاری ہے اور روز بروز اس کے یہ اثرات پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

۳۔ جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پوری کائنات پر حاوی ہے۔ وہ کائنات کی حقیقت اور اُس کے آغاز و انجام اور اس کے نظم و آئین پر کلام کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق اور ناظم و مدبر کون ہے، کیا اس کی صفات ہیں، کیا اس کے اختیارات ہیں۔ اور وہ حقیقتِ نفس الامری کیا ہے جس پر اُس نے یہ پورا نظامِ عالم قائم کیا ہے۔ وہ اس جہان میں انسان کی حیثیت اور اس کا مقام ٹھیک ٹھیک مشخص کر کے بتاتی ہے کہ یہ اُس کا فطری مقام اور یہ اس کی پیدائشی حیثیت ہے جسے بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس مقام اور اس حیثیت کے لحاظ سے انسان کے لیے فکر و عمل کا صحیح راستہ کیا ہے جو حقیقت سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور غلط راستے کیا ہیں جو حقیقت سے متصادم ہوتے ہیں۔ صحیح راستے کے صحیح ہونے اور غلط راستوں کے غلط ہونے پر وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز سے نظامِ کائنات کے ایک ایک گوشے سے، انسان کے اپنے نفس اور اس کے وجود سے اور انسان کی اپنی تاریخ سے بے شمار دلائل پیش کرتی ہے اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان غلط راستوں پر کیسے اور کن اسباب سے پڑتا

رہا ہے۔ اور صحیح راستہ جو ہمیشہ سے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا۔ کس ذریعہ سے اس کو معلوم ہو سکتا ہے۔ اور کس طرح ہر زمانے میں اس کو بتایا جاتا رہا ہے۔ وہ صحیح راستے کی صرف نشاندہی کر کے نہیں رہ جاتی بلکہ اس راستے پر چلنے کے لیے ایک پورے نظامِ زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ جس میں عقاید، اخلاق، تزکیۂ نفس، عبادات، معاشرت، تہذیب، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت، قانون، غرض حیاتِ انسانی کے ہر پہلو سے متعلق ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔ مزید براں وہ پوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اس صحیح راستے کی پیروی کرنے اور اُن غلط راستوں پر چلنے کے کیا نتائج اس دنیا میں ہیں اور کیا نتائج دنیا کا موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے عالم میں رونما ہونے والے ہیں۔ وہ اس دنیا کے ختم ہونے اور دوسرا عالم برپا ہونے کی نہایت مفصل کیفیت بیان کرتی ہے، اس تغیر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے بتاتی ہے۔ دوسرے عالم کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے۔ اور پھر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہاں انسان کیسے ایک دوسری زندگی پائے گا۔ اور کس طرح اس کی دنیوی زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ کن امور کی اس سے باز پُرس ہوگی، کیسی ناقابلِ انکار صورت میں اس کا پورا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ کیسی زبردست شہادتیں اس کے ثبوت میں پیش کی جائیں گی۔ جزا اور سزا پانے والے کیوں جزا اور سزا پائیں گے۔ جزا پانے والوں کو کیسے انعامات ملیں گے اور سزا پانے والے کس کس شکل میں اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ اس وسیع مضمون پر جو کلام اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اس حیثیت سے نہیں ہے کہ اس کا مصنف کچھ صغریٰ کبریٰ جوڑ کر چند قیاسات کی ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے، بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اس کا مصنف حقیقت کا براہِ راست تعلق رکھتا ہے، اس کی نگاہ ازل سے ابد تک سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ تمام حقائق اس پر عیاں ہیں کائنات پوری کی پوری اس کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ نوعِ انسانی کے آغاز سے اس کے خاتمہ تک ہی نہیں بلکہ خاتمہ کے بعد اس کی دوسری زندگی تک بھی وہ اس کو بیک نظر دیکھ رہا ہے۔ اور وہ قیاس و گمان کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر انسان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جن حقائق کو علم کی حیثیت سے وہ پیش کرتا ہے ان میں سے کسی ایک کو بھی آج تک غلط ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ جو تصورِ کائنات و انسان پیش کرتا ہے وہ تمام مظاہر اور واقعات کی مکمل توجیہ کرتا ہے۔ اور ہر شعبۂ علم میں تحقیق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ فلسفہ و سائنس اور علوم و عمران کے تمام آخری مسائل کے جوابات اس کے کلام میں موجود ہیں۔ اور سب کے درمیان ایسا منطقی ربط ہے کہ ان پر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر قائم ہوتا ہے۔ پھر عملی حیثیت سے جو رہنمائی اس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو دی ہے وہ انتہائی معقول اور انتہائی پاکیزہ ہی نہیں بلکہ ۱۴ سو سال سے روئے زمین کے مختلف گوشوں میں بے شمار انسان بالفعل اس کی پیروی کر رہے ہیں اور تجربے نے ان کو بہترین ثابت کیا ہے۔ کیا اس شان کی کوئی انسانی تصنیف دنیا میں موجود ہے۔ یا کبھی موجود رہی ہے جسے اس کتاب کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہو؟

۴۔ یہ کتاب پوری کی پوری بیک وقت لکھ کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کر دی گئی تھی بلکہ چند ابتدائی ہدایات کے ساتھ ایک تحریکِ اصلاح کا آغاز کیا گیا تھا اور اس کے بعد ۲۳ سال تک وہ تحریک جن جن مرحلوں سے گزرتی

رہی ان کے حالات اور ان کی ضروریات کے مطابق اس کے اجزا اس تحریک کی رہنمائی کی زبان سے کبھی طویل خطبوں اور کبھی مختصر جملوں کی شکل میں ادا ہوتے رہے۔ پھر اس مشن کی تکمیل پر مختلف اوقات میں صادر ہونے والے یہ اجزا اس مکمل کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر دنیا کے سامنے رکھ دیے گئے۔ جسے "قرآن" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تحریک کے رہنما کا بیان ہے کہ یہ خطبے اور جملے اس کے طبعزاد نہیں ہیں۔ بلکہ خداوندِ عالم کی طرف سے اس پر نازل ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص خود انھیں اس رہنما کے طبعزاد قرار دیتا ہے تو وہ دنیا کی پوری تاریخ سے کوئی نظیر ایسی پیش کرے کہ کسی انسان نے سالہا سال تک مسلسل ایک زبردست اجتماعی تحریک کی بطور خود رہنمائی کرتے ہوئے کبھی ایک واعظ اور معلمِ اخلاق کی حیثیت سے، کبھی ایک مظلوم جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے، کبھی ایک مملکت کے فرمانروا کی حیثیت سے، کبھی ایک برسرِ جنگ فوج کے قائد کی حیثیت سے، کبھی ایک فاتح کی حیثیت سے، کبھی ایک شارع اور مقنن کی حیثیت سے، غرض بکثرت مختلف حالات اور اوقات میں بہت سی مختلف حیثیتوں سے جو مختلف تقریریں کی ہوں یا باتیں کہی ہوں وہ جمع ہو کر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر و عمل بنا دیں، ان میں کہیں کوئی تناقض اور تضاد نہ پایا جائے، ان میں ابتدا سے انتہا تک ایک ہی مرکزی تخیل اور سلسلۂ فکر کار فرما نظر آئے۔ اس نے اول روز سے اپنی دعوت کی جو بنیاد بیان کی ہو آخری دن تک اسی بنیاد پر وہ عقائد و اعمال کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام بناتا چلا جائے جس کا ہر جزو دوسرے اجزا سے کامل مطابقت رکھتا ہو اور اس مجموعہ کو پڑھنے والا کوئی صاحبِ بصیرت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ تحریک کا آغاز کرتے وقت اس کے محرک کے سامنے آخری مرحلے تک کا پورا نقشہ موجود تھا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بیچ کے کسی مقام پر اس کے ذہن میں کوئی ایسا خیال آیا ہو جو پہلے اس پر منکشف نہ تھا۔ یا جسے بعد میں اس کو بدلنا پڑا۔ اس شان کا کوئی انسان اگر کبھی گزرا ہو جس نے اپنے ذہن کی خلاقی کا یہ کمال دکھایا ہو تو اس کی نشاندہی کی جائے۔

۵۔ جس رہنما کی زبان پر یہ خطبے اور جملے جاری ہوتے تھے وہ یکایک کسی گوشے سے نکل کر صرف ان کو سنانے کے لیے نہیں آجاتا تھا اور انھیں سنانے کے بعد کہیں چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ اس تحریک کے آغاز سے پہلے بھی انسانی معاشرے میں زندگی بسر کر چکا تھا اور اس کے بعد بھی وہ زندگی کی آخری ساعت تک ہر وقت اسی معاشرے میں رہتا تھا۔ اس کی گفتگو اور تقریروں کی زبان اور طرزِ بیان سے لوگ بخوبی آشنا تھے۔ احادیث میں ان کا ایک بڑا حصہ اب بھی محفوظ ہے جسے بعد کے عربی دان لوگ پڑھ کر خود بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ اس رہنما کا اپنا طرزِ کلام کیا تھا۔ اس کے ہم زبان لوگ اس وقت بھی صاف محسوس کرتے تھے اور آج بھی عربی زبان کے جاننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کتاب کی زبان اور اس کا اسٹائل اس رہنما کی زبان اور اس کے اسٹائل سے بہت مختلف ہے۔ حتیٰ کہ جہاں اس کے کسی خطبے کے بیچ میں اس کتاب کی کوئی عبارت آجاتی ہے وہاں دونوں کی زبان کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کبھی اس بات پر قادر ہوا ہے یا ہو سکتا ہے کہ سالہا سال تک دو قطعی مختلف اسٹائلوں میں کلام کرنے کا تکلف نباہتا چلا جائے، اور کبھی یہ راز فاش نہ ہو سکے کہ یہ دو الگ اسٹائل دراصل ایک ہی شخص کے ہیں؟ عارضی اور وقتی طور پر اس قسم کے تصنع میں کامیاب



، ہو جانا تو ممکن ہے۔ لیکن مسلسل ۲۳ سال تک ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص جب خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر کلام کرے تو اس کی زبان اور سٹائل کچھ ہو، اور جب خود اپنی طرف سے گفتگو یا تقریر کرے تو اس کی زبان اور اس کا اسٹائل بالکل ہی کچھ اور ہو۔

۶۔ وہ رہنما اس تحریک کی قیادت کے دوران میں مختلف حالات سے دوچار ہوتا رہا۔ کبھی برسوں وہ اپنے ہم وطنوں اور اپنے قبیلے والوں کی تضحیک، توہین اور سخت ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔ کبھی اس کے ساتھیوں پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔ کبھی دشمنوں نے اس کے قتل کی سازشیں کیں، کبھی خود اسے اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ کبھی اُسے پیہم لڑائیوں سے سابقہ پیش آیا۔ جن میں شکست اور فتح دونوں ہی ہوتی رہیں۔ کبھی وہ دشمنوں پر غالب آیا۔ اور کبھی وہی دشمن جنھوں نے اس پر ظلم توڑے تھے اس کے سامنے سرنگوں نظر آئے۔ کبھی اسے وہ اقتدار نصیب ہُوا جو کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ان تمام حالات میں ایک انسان کے جذبات ظاہر ہے کہ یکساں نہیں رہ سکتے۔ اس رہنما نے ان مختلف مواقع پر خود اپنی ذاتی حیثیت میں جب کبھی کلام کیا، اس میں ان جذبات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے جو ایسے مواقع پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر ان مختلف حالات میں جو کلام اس کی زبان سے سنا گیا وہ انسانی جذبات سے بالکل خالی ہے۔ کسی ایک مقام پر بھی کوئی بڑے سے بڑا نقاد انگلی رکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ یہاں انسانی جذبات کارفرما نظر آتے ہیں۔

۷۔ جو وسیع اور جامع علم اس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ اس زمانے کے اہل عرب اور اہل روم و یونان و ایران تو درکنار اس بیسویں صدی کے اکابر اہلِ علم میں سے بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ فلسفہ، سائنس اور علمِ عمران کی کسی ایک شاخ کے مطالعہ میں اپنی عمر کھپا دینے کے بعد آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ اس شعبۂ علم کے آخری مسائل کیا ہیں اور پھر جب وہ غائر نگاہ سے قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ان مسائل کا واضح جواب موجود ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک علم تک محدود نہیں ہے بلکہ ان تمام علوم کے باب میں صحیح ہے جو کائنات اور انسان سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ۱۴ سو برس پہلے ریگستانِ عرب میں ایک اُمّی کو علم کے ہر گوشے پر اتنی وسیع نظر حاصل تھی۔ اور اس نے ہر بنیادی مسئلے پر غور و خوض کر کے اس کا ایک صاف اور قطعی جواب سوچ لیا تھا؟

اعجازِ قرآن کے اگرچہ اور بھی متعدد وجوہ ہیں، لیکن صرف ان چند وجوہ ہی پر اگر آدمی غور کرے تو معلوم ہو جائیگا کہ قرآن کا معجزہ ہونا جتنا نزولِ قرآن کے زمانے میں واضح تھا اس سے بدرجہا زیادہ آج واضح ہے، اور انشاء اللہ قیامت تک یہ واضح تر ہوتا چلا جائے گا۔

قرآن اور دوسری مذہبی کتب

سید معروف شاہ شیرازی

وید

ہندو مت ایک ایسا دھرم ہے جس کی تعلیمات اخفا کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں۔ نہ اس کے اصول ہی واضح ہیں اور نہ فروع۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی اور اس کے مذہبی رہنما کون کون گزرے ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس ہندو مت کا جو مذہبی لٹریچر ہے اس میں کوئی ایسا فکری اتحاد نہیں جس پر "ہندوازم" کا اطلاق کیا جاسکے۔ انسانیت کے غور و فکر کے انتہائی اہم موضوعات یعنی کائنات، اُس کا خالق، ہدایت و ضلالت اور اس کائنات میں انسان کے مقام، ایسے بنیادی مسائل پر بھی، جو ہمیشہ فکرِ انسانی کی جولانگاہ رہے ہیں، اس لٹریچر میں کوئی تسلی بخش مواد نہیں ہے۔ بلکہ ہندو مت میں کتاب کا تصور ہی بالکل جُدا ہے۔

ہندوؤں کا مذہبی لٹریچر

ہندوؤں کے مذہبی لٹریچر میں سے قدیم ترین چیز سمہت Samhita ہیں۔ یعنی گیتوں کے مجموعے۔ یہ چار مجموعے ہیں جنھیں وید کہا جاتا ہے۔ یعنی "مقدس علم"۔ ان کا زمانۂ تصنیف مختلف ہے۔ ان میں سے (۱) رگوید تمام ویدوں سے پرانا ہے۔ یہ مختلف لوگوں کے تصنیف کردہ گیت ہیں۔ اُن کی تصنیف پر حاکمانِ وقت کے دربار سے صلہ ملا کرتا تھا۔ تقریبات میں جو لوگ اِن کو پڑھتے تھے انھیں 'ہوتری' کہا جاتا تھا۔ (۲) 'سام وید'۔ اس میں بھجن ہیں، جنھیں ترنم کے ساتھ گایا جاتا ہے اور گویّے کو "اوگتری" کہتے ہیں۔

(۳) 'یجر وید' میں مذہبی رسومات کے مختلف طریقے ہیں اور جو پروہت یہ طریقے ادا کرتا ہے وہ "ادھ وریو" کہلاتا ہے۔ (۴) 'اتھر وید' اس میں خیالات بالکل دُوسرا رنگ اختیار کر جاتے ہیں۔ بخلاف ان کے جو سابقہ ویدوں میں بیان ہُوئے ہیں۔ یہ دوسرے تین ویدوں کے بعد لکھا گیا ہے۔ اور اسی کے ذریعہ ہندو مذہب میں وہ باتیں داخل ہوئیں جو قدیم آریاؤں کے سادہ مذہب میں نہ تھیں۔ مثلاً جادو افسوں، اور اوہام و خرافات۔ یہ چیزیں آریاؤں سے پہلے ہندوستانی باشندوں میں رائج تھیں۔ ان سے ملاپ کے بعد آریاؤں نے انھیں قبول کر لیا۔ ویدوں کے علاوہ 'برہمن' وہ لٹریچر ہے جو ویدوں کی تفسیر و تشریح میں لکھا گیا اور "آرنیک" وہ لٹریچر ہے جو رشیوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ لیکن رشیوں کی حیثیت متعین نہیں ہے کہ وہ نبی ہیں، ولی ہیں یا محض نیک لوگ ہیں۔ "اپ نشد" وہ لٹریچر ہے جو ترکِ دُنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے مباحث مکالمے

کی شکل میں ہیں۔ یہ فلسفیانہ کتابیں ہیں اور ویدوں کی تعلیمات کے خلاف ردِ عمل ہیں۔ اس تحریک کے مذہبی راہنما برہمنوں کے بجائے عوام سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے کوشش کی کہ وہ سخت ریاضتوں اور ترکِ دنیا کے ذریعہ ایک اعلیٰ معیار قائم کرکے برہمنوں کی برتری کو ختم کر دیں۔ یہ تحریک بہت کامیاب ہوئی۔ رامائن اور مہابھارت بھی مقدس کتابیں سمجھی جاتی ہیں جو درحقیقت تاریخ و سوانح کی کتابیں ہیں۔ بھگوت گیتا مہابھارت کا ایک حصہ ہے "شاستر" فلسفیانہ اور متکلمانہ کتابیں، "پران" کہانیوں پر مشتمل داستانیں ہیں۔

نامعلوم زمانہ و ماخذ

ویدی لٹریچر کس طرح عالم وجود میں آیا؟ اس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ نہ ان کا ماخذ و مصدر معلوم ہے اور نہ سنِ تصنیف کا صحیح پتہ ہے۔ اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ خیالات ہیں جو آریہ اپنے اصلی وطن سے ساتھ لائے تھے۔ سنِ تصنیف کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض محققین اس کا سنِ تصنیف [illegible] قبل مسیح، بعض [illegible] ق م، بعض [illegible] ق م اور بعض [illegible] ق م بتاتے ہیں۔ یہ سنسکرت زبان میں ہیں۔ ماہرینِ لسانیات کا خیال ہے کہ یہ زبان اور ایران کی قدیم زبان ژند ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ ایران کے قدیم مذہب مجوسیت کی بعض تعلیمات اور ویدوں کی بعض تعلیمات آپس میں ملتی ہیں۔ مثلاً مجوسیت میں بھی آگ کی اہمیت ہے اور ویدوں کے اہم دیوتا کا نام بھی "اگنی" ہے

تعلیمات کی نوعیت

وید جس قسم کی تعلیمات پر مشتمل ہیں اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات خدائی تعلیمات نہیں ہیں۔ یہاں ایک دیوتا جسے "پرجا پتی" کہا جاتا ہے، خالقِ کائنات ہے لیکن "برہما" کے دور میں اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ باقی جتنے دیوتا ہیں اُن کی حیثیت چند مظاہر یا اونچے درجے کے انسانوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ویدک تعلیمات میں یگانگت اور نظم بالکل نظر نہیں آتا۔ امتدادِ زمانہ سے خیالات بدلتے رہے ہیں۔ پھر مقامِ انسانیت کے متعلق ان کی تعلیمات قابلِ قبول نہیں۔ یہ انسانوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کرتی ہیں، اور عزت و شرف کا معیار طبقے کو قرار دیتی ہیں، انسانی خیر اور سیرت و کردار کو نہیں۔ ان تعلیمات میں مظاہر پرستی اور رسم پرستی کی بھرمار ہے۔ سرسری مطالعے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تعلیمات خدائی تعلیمات نہیں، بلکہ انسانی تعلیمات ہیں۔ ویدوں اور اُن کے بعد آنے والی تعلیمات مثلاً برہمن، اپ نشد، شاستر وغیرہ کا معاشرہ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان دنیوی زندگی سے فرار اختیار کرے، مایوس ہو جائے اور بالآخر خودکشی کر ڈالے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ویدازم کے بعد ہندوستان میں جتنے 'ازم' پیدا ہوئے۔ انھوں نے انسانیت کو مایوسی کا شکار کیا۔ مثلاً اپ نشد کی تعلیم، بدھ مت کی تعلیمات اور جین مت کا فلسفہ۔ آخرالذکر میں تو زندگی کے حقائق سے فرار اس حد تک بڑھا کہ خودکشی جیسے جرم کو قابلِ ستائش اور شہادتِ عظمیٰ قرار دیا گیا۔

غیر الہامی مواد

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ ویدوں کے ہر اشلوک کا مصنف کوئی انسان ہے۔ بعض اشلوکوں میں ان رشیوں کا نام تک موجود ہے۔ جنھوں نے یہ اشلوک کہا ہے۔ بعض اشلوک جمادات و حیوانات وغیرہ کی زبانی کہے گئے ہیں۔ اس وجہ سے اکثر ہندو اہلِ علم کی رائے ہے کہ یہ اشلوک الہامی نہیں ہیں۔

ان کی زبان سنسکرت ہے اور یہ زبان کسی وقت بھی ہندوستان کے عوام کی زبان نہیں رہی ہے۔ صرف برہمنوں تک محدود رہی ہے اور عرصۂ دراز تک یہ اس قدر مقدس سمجھی گئی ہے کہ اس کا لکھنا تک ممنوع رہا

ہے۔ تقدس کا یہ تصور بھی بجائے خود غیر عقلی ہے اور برہمنوں کے علاوہ کسی اور کے لیے اس کا سیکھنا ممنوع تھا۔ جب کوئی زبان عام نہ ہو۔ اس میں کتابیں لکھی ہوئی نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ ایک اجارہ دار طبقے نے اس میں کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جین مت اور بدھ مت نے بڑی سختی سے سنسکرت کے تقدس اور برہمنوں کی اجارہ داری کی مخالفت کی۔

ہندو یونیورسٹی کے ڈاکٹر پران ناتھ کی رائے یہ ہے کہ رگ وید کا تعلق اس وقت سے ہے جب آریہ بابلی اور مصری اقوام ایک جگہ رہ رہی تھیں اور سنسکرت میں اس کا ترجمہ برہمنوں نے کیا ہے۔ یہی تعلیمات آریہ کے ساتھ منگولیا گئیں اور ایرانی اپنے ساتھ ایران لے گئے۔

غرض وید نہ اصلی شکل میں موجود ہیں نہ مصنف اور زمانۂ تصنیف کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے ان کی تعلیمات ایسی ہیں جنھیں نہ عقل و دانش سے کوئی نسبت ہے اور نہ ادیانِ سماوی، یہودیت، عیسائیت اور اسلام سے کوئی یگانگت ہے۔ کتاب تو کتاب رہی اس کے دیوتاؤں تک کے مقام، ان کی اہمیت اور تقدیس میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ آج ایک دیوتا بڑا ہے تو کل کوئی اور اس سے بڑا ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وید میں کا حقیقت سے کوئی تعلق ہے۔ کوئی متعین اصول اور مرتب نظام نہ ہونے کی وجہ سے اس مذہب میں ایک عجیب قسم کی لچک پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا مزاج انضمامی بن گیا ہے۔

یہ دوسری قوموں، دوسرے مذاہب اور دوسرے طریقوں کو بہت جلد اپنے میں ضم کر لیتا ہے لیکن اس طرح کہ یہ انضمام اعلیٰ سطح پر نہیں بلکہ پست ترین سطحوں پر ہوتا ہے اور اصل اہلِ مذہب کی اجارہ داری کو متاثر نہیں ہونے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مغربی اہلِ علم نے اس مذہب کے مزاج کو "سامراجی مزاج" قرار دیا ہے۔ اس کی لچک پسندی کا حال یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر رادھا کرشنن اس میں موحد سے لے کر ملحد تک سبھی جمع ہو سکتے ہیں۔ اس طرح یہ کوئی مخصوص مرتب نظام نہیں دیتا بلکہ ایک مخصوص ذہنیت کے ساتھ ایک خاص طبقے کی اجارہ داری قائم کرتا ہے اور ہر کسی کو اپنے تسلط میں لینے کی کوشش کرتا ہے اور ایک بت پرستانہ برہمنی کلچر کا مضبوط حصار اپنے گرد بنائے ہوئے ہے۔ یہ ہر نئے رجحان یا فکر کو اپنے عقل کش صنمیاتی نظام کے تحت لے کر اسے مسخ کر لیتا ہے۔ اسلام کو بھی اس مذہب نے "ہضم" کرنے کی بڑی منظم کوشش کی تھی۔ لیکن اس میں قطعاً ناکام رہا۔ ہندو معاشرہ ویدوں اور اپنے صنمیاتی تصورات اور منفی تعصبات اور مذہبی طلسم کے گرد اگر جمع ہے تو محض ایک غیر عقلی اعتقاد کی وجہ سے۔ جس دن اس معاشرے میں عقل جاگ اٹھی اور مذہبی مواد کا تنقیدی جائزہ لینے کا آغاز ہوا اس دن بہت بڑے ذہنی انقلاب کا آغاز ہوگا۔

زند اوستا

اوستا وہ کتاب ہے جسے زرتشت مذہب کے پیرو اپنی مقدس اور آسمانی کتاب سمجھتے ہیں زردشت کی ذات اور اس کے زمانے کے متعلق بیحد اضطراب پایا جاتا ہے۔ بعض کے قول کے مطابق وہ ۶۳۵ ق م میں اور بعض دوسرے محققین کی رائے میں وہ ۶۰۰ ق م میں گزرے ہیں۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ زردشت کسی ایک شخص کا نام نہیں بلکہ کئی اشخاص اسی نام کے گزرے

ہیں، جو مختلف اوقات میں لوگوں کی رہنمائی کرتے رہے بہر حال کسی وقت پورے ایران پر اوستا کی حکمرانی تھی۔ اوستا Avesta کا قدیم تلفظ اوستاک Avestak تھا۔ دونوں کے لفظی معنے معلوم نہیں۔

اوستا کے چار حصّے

موجودہ اوستا کے چار حصے ہیں:

(۱) یسنا Yasna اس میں عبادت کے لیے دعائیں درج ہیں۔ اس کے کل ۷۲ ابواب ہیں، جن میں سے باب ۲۸ تا باب ۵۴ خود زردشت کے لکھے ہوئے بتائے جاتے ہیں۔ اسی یسنا میں وہ حصہ بھی شامل ہے، جسے گاتھا Gathas کہتے ہیں اور یہ نثر کے درمیان منظوم قطعات ہیں۔ جس کی نوعیت مذہبی ترانوں کی ہے۔

(۲) ویسپریڈ Vispered اس کے چوبیس ابواب ہیں اور یسنا کی طرح دعاؤں پر مشتمل ہے۔

(۳) وندیداد Vendidad اس کے بائیس ابواب ہیں۔ اس میں دیووں اور بھوتوں وغیرہ سے محفوظ رہنے کے منتر ہیں۔ نیز زراعت، اچھے جانوروں کی حفاظت، پاکیزہ عناصر کی حفاظت، اور انسانی جسم کو گندہ ہونے سے بچانے کے متعلق تدابیر و ہدایات درج ہیں۔

(۴) یاشت Yashts اس میں مردہ روحوں اور خداؤں سے استمداد کی دعائیں ہیں۔ ان کی ترکیب گو شاعرانہ نہیں، پھر بھی ان میں ترنم پایا جاتا ہے۔ اور ان کی حیثیت بھی سرود کی ہے۔

اس کے علاوہ بھی مقدس کتابیں ہیں مثلاً وساتیر جس میں پندرہ مختلف اشخاص کے خطوط ہیں۔ اگرچہ ان میں کچھ حقائق بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر خرافات پر مشتمل ہیں۔ بعض خطوط زرتشوروں (پیغمبروں) کے بتائے جاتے ہیں۔

تاریخی حیثیت

اوستا کو "زند اوستا" کہا جاتا ہے۔ چونکہ زند زبان میں اوستا کا اصل متن موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس کی حقیقت تک پہنچنا مشکل ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایران میں ستر فرقے موجود تھے۔ ہر ایک کے پاس اپنی اوستا تھی۔ جسے وہ حقیقی اور اصل سمجھتے تھے۔ چنانچہ شاہ اوتخشتاہ Artneskes نے ۴۸۵ ق م میں اسی ہزار منوں کی کونسل منعقد کی۔ ان میں سے سات افراد کا چناؤ ہوا۔ پھر ان سات میں ایک اہل تر کو منتخب کیا گیا۔ اسے شراب کے تین پیالے پلائے گئے۔ وہ ایک طویل اور گہری نیند سویا اور اٹھ کر بتایا کہ اس نے اس دوران آسمانوں کی سیر کی اور دیوتاؤں سے اصل اوستا کی تعلیمات معلوم کر لیں۔ سب نے اس پر یقین کر لیا اور ایک کتاب مرتب ہوئی لیکن یہ کتاب بھی آج موجود نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ زردشت نے ۲۰ کتابیں لکھی تھیں، جو ایک لاکھ آیات پر مشتمل تھیں، اور گائے کے بارہ سو یا بارہ ہزار چمڑوں پر تحریر تھیں سکندرِ اعظم نے ان کو تباہ کر [illegible] ب اس کا دور ختم ہوا تو مختلف لوگوں سے ٹکڑے جمع کر کے یہ اوستا پھر مرتب ہوئی۔ جدید تحقیقات نے [illegible]س بات کی تصدیق کر دی ہے کہ اوستا کا اصل نسخہ [illegible]مش حکومت کے زمانے میں برباد ہو گیا۔ پھر تقریباً چار سو [illegible]ل بعد بلاس اوّل کے عہد میں اس کی تدوینِ ثانی کی

ل Encyclopaedia of Religions اسے بعض لوگ ہندی آریائی، اور بعض فلسطینی بتاتے ہیں۔

۲: "اسلام اور مذاہب عالم ص ۳۴ لاہور ۱۹۶۵ء

۳: انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۲۳ ص ۹۴۲

۴ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۲۳ ص ۹۴۲، ۹۴۳

کوشش کی گئی، مگر تکمیل ساسانی اردشیر بابکان کے زمانے میں ہوئی۔ اس تدوین میں گاتھا کے علاوہ بقیہ تمام حصے کی تصنیف میں محض حافظے پر اعتماد کیا گیا۔ زردشتی روایت اور ایک پہلوی کتاب دینکرت Dinkart کے بیان کے مطابق قدیم اوستا ایک ہزار ابواب اور اکیس صحیفوں پر مشتمل تھی۔ تدوینِ ثانی کے وقت اس کے کل ۳۴۸ ابواب دستیاب ہو سکے جن کو سابقہ تدوین ہی کے اصول پر اکیس صحیفوں پر تقسیم کیا گیا۔ جدید محققین بتاتے ہیں کہ وہ دوسرا نسخہ بھی جس کو ساسانی نسخہ کہا گیا ہے باقی نہیں رہا۔ اس دوسرے نسخے میں ۳،۴۵،۰۰۰ کلمات (آیات) تھے۔ مگر موجودہ اوستا میں کل تراسی ہزار (۸۳۰۰۰) کلمات ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دوسرے نسخے کا بھی تین چوتھائی حصہ برباد ہوگیا اور کل ایک چوتھائی حصہ باقی بچا[1]۔ غرض خود پارسی روایات اس بات کی تصدیق کر رہی ہیں کہ اُن کے پاس اصل اوستا نہیں ہے۔ موجودہ اوستا اصل تعلیمات کا ایک مجموعہ ہے اور اس میں سے بھی کسی چیز کے بارے میں

> ایک کونسل میں سے سات افراد ... پھر اُن سات میں سے ایک اہل تر کو منتخب کیا گیا۔ اُسے شراب کے تین پیالے پلائے گئے۔ وہ ایک طویل اور گہری نیند سویا اور اُٹھ کر بتایا کہ اُس نے اس دوران آسمانوں کی سیر کی اور دیوتاؤں سے اصل اوستا کی تعلیمات معلوم کر لیں

حوالے: [1] انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن ص: ۱۴۔
قدیم مشرق جلد ۲ - صفحہ ۱۴۲

یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فی الواقع زردشت کی تعلیمات کا حصہ ہے۔

حق و باطل کی آمیزش

زردشت کی تعلیمات کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ وہ ایک حد تک جامعیت رکھتی ہیں۔ اُن میں زندگی کے تقریباً تمام مسائل کو چھیڑا گیا ہے۔ لیکن اصل تعلیمات کے بار بار ضائع ہونے اور پھر ترتیب پانے سے اب یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ زردشت کی اصل تعلیمات کیا تھیں۔ اور خارجی اثرات کیا پڑے۔ اگر زردشت پیغمبرِ حق تھے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اُن کی تعلیمات میں ثنویت (دو خداؤں کا ماننا) دیوتاؤں کی پرستش، آگ کی تقدیس اور اسی قسم کے دوسرے خیالات اور رسومات وغیرہ کی شمولیت، ہندومت، مجوسیت، اور یونانیوں کے زیرِ اثر بہت بعد میں ہوئی اور اگر وہ مجوسی مذہب کے پیروکار تھے تو پھر اُن کے مذہب نے کچھ بیرونی اصلاحات قبول کیں۔ اہورا ماڑ داد (خدا) اور اُس کی چھ صفات[2]، عقیدۂ آخرت۔ پل صراط، صفائی اور پاکیزگی اور تمام اخلاقی تعلیمات یہودیت و عیسائیت وغیرہ سے درآمد ہوئیں۔ ان ہی خصوصیات کی وجہ سے اکثر پارسی لوگ اسلامی انقلاب کے بعد اس میں داخل ہو گئے۔

بہر حال موجودہ اوستا کی تعلیمات میں حق و باطل کی ایک عجیب و غریب آمیزش ہے۔ خدا کے مقابل میں شیطان کا تصور ایک عام تصور ہے، لیکن زردشتی تعلیمات میں اہورا ماڑدا (خدا)، کے مقابلے میں اینگرو مینو (شیطان)، ایک مستقل خدا اور خالقِ شر بن گیا۔ اسی طرح عذاب و آخرت کے متعلق مجموعی تصور درست ہونے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ انسان کو دنیا میں دوبارہ آ کر کام کرنے کا موقع دیا جائیگا۔ خود خدا کی صفات اور ایک خدا کی پوجا کے بعد صفات کی تجسیم

[2] تاریخ مذاہب رشید احمد ص ۱۷۰ نیز اسلام اور مذاہب عالم ص ۵

شروع ہو جاتی ہے اور دیوی دیوتا بن جاتے ہیں اور خود خالقِ شر اینگرو مینو اور اُس کے دیوتاؤں کی قربانی بھی مذہبی فرائض میں داخل ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ دفعِ شر کے لیے ہے، اہورا ماڑدا کی عبادت کے وقت آگ کا ہونا ضروری متصور ہوتا ہے، جو مجوسیت کے زیرِ اثر ہے۔ جادو اور بے جا روحانیت کی مخالفت کے باوجود خود زردشت کو ایک جادوگر اور روحانیت کا ایسا علمبردار ثابت کیا جاتا ہے جو مستقبل کے حالات کا علم رکھتا ہے۔ ایک طرف بجا طور پر صفائی اور پاکیزگی کی تاکید ہے لیکن اس میں اس قدر غلو ہے کہ انسانی لاشوں کو بھی گندگی سمجھ کر دفنایا نہیں جاتا۔ بلکہ پرندوں کے آگے ڈالا جاتا ہے، تاکہ زمین پلید نہ ہو جائے[1]۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس وقت زردشتی مذہب کے بانی کے بارے میں شدید اختلافات ہیں کہ وہ کون تھا اور اس نے کہاں پرورش پائی۔ اس کے بعد اس کی تعلیمات کی باری آتی ہے تو نہ زند اوستا محفوظ ہے اور نہ ہی اُس کی تعلیمات میں توازن اور وحدتِ فکر ہے۔ توحید و شرک، حق و باطل، حقیقت پسندی اور اوہام پرستی شانہ بشانہ نظر آتی ہیں۔ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے اصل خیالات کونسے ہیں اور بعد میں داخل ہونے والے کونسے۔ صرف اس قدر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ زردشتی تعلیمات حقیقت کے قریب تر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ماننے والے بہت جلد اسلام کی طرف لپکے اور اُن کے جذبۂ عملیت نے اسلامی تحریک کی بڑی خدمت انجام دی۔ انھوں نے اسلام کی تعلیمات کی حقانیت کو بہت جلد پہچان لیا اور فطری لگاؤ کے ساتھ اس طرف لپکے۔ یہ تاریخی حقیقت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بگاڑ کے باوجود اُن کے مذہب میں حقیقی الہامی ہدایت کے اتنے اثرات موجود تھے کہ انہوں نے ہدایتِ الٰہی کو فوراً پہچان لیا۔

[1] اسلام مذاہب عالم منظر الدین۔ ثقافتِ اسلامیہ لاہور ص ۵۲ ۱۹۶۵ء

تورات

بنی اسرائیل دنیا کی وہ واحد قوم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کی انتہا کر دی، لیکن جو اپنی بداعمالیوں کے باعث زمین کا ناسور بنی اور خدا کے غضب اور اُس کی لعنت کی سزاوار ہوئی۔ اس قوم پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بے پناہ بارشیں ہوئیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے نوازا۔ راہ نمائی کے لیے بیشمار نبی بھیجے۔ تورات، زبور اور انجیل تین آسمانی کتابیں اور بیشمار صحیفے عطا فرمائے۔ دنیاوی شوکت اور دینی سیادت کے لحاظ سے اُسے پورے جہان پر فضیلت دی (فضلتکم علی العلمین[1]) مصر کی غلامی سے نجات دی گئی، صحرا کی دشت نوردی سے چھڑایا گیا۔ بابلیوں اور رومیوں کی غلامی سے نجات دلائی گئی لیکن ان سب انعامات کے، باوجود اس قوم نے اللہ کی نافرمانی کی، اس کی اطاعت سے مُنہ موڑا۔ اس کے نبیوں کو قتل کیا۔ اس کی کتابوں کو ... دیا اور بار بار شرک و بت پرستی میں مبتلا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار تنبیہ کی گئی لیکن اُن کے فسق و فجور اور کفر و عصیان میں کوئی کمی نہ آئی۔ بالآخر حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ملعون قرار دیئے گئے۔ اس پر انھوں نے آپ کے خلاف بھی سازش کا جال تیار کیا اور آپ کو گرفتار کر کے قتل کرنے کی کوشش کی۔ مگر اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو اُن کے دستِ ظلم سے بچا لیا۔ غرض اُن کے یہ کرتوت جاری تھے کہ قرآن کا فیصلہ صادر ہوا:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا
بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُو

[1] : البقرۃ : ۴۷

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

(آل عمران ۳ : ۱۱۲)

یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی۔ کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو اور بات ہے۔ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے اور یہ سب کچھ صرف اسی وجہ سے ہوا کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے۔ اور انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔

بنی اسرائیل کا عبرتناک ماضی

بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں جن کا نام اسرائیل تھا۔ حضرت یوسفؑ کے دور میں یہ لوگ مصر میں آباد ہوئے۔ اور کافی پھلے پھولے۔ بعد کے زمانے میں مصریوں نے انھیں اپنا غلام بنا لیا۔ یہاں تک کہ اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور اس قوم میں ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا۔ ان کو مصر کی غلامی سے نجات ملی۔ اس کے بعد ان کو حکم ہوا کہ فلسطین کو فتح کرو لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ لوگ فلسطین میں داخل ہوئے۔ ان کو حکم یہ تھا کہ وہاں کی بت پرست اقوام کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ لیکن انھوں نے پھر نافرمانی کی اور یہاں کی حتی، اموری، کنعانی، فرزی، حوی، یبوسی اور فلستی اقوام سے گھل مل گئے۔ یہ قومیں حد درجہ بت پرست تھیں۔ بنی اسرائیل بھی اپنے دین کو بھلا کر بت پرست بن گئے[1]۔ ان اقوام نے متحد ہو کر اسرائیل کو مغلوب کر لیا۔ اور اُن سے تابوتِ سکینہ چھین لیا۔ حضرت طالوتؑ اور حضرت داؤد (۱۰۰۰ ق م تا ۹۳۶ ق م) کے دور میں کھویا ہوا اقتدار انھوں نے پھر حاصل کیا۔ اور حضرت داؤدؑ کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ان کی شوکت پھر اپنی انتہا کو پہنچی لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد آپس میں نا اتفاقی کی وجہ سے اُن کی سلطنت دو حصوں میں میں بٹ گئی۔ شمال میں اسرائیل اور جنوب میں یہودا کے نام سے دو سلطنتیں قائم ہوئیں۔ بنی اسرائیل شرک و بت پرستی میں پھر مبتلا ہو گئے۔ اور ان پر آشوریوں نے حملے شروع کر دیے۔ بالآخر ۷۲۱ قبل مسیح میں آشور کے حکمران سارگون نے شمالی ریاست کو فتح کر لیا۔ ہزارہا اسرائیلی مارے گئے۔ ۲۷ ہزار سے زیادہ بااثر لوگوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ آشوریوں نے جنوبی ریاست پر بھی حملہ کر کے اسے اپنا باجگزار بنا لیا۔ یہ ریاست بھی بت پرست بن چکی تھی۔ ۶۰۶ ق م میں اس ریاست کو بابل کے بادشاہ بخت نصر نے فتح کر لیا۔ بنی اسرائیل نے وقت کے نبی کی صریح ہدایات کے خلاف بابلیوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ بخت نصر نے ۵۹۰ ق م میں حملہ کر کے ان کا صفایا کر دیا۔ تمام بڑے بڑے شہر مسمار کر دیے ہیکل سلیمانی کو اس طرح گرایا گیا کہ کوئی دیوار اپنی بنیاد پر باقی نہ رہی۔ تمام مذہبی کتابوں اور انبیاءؑ کے صحیفوں کو جلا ڈالا۔ اس کے ایک عرصہ بعد خوش قسمتی سے بابل پر ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا اور یہ لوگ پھر دب گئے۔ سکندر اعظم کی موت کے بعد اس کی ریاست کے حصے بخرے ہو گئے، اور شام

---

[1] قضاۃ : باب ۲ : آیت ۱۱ تا ۱۳

کی سلوقی سلطنت کے فرمانروا انٹیوکس نے ۱۷۰ ق م میں یروشلم پر حملہ کر دیا۔ آبادی کے ایک بڑے حصے کو قتل کر دیا۔ ایک اندازے کے مطابق چالیس ہزار افراد قتل ہوئے اور اس سے بھی زیادہ لوگ غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے۔ جو لوگ بچ گئے تھے ان کے لیے کسی قسم کا مذہبی فریضہ ادا کرنا یا ہیکل میں جانا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ورنہ قتل کر دیا جاتا تھا۔ توریت خلافِ قانون قرار دے دی گئی۔ اور تمام نسخے جلا دیے گئے۔ ایک زمانے کے بعد یہوداہ مقابیس کی جدوجہد سے بنی اسرائیل کو نجات ملی تو ہیکل دوبارہ تعمیر ہوا اور یہوداہ مقابیس نے کسی نہ کسی طرح توریت کی نقل فراہم کر لی۔

> "جس حفاظت سے قرآن ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی نظیر دنیا میں نہیں"
>
> (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام)

۷۰ء میں ٹائٹس رومی نے ہیکل سلیمانی کو پھر مسمار کیا۔ گیارہ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا اور بے شمار افراد کو قید کر کے غلام بنا لیا۔ اس کے بعد قیصر ہیڈرین نے پانچ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا اور انھیں جلاوطن کر کے ان کی جگہ رومیوں کو بسا دیا۔ شہر کا نام بدل کر "ایلیا" رکھا گیا اور توحید کے بجائے وہاں بت پرستی شروع ہوئی۔ اس کے بعد پھر بیت المقدس کو متعدد بار ایرانیوں اور دوسری وحشی اقوام نے تباہ کیا، اور مذہبی کتابوں کو نیست و نابود کیا۔ اس طرح یہود کی تباہی کے ساتھ بار بار مذہبی کتابیں بھی تلف ہوتی رہیں۔

تدوینِ نو

متذکرہ بیان کی تصدیق کے لیے ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"کیونکہ تیری (کتاب) ہدایت جل چکی ہے اس لیے کوئی شخص ان معاملات کا علم نہیں رکھتا ہے جو گزر چکے۔ روح القدس کو مجھ میں داخل کر دے اور میں پھر وہ سب کچھ لکھوں جو تیرے قانون کی کتابوں میں لکھا ہوا تھا"[1]

اور پھر:

"دوسرے روز آواز نے مجھے بلایا اور کہا اے عزرا! اپنا منہ کھول اور وہ کچھ پی جو میں تجھے پینے کے لیے دیتا ہوں۔ سو میں نے اپنا منہ کھول دیا۔ تب اس نے مجھ تک ایک پیالہ بھیجا۔ وہ پانی سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا لیکن اس کا رنگ آتشیں تھا۔ میں نے اسے لیا اور پی گیا۔ جب میں نے اُسے پی لیا تو مجھ میں فہم و فراست اور بصیرت پیدا ہو گئی اور میری روح نے میرے حافظے کو قوی بنا دیا اور پھر میری زبان کھل گئی تو بند نہیں ہوئی اور لکھنے والے چالیس دن تک بیٹھے رہے۔ وہ دن بھر لکھتے تھے اور صرف رات کے وقت کچھ کھاتے تھے۔ اور میں دن بھر لکھتا رہتا تھا۔ اور رات کو بھی میری زبان بند نہ ہوتی تھی۔ چالیس دنوں میں انھوں نے ۲۰۴ کتابیں لکھ ڈالیں"[2]

توریت گم ہو جاتی رہی

یہ ہیں وہ الفاظ جو فقیہ عزرا نے ۴۴۵ ق م

---

[1] عزرا دوم باب ۱۴ آیت ۲۰ تا ۲۲

[2] ایضاً باب ۱۴ آیت ۳۸ تا ۴۴

میں دوبارہ توریت کو مرتب کرنے کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھے ہیں لیکن اس سے پہلے بھی ۶۹۱ ق م میں شاہ یہوداکے دور میں توریت گم ہو گئی تھی[1]۔ پورے ۵۰ سال اس کا کوئی پتا نہ چلا۔ پھر شاہ یوسیاہ کے عہد میں کاہنوں کے سردار خلقیاہ نے ۶۲۴ء میں اُسے اچانک برآمد کر لیا۔ بعض کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب پورے تین سو سال تک گم رہی۔ اگر دوسری روایت کو تسلیم نہ کیا جائے تب بھی یہ بات ثابت ہے کہ یہ کتاب کم سے کم ۵۰ سال کے بعد اس طرح دستیاب ہوئی کہ اچانک کاہن خلقیاہ نے منشی سافن سے کہا کہ مجھے خداوند کے گھر میں توریت ملی ہے[2] اور جو عہد کی کتاب خداوند کے گھر سے ملی تھی اس کی سب باتیں ان کو پڑھ کر سنائیں[3]

ایک طویل عرصے کی گمشدگی کی مندرجہ بالا روایات واضح طور پر موجودہ عہد نامۂ عتیق کو ایک مشکوک دستاویز بنا دیتی ہیں۔ لیکن یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ خلقیاہ کی برآمد کردہ توریت کو مستند تسلیم کر لیا گیا، لیکن ۵۸۶ ق م میں اس پر ایک اور آفت آئی۔ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے تباہی مچا دی اور تمام مقدس صحیفوں کو جلا ڈالا جس کی فریاد عزرا کاہن اوپر اِن الفاظ میں کر چکے ہیں:۔

" اور تیری کتاب ہدایت جل چکی ہے"

تورات ان ہدایات کا مجموعہ تھی جو حضرت موسیٰؑ کو تقریباً چالیس سالہ دورِ نبوت کے عرصہ میں ملتی رہیں۔ ان میں دس احکام کو تو تختیوں پر لکھا گیا تھا اور باقی کی نقلیں کر کے ۱۲ قبیلوں کو دے دی گئی تھیں۔ ایک مجموعہ بنی لاوی کو حفاظت کے لیے دیا گیا تھا۔ اس کا نام توریت تھا۔ انھوں نے اس کو احکامِ عشرہ کی تختیوں کے ساتھ عہد کے صندوق میں رکھ دیا تھا۔ بنی اسرائیل اپنی مقدس کتاب سے اس قدر غافل ہو گئے تھے کہ کسی کو پتا بھی نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، چنانچہ روایات کے بموجب شاہ یوسیہ کے عہدِ حکومت میں ہیکل کی مرمت کے دوران وہ کتاب ملی، اور خلقیاہ نے اُسے شاہی منشی کو دیا۔ اور وہ بادشاہ کے سامنے پیش کی گئی۔ یہ تھی اصل تورات جو یروشلم کی تباہی کے وقت ضائع ہوئی اور بعد میں عزرا کاہن نے اپنی یادداشتوں سے اسے مرتب کرنے کی کوشش کی۔

اختلافات

ان کتابوں کا مجموعہ جو عیسائیوں اور یہودیوں کے عقاید کے مطابق حضرت موسیٰؑ سے قبل انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہُوا۔ اب عہد نامہ عتیق Old Testament کہلاتا ہے۔ یہ ۳۹ کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی پانچ کتابوں کے مجموعے کو تورات کہا جاتا ہے، یعنی پیدائش، خروج احبار، گنتی اور استثنا۔ یہ کتابیں ابتدا میں ایک ہی وحدت کی حیثیت رکھتی تھیں، لیکن ۲۸۴-۸۵ ق م میں ۷۲ علمائے یہود نے اس کتاب کا عبرانی زبان سے یونانی میں ترجمہ کیا اور مضامین کے اعتبار سے کتاب کو مذکورہ بالا پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ آیات و ابواب کی تقسیم ۱۲۴۴ء میں کارڈینیل ہوگو نے کی۔ کتاب اصل میں عبرانی زبان میں تھی، لیکن اِس وقت دنیا کے پاس اس کا اصل عبرانی نسخہ موجود نہیں ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کی تباہیوں کے نتیجے میں ان کا مذہبی اور علمی سرمایہ بار بار مرتب ہوتا رہا۔

---

[1] : احوالِ کتابِ مقدس حصہ اول ص ۱۰۰ — طبع لندن ۱۸۶۰ء

[2] : سلاطین دوم باب ۲۲ آیت ۸

[3] : " " باب ۲۳ آیت ۲

حقیقت یہ ہے کہ آج تک اس مذہبی سرمایے کی مقدار پر اتفاق نہ ہو سکا۔ بلکہ عہد نامۂ عتیق کی کتابوں کی مجموعی تعداد تک میں سخت اختلاف ہے۔ علاوہ ازیں ان کے مستند اور غیر مستند ہونے کا مسئلہ الگ ہے۔ بابل کی اسیری کے بعد عزرا فقیہ نے ۲۰۴ کتابوں کو املا کرایا تھا۔ ان کتابوں میں سے ایک بڑی تعداد کو انھوں نے عوام الناس سے پوشیدہ رکھا اور کہا کہ عام لوگ اس قابل نہیں کہ اُن کے سامنے یہ علوم پیش کیے جا سکیں۔ صرف علماء اور خواص کو ان کی تعلیم سینہ بسینہ دی جاتی تھی۔ ایسی کتابوں کی تعداد ستر تھی۔ لیکن اس کے برعکس یہودیوں کا مستند مورّخ جوزفس، جو پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے اور مشہور کتاب Antinitus of Jews کا مصنف ہے۔ ان کی تعداد صرف ۲۲ بتاتا ہے۔ موجودہ ۳۹ کتابوں میں سترہ ایسی کتابوں کے نام اور حوالے درج ہیں جو آج ناپید ہیں۔ اس لیے مغربی محققین کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ یہودیوں نے اپنی لاپروائی اور دینی غفلت کی وجہ سے متعدد کتابوں کو ضائع کر دیا۔ ان کتابوں کے علاوہ ۳۵ یا ۳۸ (باختلافِ روایت) ایسی کتابیں تھیں جو کسی نہ کسی وقت عہد نامۂ عتیق میں شامل تھیں اور معابد میں ان کی تلاوت سالہا سال تک ہوتی رہی۔ پروٹسٹنٹ فرقے نے انھیں اپوکریفا Apocrypha قرار دے کر خارج کر دیا۔ متفق علیہ روایات کی رو سے ۵۲ یا ۵۵ کتابوں کو عہد نامۂ عتیق سے خارج کر دیا گیا۔ حالانکہ ضروری نہیں کہ جو مواد خارج کیا گیا سب کا سب جعلی ہو۔ یہ کام نقد و جرح کے مسلّم اصولوں کے مطابق نہیں بلکہ فرقہ وارانہ تعصب اور انفرادی رجحانات کے مطابق کیا گیا کہ جس چیز کو انھوں نے اپنے ذوق و خیالات کے خلاف پایا۔ اس کو وضعی قرار دے کر حذف کر دیا۔ خواہ دراصل وہ غیر وضعی ہی کیوں نہ ہو۔ پھر کچھ فرقے ان کتابوں کو مدت تک مانتے رہے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اصل وحی کو تو جعلی بنا ڈالا اور جعلی کتابوں کو اصل ٹھہرا لیا۔

ترجمہ در ترجمہ

یہ کتبِ سماوی عبرانی زبان میں لکھی ہوئی تھیں۔ لیکن بابل کی اسیری کے زمانے میں اصل مجموعہ تلف ہو گیا۔ یہودی اپنی زبان تک بھول گئے۔ عزرا نے یہ کتابیں آرامی زبان میں مرتب کیں۔ ۲۳۱ء میں اوریجن نے اپنا ترجمہ ہیکسپلا ترتیب دیا تو یونانی ترجمہ کی مدد سے عبرانی نسخہ بھی مرتب کیا۔ اس کام پر ۲۸ سال لگے اور پھر بھی اصل عبرانی کے کچھ الفاظ نہ تھے۔ اس سے پہلے یہودیوں کے پاس اصل عبرانی نسخہ سرے

> ### تحریف سے پاک
>
> "کوئی جزو۔ کوئی فقرہ۔ کوئی لفظ قرآن میں، ایسا نہیں سنا گیا کہ جسے جمع کرنے والوں نے چھوڑ دیا ہو اور کوئی لفظ ایسا نہیں سنا گیا جو اس مسلّم مجموعہ میں داخل کر دیا گیا ہو۔ جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک ہو"
>
> (مشہور متعصب مستشرق سر ولیم میور)

---

[1] متعلقہ حوالے: کتاب عزرا ۷ باب آیت ۸۰ تا ۴۴ (۲) کتاب عزرا باب ۱۴ آیت ۴۴ تا ۶۴ (۳) دیکھیے ہمفرڈ کی کتاب سوالات سوال دوئم۔

سے نہ تھا کیونکہ ۲۸۵ قبل مسیح میں جب عبرانی تورات سے یونانی میں نسخہ سبعینیہ کا ترجمہ ہوا تو اس کے بعد اصل عبرانی نسخہ گم ہو گیا۔ اور تیسری صدی عیسوی میں ترجموں کی مدد سے اسے پھر تیار کیا گیا۔

دو اختلافی نسخے

غرض تیسری صدی سے چھٹی صدی عیسوی تک بالکل مشکوک اور مختلف عبارتوں والے نسخے رائج رہے۔ چھٹی صدی اور دسویں صدی عیسوی کے درمیان جب یہودیوں کو اطمینان نصیب ہوا تو انھوں نے مذہبی تعلیم کے دو مراکز قائم کیے یعنی بابل میں اور ٹائبریس میں۔ بابل میں جو نسخے رائج تھے انھیں Oriental Reading اور ٹائبریس میں جو نسخے رائج تھے انھیں Occidental Reading کہا جاتا تھا۔ ان کی شان یہ تھی کہ آٹھویں اور نویں صدی میں جو

> ### توریت کے دو نسخوں کے اختلافات
>
> آٹھویں اور نویں صدی میں سرسری طور پر ان نسخوں کا باہمی مقابلہ کیا گیا تو کم و بیش ۲۲۰ اختلافات پائے گئے۔ گیارہویں صدی میں یہ اختلافات ۸۶۴ تھے۔ یہ کتابیں ۱۷۰۵ء میں طبع ہوئیں تو بارہ ہزار مقامات پر طبع اوّل سے اختلاف ہُوا۔

سرسری طور پر ان نسخوں کا باہمی مقابلہ کیا گیا تو کم و بیش ۲۲۰ اختلاف پائے گئے۔ گیارہویں صدی میں یہ اختلافات ۸۶۴ تھے۔ چنانچہ فادر مارن، لوئیس کیپل اور بشپ والٹن نے عبرانی نسخوں کی غلطیاں ثابت کیں اور مطالبہ کیا کہ عہد نامۂ عتیق کی تصحیح کے لیے کوئی نیا فارمولا ہونا چاہیے پہلی مرتبہ یہ کتابیں ۱۴۸۸ء میں طبع ہوئیں۔ جب یہ ۱۷۰۵ء میں دوبارہ طبع ہوئیں تو بارہ ہزار مقامات پر طبع اول سے اختلاف ہُوا۔ ریورنڈ ہارن لکھتے ہیں: "الحاق کے باب میں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ تورات میں الحاقی فقرے موجود ہیں" جان کیلو اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتے ہیں "یہی کافی نہیں کہ جن مقامات کو ہم غلط سمجھیں انھیں کو الحاقی مانیں اور باقی کو بلاکم و کاست صحیح جانیں۔ بلکہ ممکن

> ریورنڈ ہارن لکھتے ہیں:-
> "الحاق کے باب میں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ تورات میں الحاقی فقرے موجود ہیں"

ہے کہ جنھوں نے الحاق کیا ہو انھوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو"[1]

تحریف کی مزید راہیں

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ عزرا فقیہ نے جب ۴۴۵ ق م میں تورات کو از سرِ نو مرتب کیا تو اس وقت بنی اسرائیل اپنی مادری زبان تک بھول گئے تھے اور یہ کتابیں انھوں نے آرامی زبان میں مرتب کی تھیں۔ اس کے ایک عرصہ بعد سن ۲۴۷-۲۸۴ ق م میں شاہِ مصر بطلیموس فلاڈیلفوس نے اپنے مشہور کتب خانہ سکندریہ کے لیے عزرا کی مرتب کردہ تورات کا ترجمہ کرایا۔ یہ ترجمہ یہودیوں میں بہت مقبول ہُوا اور وہ اس کو پڑھنے

---

[1] : کتب سماوی پر ایک نظر ص: ۱۲۵، ۲۶

لگے۔ کیونکہ اب وہ آرامی اور عبرانی کے بجائے یونانی بولتے تھے۔ اس ترجمے سے یہودیوں کے دین میں یونانی افکار داخل ہو گئے اور دوسری صدی عیسوی تک یہودی اس پر اعتماد کرتے رہے[1]۔ ۱۲۹ء میں اقوِلیہ Aquilla نے محض لفظی ترجمہ کیا اور ۱۲۹ء میں تھیوڈوشن Theodotion نے با محاورہ ترجمہ کیا۔ ۲۳۱ء میں ایک شخص اوریجن Orighen نے ایک کتاب مرتب کی جس کے چھ خانے تھے، اور ان میں علی الترتیب تورات کے تراجم کو جمع کیا یعنی عبرانی عبارت یونانی رسم الخط میں، ترجمہ اقوِلیہ، ترجمہ تمکوس، ترجمہ سبعینیہ اور ترجمہ تھیوڈوشن اس کتاب کا نام "ہیکسپلا" رکھا۔ اس شخص نے ترجمہ کے ساتھ تفسیر بھی لکھ دی جو اصل عبارت میں مل گئی۔ مشہور تھا کہ یہ شخص عیسائیت کی تحریف کو جائز تصور کرتا تھا۔

سنہ ۳۸۳ء میں پاپائے روم وماموس نے سینٹ جروم کو مقرر کیا کہ وہ اناجیل کا ایک مستند ترجمہ تیار کرے۔ عہد نامۂ عتیق کے لیے اس نے شام کا سفر کیا اور منتخب عبرانی نسخوں سے فائدہ اٹھا کر علمائے یہود کی مدد سے اپنا لاطینی ترجمہ ولگیٹ Vuigate مرتب کیا۔ یہ ترجمہ سنہ ۱۵۲۲ء تک متداول رہا۔ اس کے متعلق پادری ٹامس کا قول ہے کہ "اگرچہ جروم کو پرانے صحیفے دستیاب ہوتے، لیکن پوری صحت نہ ہو سکی"[2]۔ پادری ہارن کہتا ہے "جرم کیا کر سکتا تھا، کتبِ مقدسہ کے اصل نسخے مفقود تھے اور موجودہ نسخوں میں بیشمار الحاقی عبارتیں تھیں"[3]

بائبل کا آخری ترجمہ King James Bible سن ۱۶۰۳ء میں شائع ہُوا۔ یہ ترجمہ تمام مذاہب کی مشترکہ کانفرنس میں کیا گیا۔ سن ۸۵-۱۸۸۱ء میں عہد نامۂ جدید کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع ہُوا "اسی ترجمے کے سب سے بڑے نقاد ڈاکٹر گڈس جان بیلنی اور سرجیمس بلینڈ ہیں۔ انھوں نے اپنی طویل تحریروں میں اس ترجمے پر سخت اعتراضات کیے ہیں۔ جان بیلنی نے اپنی تحریر میں جسے انھوں نے سن ۱۸۱۸ء میں شائع کیا تھا۔ اس بات کا صاف اقرار کیا کہ سن ۱۲۸ء کے بعد اصل عبرانی متن سے کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ "چوتھی صدی میں سینٹ جروم نے یونانی ترجمہ سے اپنا رومی ترجمہ کیا۔ ان کے رومی ترجمہ سے رومی ولگیٹ مرتب ہُوا اور اس سے یورپ کی بقیہ تمام زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ لہٰذا یہ ترجمے دائمی طور پر غلط رہے"۔

غرض عزرا فقیہ کی مرتب کردہ آرامی یادداشتوں سے یونانی ترجمہ ہوا اور یونانی ترجمے کی مدد سے پھر اصل عبرانی تورات مرتب ہوئی اور دوسری زبانوں کے تمام تراجم یونانی سے ہُوئے جن کی اصلاح آج تک مکمل نہیں ہو سکی۔ اگرچہ جزوی اصلاحات کا سلسلہ جاری ہے۔ ترجمہ در ترجمہ کی یہ طویل داستان زبانِ حال سے پکار رہی ہے کہ ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی۔

کتاب مقدس کا مواد اور اندازِ نگارش

اب تک ہم نے تورات

---

[1] : اور دوسری صدی کے بعد انھوں نے محض اس لیے اس کو غیر مستند ٹھہرایا کہ اس سے عیسائیوں کے مذہب کے حق میں کم دلائل ملتے تھے اس لیے انھوں نے اس کو ترک کر کے اصل تورات کو پھر مرتب کیا۔

[2] : صحفِ سماوی نواب علی صاحب۔ ص۔ ۵

[3] کتب سماوی پر ایک نظر ص ۱۳۱۔ از ذوقی شاہ شائع کردہ اقبال اکیڈمی۔ لاہور۔

کا مطالعہ تاریخی اعتبار سے کیا ہے لیکن غور و فکر کا ایک نہایت اہم گوشہ ہمیں مزید مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ کسی چیز کو جانچنے کے لیے خود اس کی اندرونی شہادت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر ان کتب مقدسہ کا مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ جس مواد پر یہ کتابیں مشتمل ہیں وہ قطعاً الہامی نہیں ہو سکتا مثلاً:

۱۔ حضرت موسیٰؑ کی تحریر کردہ کتابوں میں خود ان کے بارے میں غائب ضمیر استعمال ہو رہی ہے۔ مثلاً "موسیٰ اپنے سسر کی نگہبانی کرتا تھا" "تب موسیٰ نے کہا: ......" "موسیٰ نے خدا سے کہا" وغیرہ۔ عیسائی اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس وقت کا طرزِ کلام ہی ایسا تھا۔ لوگ اپنے متعلق غائب کی ضمیر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن خود ان کتابوں میں متکلم کی ضمیر موجود ہے "میں واعظ یروشلم میں بنی اسرائیل کا بادشاہ تھا۔" "میں نے اپنے دل میں یہ بات کہی" وغیرہ۔

۲۔ کتاب استثنا کو خود حضرت موسیٰؑ کا الہام کہا جاتا ہے لیکن اس میں حضرت موسیٰؑ کی موت کے واقعات درج ہیں (باب ۳۴) اور یہ لفظ موجود ہے "اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰؑ کی مانند نبی نہیں آیا۔" جب لفظ "اب تک" نے یہودی اور عیسائی مفسرین کو مشکل میں ڈالا تو بالآخر انھیں یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ یہ پورا باب ہی الحاقی ہے۔

۳۔ اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور ممرے کے بلوطوں میں جو حبرون Hebron میں ہے جا رہا۔ (پیدائش ۱۳ : ۱۸) پہلے اس گاؤں کا نام اربع تھا (یشوع ۱۴ : ۱۵) حضرت موسیٰؑ کے بعد فلسطین فتح ہوا اور اس کا نام حبرون رکھا گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب حضرت موسیٰ کے بہت بعد کسی نے لکھی ہے۔

۴۔ گنتی باب ۲۱ آیت ۱۴ میں ہے "اس سبب خداوند کے جنگ نامہ میں ہے کہ خداوند آندھی میں وہیب پر قابض ہوا اور ارنون کی نہروں پر۔ یہ حوالہ "جنگ نامۂ خداوند" سے نقل ہو رہا ہے اور یہ کتاب باختلافِ روایت کسی اسرائیلی یا بت پرست نے لکھی تھی۔ جس میں فتحِ سیہون کا تذکرہ تھا۔ یہ واقعات حضرت موسیٰ کے بہت بعد میں پیش آئے تھے۔ جنگ نامہ کی تصنیف اس کے بعد ہوئی اور پھر اس سے بھی متاخر عہد میں گنتی کی تصنیف عمل میں آئی۔

۵۔ نیز اس کتاب میں متضاد اور خلافِ واقعہ باتیں، پیغمبروں کی معصومیت کو بٹہ لگانے والے تذکرے۔ خدا تعالیٰ پر بہتان

> اگر فحش لٹریچر کی مخالفت کے قانون کا ایمان داری کے ساتھ اطلاق ہو تو پہلی کتاب جسے ضبط کرنا پڑے گا، خود کتابِ مقدس ہوگی۔

کی مثالیں اور عقلِ سلیم کے خلاف اور مسلّمہ اخلاقی قدروں کے خلاف مندرجات ملتے ہیں۔ اس مواد سے معلوم ہوتا ہے کہ الہامی تعلیمات کو انسانی مفادات نے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ مغرب کے موجودہ فحش نگاری کے دور میں بھی ایسے فحش ٹکڑے تلاش کرنا مشکل ہے جو عہد نامۂ قدیم میں ملتے ہیں۔ انبیاء کرام کے تصورِ عصمت کے پیشِ نظر ایسے ٹکڑوں کو نقل کرنا بھی ہمارے لیے دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جدید نقاد نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر فحش لٹریچر کی مخالفت کے قانون کا ایمانداری کے ساتھ اطلاق ہو تو پہلی کتاب جسے ضبط کرنا پڑیگا خود کتابِ مقدس ہی ہوگی۔ اس کے برعکس قرآن مجید کا اوّل سے آخر تک مطالعہ کیجیے، جس میں نہ صرف یہ کہ عصمتِ انبیاء کے خلاف کوئی چیز نہ ملے گی بلکہ کتبِ مقدس کے تمام اتہامات کی مکمل برأت ملے گی۔ قرآن کریم انبیائے کرام کو ایسی پاکیزہ

ہستیوں کی شکل میں پیش کرتا ہے جس کی خود بارگاہِ الٰہی سے حفاظت ہوتی ہے اور انھیں معمولی سی لغزش پر بھی قائم نہیں رہنے دیا جاتا۔ ان کی زندگی معیارِ ہدایت ہوتی ہے اور اُن کے ہر قول و فعل کا اتباع ضروری ہوتا ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ متصور کیے جاتے ہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر عقلِ سلیم یہ باور نہیں کر سکتی کہ موجودہ کتبِ مقدس کا ریکارڈ کوئی الہامی ریکارڈ ہو سکتا ہے۔ یا وہ اپنی غیر محرف شکل میں موجود ہیں۔

نتائج بحث

اس پوری بحث سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

بنی اسرائیل کی تاریخ میں بڑے بڑے اتار چڑھاؤ واقع ہوئے۔ انہیں بار بار غلام ہونا پڑا اور اُن کی تہذیب کو ختم کیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مادری زبان بھی بھول گئے۔ ان کی مذہبی کتابیں بار بار تلف ہوئیں اور پھر غیر زبانوں کے ترجموں سے مرتب ہوتی رہیں۔ نہ صرف ترجمے غیر مستند تھے۔ بلکہ جس متن سے ترجمہ کیا گیا وہ بھی غیر مستند تھا۔ متن میں سے بھی کسی فقرے کے بارے میں یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کلامِ الٰہی ہے۔ داخلی طور پر ان میں ایسا مواد موجود ہے جسے عقلِ سلیم (اور خود بہت سے یہود و نصاریٰ تک)، کلامِ الٰہی تو کیا ایک شریف النفس انسان کا کلام بھی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے برعکس خدا کے فضل سے مسلمان ہمیشہ آزاد رہے۔ اُن کی مذہبی کتابوں پر کوئی ایسی تباہی نہیں آئی۔ اول روز سے قرآن کریم کا ایک ہی مستند متن ہے جس میں حرف و کلمہ کی تبدیلی تو دور کی بات ہے ایک ایک زیر اور زبر کو منضبط کر دیا گیا ہے۔ قرآن کی حفاظت کا بہترین بندوبست کیا گیا اور خود خالقِ کائنات نے ان الفاظ میں اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے کہ:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

انجیل

آج کی عیسائی دنیا جن کتابوں کو عہد نامۂ جدید کے نام سے جانتی ہے ان کی تعداد ۲۷ ہے۔ یہ کتابیں قرآن کریم کی طرح خالص خدائی کلام پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ بعد کی تصنیف ہیں اور خود اپنے مصنفین کی طرف منسوب ہیں مثلاً متی کی انجیل، یوحنا کی انجیل وغیرہ۔ ان اناجیل کے مصنفین میں سے کوئی ایک بھی حضرت عیسیٰؑ کا براہِ راست شاگرد یا اُن کا ہم عصر نہ تھا۔ متعدد دوسرے لوگوں کے خطوط کو بھی اس عہد نامہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مثلاً پال کے چودہ خطوط وغیرہ۔ اناجیل اور یہ خطوط چونکہ چند شخصیات سے متعلق ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعارف کرا دیا جائے۔

حضرت عیسیٰؑ کی رسالت

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے بندے اور سچے رسول تھے۔ آپ حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے بن باپ پیدا ہوئے۔ یہودیوں نے بہتان تراشیاں کیں اور حضرت مریمؑ کو دو بار ملک چھوڑنا پڑا (متی ۲-۱۳-۲۳) ۳۰ سال کی عمر میں آپ نبوّت سے سرفراز ہوئے لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے نبوت کا دور بہت مختصر رہا جب یہودیوں نے سازش کر کے آپ کو گرفتار کروا لیا تو آپ کے حواریوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اور آپ کے شاگرد رشید پطرس Peter نے تین دفعہ آپ کا انکار کیا۔ [ل] اللہ تعالیٰ نے آپ کو اٹھا لیا۔ البتہ عیسائیوں کے عقیدے کے

ل "Just b…fore emancipation he denied the Master Thrice"
—Encyclopea 'a of Religions
—Page 297 - N…w York, 1958

مطابق آپ کو سولی پر چڑھایا گیا! قرآن نے اس بات کی صراحت کے ساتھ تردید کی ہے)

حضرت علیٰؑ کے بعد

آپ کے اُٹھائے جانے کے بعد آپ کے حواری تتر بتر ہوگئے۔ نہ وہ انجیل کو لکھ سکے اور نہ حضرت علیٰؑ کی تعلیمات ہی محفوظ کر سکے۔ حضرت علیٰؑ کے بعد پطرس نے اس بناء پر اہمیت حاصل کی کہ اس کے بارے میں حضرت علیٰؑ نے کہا تھا "تو چٹان ہے اور تجھ پر میں اپنی شریعت تعمیر کروں گا"۔ عیسائیت کے بکھرے ہوئے چند پیروکار اس کے گرد جمع ہوئے۔ پطرس غیر یہودیوں کو دعوت دینے کے خلاف تھا لیکن بالآخر پال کی تحریک کے سامنے اُس نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ ۶۴ء میں پیٹر اور پال دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے شاگرد مرقس تھے، جنہوں نے ایک انجیل لکھی۔

دوسری شخصیت جس نے عیسائیت کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا وہ یہی پال ہے۔ یہ ایک یہودی تھا اور عیسائیوں کا کٹر دشمن تھا۔ یروشلم میں رہنے کے باوجود حضرت علیٰؑ سے ملاقات نہ کی تھی۔ اُس نے عیسائیت کُشی کے لیے سفر کیے۔ ۳۲ء میں یہ ڈرامائی طور پر عیسائی بن گیا۔ تین سال عرب میں گوشہ نشین رہا۔ جب دمشق لوٹا تو پھر بھی عیسائیوں کو اس پر شبہ تھا۔ جلد ہی اس کی اور پطرس کی کش مکش شروع ہوگئی۔ یہ عیسائی مذہب کو تمام انسانوں تک عام کرنا چاہتا تھا۔ خصوصیت سے لامذہبوں Pagans میں تبلیغ کا داعی تھا۔ اس نے عیسائیت کو پھیلانے کے لیے قبرص اور ایشیائے کوچک کے دورے کیے اور یورپ میں جا کر جگہ جگہ کلیسا قائم کیے۔ اس نے عیسائیت کے لیے بہت مشکلات برداشت کیں جس کی وجہ سے اس پر لوگوں کا اعتماد بڑھتا گیا۔ مذہبی اعتبار سے جدید عیسائیت کا اصل بانی یہی پال ہے۔ اسی نے عیسائی عقائد کی صورت گری کی۔ حضرت علیٰؑ سے منقول باتوں کو یونانی افکار سے ملا کر اُس نے عیسائی الٰہیات کی تشکیل کی اور اُن پر فلسفہ کا رنگ چڑھا دیا۔ اس کی بہت سی من گھڑت باتوں کی وجہ سے عیسائیت ایک مشرکانہ مذہب بن گئی حالانکہ حضرت علیٰؑ کی تعلیمات ہر شائبہ شرک سے پاک تھیں۔ اور ان کا لایا ہوا اصل دین اسلام ہی تھا لیکن عیسائیت کا تصوّرِ الوہیت باپ، بیٹا اور روح القدس یا باپ بیٹا اور کنواری مریم کے مخلوطہ سے تیار ہوتا ہے۔ پال کے شاگرد لُوقا تھے جو ان کی ترجمانی کرتے تھے۔ انہوں نے بھی ایک انجیل لکھی۔

پیٹر اور پال کے علاوہ یوحنا اور متی بھی اہم شخصیتیں ہیں جو حضرت علیٰؑ کے حواریوں میں سے تھے لیکن عیسائی محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اناجیل کے مصنف یوحنا اور متی ہیں ــــــ وہ یوحنا اور متی نہیں جنہوں نے حضرت علیٰؑ علیہ السلام کو دیکھا تھا، بلکہ یہ کافی بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ [1]

انجیل کی ترتیب و تدوین کا دورِ ثانی

پیٹر اور پال کی مساعی سے بکھرے ہوئے عیسائی دوبارہ منظم ہوئے تو انہیں دینی تعلیمات کو مرتب و منضبط کرنے کی فکر ہوئی۔ چنانچہ عیسائیوں میں سے کئی حضرات نے سُنی سنائی باتیں لکھنا شروع کیں۔ سب سے پہلے ۶۵ء اور ۷۰ء کے درمیان مرقس نے اپنی انجیل لکھی یہ پطرس Peter کا شاگرد تھا۔ اس کی موت کے بعد یہ انجیل لاطینی

---

[1] دیکھئے حیات مسیح ص ۸۱ نیز The fall of Idols by W. R. Ing ص ۲۶۱۔ مصنف۔

زبان میں لکھی گئی۔ اس کے بعد لُوقا نے ۸۰ء اور ۹۰ء کے درمیان اپنی انجیل تیار کی۔ یہ صاحب پولوس Paul کے ترجمان تھے۔ اس کے بعد ۱۰۰ء اور ۱۴۰ء کے درمیان یوحنا کی انجیل لکھی گئی۔ عیسائی محققین اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ یہ یوحنا گلیلی کے ماہی گیر اور حضرت علیٰؑ علیہ السلام کے حواری ہرگز نہیں ہیں [2] خود اسی انجیل میں ایسے فقرے موجود ہیں جو حواری یوحنا کے متعلق ہیں لہٰذا یہ تصنیف انکے بجائے بعد میں آنیوالے کسی دوسرے یوحنا کی ہے۔ [3] متی کی انجیل ۸۰ء اور ۱۰۰ء کے درمیان لکھی گئی۔ یہ انجیل بھی اس متی کی تصنیف نہیں ہے جو حضرت علیٰؑ کے شاگرد تھے کیونکہ خود اس کے اندر بھی حواری متی کے متعلق ایسے فقرے موجود ہیں جو کوئی مصنف اپنے متعلق نہیں لکھ سکتا۔ [3] اسی انجیل کے متعلق اتفاق ہے کہ یہ عبرانی زبان میں تھی۔ بعد میں یونانی میں ترجمہ ہوا لیکن اس وقت اصل نسخہ موجود نہیں ہے۔

یہ قصہ تو چار مستند ترین اناجیل کا ہے۔ ان کے علاوہ بھی پہلی صدی میں بے شمار اناجیل رائج تھیں جو متعدد اشخاص نے تصنیف کر لی تھیں۔ [4] دوسری صدی میں ۳۴ اناجیل اور ۱۱۳ خطوط کتب مقدسہ میں داخل تھے اور یہ سب چیزیں یونانی زبان میں تھیں۔ ۳۲۵ء میں نیقیہ کی کونسل نے نامعلوم طریقۂ تحقیق کے مطابق باقی تمام اناجیل اور خطوط کو جعلی قرار دے کر موجودہ اناجیل اور خطوط ہی کو رہنے دیا، لیکن یہ کام کسی علمی اصولِ نقد و جرح کے مطابق نہیں کیا گیا بلکہ محض انفرادی ذوق اور فرقہ وارانہ تعصب کے مطابق ہوا۔ [5]

نسخوں کے اختلافات

اس سے پہلے کی بحث سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت علیٰؑ علیہ السلام پر جو کلام الٰہی نازل ہوا تھا اور جسے قرآن نے انجیل کہا ہے وہ اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ بعد میں لوگوں نے جو اناجیل مرتب کیں وہ اپنے ذوق کے مطابق مرتب کیں لیکن وہ بھی اپنی اصل شکل اور اپنی اصل زبانوں میں ہمارے پاس موجود نہیں ہیں صرف یونانی تراجم پائے جاتے ہیں۔ ان تراجم کے بھی اصل نسخے نہیں ملتے، بلکہ صرف چوتھی صدی کے بعد کے لکھے ہوئے نسخے ملتے ہیں اور ان نسخوں کی حالت بھی یہ رہی ہے کہ جرمنی کے مشہور عالم اور مصنف ڈاکٹر میل نے جب تمام نسخوں کا باہمی مقابلہ کیا تو تیس ہزار اختلافات پائے۔ نیز جان جیمس ویطیطین نے مختلف ممالک سے نسخے منگوا کر مقابلہ کیا تو دس لاکھ اختلافات نکلے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر اختلافات قرأت اور کتابت کے تھے لیکن ایسے اختلافات بھی ہزاروں کی تعداد میں تھے جن کی وجہ سے معانی کچھ کے

---

[1] حیات مسیح

[2] ملاحظہ ہو یوحنا باب ۲۱ آیت ۲۴

[3] دیکھئے باب ۹ آیت ۹

[4] لُوقا باب آیت ۱۔ پال کا دوسرا خط باب ۲ آیت ۲۔ نیز اسی وقت عیسائی نصرتِ حق کے لیے جھوٹ تک بولنا جائز سمجھتے تھے۔ پولس کا خط رومیوں کے نام، باب ۳ آیت ۷، نیز دیکھیے موشیم کی تاریخ حصہ ۲ باب ۲ ص ۳۶ طبع ۱۸۶۰ء نیز تاریخ کلیسا مطبوعہ مرزا پور ۱۸۰۶ء ص ۹۰

[5] ایک مشہور تاریخی روایت کے مطابق انجیلوں کے ایک ڈھیر میں سے قرعہ اندازی کے اسلوب پر چار کتابوں کو چھانٹ لیا گیا۔ (ایڈیٹر)

کچھ ہو جاتے ہیں۔

انگریزی میں انجیل کا پہلا ترجمہ ۱۳۸۲ء میں ہوا۔ پادریوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور مترجمین کو جلا دیا گیا۔ ۱۵۲۶ء میں ولیم ٹینڈل نے ترجمہ کر کے غیر ممالک سے

> تین سو سال تک عیسائی اپنے بنیادی عقائد کے بارے میں بھی فیصلہ نہ کر سکے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔

شائع کرایا۔ اس کے نسخے جلائے گئے اور اُسے قتل کر دیا گیا اس کی نعش کو بھی جلا دیا گیا۔ اس کے بعد انگلستان میں جب ترجموں کی اجازت ہوئی تو لوگ بڑے اہتمام سے ترجمے چھاپنے لگے لیکن ہر نیا ایڈیشن اگلے سے مختلف ہوتا تھا اور آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔

تعلیمات میں اختلاف

تمام آسمانی اور مقدس کتابوں کی یہ لازمی خصوصیت رہی ہے کہ وہ انسانوں کے لیے کتاب ہدایت ہوتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم اناجیل اور رسولوں کی طرف منسوب خطوط کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ تمام ریکارڈ ہمیں بالکل تشنہ نظر آتا ہے۔ اس ریکارڈ میں انسانی ہدایت اور راہنمائی اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ہدایت اور احکامات کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ اناجیل دراصل حضرت عیسٰی علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کی زندگی کے حالات اور ان کے اقوال کا مجموعہ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایک سیرت کی کتاب کی سیرۃ ہے بھی یہ کتابیں حد درجہ غیر مکمل ہیں۔ ہمارے ہاں تاریخ و سیر کا جو نرم معیارِ روایت اختیار کیا گیا ہے اناجیل اس پر پوری نہیں اترتیں۔

حضرت عیسٰیؑ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی کے پیش نظر اگر یہ کتابیں صرف غیر مکمل ہوتیں تو بھی انہیں گوارا کیا جا سکتا تھا لیکن غیر مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیمات اور طرزِ فکر میں بھی بے حد اختلاف ہے۔ تقریباً ۲ ہزار سال سے عیسائی علماء یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان اختلافات کو دُور کیا جا سکے لیکن اب تک وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے چنانچہ منصف مزاج عیسائی کہتے ہیں: "اگر مسیح نے ایسی ہی باتیں کہی تھیں جو متی نے لکھی ہیں تو وہ یقیناً ایسی باتیں نہیں کر سکتا جو یوحنا نے لکھی ہیں"۔ [1] یہی مصنف ایک دوسری جگہ لکھتا ہے "اناجیل کھلے طور پر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں"۔ [2] اگر موجودہ اناجیل خدا کا کلام ہوتیں جیسا کہ عیسائی عوام کو یقین دلا رہے ہیں تو یقیناً ان میں اس طرح کا تضاد نہ ہوتا۔ قرآن کریم نے اپنے متعلق اسی لیے دعویٰ کیا ہے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا [3] اور

> پال — ایک یہودی تھا اور عیسائیوں کا کٹر دشمن۔ ۳۳ء میں یہ ڈرامائی طور پر عیسائی بن گیا۔ تین سال عرب میں گوشہ نشین رہا — مذہبی اعتبار سے جدید عیسائیت کا اصل بانی یہی پال ہے۔ اس نے عیسائیت کے عقائد کی صورت گری کی۔

---

[1] حیات مسیح ص ۱۶
[2] حیات مسیح ص ۲۲
[3] النساء ص ۸۲

اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے — کیوں کہ انسانی تعلیمات اور طرزِ فکر میں ضرور اختلافات رونما ہو جاتے ہیں۔

شرک اور کفارہ کے عقائد

حضرت آدمؑ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء بھیجے گئے انہیں واضح ہدایات دی گئیں خصوصاً عقائد کے بارے میں تو تمام پیغمبر متفق ہیں۔ عیسائیوں کے پاس اگر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تعلیمات پوری طرح محفوظ ہوتیں تو ان کے عقائد ہرگز اس قدر مشرکانہ نہ ہوتے۔ اناجیل جو عیسائیوں کو اس راستے سے ہٹانے کا باعث ہوئیں جس راستے پر تمام انبیاء نے انسانوں کو چلانے کی کوشش کی وہ ہرگز کلام الٰہی نہیں کہلائی جا سکتیں۔ ان اناجیل کی ترتیب کے بعد عیسائیوں نے حضرت عیسٰیؑ کو جس طرح رب قرار دیا اس کی داستان بڑی عجیب ہے۔ ان اناجیل میں خدا کے متعلق "باپ" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس سے آگے بڑھ کر جب عیسائیوں کی راہنمائی کے منصب پر پال جیسا باطنی صوفی فائز ہوا تو اُس نے حضرت عیسٰیؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ اس پر تین سو سال تک عیسائیوں کے درمیان مجادلہ و مقابلہ ہوتا رہا اور بالآخر ۳۲۵ء میں نیسیہ میں کونسل منعقد ہوئی اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کو متفقہ طور پر خدا کا بیٹا قرار دیا گیا اور اس کا انکار کرنیوالوں کو عیسائیت سے خارج کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جو کتابیں انسانیت کی پوری تاریخ میں آنیوالے تمام انبیاء کے راستے سے ہٹاتی ہوں وہ کس طرح کلام الٰہی ہو سکتی ہیں۔

منجملہ اور عقائد کے موجودہ اناجیل نے یہ تعلیم بھی دی ہے کہ حضرت عیسٰیؑ مصلوب ہو کر قیامت تک آنے والے تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ بن گئے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ یہ کس قدر غیر معقول عقیدہ ہے کسی سچے مذہب کی تعلیم ہرگز یہ نہیں ہو سکتی۔ مذہب آتا ہی اس لیے ہے کہ لوگوں کی اصلاح کرے لیکن یہ عقیدہ اصلاح کے بجائے الٹا لوگوں کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے اور اپنے پیرو کاروں کو گناہ کے معاملے میں بے باک بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی معاشرہ ہمیشہ اخلاقی مفاسد میں دوسروں سے کچھ زیادہ ہی مبتلا رہا ہے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کو کام کرنے کا بہت کم موقع ملا۔ دار و گیر کے بعد آپ کے تمام شاگرد آپ کو چھوڑ کر تتر بتر ہو گئے۔ آپ کی تعلیمات کو محفوظ کرنے کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ جب آپ کے بعد آپ کی تعلیمات کی جمع و تدوین شروع ہوئی تو ان پر یونانی فلسفے اور یونانی افکار چھا گئے۔ تین سو سال تک اپنے بنیادی عقائد کے بارے میں بھی فیصلہ نہ کر سکے مثلاً یہ کہ (۱) حضرت عیسٰیؑ خدا کا بیٹا ہیں (۲) آپ کی تعلیمات صرف بنی اسرائیل کے لیے ہیں یا تمام دنیا کے لیے (۳) تورات پر عمل ضروری ہے یا نہیں (۴) نجات کا دار و مدار کن امور پر ہے (۵) خود حضرت عیسٰیؑ کا انجام کیا ہوا، سولی پر چڑھائے گئے یا نہیں؟ دوبارہ لوٹ کر آئیں گے یا نہیں؛

اب مختلف لوگوں نے آپ کی سُنی سُنائی متفرق باتوں کو نوٹ کیا جو اناجیل کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں ان اناجیل کو اس حد تک بھی مستند نہیں کہا جا سکتا جس حد تک ہم ایک یونانی مصنف کی کسی کتاب کو مستند کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں قرآن و سنت تو بڑی بات ہے دوسری اسلامی کتب ہی کو دیکھ لیجیے، مسلمانوں نے پیغمبرِ اسلام کے لاکھوں صحابۂ کرامؓ کے حالات زندگی کو ہی اس شان سے مرتب کیا جس کا جواب پوری انسانیت کے پاس نہیں

★

قرآن، بابا نانک اور گرنتھ صاحب

مہاشے عبدالکریم نظامی اکبرآبادی

قرآن نمبر کے اس حصے میں ہم ایک بزرگ کے قلم سے ایک مختصر سا مضمون بابا گورو نانک اور گرنتھ صاحب کے متعلق شامل کر رہے ہیں۔ اس مختصر مضمون سے ایک خلاء پُر ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارا موضوع "الہامی کتب" ہوتا تو میدانِ گفتگو ذرا مختلف ہوتا۔ مگر اب بحث کا محور "مذہبی کتب" ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ سکھ دھرم برصغیر کا جانا پہچانا مذہب ہے اور اس کا محور مشہور مذہبی کتاب گرنتھ صاحب ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے اصولِ توحید اور انسانی مساوات کی روشنی جب اس برصغیر میں داخل ہوئی تو مورتی پوجا اور جاتی سسٹم یا برہمن ازم کے غیر عقلی تصورات کے خلاف ایک باغیانہ رجحان اُبھرا۔ اس رجحان کا پرجوش ظہور سکھ دھرم کی شکل میں ہوا۔ بقیہ ہندو سماج میں بھی ایک ہل چل آہستہ آہستہ پیدا ہوئی اور اُس نے آریہ سماج کی شکل اختیار کی پھر اس خطے کی تاریخ پر اسلام کے مزید اثرات غیر شعوری طریق سے کارگر ہو کر برہمن تحریک کی صورت میں بھی ظاہر ہوئے۔ بابا نانک کا مزاج صوفیانہ ہے اور اسلام کی روشنی بھی ان تک تصوف کے راستے سے پہنچی۔ ظاہر بات ہے کہ جب بادشاہت کا سارا محور توجہ سیاست کاری ہو تو عوام میں دینی و روحانی دعوت کا ذریعہ صوفیا و علماء ہی رہ جاتے ہیں۔ قصر و بام کی بلندیوں سے جو کام نہیں ہو رہا تھا، اُسے بوریا نشینوں نے کر دکھایا۔

اس مضمون کو درج کرتے ہوئے مجھے ایک دوست کی گفتگو یاد آگئی جو کہتے تھے کہ سکھ گروہ اپنی مذہبی تعلیمات کے لحاظ سے بہ مقابلہ ہندوؤں کے مسلمانوں سے زیادہ اقرب ہے۔ مگر مسلمان معاشرہ پچھلے لمبے دور میں انھیں اپنی طرف کھینچنے کے بجائے، شروع ہی سے ان کو دھکیلنے کے محرکات روبکار لایا۔ اور سکھ گروہ کا ثقافتی رابطہ ہندوؤں سے استوار رہا۔ اس میں بھی سیاسی احوال کو زیادہ دخل حاصل ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ہندو سماج کا معاشرتی قفس ایسا مضبوط ہے کہ اس نے گرنتھ صاحب کے علمبرداروں کو بھی اپنے حلقے سے نکلنے نہیں دیا۔

اب بھی اگر کچھ محققین مسلمانوں اور سکھوں میں سے ایسے نمودار ہوں جو گرنتھ صاحب کی تعلیمات اور بابا گرو نانک کے کردار اور اقوال و افعال اور اُن کی سوانح پر تحقیقی کام کریں تو بعید نہیں کہ خود سکھوں پر یہ راز کھل جائے کہ وہ حقیقت میں کیا ہیں۔ اور انھوں نے اپنے آپ کو تاریخ اور سماج کے نقشے میں کہاں کھپا رکھا ہے۔ کہیں خواجہ معین الدین چشتی کے پیغامِ حق اور گورو نانک کے وحدت کے گیت کا رشتہ کسی ایک ساز کے تاروں سے تو نہیں جا ملتا۔

چشتی نے جس زمین میں پیغامِ حق سُنایا
نانک نے جس وطن میں وحدت کا گیت گایا

ادارہ

سکھ مذہب کے بانی گرو نانک صاحب اسلامی تعلیم سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں اکثر کلامِ الٰہی کے عربی الفاظ جگہ جگہ تحریر کئے ہیں۔ چند حوالے پیش کرتا ہوں ۔

سو کرتا قادر کریم۔ دے جیا رزق سنبھائے
گرنتھ صاحب صفحہ ۴، سطر ۳ آسا دی وار

مطلب: ہر ایک کو قادر کریم کا روزانہ جاپ کرنا چاہیے جو رزاق بھی ہے۔

کوئی بولے رام رام کوئی خدا
کوئی سیوے گسیاں کوئی اللہ
کارن کرن کریم کرپا دھار رحیم
گرنتھ صاحب صفحہ ۸۸۵ سطر ۲ رام کلی محلہ ۵

غور کریں اس شعر میں خدا، اللہ، کریم، رحیم جیسے اسماء بھی موجود ہیں۔

ولا کا مالک کرے پاک
قرآن کتیب تے پاک
گرنتھ صاحب صفحہ ۹۰۰ سطر آخری رام کلی محلہ ۵

آپ غور کریں لفظ "مالک" کے علاوہ قرآن کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ توضیحی لفظ "پاک" موجود ہے۔

کل پروان کتیب قرآن
پوتھی پنڈت رہے پران
نانک ناؤ بھیا رحمٰن
کر کرتا تو ایکو جان
گرنتھ صاحب صفحہ ۹۰۳ رام کلی محلہ پہلا

یعنی کہ گرنتھ صاحب میں کئی جگہ عربی الفاظ بیان کیے گئے ہیں۔

قرآن مجید پر ہر مسلمان کا ایمان لانا فرضِ اولیٰ ہے۔ درحقیقت یہی وہ کتاب مقدس ہے جس کے پڑھنے اور عمل کرنے سے حیوان سے انسان اور انسان سے با خدا انسان بن جاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ گرو نانک صاحب نے نہ صرف قرآنِ پاک کے الفاظ ہی اپنے کلام میں شامل کیے ہیں۔ بلکہ اس مقدس کتاب پر اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر فرمائی ہے:

توریت۔ زبور۔ انجیل۔ ترے پڑھ سن ڈٹھے وید
رہی قرآن کتاب کل یگ میں پروار
جنم ساکھی کلاں صفحہ ۴۰

مطلب: گرو نانک صاحب فرماتے ہیں کہ توریت، زبور، انجیل، وید ہر کتاب کو خود بھی پڑھا اور دوسروں سے پڑھا کر بھی سُنا۔ اس یُگ کے دور میں اگر کوئی کتاب دنیا کو گناہوں سے بچا سکتی ہے تو وہ صرف قرآن ہے۔

گورو صاحب فرماتے ہیں ؎

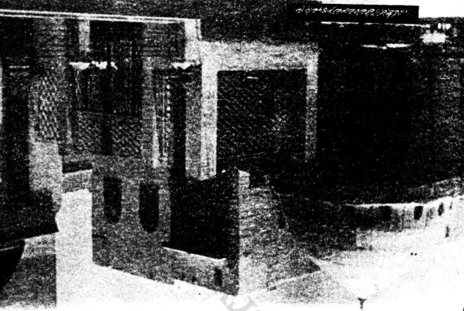
کھاون قسم قرآن دی۔ کارن دنی حرام
آتش اندر سڑسن آکھے نبی کلام
جنم ساکھی بھائی بالا صفحہ ۱۷۵

مطلب: قرآن جیسی بے نظیر کتاب کی جھوٹی قسم جو لوگ کھاتے ہیں وہ بڑا ذلیل اور بڑا حرام کام کرتے ہیں۔ وہ بلا شبہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے، و یہی نبی (صلعم) کا ارشاد ہے۔

اور ملاحظہ کیجیے:

تیہے حرف قرآن دے۔ تیہے سپارے کین۔
تس وچ پند نصیحتاں سُن سُن کرو یقین

مطلب: قرآن شریف کے تیس حروف اور تیس ہی پارے ہیں۔ اور اس اکمل کتاب میں لا انتہا پند نصیحتیں ہیں۔ اے سننے والو! نہ صرف سنو، بلکہ اس پر ایمان لاؤ۔



فی ۱۲۷۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین الرحمن الرحیم ملک یوم الدین ایاک نعبد وایاک نستعین

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین

انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین

حررہ محمد حسین لاخ العزیز

۱۰۰ سال قبل کا فردہ خطاطی (غیر مطبوعہ)



قرآن اور اصحابِ رسولؐ

— نثار احمد —

صحابی [1] کے معنی ساتھی اور رفیق کے ہیں اور یہ اصطلاحاً وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جنہوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت و محبت اختیار کی اور جس دین کو آپ لیکر آئے تھے۔ اسے نہ صرف خود قبول کیا اسے دنیا میں قائم و نافذ کرنے میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا صحابہؓ امتِ مسلمہ کا سب سے اعلیٰ گروہ، ممتاز طبقہ اور افضل ترین جماعت ہیں۔ یہ حضرات روشنی کے مینار اور رہباری کے چراغ ہیں۔ وہ سیرت و کردار کے ہر اس اعلیٰ معیار پر بھی پورے اترتے ہیں جو کسی انسان کے لیے مقرر کیا جاسکتا ہے۔ ان کی زندگی کا ہر گوشہ مثالی حیثیت رکھتا ہے خواہ اس کا تعلق معاشرت سے ہو۔ معاملات سے، سیاست سے ہو یا عبادات سے۔

صحابہؓ کے وجوہِ عظمت

صحابہؓ کو ایک طرف تو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہیں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کی سعادت میسر آئی، وہ قرآن کے اولین مخاطب بنے اور ان میں سے بعض کو اس دنیا میں ہی جنت کی بشارت دیدی گئی۔ دوسری طرف ایک اور اعزاز اور سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا و خوشنودی کا اعلان کیا۔ کسی بندہ کی اس سے بڑھ کر اور خوش قسمتی کیا ہوسکتی ہے کہ فاطرِ ارض و سما اس سے راضی ہوجائے۔ قرآن میں اس رضا کا صاف اعلان ہے:

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے۔
یہی بڑی کامیابی ہے۔ (مائدہ ۱۱۹)

"وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔" (توبہ ۱)

[1] صحابی کی جمع ہے صحابہ۔ صحابی کا لفظ "صحبت" سے نکلا ہے، خواہ صحبت کی مقدار کچھ ہو۔ ان اختلافات سے قطع نظر جو صحابی کی تعریف کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔ اسلام میں اصطلاحی حیثیت سے "صحابی" ہر وہ شخص ہے جس نے حالتِ اسلام میں محض آپ کو دیکھا ہے یا ملاقات کی ہے"۔ (اسوہ صحابہ جلد اول۔ عبدالسلام ندوی اعظم گڑھ ص ۹ تا ۱۱)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے راضی ہوا جبکہ یہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔" (فتح ۱۸)

"اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا وہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ یہ لوگ اللہ کا گروہ (حزب اللہ) ہیں خوب سن لو کہ اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے۔" (مجادلہ ۲۲)

ظاہر ہے کہ ایک انسان کی زندگی کا حاصل اور ایک مسلمان کی کشمکشِ حیات کا آخری ہدف یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرلے تخلیقِ انسانی کا مقصد، عبادت کی غرض و غایت اور اسلام کا مدعا یہی ہے۔ اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام جس تعلیم کو لے کر آئے اس کا آخری سبق یہی ہے۔ اس اعتبار سے صحابہؓ کی زندگی مثال اور نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

صحابہؓ کی شانِ رفاقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکّہ میں اعلانِ نبوت فرمایا تو جیسے زمین و آسمان اجنبی بن گئے۔ آپ کا یہ اعلان اہلِ قریش کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ "صادق و امین" یکایک ان کے لیے "خطرہ" بن جائے گا اور وہ "شرم و حیا کا پتلا" جس کی نگاہیں ہمیشہ نیچی رہتی تھیں اس قدر "بیباک" ہوجائے گا کہ اپنے آبا و اجداد کے مذہب تک کو چیلنج کر گزرے گا۔ اس اعلان کا صاف مطلب یہ تھا کہ نہ صرف اہلِ مکہ بلکہ پورے عرب معاشرے سے اعلانِ جنگ کیا جا رہا ہے۔ سو وہ ہوا۔ پورا معاشرہ ایک اکیلی جان کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف سے مخالفت کا طوفان امنڈ آیا، یہ بڑا سخت وقت تھا۔ ایسے حالات میں اس "داعیِ حق" کی حمایت و نصرت کے لیے کسی شخص کا آواز بلند کرنا موت کے ہم معنی تھا۔ مگر زندہ ضمیر افراد ایک ایک کرکے اپنے سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلے۔ اس کے ہمدم، ہمراز، ہمراہی، پشت پناہ، ساتھی اور مددگار بنے۔ انہوں نے ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ ہر آزمائش کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اہلِ مکّہ کے ہر ظلم و ستم کو بہ رضا و رغبت انگیز کیا! انہیں ستایا گیا، کوڑوں کی ضربیں لگائی گئیں، دہکتے انگاروں پر لٹایا گیا، زنجیریں باندھ کر تپتی زمینوں پر گھسیٹا گیا، تختۂ دار پر کھینچا گیا، مقتل کی سیر کرائی گئی، لوہے کے گرم گرم اوزاروں سے داغ لگائے گئے، بوجھل پتھروں کے نیچے دابے گئے، غرض وہ سب کچھ ہوا جس کا ظلم کے عنوان سے ایک انسان تصور کرسکتا ہے۔ یہ آزمائشیں ان لوگوں کی راہ کھوٹی نہ کرسکیں۔ ان "صاحبانِ عزم و استقلال" نے کسی قیمت پر بھی داعیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی مفارقت گوارا نہ کی معیت و مصاحبت کو ترک نہ کیا۔ اور ایک مرتبہ جس رشتۂ رفاقت و الفت میں منسلک ہوگئے تھے پھر اس پر کوئی حرف نہ آنے دیا۔ یہ حضرات آپ کے ایسے ساتھی اور رفقا تھے کہ دن رات کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جس میں یہ آپ سے جدا ہوتے ہوں۔ پھر ان صحابہ کرامؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محض "تعلق" نہ تھا، "عشق" تھا۔ یعنی ایک طرف تو مقصد کی ہم آہنگی، رفاقت اور تعاون کا تقاضا تھا کہ کسی لمحہ ساتھ نہ چھوڑا جائے اور دوسری طرف "دل کے تقاضے" تھے کہ محبوب نظر آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ اس عشق کے آداب قرآن میں یوں سکھائے گئے ہیں:

"اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑجانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ کی جدوجہد

سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ
اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔"

(توبہ۔ ۲۴)

صحابہ کرامؓ کو حضورؐ سے جو محبت تھی وہ اپنے ماں باپ، بھائی بہن، اعزہ و اقارب بلکہ دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ تھی۔ وہ اس بات کو گوارا کرنا تو بڑی بات ہے، اس کا تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ حضورؐ کے کانٹا بھی چبھے اور وہ آرام سے اپنے گھر میں بیٹھے رہیں۔ صحابہ کا یہ عشق ہمہ گیر تھا۔ آپؐ کی ذات و شخصیت سے بھی تھا اور آپؐ کے پیغام و دعوت سے بھی۔ وہ آپؐ پر ایمان لائے۔ آپؐ کی دعوت پر لبیک کہا اور آپؐ کی خاطر تکلیفیں اٹھائیں، ہجرت کی اور ہر مرحلے میں دوش بدوش چلے۔ ان کی یہ محنتیں رائیگاں نہ گئیں۔ اس کا انہیں بدلہ بھی خوب ملا۔

"جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی
راہ میں گھر بار چھوڑے اور جد و جہد کی اور
جنہوں نے پناہ دی، اور مدد کی، وہی سچے
مومن ہیں۔ ان کے لیے خطاؤں سے درگزر
ہے، اور بہترین رزق ہے اور جو لوگ بعد میں
ایمان لائے اور ہجرت کر کے آئے اور تمہارے
ساتھ مل کر جد و جہد کرنے لگے وہ بھی تم میں
شامل ہیں"۔ (الانفال۔ ۷۴)

"جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے وہ
افضلِ خلائق (تمام مخلوقات میں سب سے
افضل) ہیں ان کا بدلا ان کے رب کے یہاں
یہ ہے کہ بسنے والے باغ ہیں جن کے نیچے
نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔
اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہونگے
یہ (بدلہ) ملتا ہے (ہر) اس (شخص) کو جو اپنے
رب سے ڈرتا ہے"۔ (بینہ۔ ۸)

انہوں نے اسلام کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیا۔ اور یہ ساری متاعِ دنیا دراصل ہے بھی بے مایہ، اُس معاوضہ کے مقابلہ میں جو انہیں حاصل ہوا۔

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان
کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید
لیے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے
اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ)
اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے، توراۃ،
اور انجیل اور قرآن میں، اور کون ہے جو اللہ
سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو۔

(توبہ۔ ۱۱۱)

لیکن اسلام کے لیے اپنی ان عالی خدمات کی بنا پر انہیں مطلق یہ احساس نہ تھا کہ وہ بھی "کچھ" ہیں۔ سب کچھ قربان کرنے کے باوجود غرور و تکبر اور بڑائی کا "وسوسہ" تک صحابہؓ کے دل میں پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ سب "کارنامے" ہماری کوششوں کا حاصل نہیں ہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق کا نتیجہ ہیں۔ جو لوگ کم ظرف ہوتے ہیں وہ کسی مقصد کے لیے اپنی ذرا سی "خدمت" پر پھول جاتے ہیں، اور بہت سارے حقوق و مراعات اپنے لیے محفوظ سمجھتے ہیں۔ مگر ان جاں نثاروں کا حال یہ نہ تھا۔ ہر لمحہ سہمے سہمے اور خوفزدہ رہتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری کسی کوتاہی کی وجہ سے یہ خدمات قبولِ بارگاہ نہ ہو سکیں۔ پھر آخرت میں اجر کے ایسے حریص تھے کہ ڈرتے تھے کہ کہیں ہمیں اس دنیا میں ہی ساری کوششوں کا صلہ نہ مل جائے کہ وہاں خالی ہاتھ رہیں۔ اسی بنا پر وہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے اور استغفار کیا کرتے تھے۔ تاکہ اس جد و جہد میں بر بنائے بشریت جو لغزشیں ہو گئی ہوں، ان کی تلافی ہو جائے۔ وہ پکار اٹھتے :۔

"مالک! ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے
درگذر فرما اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچالے"۔
یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں، راستباز ہیں۔
فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری
گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا
کرتے ہیں۔ (آلِ عمران، ۱۶، ۱۷)

اور حقیقت میں یہ ممکن بھی نہ تھا کہ جن نفوسِ قدسیہ کی تعلیم و تربیت آغوشِ نبوت میں ہوئی تھی اس میں رزائلِ اخلاق کی کوئی آلائش باقی رہتی۔ کیونکہ جن بھٹیوں میں سے گزر کر وہ کندن بنے تھے۔ اس عمل میں غرور، تکبر، حسد اور دوسری برائیاں جل کر خاک ہو گئی تھیں۔

(۳)

صحابہؓ کا یک رنگ کردار

صحابہؓ کی نجی اور مجلسی زندگی بھی بہت پاکیزہ تھی۔ کتنے لوگ ہیں جو اپنے ظاہر و باطن میں یکساں ہوتے ہیں؟ اور کتنے اشخاص ہیں جو اپنی نجی و انفرادی زندگی میں اسی طرح میزان پر پورے اترتے ہیں جس طرح اپنی مجلسی و اجتماعی زندگی میں؟ بس ایک صحابہؓ کا گروہ ہے جو اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں میں اس طرح پاکباز ہے کہ "متقیون" "مفلحون" اور "فائزون" کے الفاظ انہی پر زیب دیتے ہیں۔ ان کی زندگی کے یہ دونوں پہلو ان آیات سے جھلک رہے ہیں:

"جو اُٹھتے بیٹھتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے
ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و
فکر کرتے ہیں"۔ (آلِ عمران۔ ۱۹۱)

"اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں
ان سے درگذر فرما۔ جو برائیاں ہم میں ہیں
انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں
کے ساتھ کر"۔ (آلِ عمران۔ ۱۹۳)

"یقیناً فلاح پائی ہے ایمان والوں نے جو۔
——— اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔
——— لغویات سے دور رہتے ہیں۔
——— زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں۔
——— اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے
ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان
عورتوں کے جو ان کی ملکِ یمین میں
ہوں کہ ان پر (استفادہ کرنے میں)
وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ البتہ جو
اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی
زیادتی کرنے والے ہیں۔
——— اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا
پاس رکھتے ہیں۔
——— اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے
کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور بُرائی سے
روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے
ہیں۔ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں"۔

(توبہ۔ ۷۱)

"رحمان کے (سچے) بندے وہ ہیں جو۔
——— زمین پر نرم چال چلتے ہیں۔ اور جاہل
ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم
کو سلام۔
——— اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام
میں راتیں گذارتے ہیں۔
——— جو دعائیں کرتے ہیں ......
——— جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی

کرتے ہیں نہ بخل بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔

—— جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔

—— اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے ہیں۔

—— نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں .....

—— جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے۔

—— کسی لغو چیز پر ان کا گذر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گذر جاتے ہیں۔

—— جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سُنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔

(فرقان - ۶۳ - تا ۷۳)

"ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے (راہِ خدا میں) خرچ کرتے ہیں"

(السجدہ - ۱۶)

"آپ کے رب کو معلوم ہے کہ آپ کے ساتھیوں میں سے کچھ آدمی (کبھی) دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں"

(مزمل - ۲۰)

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو انتہائی سخت ہیں، لیکن آپس میں انتہائی رحمدل اور (شفیق) ہیں۔ (اے دیکھنے والے) تم ان کو دیکھتے ہو کہ خدا کے آگے سربسجود ہیں اور خدا کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں۔ کثرتِ سجود سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف توراۃ میں مرقوم ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں پائے جاتے ہیں۔ (فتح - ۲۹)

اور کمال یہ ہے کہ معاملہ انفرادی نوعیت کا ہو یا اجتماعی نوعیت کا، غفلت کوشی کسی سمت سے راہ نہیں پاتی۔ اپنے مقصدِ حیات کو وہ کسی وقت فراموش نہیں کرتے اللہ کی یاد ان کے دلوں سے کسی لمحہ محو نہیں ہوتی۔ ہر آن رب العالمین کی رضا اور خوشنودی کی طرف ہی قدم بڑھتے ہیں۔

"ایسے لوگ جنہیں نہ تجارت غفلت میں ڈالتی' نہ خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے (باز رکھتی) وہ ڈرتے رہتے ہیں" (نور - ۳۷)

پس سیرت و کردار کا یہی وہ نمونہ ہے جس کے متعلق مخبرِ صادق نے کہا ہے "ان میں سے جس کی بھی تم پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے"

●

چیلنج کہ دیجیے اے نبیؐ کہ اگر سارے انسان اور سارے جن مل کر بھی یہ چاہیں کہ اس قرآن کی طرح کوئی چیز بنا لیں تو اس جیسی کوئی چیز نہیں بنا سکیں گے۔ چاہے یہ سب ایک دوسرے کی پشت پناہی کریں (الاسراء : آیت ۱۷)



قرآن سے صحابہؓ کا طریقِ استفادہ

سید معروف شاہ شیرازی

آج بھی دنیا میں قرآن مجید کے ساتھ مسلمانوں کا جو لگاؤ اور شغف ہے وہ کسی دوسری کتاب کے ساتھ کسی قوم کو نہیں ہے۔ اس گئے گذرے زمانے میں بھی جگہ جگہ قرآنی مکتب قائم ہیں اور باوجودیکہ بے شمار کتابیں اور بے اندازہ دوسرے علوم و فنون موجود ہیں جو انسان کی دلچسپی کا محور بن رہے ہیں لیکن ہر مسلمان بچہ قرآن ضرور پڑھتا ہے اور سینکڑوں' ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد اس کتابِ مقدس کو حفظ کرتے ہیں۔ یہ تو ہے ہمارے زمانہ کی حالت۔ اب ذرا اس دورِ زریں کو قیاس کیجیے۔ جب کہ مسلمانوں کے درمیان خدا کا نبی (آپ پر اللہ کی سلامتی ہو) موجود تھا اور خدا کا کلام روز و شب اُتر رہا تھا۔ دورِ صحابہ کرامؓ میں حالت یہ تھی کہ کتاب اللہ صحابہ کرامؓ کی زندگی کا محور تھی۔ عرب جو اسلوب کے حُسن کی بنا پر نثر میں شعر کہتے تھے اور بلا کے ذہین تھے' جب ان کے سامنے اس قسم کی ایک بلند پایہ کتاب آئی تو وہ اس کے شیدائی بن گئے۔ شعراء اپنے شعر بھول گئے' خطباء قرآن کے مقابلے میں گونگے ہو گئے، جو قادر الکلام تھے ان کو زبان کھولنے کا یارا نہ رہا۔ اب ان کا اوڑھنا اور بچھونا قرآن تھا۔ اس کو انہوں نے حرزِ جان بنا لیا تھا۔

مسجدِ نبوی نے ایک مکتب' ایک مدرسہ' اور ایک اکادمی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اِدھر کتاب اللہ کی کتابت ہو رہی ہے۔ اُدھر ایک گروہ تلاوت میں مصروف ہے۔ کہیں قرآن کے مضامین سمجھے اور سمجھائے جا رہے ہیں۔ کسی گروہ میں مسئلہ تقدیر جیسے فلسفیانہ مسائل پر بحث ہو رہی ہے تو کہیں فقہی اور دینی مسائل پر غور و فکر جاری ہے کسی کو کوئی مشکل پیش آ رہی ہے تو کوئی دوسرا مشکل کشائی میں مصروف ہے۔ اگر کہیں اختلاف ہو گیا

توحضورؐ کی طرف رجوع کیا جارہا ہے اور آپ تعلیم وتربیت اور تشریح وتوضیح کا فرض سرانجام دے رہے ہیں۔ مسجدِ نبوی میں ایک طرف ذکروفکر اور عبادت گذاری ہورہی ہے تو دوسری طرف علمی مجلسیں گرم ہیں۔ حضورِ انور حجرۂ مبارک سے نکلتے ہیں، دونوں مجالس کی نگاہیں اٹھتی ہیں کہ دیکھیں حضورؐ کس مجلس میں رونق افروز ہوتے ہیں، حضورؐ مجلسِ تعلیم وتدریس کو اولیت دیکر اشارہ فرمادیتے ہیں کہ دین میں علم کا کیا مقام ہے؛ غرض ایک طرف تعلیم وتربیت کا یہ سلسلہ چل رہا ہے تو دوسری طرف کچھ اور صحابہؓ وحی ربانی کو حفظ کررہے ہیں۔ کوئی مفہوم پوچھ رہا ہے۔ کوئی کسی کے لہجے کی تصحیح کررہا ہے غرض ہرطرف قرآن ہی قرآن ہے اور اصحابِ صفہ نے تو اپنے آپ کو قرآن کے لیے وقف ہی کردیا ہے ساری دنیا سے کٹ کر وہ صرف خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جُڑ گئے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی تک سے دست کش ہیں؛ کچھ اصحابِ خیر کھجور کے خوشے لاکر مسجد میں رکھدیتے ہیں اور یہ لوگ ان پر بسر اوقات کرلیتے ہیں۔

اس دور کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد قرآن اور صحابہ کے تعلق سے متعلق جو بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں ان کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

تلاوتِ قرآن

صحابہؓ میں سے ہر فرد قرآن کا کچھ حصہ روزانہ پڑھتا تھا۔ چونکہ ان بزرگوں کو الفاظ اور تراکیب سمجھنے کی ضرورت نہ تھی (کیونکہ معاملہ اپنی زبان کا تھا) لہذا وہ معانی ہی پر غوروفکر کرتے تھے۔ صحابۂ کرامؓ نے اپنی اپنی طاقت کے مطابق قرآن مجید کے حصے مقرر کررکھے تھے جن کی تلاوت وہ ہرروز کرتے تھے۔ حضورؐ نے منع فرمایا تھا کہ کوئی بھی سات دن سے کم وقت میں قرآن ختم نہ کرے۔ صحابہ کرامؓ قرآن کو انفرادی طور پر بھی پڑھتے تھے اور ایک جگہ جمع ہوکر بھی۔ ایک دفعہ مسجدِ نبوی میں صحابۂ کرامؓ قرآن مجید پڑھ رہے تھے جن میں بدوی، عجمی اور دوسرے صحابہ شریک تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور نہایت خوش ہوئے۔ فرمایا "پڑھے جاؤ سب کا طرز اچھا ہے۔ اس کے بعد ایسی قوم پیدا ہوگی جو قرآن مجید کو تیر کی طرح سیدھا کرے گی لیکن اس کا مقصد ثوابِ آخرت نہ ہوگا بلکہ دنیا ہوگی" ــــــ ایک دوسری روایت میں آتا ہے "قرآن اُن کے حلق سے نیچے نہ اترے گا" یعنی یہ لوگ اس پر عمل نہ کریں گے اور نہ ہی اسے سمجھ کر پڑھیں گے ــــــ اسی طرح ایک دفعہ آپ نے صحابہ کرامؓ کی ایک جمعیت کو تلاوت کرتے دیکھا تو فرمایا "شکر ہے کہ کتاب اللہ ایک ہے اور تم میں سُرخ، سفید اور سیاہ سب قسم کے لوگ شامل ہیں" ــــــ صحابہ کرامؓ بڑے شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے کلام الٰہی سنتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے متعلق ایک روایت میں آتا ہے کہ وہ دیر سے حجرے میں تشریف لائیں حضورؐ نے دریافت فرمایا تو کہا کہ کوئی صحابیؓ نہایت خوش الحانی سے قرآن مجید پڑھ رہے تھے، میں سنتی رہی۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم مختلف صحابہؓ سے قرآن پاک سنتے تھے۔

حفظِ قرآن

اگرچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مجید کی کتابت ہوچکی تھی لیکن مسلمانوں نے حفاظتِ کتاب کا مدار صرف کتابت پر نہ رکھا بلکہ بے شمار افراد نے اسے مکمل طور پر حفظ کرلیا تھا۔ عرب بلا کا حافظہ رکھتے تھے اور پھر معاملہ جب خدا کی کتاب کا ہو جو انہیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی تو وہ اسے حفظ کیوں نہ کرتے۔ ان کے حفظ کی تو

یہ کیفیت تھی کہ صرف ایک جنگِ یمامہ میں (حضرت صدیقؓ کے عہد میں) شہادت پانے والوں میں ... حفاظ تھے۔ حضورِ اکرمؐ کے زمانہ میں جن لوگوں نے پورا قرآن مجید حفظ کرلیا تھا اور مسندِ تعلیم وارشاد پر متمکن تھے ان میں سے ایک مختصر فہرست یہ ہے: چاروں خلفائے راشدینؓ عبداللہ بن مسعودؓ عبادہ بن الصامت، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، ابوزید، سالم، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، حذیفہ بن الیمان، ابوہریرہ، مجمع بن حارثہ، فضالہ بن مجید، ابوموسیٰ اشعری، عمرو بن العاص، سعد بن عبادہ، عبداللہ بن عباس، ابوایوب انصاری، عبداللہ بن ذوالبجادین، عبید بن معاویہ، سلمہ بن مخلد بن الصامت، سعد بن علید بن نعمان انصاری، عبداللہ بن الصائب، سلیمان بن ابی حثمہ، تمیم الداری، معاذ بن الحارث، ابوالدرداء، عقبہ بن عامر الجہنی، عبداللہ بن عمر بن الخطاب، سعد بن المنذر بن اوس، قیس بن صعصعہ، عبداللہ بن عمرو بن العاص اور ابوحلیمہ معاذ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ان مردوں کے علاوہ عورتوں میں حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، ام سلمہؓ اور ام ورقہؓ ابن نوفل۔ ان حضرات کے علاوہ ایسے صحابہ جو قریب قریب حافظ تھے ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

استفادہ کا طریقہ

صحابہ کرامؓ نے مطالعۂ قرآن میں تین طریقے استعمال کیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنا، ایک دوسرے سے دریافت کرنا اور خود غوروفکر کرنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے کے کئی واقعات کتبِ تفسیر اور احادیث میں مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات تفسیرِ آیات کے لیے وحی نازل ہوئی اور بعض اوقات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تشریح فرمادی۔

مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۵ میں "خیط ابیض" اور "خیط اسود" کی تشریح کے لیے فرشتۂ وحی "من الفجر" کے الفاظ لے کر آیا، جب کہ ایک صحابی نے ان الفاظ سے مراد سفید اور سیاہ دھاگے لیے اور اس وقت تک سحری کھانا جائز سمجھتے تھے جب تک دونوں دھاگے صاف صاف الگ نظر نہ آجائیں۔

جب حرمتِ شراب نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ کو شبہ ہوا کہ جو لوگ اعلانِ حرمت سے پہلے ترکِ شراب کے بغیر فوت ہوئے، وہ بھی گناہگار ہیں اور ان سے مواخذہ ہوگا۔ اس پر مائدہ آیت ۹۳ نازل ہوئی ــــ لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيمَا .... الخ

آیت لَمْ يَلْبِسُوٓا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ (۶ - ۸۲) ... الخ

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کی تشریح شرک سے کی اور آلِ عمران کی آیت ۶۴ کے بارے میں جب بعض صحابۂ کرام نے یہ سوال کیا کہ اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو "اربابا من دون اللہ" نہیں سمجھتا تو حضورؐ نے "رب" کے مفہوم کی وضاحت فرمائی کہ اس سے مراد قانون ساز ہے اور ظاہر ہے کہ اہلِ کتاب اپنے مذہبی پیشواؤں کی بطور خود حلال کردہ چیزوں کو حلال اور حرام کردہ کو حرام سمجھتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ کو جب کوئی غلط فہمی یا شبہ ہوتا تو وہ بے تکلفی سے ایک دوسرے سے استفادہ کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خیال تھا کہ حضورؐ فوت نہیں ہوئے اور انہوں نے اعلان کردیا کہ جس شخص نے آپؐ کے انتقال کا نام تک

لیا میں اسی کی گردن اڑا دوں گا لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آلِ عمران کی آیت ۱۴۴ سے استدلال فرمایا تو آپ خاموش ہو گئے اور عمر بھر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے ممنونِ احسان رہے۔

حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت عمر بن معدیکرب رضی اللہ عنہما کو یہ غلط فہمی تھی کہ لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا الَّذِيْ (مائدہ۔۹۳) کے

قرآن کا سچا علمبردار

حضرت ابو عبداللہ سالم رضی اللہ عنہ غزواتِ بدر و اُحد میں شرکت کرنیوالے بہادر مجاہد تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں مرتدین کے خلاف جنگِ یمامہ میں علم اُٹھائے ہوئے تھے کسی نے کہا "آپ کی جان کو خطرہ ہے یہ جھنڈا کسی اور کو دے دیجئے" فرمایا: "پھر تو میں بہت بُرا حاملِ قرآن ہوں گا۔ میدان میں ڈرانہ بڑھتے چلے گئے۔ داہنا ہاتھ کٹ گیا تو علم بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ بایاں بھی قلم ہو گیا تو علم کو گردن سے تھام لیا اور اُسے خم نہ ہونے دیا۔ اس حالت میں یہ آیت وردِ زبان تھی: وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ

مطابق شراب بدکاروں کے لیے تو حرام ہے اور نیکوکاروں کے لیے جائز ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ تصریح کی کہ یہ آیت لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اُتری ہے کہ جو لوگ اب سے پہلے شراب پیتے تھے اور اس حالت میں ان کی وفات ہوئی ان کو شاید آخرت میں عذاب دیا جائے گا اللہ نے وضاحت فرما دی کہ ان سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا اسی طرح سعی صفا و مروہ کے بارے میں حضرت عروۃ کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا (بقرہ - ۱۵۸) سے معلوم ہوتا ہے اگر کوئی سعی کرے تو گناہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی چھوڑ دے تو بھی مواخذہ نہ ہوگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں سمجھایا کہ دراصل مسلمان اس سعی کو مکروہ سمجھنے لگے تھے کیونکہ جاہلیت کے دور میں وہاں بُت رکھ دیئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا سعی کرو یہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آیات پر خود غور و فکر کر کے نئے نکات سمجھ لیتے تھے لیکن یہ نئے نکات اسلام کے مجموعی تصور کے مطابق اور اسالیبِ کلامِ عرب کے مطابق ہوتے تھے۔ کیوں کہ قرآن مجید عام اسلوب کے مطابق عربی مبین میں نازل ہوا تھا۔ مثلاً سورہ النصر اور اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ استنباط کیا کہ حضورؐ کی رحلت کا وقت قریب ہے۔

ایک دفعہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام سے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۶ میں بیان کردہ تمثیل کا مفہوم دریافت کیا جس میں کہا گیا ہے کہ کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا بہترین باغ ہو اور وہ ضعیف ہو چکا ہو اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں کہ اچانک اس کا یہ باغ جل جائے؟ صحابہ کرام خاموش ہو گئے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ توجیہ کی "اللہ دراصل" یہ بیان فرماتا ہے کہ تم میں سے کوئی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ ساری عمر نیک کام کرتا رہے کہ جب اس کی عمر انتہا کو پہنچ رہی ہو اور وہ خاتمہ بالخیر

کا محتاج ہو لیکن اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو اس کی بُری عاقبت کا باعث ہو جائے۔ سورۂ بقرہ کی اس تمثیل سے مقصود یہ ہے کہ احسان کرنے کے بعد احسان جتلانے سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس سے مزید مفہوم اخذ کیا جو قرآن و سنت کے مجموعی تصور کے مطابق ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں عظمت و جلالت

کتاب اللہ کی جو عظمت و جلالت جاگزیں تھی۔ آج اس کا تصور بھی مشکل ہے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرائط صلح کو ناپسند فرمایا تھا لیکن بعد میں وہ پشیمان ہوئے اور مارے خوف کے چھپتے پھرے کہ کہیں ان کے بارے میں تادیبی آیات نازل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اسی حال میں انہیں کسی نے پکارا کہ دربارِ نبوت سے آپ کا بلاوا آیا ہے۔ گھبرا کر کانپ اُٹھے لیکن جب حضورؐ نے إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (سورۂ فتح۔ ۱) کی آیات پڑھ کر سنائیں تو تسلی ہوئی۔ حضورؐ کی وفات کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپؐ کے وصال کا یقین نہ آتا تھا جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آیت وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ (آلِ عمران ۱۴۴) پڑھ کر سنائی تو نہ صرف یہ کہ ان کو غلطی کا احساس ہوا بلکہ مارے خوف کے زمین پر گر پڑے کہ ان سے کتنی بڑی غلطی ہوئی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ وہ زمانۂ نزولِ قرآن میں محرم عورتوں سے بھی ہنسی کی کوئی بات نہ کرتے تھے کہ یہ بھی کہیں حرام قرار نہ دی جانیوالی ہو۔

ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے آپؐ نے فرمایا "وہی لوگ گھاٹے میں ہیں" ابوذر رضی اللہ عنہ خوفزدہ ہو گئے کہ شاید ان کے بارے میں کوئی ایسی بات نازل ہو گئی۔ حالانکہ دراصل آپؐ کی مراد (جیسا کہ وضاحت ہو گئی) ان لوگوں سے تھی جو زکوٰۃ نہ دیتے تھے۔

جب آیت وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ نازل ہوئی تو صحابۂ کرام بہت گھبرائے کیونکہ بہتوں کے پاس ضرورت سے زیادہ کچھ نہ کچھ پس انداز کردہ مال موجود تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اس پریشانی کو بھانپ لیا اور حضورؐ سے عرض کیا کہ بظاہر یہ آیت عام لوگوں کیلئے سخت پریشانی اور گھبراہٹ کا سبب بنی ہوئی ہے آپؐ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ مال ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو اور نہ دی گئی ہو۔ اگر مقصود یہی ہوتا کہ ضرورت سے زیادہ

اُمت کے لیے سرمایۂ فخر!

حضرت سالم رضی اللہ عنہ ایسی خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے کہ ایک مرتبہ پہلے حضرت عائشہ تلاوت سننے کے لیے اپنے حجرے میں جاتے جاتے رک گئیں اور پھر جب آنحضرتؐ کو معلوم ہوا تو ردا مبارک سنبھالتے ہوئے باہر تشریف لائے اور حضرت سالم رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا کہ:

"حمد اس خدا کے لیے جس نے میری اُمت میں تم جیسے آدمی کو پیدا کیا۔——"

کوئی بھی کچھ اپنے پاس نہ رہنے دے تو تقسیم میراث کے حکم کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے۔ اس تشریح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہایت خوش ہوئے اور لوگوں کو بھی یہ خوشخبری سُنا دی۔

غرض ایسے بے شمار واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام کو جس قدر قرآن مجید سے محبت تھی اس سے کہیں زیادہ وہ قرآن مجید کی جلالتِ شان اور رفعتِ مقام کے قائل تھے۔ وہ صفائی و پاکیزگی کی حالت میں نہایت ہی عزت و احترام سے اُسے چھوتے تھے۔ تلاوت و مطالعہ کے وقت کسی سے بات نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے قرآن مجید ہاتھ میں لیے ہوئے اپنا بدن کھجایا تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نہایت برہم ہوئے اور تادیباً حکم دیا کہ وضو کرو۔

عمل بالقرآن

صحابۂ کرامؓ نے قرآن مجید پر عمل کرکے ایک ایسا معیار قائم کر دیا ہے جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ وہ ہر آیت پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہمہ وقت اور ہمہ تن آمادہ رہتے تھے۔ تحویلِ قبلہ کا حکم سنتے ہی نئے قبلے کی طرف منہ پھیر لیتے ہیں۔ اِدھر شراب کی حرمت کا حکم آتا ہے اور اُدھر جو جام ہونٹ تک آچکے تھے وہ واپس چلے جاتے ہیں اور مدینے کی گلیوں میں شراب بہہ نکلتی ہے اس کے برتن تک توڑ دیئے جاتے ہیں۔ چار سے زائد بیویاں رکھنے کی ممانعت آتی ہے تو لوگ فوراً اپنی عزیز بیویوں کو رخصت کر دیتے ہیں۔ اسی طرح حکم آتے ہی مشرک عورتوں کی تفریق کر دی جاتی ہے جب یہ آیت اُترتی ہے لن تنالوا البر حتیٰ تنفقو مما تحبون (تم اس وقت تک نیکی حاصل نہ کرسکو گے جب تک تم اس چیز کو خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے) تو حضرت طلحہؓ اپنا محبوب ترین باغ اللہ کی راہ میں دیدیتے ہیں۔ جب قرآن کریم نے حکم دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بلند آواز سے گفتگو نہ کی جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قدر آہستہ لہجے میں بات کرتے کہ لوگ سُن نہ سکتے۔ دوسرے صحابی حضرت ثابت بن قیسؓ جو بلند آواز تھے گھر ہی میں بیٹھ گئے اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہونا خدا کی ناراضی کے ڈر سے چھوڑ دیا۔ چنانچہ آپؐ نے کسی سے پوچھا کہ وہ بیمار تو نہیں ہیں۔ تفتیش پر انہوں نے بتایا کہ میں اونچی آواز سے بولنے کا عادی ہوں اور آیت کے موجب وعید کا مستحق ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا آپ تو جنتی ہیں۔ جب پردے کا حکم ہوا تو سب عورتوں نے اپنی چادریں لٹکائیں اور اسی طرح معلوم ہوتا تھا کہ شاید ان کے سروں پر کوّے بیٹھے ہوئے ہیں۔

غرض یہ تھا صحابہؓ کے تعلق بالقرآن کا حال، اسی کی برکت ہے کہ اتنے مختصر عرصے میں عرب جیسی قوم نے وہ اصلاحات قبول کرلیں جن کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

حضرت عائشہؓ کی نگاہ میں
نہایت سخت آیت

ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ قرآن پاک کی یہ آیت بہت سخت ہے ——

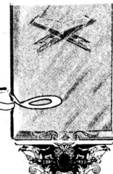
مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ

جو کوئی (کچھ بھی) بُرا عمل کریگا، اُسے اس کا بدلہ ملے گا۔

حضورؐ نے ان کو تسلی دلائی کہ مومن طاعت کیش کی چھوٹی موٹی لغزشوں کا حساب زندگی کی روزمرہ کی تکالیف سے پورا کر دیا جاتا ہے

(ابوداؤد، کتاب الجنائز۔ باب الامراض مکفرۃ للذنوب)

مولانا ابوالحسن علی ندوی



صے اپنے آپ کو پالیا

احنف بن قیس ایک بڑے عرب سردار تھے مشہور تھا کہ اگر احنف کو غصہ آتا ہے تو ایک لاکھ تلواروں کو غصہ آ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت تو انہوں نے نہیں کی مگر آپؐ کی زیارت کرنے والوں کی زیارت کی اور اُن کے ساتھ رہے۔ خاص طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بڑے معتمد اور مخلص تھے۔

ایک دن کسی قاری نے یہ آیت تلاوت کی:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ہی تذکرہ موجود ہے۔ تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟

(سورہ الانبیاء - ۱۰)

عربی اُن کی زبان تھی سُن کر چونک پڑے۔ گویا نئی بات سُنی، کہنے لگے ہمارا تذکرہ! ذرا قرآن تو لاؤ، دیکھوں میرا کیا تذکرہ ہے اور میں کن لوگوں کے ساتھ ہوں؟"

قرآن مجید آیا اور لوگوں کی صورتیں ان کے سامنے سے گزرنے لگیں، ایک گروہ آیا جس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ... وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ... وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ

وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور آخر شب میں استغفار کیا کرتے تھے اور اُن کے مال میں سائل اور محروم کا حق تھا۔

(الذاریات - ۱۷، ۱۸، ۱۹)

پھر کچھ ایسے لوگ آئے جن کا حال یہ تھا کہ

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

اُن کے پہلو خوابگاہوں سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے رب کو اُمید سے اور خوف سے پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی چیزوں سے خرچ کرتے ہیں۔ (حٰم السجدہ-۱۶)

پھر کچھ ایسے کہ:

يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا

راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدے

اور قیام میں لگے رہتے ہیں۔ (الفرقان - ۶۴)
پھر ایک ایسا قافلہ گزرا جس کی شان یہ تھی کہ :

يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

خرچ کرتے ہیں فراغت میں اور تنگی میں اور غصے کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے اور اللہ ایسے نیکو کاروں کو محبوب رکھتا ہے۔ (آل عمران - ۱۳۴)

ابھی نظر بھر کر ان کو دیکھ نہیں سکے تھے کہ کچھ ایسے جوان مرد سامنے آگئے جن کا عالم یہ تھا :

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کو تنگی وفاقہ ہو اور (واقعی) جو اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے وہ بڑا کامیاب ہے۔ (الحشر - ۹)

ابھی ہٹے ہی تھے کہ ایک دوسرا نمونہ سامنے آیا:

كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ۝ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ

جو بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور وہ نماز کے پابند ہیں اور ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے اور ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں خرچ کرتے ہیں۔ (الشوریٰ - ۳۷ - ۳۸)

حضرت احنف، اپنے کو پہچانتے تھے۔ کہنے لگے خدایا میں تو ان میں کہیں نظر نہیں آتا؟

اب انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس راستے میں ان کو اور طرح طرح کے آدمی نظر آنے لگے۔ ایک بھیڑ ملی، جس کا حال یہ تھا :

إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُو آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ

جب اُن سے کہا جاتا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو تکبر کیا کرتے اور کہتے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعرِ دیوانہ کی وجہ سے چھوڑ دیں گے؟ (الصّٰفّٰت - ۳۵ - ۳۶)

اور آگے بڑھے تو کچھ ایسے لوگ ملے کہ :

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ

جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر آتا ہے تو اُسی وقت وہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ (الزمر - ۴۵)

کچھ ایسے بدقسمت بھی کہ جب اُن سے کہا جائے گا:

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ

تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا؟ (المدثر - ۴۲)

تو وہ جواب دیں گے :

لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ

ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ غریب کو کھانا کھلایا کرتے تھے اور ہم باتیں بنانے والوں کے ساتھ خود بھی مشغول ہو جاتے تھے اور ہم آخرت کا انکار کرتے تھے؟ یہاں تک کہ ہم کو موت آگئی۔ (المدثر - ۴۳ - ۴۴ - ۴۵ - ۴۶)

احنف یہ صورتیں دیکھ کر گھبرا گئے۔ کہنے لگے "خدایا! ایسے لوگوں سے تیری پناہ! میں ان سے بیزار ہوں اور مجھے ان سے کوئی تعلق نہیں"۔

وہ اپنے متعلق نہ تو دھوکے میں تھے اور نہ ایسے بدگمان کہ اپنے کو مشرکوں اور باغیوں میں سمجھ لیں وہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی دولت دی ہے ان کا مقام بہت بلند نہ سہی مگر ان کی جگہ مسلمانوں ہی میں ہے۔ ان کو ایسی صورت کی تلاش تھی جس کو وہ اپنی کہہ سکیں۔ ان کو اپنے ایمان کا یقین بھی تھا اور اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا علم بھی اور اللہ کی رحمت اور مغفرت پر بھروسہ بھی۔ نہ ان کو اعمال پر غرّہ تھا نہ خدا کی رحمت سے مایوسی۔ ان کو اس ملی جلی صورت کی تلاش تھی اور اس کا یقین تھا کہ وہ صورت اس جامع و کمل اس زندہ و تازہ کتاب میں ضرور ملے گی۔ کیا ایسے خدا کے بندے نہیں ہیں جو ایمان کی دولت بھی رکھتے ہیں اپنے گناہوں اور تقصیروں پر شرمندہ بھی ہیں؟ کیا خدا کی رحمت ان کو محروم رکھے گی؟ کیا اس کتاب میں جو سارے انسانوں کے لیے ہے ان کی صورت اور ان کا تذکرہ نہیں ملے گا؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔

جوئندہ یابندہ احنف کو اپنی تلاش میں کامیابی ہوئی، انہوں نے اللہ کی اس پاک کتاب میں اپنے کو ڈھونڈ نکالا :

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

اور کچھ اور لوگ ہیں جن کو اپنی خطاؤں کا اقرار ہے انہوں نے ملے جلے عمل کیے تھے کچھ بھلے کچھ بُرے۔ اللہ سے امید ہے کہ ان کے حال پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائے۔ بلاشبہ اللہ بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے۔ (التوبہ - ۱۰۲)

انہوں نے کہا بس بس میں مل گیا۔ میں نے اپنے کو پالیا۔ مجھے اپنے گناہوں کا اعتراف ہے۔ مجھے خدا کی توفیق سے جو کچھ نیک اعمال ہوئے ان کا انکار نہیں۔ اُن کی ناقدری نہیں ناشکری نہیں۔ مجھے خدا کی رحمت سے ناامیدی نہیں۔ وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ اللہ کی رحمت سے وہی مایوس ہو سکتے ہیں جو گمراہ ہیں۔ (حجر - ۵۶)

ان سب سے مل جل کر جو صورت تیار ہوئی وہ میری صورت ہے۔ اس آیت میں میرا اور میرے جیسوں کا حال بیان کیا گیا ہے اور ان کا نقشہ کھینچا گیا ہے ـــــ قربان اپنے رب کے جس نے اپنے گنہگار بندوں کو فراموش نہیں فرمایا ـــــ

حضرت احنف کی تلاش کا یہ قصہ ختم ہو گیا۔ حضرت احنف بھی دنیا سے چلے گئے۔ اپنے پیدا کرنے والے کے پاس پہنچ گئے۔ مگر یہ کتاب موجود ہے اور قیامت تک رہے گی۔ قومیں اگر اپنے کو اس میں تلاش کریں گی تو پا لیں گی۔ جماعتیں اور مختلف طبقے اگر اپنے کو اس آئینہ میں دیکھنا چاہیں گے تو دیکھ لیں گے۔ افراد ـــــ ہم اور آپ ـــــ اگر اپنے کو تلاش کرنے نکلیں گے" انشاءاللہ ناکام واپس نہیں ہوں گے۔ حضرت احنف نے ہم کو سچی تلاش کا ایک نمونہ دکھلایا اور قرآن پڑھنے اور اس پر غور کرنے کا صحیح طریقہ سکھا گئے۔ ہمیں اس نمونے اور تعلیم سے فائدہ اٹھا کر قرآن مجید کا مطالعہ شروع کرنا چاہیئے ..

نظمِ قرآن

— مولانا حمید الدین فراہی —

یہ مضمون مولانا فراہی کے مقدمہ تفسیر نظام القرآن (مجموعہ تفاسیر فراہی) سے ماخوذ ہے۔

آیاتِ قرآنی کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائے۔ ایک عظیم الشان علم ہے۔ نظمِ قرآن کے علم کی ضرورت مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر ہوتی ہے:

۱۔ قرآن کی تاویل میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ عام طور پر اس بات کا نتیجہ ہے کہ آیات کو سمجھتے وقت لوگوں نے آیات کے اندر جو نظم پوشیدہ ہے اسے نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر نظمِ کلام ظاہر ہوتا اور سورہ کا عمود یعنی مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تاویل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا۔

۲۔ ملحدین نے قرآن مجید پر یہ الزام لگایا ہے کہ اس میں بے نظمی پائی جاتی ہے۔

۳۔ نظمِ کلام میں کچھ خاص حقیقتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جو اس وقت سمجھ میں آسکتی ہیں جب ایک بات پر اس کے نظم کی روشنی میں غور کیا جائے۔ اس نظم کا اہتمام ترک کر دیا جائے تو وہ باتیں لازماً نظر انداز ہو جاتی ہیں جو خاص طور پر نظم سے نکلتی ہیں، اور نظم ہی کی رعایت سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہم نظمِ کلام سے بے پروائی برتیں تو کتاب اللہ کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہے

جس طرح ایک سپہ سالار اپنی افواج کو مختلف ڈھنگ سے ترتیب دیتا ہے اسی طرح قرآن مجید میں ایک ہی بات مختلف طریقوں سے کہی جاتی ہے۔ قرآن میں ایک چیز کبھی عمود (مرکزی مضمون) کی حیثیت سے آتی ہے۔ کبھی ضمنی مضمون کی حیثیت سے۔ کبھی وہی چیز اجمال کے ساتھ آتی ہے کبھی تفصیل کے ساتھ۔ کبھی ایک چیز موخر ہوتی ہے، کبھی مقدم۔ کبھی تنہا ہوتی ہے، کبھی اپنے مقابل کے ساتھ کبھی کسی چیز کے ساتھ اس کا جوڑ ہوتا ہے کبھی کسی چیز کے ساتھ۔ بالکل یکساں مضمون مختلف سورتوں میں مختلف ترتیبوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی شے اپنے مختلف پہلوؤں سے جلوہ گر ہوگی تو اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے اور پوری طرح پہچان لینے میں دقت نہ ہوگی۔ اگر ایک ادا نگاہ سے چوک گئی۔ دوسرا جلوہ سامنے آجائے گا۔ قرآن مجید کی اسی صفت کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ۔

(اسی طرح ہم ہیر پھیر کر اپنی آیات بیان کرتے ہیں تاکہ وہ (لوگ) سمجھیں)

اور ترتیب میں ایک خاص حکمت ملحوظ ہوتی ہے ایک ہی شے کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پہلو سے وہ کسی چیز سے مناسبت رکھتی ہے اور دوسرے پہلو سے کسی چیز

سے۔ مثلاً نماز اور حج میں کتنی مناسبتیں موجود ہیں۔ دونوں ذکرِ الٰہی کی صورتیں ہیں۔ دونوں بدنی عبادتیں ہیں۔ دونوں بیت اللہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ طواف نماز ہے۔ اب روزہ کی مناسبتوں پر غور کیجیے۔ دونوں کسی مخصوص جگہ کی قید سے آزاد ہیں۔ دونوں کی بنیاد صبر پر ہے۔ یہاں تک کہ پہلے ادیان میں سکوت بھی روزہ کے شرائط میں شامل تھا۔ اس اعتبار سے گویا نماز نفس کا باطنی روزہ ہے۔ نماز کی مناہمت روزہ کے ساتھ بھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے کمال کو پہنچتی ہیں۔ دونوں ایک ہی جڑ سے پھوٹی ہیں۔ نماز کی حقیقت بندہ کا خدا کی طرف محبت اور خشیت سے مائل ہونا ہے اور زکواۃ کی حقیقت بندہ کی طرف محبت اور شفقت سے مائل ہونا ہے پس کمال و سعادت کے لیے دونوں لازمی ٹھہریں اور

ان دونوں کی روح محبت ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ خود دین کی حقیقت بھی محبت، گدازِ باطنی اور لطافتِ احساس ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام صفات میں رحم کو مقدم کیا اور فرمایا کہ:

وسعت رحمتی کل شی

(میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے)

اس طرح ایک اور مثال ہے۔ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے کھانے کی چیزوں میں سے جو جائز ہیں ان کو بیان کیا۔ پھر جن عورتوں سے نکاح جائز ہے ان کو بیان کیا۔ پھر وضو کا ذکر کیا۔ اب ان کی مناسبت دیکھیے۔ دو چیزیں سامنے آئیں گی ایک شئ اور دوسری شرطِ شئ۔ شرائط میں سے وہ چیزیں بیان کیں جن سے یہ چیزیں پاک ہوتی ہیں۔ چنانچہ ذبح چوپایوں کو پاک کرتا ہے مہر اور نکاح سے عورتیں پاک ہوتی ہیں۔ اور وضو نماز کی



پاکی ہے۔ پھر اس تمام حقیقت کو آخر میں یہ فرما کر کھول دیا کہ

حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ
(المائدۃ ۶۰)

(اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی
ڈالے بلکہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے۔
اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے)

یہ شرائط کا بیان تھا۔ اب اشیاء پر غور کیجیے۔ یہاں تین چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ طیّباتِ طعام، طیّباتِ نساء، طیّباتِ نماز۔ اس سے زیادہ گہری نظر سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ یہ دنیا چونکہ عالمِ کون و فساد ہے۔ اس وجہ سے یہاں تین عالموں، عالمِ شخص، عالمِ نوع اور عالمِ روح کے نقص کی تلافی تین چیزوں طعام، نکاح اور نماز سے فرمائی ہے۔ پھر طعام اور نکاح میں یہ مناسبت ہے کہ دونوں میں سے جو چیزیں حرام ہیں ان کی تخصیص کر دی گئی ہے۔ اسی طرح نماز اور نکاح میں مناسبت کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ نکاح بدکاری کی آلودگیوں سے حفاظت کرتا ہے اور نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ یہ مناسبت دونوں میں پاکیزگی کے پہلو سے تھی۔

پھر ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے اور سورتوں کے مطالب میں بظاہر جو بے نظمی نظر آتی ہے محض قلتِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ یہ بات ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کی سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ ہر سورہ میں اگر کوئی ایک متعین مقصد نہ ہوتا جس کے پورے ہونے سے سورہ پوری ہوتی ہو، تو یہ الگ الگ حد بندیوں کی کیا ضرورت تھی۔ سارے قرآن کو ایک ہی سورہ بنا دیا جاتا۔ نیز جب سورتوں کے لیے کوئی خاص مقدار نہیں ٹھہرائی گئی۔ بڑی چھوٹی ہر طرح کی سورتیں ہوتیں تو اگر ہر سورہ کے اندر کوئی نظمی وحدت مدِنظر نہیں ہے تو آیتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کیا ضرورت تھی۔ اجزاء یوں ہی بکھیر دیے جاتے۔ اور اگر سطر سطر کے برابر کے اجزا ہوتے جب بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مجموعہ ایک سورہ کے اندر رکھا گیا اور وہ سورہ کے نام سے موسوم ہوا۔ گویا ایک شہر بسا کر اس کے ارد گرد شہر پناہ کھینچ دی گئی۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایک ہی شہر پناہ کے اندر کئی شہر کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ جب قریش قرآن کے مانند دس سورتیں لانے سے عاجز رہے تو کم از کم ایک سورہ کے لیے مطالبہ ہوا۔ اس سے کم کے لیے مطالبہ نہیں ہوا اور سورتیں چھوٹی بڑی ہر قسم کی مراد ہوتیں لیکن اس سے سورہ کے بقدرِ کلام مراد نہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ قرآن نے جو مطالبہ کیا ہے اس میں پیش نظر ایک سورہ بحیثیت مجموعی ہے۔ بلاشبہ کسی سورہ کی مثال پیش کرنا جن و بشر کی طاقت سے باہر ہے۔ اگرچہ سورہ کوثر کی سی مختصر سورہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ سورہ سے اللہ تعالیٰ کی مراد ایک منظم کلام ہے۔ اس میں چھوٹی اور بڑی کا امتیاز نہیں اور ایک سورہ کے لیے ایسی نظمی وحدت ضروری ہے۔ جس میں تمہید (ابتدا) خاتمہ (انتہا) اور عمود (مرکزی مضمون) ہو۔ اسی لیے کم از کم تین آیتیں ایک سورہ کی تالیف کے لیے ضروری ہوتیں۔

مزید برآں قرآن کی چھوٹی سورتیں ربط و نظام کے محاسن کے لحاظ سے بڑی سورتوں کی ہمعصر ہیں۔ چھوٹی سورتوں کے اندر بھی ربط و پیوستگی کی وہ تمام نزاکتیں موجود ہیں جو بڑی سورتوں کے اندر ہیں۔

قرآن مجید کا طرزِ استدلال

مولانا افتخار احمد بلخی

سلسلۂ رسالت کے جاری کیے جانے اور انبیا علیہم السلام کے مبعوث ہونے اور کتبِ الٰہیہ کے نازل کیے جانے کا مقصد اگر دو لفظوں میں بیان کیا جائے تو وہ ہے "تزکیۂ نفس"۔ یہی تزکیۂ نفس رسالتِ محمدیؐ کی غرض ہے اور قرآن مجید کے نازل کیے جانے کا بھی مقصد ہے

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا جبکہ اس نے خود ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے" (القرآن)

اس تزکیۂ نفس کے لیے ضروری تھا کہ ایک طرف تو حق و صداقت پر قلوب کو پوری طرح مطمئن کیا جائے اور دوسری طرف باطل کی پیداوار کے سارے شکوک و شبہات کا قلع قمع کیا جائے۔ اس بنا پر قرآن نے نہ صرف یہ کہ حق و صداقت کو پیش کیا ہے بلکہ حق کے حق ہونے کے واضح اور مستحکم دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ اور باطل کے فساد کے متعلق بھی مسکت براہین بیان کیے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ آیت اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کیونکہ اس میں رسول اللہ کی ذمہ داری سے متعلق تین باتیں بیان کی گئی ہیں: سب سے پہلے تلاوتِ آیات (يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ)، اس کے بعد بعثتِ رسول یا نزولِ قرآن کی غرض و غایت یعنی تزکیۂ نفس (يُزَكِّيْهِمْ)، پھر تعلیم کتاب و حکمت (يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ)، تاکہ اس کتاب کی تعلیم کے بعد حق کھل کر سامنے آجائے اور باطل کا فساد پوری طرح عیاں ہو جائے۔

قرآن کے یہ دلائل و براہین جیسا کہ علماء کا قول ہے، علم مباحثہ کی تقریباً تمام انواع و اقسام پر مشتمل ہیں۔

البتہ قرآن نے متکلمین کے طریقوں اور بحث و مناظرہ کے اسلوبوں کی اتباع کیے بغیر بالکل سادہ انداز سے اور اہلِ عرب کی عادت کے مطابق دلائل و براہین کو پیش کیا ہے۔

"ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے تو اس کی قوم ہی کی زبان میں پیغام بھیجا ہے، تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے" (القرآن)

ظاہر ہے کہ قرآن کے اولین مخاطب اہلِ عرب تھے اور نزولِ قرآن کے وقت نہ متکلمین کا طریقۂ استدلال رائج تھا اور نہ اہلِ عرب اس اسلوبِ بحث سے آشنا تھے۔ اس لیے تبیین و توضیح کے لیے وہی انداز اور وہی اسلوب اختیار کیا گیا، جو اہلِ عرب کی عادت سے مطابقت رکھتا تھا، تاکہ انھیں عذر پیش کرنے کا موقع نہ مل سکے کہ خداوند تیری بھیجی ہوئی تعلیم تو ہماری سمجھ ہی میں نہ آتی تھی تو پھر ہم اس پر ایمان کیسے لاتے؟ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ زبردست اور واضح ترین کلام کے ساتھ حجت قائم کرنے پر قادر ہے۔ اس بنا پر تثقیل اور پیچیدہ اسالیب اپنانے کی اسے ضرورت نہیں ہے۔ ایسا انداز تو وہی اختیار کرتے ہیں جو اس وصف سے عاری ہیں۔

غرض قرآن فنِ مباحثہ اور علم کلام کے قواعد و نظائر سے بھرا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود منطقی اور کلامی طرز و اسلوب سے خالی ہے اور اس کی وجہ ایک تو اوپر مذکور ہو چکی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ منطقی طرزِ استدلال اور کلامی اسلوب بُرہان اکثر و بیشتر مخاطب کو لاجواب اور ساکت تو کر دیتا ہے لیکن اس کے دل سے تردد اور شک کے کانٹے نکال کر انشراح و اطمینان کی ٹھنڈک نہیں پہنچاتا۔

لیکن دعوتِ حق کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ داعیٔ حق کی شان متکبرانہ چیلنج بازی کی نہیں ہوتی بلکہ اس کا مقصد ہدایت ہوتا ہے جو صرف اذعان و یقین سے حاصل ہو سکتی ہے اور یہ اذعان و یقین بحث و نزاع کے الجھاوے سے پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ مخاطب کے دل سے شکوک کے کانٹے نکال کر اس میں حق اتارنے کی سعی ہی سے ممکن ہے۔ اس لیے قرآن نے جو استدلال کے اسالیب اور براہین کے جو پیرائے اختیار کیے ہیں ان سے باطل کا سارا زور ٹوٹ جاتا ہے اور تردد و شک کے کانٹے بھی دل سے نکل جاتے ہیں اور انسان اگر معقولیت پسند ہے تو وہ محض ساکت اور لاجواب ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ انشراحِ صدر کے ساتھ حق کے قبول کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ بھی پاتا ہے۔

اب ہم چند مثالیں بیان کرتے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قرآن کس طرح فنِ مباحثہ اور علم کلام کے قواعد و نظائر اپنے اندر رکھنے کے باوجود برہان و حجت کی وہ زبان استعمال نہیں کرتا جو منطق اور کلام کی زبان ہے۔ (۱) توحید کے باب میں قرآن نے ایک جگہ یوں استدلال کیا ہے:

"اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان، دونوں کا نظام بگڑ جاتا"

اس استدلال کی نوعیت وہی ہے جسے فنِ مناظرہ اور علم مباحثہ میں "برہانِ تمانع" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن برہانِ تمانع سے کام لیتے وقت جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس کے بجائے اسلوب ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ مشکل و پیچیدہ پیرایہ سے ایک طرح کی جو وحشت ہوتی ہے وہ بھی پیدا نہ ہو اور فائدہ وہی حاصل ہو جو برہانِ تمانع سے کام لینے کا ہوتا ہے اور ہر شخص عوام میں سے ہو یا خواص میں سے ذہین اور طباع انسان ہو یا متوسط یا ادنیٰ درجے کا ذہن رکھنے والا سب کی سمجھ میں بات یکساں طور پر آ جائے۔ حالانکہ فنی طریقہ پر اگر یوں کہا جاتا کہ اگر دنیا کے دو یا زیادہ صانع ہوتے تو نظامِ کائنات کے ساتھ

میں اُن کی تدبیریں ہر قدم اور ہر مرحلے پر یکساں اور ہم آہنگ نہ رہتیں اور اُن کے احکام میں اتحاد و اتفاق نہ ہوتا اور یقیناً ان دونوں صانعوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو عاجز و مغلوب ہونا پڑتا کیونکہ اگر ان میں سے ایک صانع مثلاً کسی جسم کی زندگی چاہتا اور دوسرا صانع اس جسم کو مارنے کا ارادہ کرتا تو ایسی شکل میں یا تو ان دونوں کے ارادوں میں تنفیذ کے سبب فساد و تناقض پیدا ہو جاتا۔ کیوں کہ اگر اتفاق کو فرض کیا جائے تو فعل کی تجزی محال ہے۔ اور اگر اختلاف کو فرض کیا جائے تو اجتماعِ ضدین لازم آتا ہے جو محال ہے یا دونوں میں سے کسی صانع کا ارادہ نافذ نہ ہوتا تو دونوں صانع عاجز قرار پاتے حالانکہ خالق کو عجز سے پاک اور قادر ہونا چاہیے یا دونوں میں سے کسی ایک صانع کے ارادہ کی تنفیذ نہ ہوتی پھر اس کا عجز ثابت ہوتا ہے حالانکہ خدا کو عاجز نہ ہونا چاہیے۔

اس گورکھ دھندے والے اندازِ استدلال کو پوری طرح کتنے لوگ سمجھ سکیں گے؟ پھر اس اندازِ گفتگو سے اس بات کا پورا امکان ہے کہ انسان کے دل کو وحشت ہونے لگے اور وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگ کھڑا ہو لیکن قرآن نے یہی بات بیان کی اور اسی برہان سے کام لیا۔ لیکن کس قدر عام فہم اور دلکش طریقہ اختیار کیا اور ایسا پیرایہ اختیار کیا جو سہلِ ممتنع ہے اور فائدہ وہی سب کچھ حاصل ہو رہا ہے جو برہانِ تمانع سے کام لے کر فنی زبان استعمال کرنے کا ہوتا ہے۔

۲- فنِ بحث و مناظر کی ایک اصطلاح "قول بالموجب" ہے۔ جس کی حقیقت یہ ہے کہ فریقِ مخالف کے کلام کو اسی کے فحوائے گفتگو سے رد کر دیا جائے۔ مثلاً قرآن حکیم نے منافقین کے ایک قول کی حکایت اس طرح بیان کی ہے۔

"...منافقین کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینہ پہنچے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے، حالانکہ عزت خدا کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے ہے لیکن منافق نہیں جانتے۔"

منافقین نے اپنے اس جملہ میں "اعز" اپنے گروہ کے لیے اور "اذل" کا لفظ مومنین کے لیے بطور کنایہ استعمال کر کے اپنی جماعت کے لیے یہ بات کہی تھی کہ وہ مومنین کو مدینہ سے نکال دیں گے۔ اس کی تردید میں صفتِ عزت منافقین کے برعکس مومنین کی جماعت کے لیے ثابت کی گئی۔ گویا یوں کہا گیا کہ ٹھیک ہے۔ معزز لوگ ضرور وہاں سے ذلیل لوگوں کو باہر نکال دیں گے۔ مگر وہ ذلیل اور نکالے ہوئے لوگ خود منافقین ہوں گے اور اللہ اور اس کا رسول اور مومنین وہ معززین ہیں جو نکالنے والے ہوں گے۔

۳- فنِ مباحثہ کی ایک اصطلاح "تسلیم" بھی ہے۔ یعنی امرِ محال کو فرض کر لیا جائے، خواہ منفی بنا کر یا مشروط کر کے مثلاً آیت "اللہ نے کسی کو نہ تو اپنا بیٹا بنایا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا، اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے" (القرآن)

مطلب یہ کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اللہ واحد کے علاوہ اس کا کوئی اور شریک بھی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ہر خالق و صانع اپنی اپنی مخلوق کو الگ کر لے اور ہر ایک دوسرے پر برتری و غلبہ چاہے اور پھر دنیا میں کوئی امر اور کوئی حکم نافذ نہ ہو سکے۔ حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ نہایت نظم و ترتیب اور نہایت ہی ہم آہنگی کے ساتھ نظامِ کائنات کارفرما ہے۔ لہٰذا چونکہ دو یا اس سے زیادہ الٰہ کے فرض کر لینے سے فرضِ محال لازم آتا ہے اور یہ فرضِ محال تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے وقوع کا مفروضہ ایک عبث و بے فائدہ

ہوگا۔ اس لیے اِسے فرض کرنا ہی محال ہے

۴۔ فنِ مباحثہ کی ایک اور اصطلاح "انتقال" ہے یعنی ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف رجوع۔ اس کی مثال وہ حجتِ ابراہیمی ہے جس کی حکایت قرآن مجید نے کی ہے۔ اور جس سے منجملہ اور تعلیم کے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ دعوتِ حق کی راہ فلسفیانہ موشگافی کی راہ نہیں ہے۔ اس لیے داعی حق کے مکالمے کو منطقیانہ رد و قدح سے نہیں بلکہ حکمت اور موعظۂ حسنہ اور جدال احسن کی جلوہ سامانیوں سے معمور ہونا چاہیے۔

یہ حجت ابراہیمی وہ مکالمہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے اور نمرود کے درمیان ہوا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے مقابلے میں نمرود کا جواب ظاہر ہے کہ نہایت نامعقول اور انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ اس نے حضرت ابراہیمؑ کے استدلال میں ذکر کردہ الفاظ "احیا" (جلانا)، اور "اماتت" (مار ڈالنا) کا یا تو مفہوم و مدعا ہی نہیں سمجھا یا سمجھ کر رکیک تاویل اور سطحی مغالطہ کا سہارا لینا چاہا۔

نمرود کی اس کج فہمی اور سفیہانہ جواب پر ایک مناظر اُسے اس طرح آڑے ہاتھوں لے سکتا تھا کہ اس کا ناطقہ بند ہو جاتا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ ایک داعیٔ حق تھے۔ کوئی مناظر نہ تھے۔ ان کی راہ دعوت و تلقین کی راہ تھی نہ کہ جدل و خصومت کی، اور داعی کے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ اپنے مخاطب کے دل میں کسی طرح حق اتار دے، نہ یہ کہ اُسے بحث و نزاع میں سراسیمہ کر کے چھوڑ دے۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ اُن کے طرزِ استدلال اور روحِ احتجاج کو نمرود کا دماغ ہضم نہ کر سکا تو وہ اپنی دلیل پر اڑے نہ رہے بلکہ فوراً دوسری بات پیش کر دی کہ اچھا اگر تیری قدرت و اختیار کی وسعت ایسی ہی ہے تو اللہ جو میرا رب ہے، سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اس کو مغرب سے نکال کر دکھا۔"

تیر نشانے پر لگا "فبہت الذی کفر" وہ نمرود جس نے کفر و سرکشی کی روش اختیار کی تھی، یہ جواب سُن کر مبہوت و ششدر رہ گیا۔

اس طرح ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف رجوع کر کے حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کو حقیقت رب سمجھائی۔ یہ چند مثالیں بطور نمونہ آپ کے سامنے رکھی گئی ہیں۔ ورنہ استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے تو بحث و استدلال کے تقریباً سارے انواع اپنی اصلیت اور حقیقت کے لحاظ سے قرآن میں موجود ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے بحث برائے بحث اور اس کا مخاطب چونکہ مقصود قرآن نہیں اس لیے پیرایہ بیان اور طرزِ استدلال کلامی نہیں ہے۔ بلکہ خطیبانہ ہے اور نہایت موثر ہے۔

بحث و استدلال کی تمام انواع کو اپنے دامن میں رکھنے کے باوجود قرآن کا متکلمین کے طرز و ادا اختیار نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کریم رہتی دنیا تک کے لیے ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب کہ بحث و استدلال کا فن ہر زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ ایک زمانے میں جس قسم کا علمی ذوق ہوتا ہے اور گفتگو کے جیسے کچھ انداز چلن ہوتا ہے دوسرے زمانے میں وہ بدل جاتا ہے۔ یونانی فلسفے کے عروج کے زمانے میں جو پیرایہ استدلال تھا آج وہ نہیں ہے۔ آج کا جو طرزِ استدلال اور طریقۂ حجت ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ گردشِ زمانہ اُسے کب بدل دے اور کونسا پیرایۂ بیان اور طرزِ استدلال دورِ حاضر کے طرزِ استدلال کی جگہ لے لے۔ آج اذہان و قلوب پر اثر ڈالنے کے لیے سائنٹفک طریقہ استعمال کیا جاتا ہے، یہ سائنٹفک طریقہ یونانی فلسفہ کے طریقے سے قطعی مختلف ہے۔ لیکن قرآن کے طرز استدلال کی یہ خوبی بلکہ صحیح تر لفظوں میں معجزانہ شان ہے، اور جو بجائے

خود قرآن کے الہامی ہونے کی ایک دلیل ہے کہ رہتی دنیا تک ہر دور کی، ہر ذہنی سطح اس سے مستفید اور متاثر ہو سکتی ہے اور ہر زمانے کا اندازِ استدلال اگر اسے زبان مل جائے تو بے اختیار بول اُٹھے کہ :

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چنانچہ قرآن کا طرزِ استدلال اپنے اندر سائنٹفک طریقۂ استدلال کے سارے لوازم اور ساری بنیادیں بھی رکھتا ہے اور آج کا انسان بھی قرآن کے پیرایۂ بیان اور طریقۂ استدلال سے اسی طرح متاثر اور مطمئن ہو سکتا ہے جس طرح قدیم زمانے کا ذہن متاثر اور مطمئن ہو سکتا تھا۔ اسے اگر آپ سمجھنا چاہیں تو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ہر زمانے کا انسان اپنے ذہن و فکر کے مراتب کے لحاظ سے چند طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ نہایت ذہین اور طباع لوگ جن کے لیے اشارات و کنایات کافی ہوتے ہیں اور جو محض اجمالی اور اشاراتی طریقہ سے بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں انھیں حقیقت تک پہنچنے کے لیے توضیحات و تفصیلات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن میں ایسے اذہان کی ہدایت کے لیے اجمالی اور اشاراتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ سورہ العصر اس کی بہترین مثال ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور جس کی وسعت معانی تک **رسائی** زیرک اور ذکی انسان کی ہو سکتی ہے اور وہی **اس سے کما حقہٗ** فائدہ اور حقیقی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

۲۔ وہ لوگ جو اپنے ذہن و دماغ کے لحاظ سے بلند تو کہے جا سکتے ہیں مگر اتنے نہیں جتنے پہلے طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے معتدل طریقۂ تعلیم اختیار کیا جاتا ہے یعنی بات کو قدرے وضاحت اور تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔

۳۔ ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جس کی ذہنی سطح ایسی ہوتی ہے کہ اس کے لیے نہ صرف یہ کہ اشارات و کنایات ناکافی ہوتے ہیں بلکہ بات کو پوری وضاحت کے ساتھ بھی رکھ دیا جائے تو بھی وہ حقیقت کو نہیں پاتا۔ ایسے طبقے کے لیے محسوس و مشاہد طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایسے قلوب کو متاثر اور مطمئن کرنے کے لیے جو طریقۂ استدلال اختیار کیا گیا ہے اسے تمثیلی طریقہ سے تعبیر کر سکتے۔ چنانچہ امثال القرآن اس لیے ہیں کہ ان سے ایسے لوگ فائدہ اٹھائیں مثلاً قرآن میں انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق ایک مثال یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کی مثال اس بیج کی سی ہے جسے زمین میں بویا جاتا ہے کہ جب اس کو بویا گیا وہ محض ایک دانہ تھا لیکن بار آور ہوا تو ایک دانے سے سات بالیں نکل آئیں اور ہر بال سے سو دانے نکل آتے۔ اس طرح اس کے ذہن میں یہ بات راسخ کی گئی کہ دینی مطالبات اور ملی تقاضوں کی تکمیل کی خاطر ایک پیسے کا خرچ بھی اپنے اندر کتنی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے ثمرات و نتائج کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ اور اس کا وہ ایک پیسہ اس کے حق میں کتنا بڑا سرمایہ بنے گا۔

کچھ لوگوں کا ذہن تاریخی قسم کا ہوتا ہے یعنی وہ واقعات سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی ہدایت اور اطمینان و انشراح صدر کے لیے قصص القرآن کا حصہ ہے۔ پھر یہی قصص القرآن ہیں جو استقرائی طریقۂ استدلال کا کام دیتے ہیں، اور آجکل قدیم منطق کی جگہ جس منطق نے لی ہے اس کا نام استقرائی منطق ہے۔

اس استقرائی طریقے کی مختصر توضیح یہ ہے کہ قرآن نے مختلف سورتوں میں مختلف انبیا کی دعوتِ حق کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے رد و انکار کے نتائج بیان کیے ہیں۔ اس طریقۂ استشہاد سے مخاطبین کے ذہن میں یہ بات بٹھانا

مقصود ہے کہ ہر زمانے میں دعوتِ حق کے قبول و انکار کے ردِ عمل کے طور پر یہ عواقب و نتائج ہیں تو قرآنی دعوت کے رد و قبول کے بھی یہی نتائج نکلیں گے گویا قرآن اپنی صداقت میں استقرائی طریقۂ استدلال سے کام لیتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ تم سارے داعیانِ حق کو دیکھ جاؤ، ان کی دعوت کو دیکھ جاؤ۔ سب کی زندگیوں میں یکسانیت نظر آئیگی سب کی دعوت بھی ایک رہی ہے۔ سب کی دعوت قبول کرنے والوں کے ساتھ معاندین نے یکساں معاملات کیے ہیں۔ سب کی دعوت کو رد کر دینے والوں کے سامنے نتائج ایک ہی قسم کے آئے ہیں۔ یہ یکسانیت، یہ تسلسل، یہ غیر منقطع اعادہ اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ یہ اللہ کی سنت ہے جو ہمیشہ سے ایک ہی طرح کارفرما رہی ہے۔ لہذا آج قرآن کے ساتھ اور رسول کی دعوت کے ساتھ رسول اور اُن کے ماننے والوں کے ساتھ جو طرزِ عمل انسان اختیار کریں گے، نتائج و عواقب ایسے ہی نکلیں گے جیسے ہمیشہ نکلتے آئے ہیں یعنی قبول کرنے والوں کی فلاح اور انکار کرنے والوں کے لیے خسران۔ دوسری طرف ان قصص القرآن کا روئے سخن مسلمانوں کی طرف بھی ہے اور انھیں گویا متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا کہ تم اس سنت اللہ کی کارفرمائیوں سے مستثنیٰ رہ جاؤ گے۔

"یہ ہماری سنت ہے جسے ان سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنھیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا اور ہماری سنت میں تم کبھی تغیر نہ پاؤ گے" (القرآن)

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے اذہان و قلوب کی عبرت و بصیرت کے سامان سیر و سیاحت میں ہوا کرتے ہیں۔ خدا سے سرکش قوموں کی بستیوں کے وہ کھنڈر جو زبانِ حال سے اپنی بپتا سنا رہے ہیں یا آثارِ قدیمہ کی کھدائی اور انکشافات کے ذریعے ان کے دلوں پر دستک دی جا سکتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اقطارِ عالم میں جا کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ مجرمین کو کن حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اور انھیں ان کے انکار و اعتراض کے عمل نے کیسے روزِ بد دکھائے۔

"تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں تو زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ہدایاتِ ربانی کی تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا"
(القرآن)

"تو پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا۔ اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔" (القرآن)

"کہو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ ان مجرمین کا کیا انجام ہو چکا ہے"
(القرآن)

قرآن کے ان اسالیب استدلال سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن سائنس اور دوسرے علوم جدیدہ کو شجرِ ممنوعہ قرار نہیں دیتا۔ زمانہ کا ہر علم، وقت کا ہر فن اور عروج و ارتقا کی ہر حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے، جو اسے جہاں پائے حاصل کر لے۔ بلکہ کائنات کا ہر خزانہ اور دنیا کا ہر سرمایہ انسان ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اور اس کے خالق و مالک کے نام لیوا دوسروں کی بہ نسبت اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ اُن سے فائدہ اٹھائیں لیکن فرق ہے اور بہت بڑا فرق ہے۔ ان سرمایوں اور حکمتوں کے حصول ہی کو زندگی کا نصب العین بنا

لینے میں اور اُن کو خدا کی زمین پر اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے وسائل کے نقطۂ نظر سے حاصل کرنے میں جس طرح فرق ہے۔ چراغ سے راستہ دیکھنے کا فائدہ اٹھانے اور چراغ پر پروانوں کی طرح نچھاور ہونے میں۔ فزکس ہو یا کیمسٹری۔ زوالوجی ہو یا جیالوجی، کوئی علم ہو اور کوئی فن ہو آپ اُسے بشوق حاصل کریں۔ بلکہ آپ کو ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن ان علوم و فنون سے فلسفۂ الحاد کی نری تقلید میں اگر آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ دنیا کا یہ سارا کارخانہ اور یہ نظامِ کائنات ایک اندھی فطرت، بے جان مادہ اور بے حس الکٹرون کی خاصیتیں اور کرشمہ سازیاں ہیں تو یہ آپ کے لیے وہ "روشنی طبع" قرار پائے گی جو انسان کے حق میں "بلا" ثابت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر آپ نے ان علوم و فنون سے حاصل کردہ اپنی معلومات کو کام میں لا کر یہ غیر معلوم حقیقت پالی کہ آپ کا یعنی انسان کا فرضِ منصبی کیا ہے اور وہ کیوں ہے؟ تو پھر ان تمام علوم کی بدولت آپ کے حق میں آسمان اپنی برکتیں نازل کرے گا اور زمین اپنے خزانے اگل دے گی۔



سقیفہ بنی ساعدہ۔ جہاں ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر صحابہؓ نے خلافت کی بیعت کی

قرآن کی اثر انگیزی

صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں

محمد کلیم

حرم میں سردارانِ قریش کی محفل جمی ہے۔ عتبہ ابوجہل ابوسفیان جیسے اکابر شریک ہیں۔ البتہ عام دنوں کی طرح مسرت وشادمانی کے بجائے ان کے چہروں سے پریشانی اور تردد کے آثار نمایاں ہیں۔ گفتگو کا موضوع نہ تجارت ہے نہ جنگ اور نہ انتقام۔ بس "محمدؐ" ہے — ان کی دعوت' ان کی تبلیغ۔ ان کے ساتھی' نئے دین کو ماننے والے' اپنے آباؤاجداد کے مذہب کے باغی! وہ سوچتے ہیں کہ ان کو دبانے کے لیے ہم نے کیا کچھ نہ کیا؟ نئے دین سے پھیرنے کے لیے کیسی کچھ کوششیں نہ کرلیں! اور دھونس دھاندلی کا کون سا حربہ ایسا ہے جو ہم آزما نہیں چکے۔ ظلم وزیادتی کی ہر تدبیر آزما کر دیکھ لی۔ مگر کیا مجال کہ وہ دیوانہ ہوش میں آئے۔ اس کی لگائی ہوئی آگ بڑھتی ہی جارہی ہے جو ایک دفعہ اس کا ہوجاتا ہے کسی طرح "ہمارا" نہیں بنتا۔ اب تو اس کو سیدھی راہ دکھانے کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔ اسے لالچ کے دام میں پھانسا جائے "سبز باغ" دکھائے جائیں کیونکہ یہ ترکیب بھی بڑی مؤثر ہوتی ہے۔ بڑے بڑوں کے پیر پھسل جاتے ہیں۔ دولت' عزت' عورت' شہرت' آرام وآسائش کون نہیں چاہتا اور یہ سب کچھ بڑی مشکل سے ملا کرتا ہے لیکن کسی کی جھولی میں بلامحنت آپڑے تو! "ہاں یہ ترکیب ٹھیک ہے" عتبہ نے کہا "اچھا میں جاتا ہوں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ذرا دور گوشہ میں ہمارے سامنے تو بیٹھے ہیں۔ ان سے بات کرتا ہوں"۔ سب کو اطمینان تھا۔ عتبہ معمولی آدمی نہیں۔ چرب زبان' فصیح اللسان' ذہین وطباع۔ اس میدان میں اس کے حریف کم ہیں۔ ذرا دیر میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زیر کر دیگا۔ سب نے کہا "ہاں ہاں جاؤ۔ تم ہمارے نمائندے ہو"۔ عتبہ لپکا لپکا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آیا اور کہا "محمدؐ ایک بات تو سنو! تم کیا چاہتے ہو؟ مکہ کی ریاست؟ نہیں! تو کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی کے طلبگار ہو؟ اچھا دولت کا ڈھیر چاہیے؟ یقین مانو ہمیں تم سے بڑی ہمدردی ہے اگر یہ کچھ نہیں چاہتے تو ضرور تم پر جن

کا سایہ ہے لیکن ہم اس کا علاج بھی کرا سکتے ہیں۔ پھر تم جلد اچھے ہوجاؤ گے اور چلو ہم اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ پر تم حکمرانی کرو' بس جس چیز پر تم ہاں کر دو گے ہم اسے ضرور مہیا کردیں گے"۔

اب نبی پاک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا "عتبہ تم اپنی کہہ چکے؟"

وہ بولا "ہاں"

"اچھا میری سنو میں کیا سناتا ہوں"! حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا اور ان آیات کی تلاوت کی:۔

"حآمٓ۔ یہ بڑی مہربان اور رحم والی ہستی کی طرف سے بھیجی گئی ہے۔ یہ ایک نوشتہ ہے جس کی ایک ایک آیت نکھری ہوئی ہے۔ یہ قرآن ہے عربی زبان میں سمجھ بوجھ سے کام لینے والوں کے لیے (ایمان لانے والوں کو) بشارت سنانے والا اور (انکار کرنے والوں کو) تنبیہ دلانے والا' پس ان (اہل مکہ) میں سے اکثریت نے اس سے روگردانی کی اور سن کر نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ ہمارے دل اس حقیقت کے مخالف ہیں جس کی طرف تم بلاتے ہو اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان ایک روک حائل ہے سو تم اپنی جگہ کام کرو۔ ہم اپنی جگہ کام کرتے ہیں" (حمٓ السجدہ آیت ۱ تا ۵)

خدا کا رسول اسی طرح تلاوت کرتا رہا۔ عتبہ اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکائے غور سے سن رہا تھا۔ اتنے میں آیت سجدہ آئی تو آپ نے سجدہ کیا۔ پھر سر اٹھا کر کہا "ابوالولید! میرا جواب تم نے سن لیا؟ اب تم جانو اور تمہارا کام"

بیچارا عتبہ جو طلاقت لسانی کے زعم میں حضورؐ کو "فتح" کرنے آیا تھا خود "زیر" ہوگیا۔ منہ سادھے سردارانِ قریش کی طرف واپس ہوا تو اُسے دیکھتے ہی وہ سب بول پڑے ..... "خدا کی قسم عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لیکر گیا تھا"۔ انہوں نے اس سے پوچھا "کیا سن آئے؟" عتبہ نے کہا "بخدا میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم نہ یہ شعر ہے نہ سحر ہے' نہ کہانت' اے سردارانِ قریش! میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام رنگ لاکر رہے گا۔ فرض کرو اگر عرب اس پر غالب آگئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے لیکن اگر وہ عرب پر غالب آگیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی اور اسکی عزت تمہاری عزت ہوگی" عتبہ کی یہ باتیں بالکل سیدھی سادی تھیں مگر وہ سردارانِ قریش بھلا کاہے کو ماننے والے تھے۔ کہنے لگے "لو بھئی۔ اس کا جادو اس پر بھی چل گیا"۔[1]

عتبہ کی اپنے مشن میں ناکامی کوئی معمولی بات نہ تھی یہ قریش کی ناکامی تھی۔ سردارانِ باطل کی شکست تھی' کافروں کی ہار تھی۔ ذرا غور کیجئے آخر ہوا کیا؟ عتبہ کس رنگ میں رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس گیا تھا اور پھر اس کا وہ رنگ کیسے اڑ گیا۔ آپؐ نے کیا کیا تھا؟ عتبہ کی پیش کش پر کوئی لمبی چوڑی تقریر آپؐ نے نہ کی۔ جادوگر آپ یقیناً نہ تھے کہ کچھ منتر پڑھ کر پھونک دیا ہو' کوئی رعب نہیں ڈالا' کوئی دھونس نہیں جمائی' کسی بڑائی کا اظہار نہیں کیا' بس کچھ بول سنا دیئے۔ بہت میٹھے بول' جن میں معنی کی گہرائی اور مقصد کی بلندی تھی۔ وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اُترتے چلے گئے۔ یوں دل کی دنیا بدلی تو

---

[1] ابن ہشام جلد اول ص ۳۱۳-۳۱۴

چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔

بات صاف ہے یہ سب کچھ ان کلمات کا ہی کرشمہ تھا جو عتبہ نے سنے تھے۔ کلام ـــــ شاہوں کے شہنشاہ کا کلام ـــــ اہل دنیا کے جادو سے بہت مختلف ـــــ لیکن دل و دماغ کی کایا پلٹ دینے والا کلام! اس میں وہ مقناطیست ہے جو دلوں کو کھینچتی ہے اس میں وہ کیف ہے کہ سن کر آدمی تو آدمی شجر و حجر بھی جھومنے لگتے ہیں۔ وہ حلاوت ہے جو دل کے سارے تار جوڑ دیتی ہے وہ نغمہ ہے جو روح کو سرشار کر دیتا ہے وہ آگ ہے جو اندرون کی تاریک دنیا کو منور کر دیتی ہے وہ طاقت ہے جو ایک نئے انسان کو جنم دیتی ہے۔

لیکن کلام اللہ کی اثر آفرینی کی یہ منفرد مثال نہیں ہے۔ بے شمار واقعات سے تاریخ لبریز ہے جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام ایسا ہے کہ اس کو سمجھنے والے تو اس کو سن کر متاثر ہوتے ہی ہیں نہ سمجھنے والے بھی اس سے اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس بات کی ہم چند شہادتیں اور سامنے لائیں گے۔ [1]

(۲)

عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) قریش کا جوشیلا اور بانکا نوجوان جس مجلس میں پہنچ جاتا سب سے ممتاز رہتا۔ جس کی شجاعت، زور آوری، شہسواری، تیر اندازی اور بہادری کے ڈنکے پورے مکہ میں بجتے تھے جو جسم اور دل دونوں کا مضبوط تھا۔ لیکن جو واقعہ ہم سنا رہے ہیں وہ اس زمانہ کا ہے جب اسلام اس کو مسخر نہ کر سکا تھا محمد اور اہلِ ایمان کا وہ بھی اتنا ہی مخالف تھا جتنے دوسرے کافر تھے بلکہ اُن سے بھی کچھ زیادہ۔ ایک شب یہی عمر نبیٔ پاکؐ کو ستانے کی غرض سے نکلے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں نماز پڑھ رہے تھے اور سورۃ الحاقہ کی آیات آپ کی زبانِ مبارک سے ادا ہو رہی تھیں۔ جب عمر پہنچے تو دور ہی سے کان میں قرآن کی آیتیں پڑ گئیں۔ بجائے ستانے اور چھیڑنے کے قرآن کے نظم اور اسلوب سے متاثر ہو کر متحیر کھڑے رہ گئے اور دل میں کہنے لگے خدا کی قسم یہ شاعر ہے جیسا کہ قریش کہا کرتے تھے۔ ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

"یہ ایک بزرگ قاصد کا کلام ہے اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔ تم سب کم ایمان رکھتے ہو"

جب اس بات کی تردید ہو گئی تو دل نے کہا یقیناً یہ کاہن ہے لیکن پھر یہ آیت سُنی:

"یہ کاہن کا کلام بھی نہیں۔ تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔ یہ تو جہانوں کے پروردگار کی طرف سے اُترا ہے"۔

دل پر ایک چوٹ لگی وہ اسلام کی حقانیت اور صداقت کی چوٹ تھی۔ البتہ مستقل مزاجی اور پختہ کاری نے اس چوٹ کو دبائے رکھا لیکن آخر کب تک؟ ایک دن جی میں کیا آئی کہ سوچا چلو قصہ پاک کر دوں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بھی۔ اس ارادے سے گھر سے نکلے تو عجب اتفاق پیش آیا۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید بھی اسلام لے آئے۔ یہ خبر بجلی بن کر گری۔ اسی غصہ کے عالم میں بہن کے گھر پہنچے اور ان دونوں کو اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا گیا ـــــ کہاں تو یہ شقی القلبی تھی اور کہاں جب غصہ فرو ہوا اور ان سے قرآن لیکر

[1] سیرۃ النبی جلد سوم ص (۶۳۷-۶۳۸)

سورہ طٰہٰ کی ان آیتوں کو پڑھا:

"طٰہٰ۔ ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔ نازل کیا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا کیا ہے زمین کو اور بلند آسمانوں کو، وہ رحمان (کائنات کے) تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہے۔ مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمان اور زمین میں ہیں اور جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں اور جو مٹی کے نیچے ہیں، تم چاہے اپنی بات پکار کر کہو یا چپکے سے وہ کہی ہوئی بات بلکہ اس سے مخفی تر بات بھی جانتا ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، اس کے لیے بہترین نام ہیں.........." الخ

پڑھتے ہی جیسے موم ہو گئے، ساری شقاوت و کثافت دھل گئی اور یوں دامنِ اسلام میں آگرے جیسے پکا پھل ٹوٹ کر گود میں آجاتا ہے کلامِ الٰہی سنتے ہیں تو چیخ پڑتے ہیں اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتے ہیں اور سیلابِ اشک سے دل میں کفر کی جو بھٹی دہک رہی تھی سرد پڑ جاتی ہے۔ قلب نورِ ایمان سے منور ہو جاتا ہے اور سیدھے آستانۂ نبوت پر جا کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے ہیں۔

(۳)

طفیل دوسی اپنے قبیلہ کے سربرآوردہ شخص تھے۔ شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ نئے دین کا شہرہ سُنا تو تماشہ دیکھنے مکہ چلے آئے۔ مکہ پہنچے تو وہاں کے لوگ چمٹ گئے اور کہنے لگے،

"تم ہمارے شہر میں مہمان آئے ہو اس لیے آگاہ کیے دیتے ہیں کہ اس شخص نے ہماری جماعت میں پھوٹ ڈال کر ہمارا شیرازہ منتشر کر دیا ہے اور ہم لوگوں کو بہت تنگ کر رکھا ہے نہ معلوم اس کی زبان میں کیا جادو ہے جس کے ذریعہ بیٹے کو باپ سے، بھائی کو بھائی سے، بیوی کو شوہر سے چھڑا دیتا ہے۔ ہم کو خوف ہے کہ کہیں تم اور تمہاری قوم ہم لوگوں کی طرح اس کے دام میں نہ آجائے اس لیے تم اس سے نہ ملو اور نہ اس کی بات سنو۔ پہلے تو یہ قریش کی باتوں میں آگئے اور کان میں روئی ٹھونسے پھرتے تھے کہ مبادا محمدؐ کی آواز کانوں میں پڑ جائے اس حالت میں ایک دن مسجدِ حرام کی طرف سے گزرے اس وقت آپؐ خانۂ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ کچھ آیتیں کانوں میں پڑ گئیں۔ جی نہ مانا۔ سوچا "ذرا سنو تو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھتے کیا ہیں۔ کلام کے معائب و محاسن تو میں بھی خوب سمجھتا ہوں، فوراً پتہ چل جائے گا کہ کیسا کلام ہے۔ قریب کھڑے ہو کر کلام سنا تو مبہوت ہو کر رہ گئے۔ قرآن کے الفاظ کیا تھے، بجلیاں تھیں، جنہوں نے دل کے خرمنِ کفر کو بھسم کر کے رکھ دیا تھا۔ جلوۂ حیران سے آنکھ ہٹی تو دیکھا حضورؐ نماز ختم کر کے جا رہے ہیں، یہ بھی ساتھ ہو لیے آپ کے ساتھ آپ کی قیام گاہ تک پہنچے اور اپنے آپکو دامنِ اسلام میں گرا دیا ـــــ بعد کو خود کہا کرتے تھے کہ ـــــ "خدا کی قسم آج تک اس سے بہتر کلام نہ میرے کانوں نے سنا اور نہ اس سے زیادہ عادلانہ مذہب کوئی دیکھا"۔ [1]

(۴)

ولید بن مغیرہ کے بارے میں قریش نے بہت چاہا کہ یہ اہم شخصیت کہیں اس کلام معجز نما کا شکار نہ ہو جائے، ان کو سو طرح سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر ولید کا حال یہ تھا کہ ایک دفعہ آواز سنی تو جیسے شعلہ سا لپک گیا قرآن

[1] مہاجرین حصہ دوم مصنفہ شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۲۲۱

کے اسیر بن گئے۔ لوگوں نے کہا مغیرہ یہ کیا ہوا؟ وہ کہنے لگے اس کلام نے دل موہ لیا۔ یہ انسانی کلام نہیں اس کی بات خوبصورت اور اس کا انداز دل نشین ہے وہ اس بار آور درخت کی طرح ہے جس کے اوپر کا حصہ پھل دیتا ہے اور زیریں حصہ گہرا ہوتا ہے یہ غالب ہوگا اور ہرگز مغلوب نہ ہوگا جو اس سے ٹکرائے گا پاش پاش ہو جائے گا۔[1]

(۵)

جبیر ابن مطعم ایک سلیم الطبع اور ہر ظالمانہ اقدام کے خلاف آواز اٹھانے والے شخص تھے۔ ان کے باپ بھی نرم دل اور نیک طینت آدمی تھے ان سب باتوں کے باوجود عصبیتِ جاہلیت قبولِ حق سے مانع تھی۔ جبیر جنگِ بدر کے بعد اپنے قیدی کو چھڑانے کے لیے مدینہ حضورؐ کے پاس پہنچے تو اتفاق سے آپ نماز میں مصروف تھے اور سورۂ طور کی یہ آیات تلاوت فرما رہے تھے:

"طور کی قسم۔ اس کتاب کی قسم جو لکھی ہے کشادہ اوراق میں اور آباد گھروں کی قسم اور اونچی چھت کی قسم اور اُبلتے ہوئے دریاؤں کی قسم بے شک تمہارے پروردگار کا عذاب آکے رہے گا اور اس وقت اسے کوئی نہ ٹال سکے گا۔"

جبیر بھی پاس کھڑے ہو کر سننے لگے۔ تھوڑی دیر میں انہیں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے بقول ان کے "میرا قلب پھٹ جائے گا" اور جب آپ نے آخری آیت اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهُ مِن دَافِعٍ کی تلاوت فرمائی تو ان پر کپکپی طاری ہوگئی اور خوف ہوا کہ کہیں اسی وقت

حضرت جبیر بن مطعمؓ کا قبولِ اسلام، ذیل کی آیت محرک بنی!

اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَل لَّا يُوقِنُونَ

اَمْ عِندَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُونَ

کیا یہ خود بخود پیدا ہو گئے! یا یہ لوگ خود پیدا کرنے والے ہیں! کیا آسمان و زمین کو انہی لوگوں نے پیدا کیا ہے! اصل یہ ہے کہ ان کے دل میں ایمان نہیں۔ کیا خدا کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں! کیا یہ لوگ کارپرداز ہیں!

(بخاری۔ کتاب التفسیر تفسیر سورۂ طور)

اللہ کا عذاب نازل نہ ہو جائے اس کے بعد یہ ایمان لے آئے۔[2]

(۶)

"حضرت عثمانؓ ابن مظعون جو پہلے ہی سے سادہ طبیعت، نیک نفس اور پاک باز تھے۔ دل گداز رکھتے تھے انہوں نے جب یہ آیت سنی:۔

"خدا عدل، احسان اور قرابت مندوں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور بدکاری برائی اور ظلم سے روکتا ہے اور وہ نصیحتیں اس لیے کرتا ہے کہ شاید تم اس کو قبول کرو۔" (النحل۔ ۱۲)

---

[1] اتقان۔ سیوطی، ج ۲ ص ۱۱۷

[2] اعجاز القرآن۔ باقلانی ص ۲۷

تو یہ اثر ہوا کہ ان کے اپنے الفاظ میں:

"یہی وہ وقت ہے جب ایمان میرے قلب میں جاگزین ہوا اور میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے لگا۔"[1]

(۷)

سفرِ طائف کے موقع پر خالد العدوانی نے جب آپ کی زبانِ مبارک سے قرآن کے یہ الفاظ سنے وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (آسمان کی قسم اور رات میں آنیوالے کی قسم) تو فوراً پوری سورہ یاد کر لی اور مسلمان ہو گئے۔[2]

غرض یہ تو نمونے کے چند واقعات ہیں ورنہ صحابہؓ کی جماعت کی جماعت کو قرآن حکیم ہی نے اپنی طرف کھینچا تھا اور قرآنِ حکیم کی کشش میں قرآن پیش کرنے والے کی کشش قدرتی طور پر شامل تھی کیونکہ اس کا کردار بھی تو آئینہ دارِ قرآن تھا۔

کفّار کو خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ قرآن اپنے اندر کس بلا کی تاثیر رکھتا ہے اور اس کو سنانے والا کس پائے کا انسان ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا طرزِ ادا کس درجہ مؤثر ہے وہ سمجھتے تھے کہ ایسے عالی مرتبہ شخص کی زبان سے اس دلکش انداز میں اس بے نظیر کلام کو جو سنے گا وہ بالآخر گھائل ہو کر ہی رہے گا۔ اس لیے وہ اپنے بچوں اور عورتوں تک کو قرآن سننے سے روکتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو عبادت کرنے کی اجازت صرف اس شرط پر دی تھی کہ وہ قرآن باوازِ بلند نہ پڑھا کریں۔ کفار لوگوں سے کہتے تھے کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن سنائیں تو تم خوب شور مچایا کرو، تالی پیٹا کرو، اعتراضات کی بوچھاڑ کیا کرو اور آواز اتنی بلند کر لیا کرو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز دب جائے۔ اس تدبیر سے وہ نادان یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے نبی کو شکست ہو جائے گی۔

"یہ منکرین کہتے ہیں اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو۔ شاید کہ تم اس طرح غالب آجاؤ۔" (حٰم السجدہ۔ ۲۶)

کلام اللہ کی اس تاثیر کو خود قرآن نے ایک تمثیل میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر ہم قرآن کو پہاڑ جیسی سخت چیز پر بھی اتارتے تو خشیتِ الٰہی سے پھٹ کر پارہ پارہ ہو جاتا۔

لَوْ اَنزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۚ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (الحشر۔ ۲۱)

"اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو اُسے تو ضرور دیکھتا جھکا ہوا اور پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے اور یہ مثالیں لوگوں کے لیے ہم بیان فرماتے ہیں کہ وہ سوچیں۔"

البتہ اس کا اثر وہی لوگ قبول کرتے ہیں جن کے پاس سوچنے والا دماغ، سمجھنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھیں موجود ہوں۔ اسی طرح جس طرح روشنی میں صرف وہ آنکھیں ہی دیکھتی ہیں جن میں بینائی موجود ہو۔ اگر آنکھ ہی بینا نہ ہو تو آفتاب کی روشنی بھی چراغِ راہ نہیں بن سکتی!

---

[1] اسوۂ صحابہ جلد اول شاہ معین الدین ندوی ص (۲۵)

[2] ص (۲۵-۲۶)

قرآن کی اساسی تعلیمات

ادارہ

قرآن نے اخلاقی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے متعلق جو بھی ہدایات دی ہیں، وہ صرف ان لوگوں کے لیے کارآمد ہیں، جنہوں نے اس کی اساسی تعلیمات کو جذب کر لیا ہو۔ یہ گویا بنیادیں ہیں جن پر قرآن کی تجویز کردہ اسلامی زندگی کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

۱۔ فوق المادی نقطۂ نظر

قرآن وہ آفتابِ ہدایت ہے جس کی شعاعیں کسی ایسی شخصیت کے خانۂ دل میں داخل ہی نہیں ہو سکتیں جس نے مادہ پرستانہ تصورات کے کواڑوں سے روح کے دروازے بند کر رکھے ہوں۔ وہ شخص نہایت درجہ پست اور محدود ذہنیت کا شکار ہے جس نے حقیقت اور علم کو حواسِ خمسہ کے احاطے تک محدود سمجھ رکھا ہو۔ قرآن کا نہ صرف علمِ حقائق، بلکہ اس کا سارا نظامِ اخلاق و تمدن اور سلسلۂ سیاست و معیشت مادہ پرست ذہنیت کے ساتھ ناسازگاری رکھتا ہے۔ ایمان سے لے کر شہادت فی سبیل اللہ کی بلند ترین منزل تک بیچ میں حدودِ حلال و حرام کی پاسداری اور دوسروں کے لیے عدل و انصاف کے ساتھ ایثار و انفاق اور صبر و عفو کا مسلک صرف وہ عالی ظرف اور بلند نظر شخص اختیار کر سکتا ہے جو حقیقت کے محدود حسی تصورات کے قفس سے باہر نکل کر کھلی فضا میں پرواز کر سکتا ہو، اور جس کی نگاہ میں زندگی اسی دنیا تک محدود اور موجود جسم کی پابند نہ ہو — بلکہ اس جسم کے خاتمے اور اس دنیا کے بعد زندگی کو زمان و مکان کی عظیم تر وسعتوں میں موجودہ تجربوں سے زیادہ اہم اور وسیع تجربوں سے گذرنا ہو۔

ہم نے فوق المادی کی اصطلاح اس لیے استعمال کی ہے کہ قرآن مادی کائنات اور دنیوی زندگی اور جسمانی ضروریات سے انسان کو بے تعلق نہیں بناتا، بلکہ کائنات کی قوتوں سے کام لینے، دنیوی زندگی کو سنوارنے اور جسمانی ضروریات کو باحسن طریق پورا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ "ترکِ مادیت" کا داعی نہیں۔ بلکہ مادیت کو اخلاقی تقاضوں کے ذریعے قابو میں رکھنے اور انسان کو ان کا مرکب بننے کے بجائے ان کا راکب بننے کی دعوت دیتا ہے۔ یعنی مادی تقاضے بھی اہم ہیں مگر مادی تقاضوں سے اہم تر اخلاقی و روحانی تقاضے بھی انسان کی فلاح و بہبود کا تلازمہ ہیں۔

۲۔ ایمان

قرآن اگرچہ عقل سے کام لینے کی بار بار تلقین کرتا ہے اور اپنے دعووں پر عقلی استدلال بھی کرتا ہے، کیونکہ انسان کے پاس تلاشِ حقیقت کے لیے فانوسِ عقل کے سوا اور کوئی روشنی نہیں ہے۔ الہامی صلاحیت جو عقل کی کمی کو پورا کرتی ہے، اسے وہ عقل ہی کے ذریعے پہچان سکتا ہے، مگر وہ اپنے ماننے والوں کو جس حالت تک پہنچانا چاہتا ہے وہ محض ایک فلسفیانہ شعور نہیں ہے جس میں ظن و تخمین اور تامل و تذبذب اور بار بار کا ادل بدل کارفرما رہتا ہے۔ وہ اندھی جذباتیت اور اوہام پرستی سے بھی انسان کو بچانا چاہتا ہے۔ اس کا مطلوب حالتِ "ایمان" ہے۔ نہ محض تعقل، نہ غیر عملی تفلسف، نہ اوہام پرستی، نہ یکسر جذباتیت انسانی زندگی کو سنوار سکتی ہے۔ انسانی زندگی ہر حال میں حالتِ ایمان کی محتاج ہے۔ ایمان وہ اعلیٰ کیفیت ہے جو عقلیت۔ یقینِ محکم، اعلیٰ تر جذبات، اور بھرپور ذوقِ عمل کے ایک نقطے پر مجتمع ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایمان وہ قوت ہے جو انسان کی شخصیت کے تمام شعبوں کو ایک مقصد کے لیے متحرک کر دیتی ہے۔ ایمان سے بہرہ مند آدمی، راستی، عدل، محبت اور احسان کی قدروں سے سرشار ہو کر اپنے مسلمہ حقائق و مقاصد کے لیے شہادت علی الناس کے منصب پر فائز ہوتا ہے، پھر اپنے فرائض بے لوث ایثار کے ساتھ ادا کرتا ہے، خواہشات اور مفاد کی قربانیاں دیتا ہے، مخالفتوں کا مقابلہ کرتا ہے، ہنسی خوشی سے دکھ جھیلتا ہے، یہاں تک کہ پوری متاعِ زندگی کو قربان کر دیتا ہے۔

قرآن جن حقیقتوں کی طرف بلاتا ہے اور ان پر مبنی جس نظامِ زندگی کی دعوت دیتا ہے، ان کے لیے اس قسم کے زندہ و فعال ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔

۳۔ توحید

قرآن کی تعلیم کا اولین محور یہ ہے کہ یہ کائنات جس میں تم رہتے ہو، اس کا نظم، اس کے ضابطے، اس کا سلسلۂ علت و معلول، اس کے اجزا کا توافق، اس کا حسن و جمال، اس کے اندر ہونے والے ہر واقعہ کا کسی نہ کسی مقصد اور نتیجے پر منتہی ہونا ایسی کھلی شہادتیں ہیں کہ یہ کھربوں سالہائے نور کی وسعتیں رکھنے والی مادی دنیا ایک خالق کے خلق کرنے سے پیدا ہوئی ہے، ایک منتظم و مدبر کے حسنِ تدبیر سے چل رہی ہے، ایک آمر و حاکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔

پھر قرآن بتاتا ہے کہ تم بھی خدا کی اس سلطنتِ کائنات کے اندر خدا کی پیدا کردہ مخلوق ہو، خدا کے رزق پر پلنے والی رعیت ہو، اس کے عطا کردہ اعضا اور قوتوں کی مدد سے زندگی کے تقاضے پورے کرنے پر قادر ہوئے ہو، لہٰذا تمہارے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ تم اس کے بندے بن کر اس کی عبادت و اطاعت میں زندگی گذارو۔

قرآن بتاتا ہے کہ ایسی منظم و حسین کائنات کئی مختلف خداؤں کی موجودگی میں ایک لحظہ کے لیے نہیں چل سکتی، ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو اس کے ہر گوشے میں تصادم و فساد رونما ہو جاتا۔ پس تمہارا خدا ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عبادت بھی کرو تو اسی ایک ذ

کی، اور مدد بھی مانگو تو اسی ایک خدا سے۔

وہی ایک خدا تمہارا خالق ہے، رازق ہے، مالک ہے، حاکم ہے، جزا اور سزا دینے والا ہے۔ پس اسی ایک کو اپنا رب اور اپنا الٰہ مانو۔ اس کے ساتھ کسی دوسری قوت کی ربوبیت و الٰہیت کا پیوند نہ لگاؤ، یہ شرک ہے۔ اور اس کائنات کا مالک و حاکم اپنے مرتبے اور اپنی صفات اور اپنے حقوق میں کسی دوسرے کی شراکت کو تسلیم نہیں کرتا، اور نہ بطور امرِ واقعہ کے ایسی کوئی شراکت موجود ہے۔

خدا کی توحید کا یہ تصور ہی وہ واحد نقطہ ہے جس کے گرد دنیا کی تمام قومیں، تمام نسلیں، اپنی بولیوں اور رنگوں کے اختلافات کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں یہی وحدتِ انسانیت کا واحد راستہ ہے۔

حیّ و قیوم اور ازلی و ابدی خداوند کبیر و متعال کا یہ تصور نہ صرف زمین پر پھیلے ہوئے تمام ملکوں کے انسانوں کو اپنے گرد جمع کرتا ہے، بلکہ یہ تصور ساری انسانی تاریخ کو بھی جوڑ کر ایک وحدت بناتا ہے جس کے مد و جزر میں اس کی مشیت شروع سے آج تک دخیل ہے۔

یہ خدائے واحد جو انسانوں سے محبت کرتا ہے اور محبت کرنے کی وجہ ہی سے ان کے سامنے ہدایت کی راہیں الہامی تعلیم کے ذریعے واضح کرتا ہے، ان کی دعائیں سنتا ہے ان کی مصیبتوں میں سہارا بنتا ہے، اس پر ایمان لانا ایک ایسی قوت کا سرچشمہ ہے کہ جس کے بل پر انسان زندگی کی کشاکش کے پُر صعوبت مراحل کو جرأت و ہمت سے طے کرتا چلا جاتا ہے۔

۴۔ رسالت

زندگی کی عملی تشکیل کے لیے حقائق کا جتنا وسیع شعور انسان کو درکار ہے، وہ مجرد حسّی عقل فراہم نہیں کر سکتی۔ اسے حواسِ خمسہ کی دی ہوئی معلومات اور اپنے استدلال و افتاح کے ذریعے ان سے اخذ کردہ تصوّرات کے علاوہ الہامی تعلیمِ ہدایت کی بھی ضرورت ہے۔ انسانی عقل فوق المادی دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتی، انسانی عقل جذبات کی دخل اندازی سے محفوظ نہیں رہ سکتی، انسانی عقل پوری تاریخ کے تمام پیچ در پیچ عوامل کے اثر و تاثر کو حاوی نہیں ہو سکتی اور انسانی عقل بے شمار اخلاقی رویوں اور ان تمام اثرات کا احاطہ نہیں کر سکتی جن کی لہریں ایک ایک فاصل سے چل کر افراد، خاندان اور اداروں سے ہوتی ہوئی سارے معاشرے میں پھیل جاتی ہیں، اور پھر بعد میں آنے والی نسلوں کے ذہن و کردار پر بھی اثر انداز ہوتی چلی جاتی ہیں۔

عقل کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انسان الہامی ہدایت کا اسی طرح محتاج ہے جس طرح سورج کی روشنی، ہوا، پانی اور روٹی کا محتاج ہے۔ اور اس کے رب والٰہ نے اس ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام بھی اسی طرح کر دیا ہے جس طرح اس کی جسمانی ضرورتوں کا۔ اسی انتظام کا عنوان نظامِ رسالت ہے۔

خدائے واحد نے اوّلین انسان کو اپنی ہدایت سے نوازا، اور پھر جوں جوں نسلِ انسانی پھیلتی گئی، ہر دور میں ہر قوم کے لیے وقت کے بہترین ذہن و کردار کے انسانوں کو منتخب فرما کر انہیں فریضۂ نبوت و رسالت تفویض کیا۔

خدا کے مبعوث کردہ انبیاء و رسلؑ نہ صرف اس کی ہدایت اس کی طرف سے نوشتے اور صحیفے انسانوں کو پہنچاتے رہے بلکہ ان کے مطابق نمونے کی زندگیاں بسر کر کے دکھا دیتے رہے کہ خدا کے بندوں سے کیسی زندگی مطلوب ہے۔ اسے کیا چیز پسند ہے اور کیا چیز کس شکل میں ناپسند ہے۔ انبیاء کے ذریعے جو "ہدایت نامہ ہائے ہدایات" انسان تک پہنچے ہیں ان میں صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ کے علاوہ چار بڑی کتابیں معروف

عام ہیں۔ زبور، تورات، انجیل اور قرآن۔ اول الذکر تین کتابوں کی حفاظت ان کے علمبردار نہ کر سکے، بلکہ اُلٹا ان میں تحریف و تدلیس کی گئی۔ آخر کار قرآن کے ذریعے ان کی تعلیمات کو صحیح ترین اور مکمل ترین شکل میں انسانیت کے سامنے رکھ دیا گیا جسے سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم لائے، اور صرف لائے ہی نہیں، بلکہ اپنی ذات سے لے کر ایک مکمل نظامِ حیات کے دائرے تک میں اس کے ایک ایک گوشے کو جلوہ گر کر کے دکھا دیا کہ ہدایت یافتہ انسان اور ہدایت یافتہ معاشرے کی ساخت کیا ہونی چاہیے۔

حضور کی بعثت انسانیت کے بلوغ کے موقع پر اور بین الاقوامی دَور کے سرے پر ہوئی ہے، اور آپ کی لائی ہوئی کتاب جامع اور مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ تحریف کے تمام خطرات سے محفوظ کر دی گئی ہے۔ پس یہ کتاب آخری کتاب ہے اور اس کے لانے والے رسولؐ آخری رسولؐ ہیں۔

۵۔ الکتاب

قرآن کی اساسی تعلیمات کا ایک حصّہ خود اس موضوع کے لیے وقف ہے کہ خدا کی نازل کردہ اس کتابِ ہدایت کے کیا حقوق ہیں، یہ خدائے کائنات کی طرف سے مقرر کردہ جامع ضابطہ ہے۔

مطالبہ یہ ہے کہ اس کتاب کو سنوار کر پڑھا جائے اس کے مدعا و مطالب کو سمجھا جائے، اس کے مندرجات پر غور و تفکر کیا جائے، اس کے اصول و احکام کو عملاً اپنایا جائے، اس کے اخلاق و قانون کو غالب کرنے کی جدوجہد کی جائے، اسے باطل نظریات کے حملوں کی زد سے بچایا جائے اور اس کی آیات پر اُسوۂ نبوت اور سنتِ رسالت۔ اور نظامِ خلافت راشدہ کا پہرہ قائم رکھا جائے، اور اس کے مطابق نظامِ زندگی کو چلا کر ساری دنیا کو فلاح و سعادت اور امن و انصاف کا راستہ دکھایا جائے۔

۶۔ آخرت

کسی عقیدہ، نظریہ یا تصوّر کی صحت کی ایک عقلی جانچ یہ بھی ہے کہ اس سے زندگی بہتر شکل اختیار کرتی ہے، یا اس میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

اس معیار کو سامنے رکھ کر سوچیں تو انسانی زندگی کا محض اس کرۂ ارضی کے جسمانی دور تک محدود ہونا ایسے نتائج تک پہنچاتا ہے جو فساد اور بگاڑ کے سوا کوئی نتیجہ نہیں دے سکتے۔ اگر زندگی بس یہیں تک ہے اور محض جسمانی ہے تو پھر انسان کے لیے اس سے بڑا کوئی نصب العین نہیں ہو سکتا کہ وہ اس مختصر دور میں اپنی ساری قوتیں جائز و ناجائز کی تمیز میں پڑے بغیر زیادہ سے زیادہ فوائد اور لذّات حاصل کرنے میں کھپا دے۔ کہیں وہ شرافت کا بھروپ بھرے، کہیں غنڈہ گردی سے کام لے اور کہیں ہمدردی کے دام بچھائے، کہیں ظلم و جبر کی قوتیں استعمال کرے۔ عقلاً اس کا موقف صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ جسم و دماغ، برادری اور احباب، دولت و کاروبار، عہدہ و جاہ تقریر و تحریر، قیادت و تنظیم، ادب و شعر، سائنس اور انجینئرنگ علمی اور صحافت کی جو بھی قوتیں رکھتا ہو ان کو زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرے۔ وہ میکیاولی کا پرنس بن کر ڈپل کارنیگیت کے خوشنما اور سحر آفریں نفسیاتی حربوں سے کام لے کر انسانوں کا شکار کرے۔

اور افراد سے آگے نکل کر یہ تصور تقاضا کرتا ہے کہ ہر طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف اور ہر قوم دوسری قوم کے خلاف اور ہر عالمی بلاک دوسرے بلاک کے خلاف جبر و قوت اور سازباز کی مختلف ترکیبیں آزما کر اپنے مفاد کی بنیاد ددر ...

کے نقصان اور دکھ پر رکھے۔ اسی تصوّر نے سرمایہ داری اور سوشلزم کی مصیبتیں پیدا کیں، اسی نے سامراجیت کے لیے راستے ہموار کیے اور اسی نے فلسفہ ارتقا کے "اصولِ تنازع للبقا" اور "بقائے اصلح" کو اٹل صداقتیں بنا دیا، جنہیں اختیار کرکے افراد اور اقوام اور طبقوں نے لاکھوں انسانوں پر ایسے ایسے عذاب ڈھائے ہیں کہ درندے شرما جائیں۔

جس تصوّر کے نتیجے میں انسانیت صدیوں سے مصائب کے چکر میں مبتلا ہو، اور جس نے امن اور انصاف کی جڑ مار دی ہو، تاریخ خود عقلِ انسانی کے سامنے شہادت دیتی ہے کہ وہ قطعی طور پر باطل ہے اور جو نظریات اس سے ہم آہنگ ہوں، وہ بھی قابلِ استرداد ہیں۔

یہ تصوّر جس نے نمرود و شدّاد پیدا کیے، جس نے طاقت ور قوموں کو کمزور قوموں کا شکاری بنایا، جس نے سیاسی، اقتصادی اور فکری و ثقافتی غلامی کے قلاوے کمزور ملتوں کی گردنوں میں ڈلوائے، جس نے سرمایہ داری کو مزدور سے ناجائز نفع اندوزی کرنا سکھایا اور جس نے اشتراکیت کو اس منزل تک پہنچایا کہ وہ محنت کش انسانوں کو جانوروں کے گلے میں بدل دے، اسے قرآن نے توڑ کر رکھ دیا، اور اس کے بخلاف آخرت کا شعور دلایا۔

قرآن کا تصورِ آخرت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے "اجل مسمّٰی" پوری ہونے پر انسانی دنیا ایک دن ختم کر دی جائے گی، اور تمام کے تمام مردہ انسان زندگی کے اس نئے دور میں داخل ہوں گے جس کا آغاز حشر یا بعث بعد الموت سے ہوتا ہے۔ پھر خدا کی عدالت لگے گی، اس عدالت کے سامنے ہر آدمی کی زندگی کا پورا ریکارڈ پیش ہوگا۔ اس کے مظالم اور اس کے جرائم کے ستم رسیدگان مدعی بن کے اٹھیں گے، اس کی اپنی ہستی، اس کی نفسیات، اس کے اعضا، اس کے ماحول کے تمام عناصر گواہی دیں گے، اور پھر فیصلہ صادر ہوگا کہ اس شخص نے زندگی نیکی کی راہ پر گذاری یا بدی اور ظلم کے راستے پر۔ پہلی صورت میں اسے رحمتِ خداوندی جنتِ جاودانی سے نوازے گی، اور دوسری صورت میں سنگین اور طویل عذاب سے!

یہ عقیدۂ آخرت جس کے تمام پہلوؤں کو قرآن نے تفصیل سے بیان کیا ہے، اس زندگی کو ایک امتحانی زندگی قرار دیتا ہے۔ یہاں ہم ایک امتحان گاہ میں اتارے گئے ہیں اور ہماری جانچ ہو رہی ہے کہ خدا کی عطا کردہ حیات، علم، قوت و اختیار۔ اور اس کی نعمتوں سے ہم کس طرح کے مقاصد کے لیے کیا کام لیتے ہیں۔ یہ تصورِ امتحان، ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرنے کا محرک بھی بنتا ہے اور بدی کی قوتوں کے خلاف کشمکش کرنے اور راستی اور نیکی کے خدائی نظام کو برپا کرنے کی جدوجہد کا درس بھی دیتا ہے۔ اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسروں سے محبت کرو اور ان کی خدمت انجام دو۔ نہ یہ کہ ان پر ظلم کرو اور ان سے ناجائز فائدے اٹھاؤ۔ یہ عقیدہ آدمی کے سینے میں ایک پولیس چوکی، ایک ادارۂ احتساب اور ایک نظامِ عدالت قائم کر دیتا ہے جو اسے تنہائیوں میں بھی نیکی پر قائم رہنے کے رضاکارانہ جذبے سے آراستہ کرتا ہے۔

یہ قرآنی تصورِ آخرت اگر ہمارے سامنے نہ ہو تو ایسے لاینحل سوال پیدا ہوتے ہیں کہ جن کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔

وہ شخص جو ساری عمر ظلم و معصیت میں گذار کر ہزارہا انسانوں کو مصائب کا شکار بناتا ہے، کسی استعمار یا آمریت کے علمبردار جو قوموں کی قوموں کو خوں ریزی اور جبر و تشدّد کے تلخ تجربوں سے گذارتے ہیں، وہ فلسفی اور مفکر جو نسلوں کی نسلوں کو باطل نظریات کا شکار بنا دیتے ہیں، آخر کونسا دنیوی اقتدار اور قانون اور عدالتی نظام ان کے ایک ایک فعل اور اس کے اثرات کا احاطہ کرکے انہیں کماحقہٗ پوری سزا دے سکتا ہے؟

اسی طرح وہ شخص یا گروہ جو نوعِ انسانی کو سچائی اور نیکی سے بہرہ مند کرنے اور اس کی بہترین خدمات انجام دینے کے لیے عمروں قربانیاں دیتا ہے، کونسی حکومت اور اس کے ذرائع و وسائل اسے پوری پوری جزا دے سکتے ہیں۔

قرآنی تصورِ آخرت کو چھوڑ دینے سے ایسا خلا پیدا ہوتا ہے کہ زندگی عقل کی نگاہ میں لایعنیت بن جاتی ہے اور زندگی کو لایعنی ماننے کے بعد انسان کا اچھا انسان بننا ناممکن ہے۔

۷ ۔ دین

قرآن کی اساسی تعلیمات میں سے ایک یہ ہے کہ چونکہ دین نام ہے پوری زندگی بسر کرنے کے انداز و اطوار کا اور اس کے مفہوم میں مسلکِ حیات اور نظامِ حیات کے تصوّرات شامل ہیں، اس لیے انسان بیک وقت کسی ایک ہی دین کا پیرو ہو سکتا ہے۔ وہ دینِ حق پر چلے گا یا دینِ باطل پر۔ وہ خدا پرستی کی راہ اختیار کرے گا۔ یا خدا فراموشی اور نفس پرستی کی۔ وہ ایماندار ہوگا یا کفر کیش۔

ہر نظریہ اور فلسفہ ایک خاص قسم کے دین (یا نظامِ حیات) کی بنیاد ہوتا ہے۔ اور ہر قوم اور ہر فرد کی زندگی جس نقشے پر بسر ہو رہی ہے وہی اس کا دین ہوتا ہے۔

ہماری کتابِ ہدایت میں خدا نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ تمہارے لیے قرآنی تصورِ آخرت کو چھوڑ دینے سے ایسا خلا پیدا ہوتا ہے کہ زندگی عقل کی نگاہ میں لایعنیت بن جاتی ہے اور زندگی کو لایعنی ماننے کے بعد انسان کا اچھا انسان بننا ناممکن ہے۔ میں نے تمہارا خالق و مالک اور حاکم و ہادی ہونے کی حیثیت سے اسلام کو تمہارا دین مقرر کر دیا ہے اور اس کے خلاف جس بھی مسلکِ زندگی یا طرزِ زندگی یا نظامِ زندگی کو اختیار کیا جائے گا، وہ خدا کی بارگاہ (اور عدالتِ آخرت) میں جائز VALID تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ پس قرآن کا مطالبہ خدا پرستوں سے یہ ہے کہ وہ ہر طرف سے منہ موڑ کر دینِ حق کے لیے یکسو ہو جائیں اور اس پر خود جم جائیں اور اسے معاشرے میں بھی غالب کرنے کی جدوجہد کریں۔

۸ ۔ عبادت

قرآن کا تصورِ عبادت دوسرے محدود مذاہب اور تحریف شدہ ادیان سے مختلف ہے۔ اسلامی تصورِ عبادت صرف اتنا نہیں ہے کہ خاص انفرادی دائرے میں پوجا پاٹ کے چند مقررہ طریقوں کو پورا کر دیا جائے، بلکہ یہاں کا تصورِ عبادت پوری زندگی کو محیط ہے۔ زندگی کا ہر فعل خواہ وہ فرد سے تعلق رکھتا ہو یا خاندان سے، معاشرے سے یا ریاست سے، مسجد کے اندر کی ذمہ داریوں سے یا کھیت، کارخانے، بازار اور دفتر کے مشاغل سے، بال بچوں کے معاملات سے یا تھانے، کچہری اور اسمبلی کی سرگرمیوں سے، اگر اسے خدا کے احکام و حدود (جن میں مباحات کو بھی متعین کیا گیا ہے) کے تحت انجام دیا جائے تو وہ عبادت کی تعریف میں ہے، بصورتِ دیگر معصیت کے دائرے میں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہ کر بال بچوں کے نفقہ کا انتظام کرنا، ازدواجی تعلقات استوار کرنا، امارت و قیادت کے منصب پر فائز ہونا، میدانِ جنگ میں حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا، عدالت کی کرسی سے حق کے مطابق فیصلے دینا، اور صدق و دیانت کے ساتھ تجارت کرنا سبھی کچھ عبادت کی وسیع تعریف میں داخل ہے۔

عبادت ہی کے تصور کے مطابق قرآن، نیکی کا جامع تصور دلاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ رسوم کا بیرونی خول (جو اپنی جگہ ضروری بھی ہے) اصل نیکی نہیں، بلکہ اصل نیکی تو خدا و رسول ؐ پر ایمان لانا اور پھر اس ایمان کے تقاضے پورا کرنا ہے۔ جائے نماز سے لے کر میدانِ جہاد تک!

۹۔ توازن

قرآن نے ایک اہم اصطلاح "میزان" کی استعمال کی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ نظمِ کائنات بھی ایک میزان کے مطابق قائم ہے، اور تمہارا منصب بھی یہ ہے کہ اپنی زندگیوں اور سرگرمیوں میں اس میزان کو خلل ڈالے بغیر برقرار رکھو۔ وہ مزید یہ کہتا ہے کہ ہم نے اپنے انبیا کے ساتھ جہاں کتاب نازل کی ہے وہاں میزان بھی اتاری ہے۔

قرآن کے اس میزانی تصور کا منشا ایک خاص طرح کا توازن ہے جسے وہ انسان کی ساری زندگی میں کارفرما کرنا چاہتا ہے۔

قرآنی نظریۂ توازن کے کئی پہلو ہیں:

۱۔ اخلاقی اور قانونی تقاضوں میں توازن۔
۲۔ دنیوی اور اخروی زندگی کی ضروریات میں توازن
۳۔ معاش اور اخلاق میں توازن۔
۴۔ جسمانی اور روحانی ارتقا میں توازن۔
۵۔ عقل اور جذبات میں توازن۔
۶۔ فرد اور اجتماع کے حقوق و فرائض میں توازن
۷۔ مرد اور عورت کے باہمی معاملات میں توازن
۸۔ آزادیوں اور پابندیوں میں توازن۔
۹۔ بڑوں اور چھوٹوں میں توازن۔

تمام باطل نظام اصولِ توازن کے ان تقاضوں کو پامال کر کے وجود میں آتے ہیں۔

قرآن کا اندازِ بیان خود توازن کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس میں عقائد و اخلاقیات اور قانونی احکام سب ہم آہنگ ہو کر کے سامنے لائے گئے ہیں ـــ اور عقلی استدلال کے ساتھ ساتھ جذباتی کیفیات گھلی ملی ہیں۔ یہ اس لیے کہ انسان کی صحت مند زندگی اسی طرح تشکیل پا سکتی ہے کہ اس میں یہ سب عناصر ایک دوسرے سے مربوط ہوں۔

۱۰۔ نصب العین

قرآن انسانی زندگی کو ایک بے مقصد کھیل تماشے کی حیثیت نہیں دیتا بلکہ بامقصد کائنات میں رہنے والی مخلوق کو بھی وہ ایک اعلیٰ نصب العین سے بہرہ مند کرتا ہے۔

وہ نصب العین امتِ وسط، شہداء علی الناس، اور حزب اللہ ہونے کے منصبِ جلیلہ سے ساری دنیا کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا ہے ـــ کسی ذاتی لوث اور کسی گروہی مفاد سے بالاتر ہو کر!

یعنی ہمارے لیے قرآن کا عطا کردہ مقصدِ حیات یہ ہے کہ ہم جس مقام پر بھی ہوں، جس حیثیت کے مالک بھی ہوں، جیسی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں، جس پیشے میں بھی معروف ہوں، ہماری تمام سرگرمیوں کا ہدفِ مقصود ساری دنیا تک صلاح و فلاح کا وہ پیغام بذریعہ قول و عمل پہنچانا ہے جس پر قرآن مشتمل ہے ـــ انفرادی حیثیت سے بھی، اجتماعی حیثیت سے بھی!

تمام قومی منافرتیں، تمام نسلی عصبتیں، تمام لسانی اور لونی دیواریں بیچ میں سے ہٹا دی گئی ہیں، تمام دوسرے مفاد و مقاصد کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ قرآن کے مومن کا ایک ہی مقصد ہے ـــ ہر شخص، ہر گروہ، ہر قوم اور ساری انسانیت کو قرآنی نظام عدل و احسان کے قریب لانا

اس قسم کے بلند، پاکیزہ اور اخلاقی نصب العین سے جو لوگ محروم رہ گئے ہیں ان کے سامنے دولت پرستی، نفس پرستی جاہ پرستی اور جنس پرستی کے علاوہ دلچسپی کا کوئی اور عنوان ہی باقی نہیں رہا۔ اور اس بیماری میں مبتلا اقوام اور تحریکوں کا حال یہ ہے کہ وہ جارحیت اور ظلم اور بداخلاقی کو تیزی سے فروغ دے رہی ہیں۔

۱۱۔ شرف انسانیت

قرآن کی اساسی تعلیمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کا مقام کیا ہے؟ اس کے جواب میں جہاں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اسے احسنِ تقویم پر پیدا کیا گیا ہے اور اسے کرامت سے نوازا گیا ہے، اسے علم سے بہرہ مند کیا گیا ہے، وہاں اس کا منصب خدا کی خلافت و نیابت ہے۔

خلافت و نیابت کے منصب کی بوجھل ذمہ داریوں کو اگر وہ خدا کی ہدایات کے مطابق انجام دے تو وہ آزمائش میں پورا اترا اور انعام کا مستحق ٹھہرا۔

لیکن اگر وہ اس منصب کے تقاضوں کی خلاف ورزیاں کرے ـــ یہاں تک کہ وہ سرے سے اپنے اصل مالک و حاکم کے وجود ہی کا انکار کرنے لگے، یا اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کرے، یا خود اپنی خدائی کا باطل دعویٰ کر بیٹھے تو اس صورت میں اگرچہ بحیثیت انسان وہ خلافت و نیابت کے لیے استعمال کی جانے والی قوتوں کو بغاوت کے لیے استعمال کر سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ عملاً DE FACTO اس تفویض کردہ محدود علم، اختیار اور تخلیق و ایجاد کا بدستور حامل رہتا ہے لیکن آئینی طور پر DE JURE وہ بغاوت کا مجرم قرار پاتا ہے۔ اسے جو مہلت دی گئی ہو اس میں وہ اذنِ مشیت کے دائرے میں جس طرح چاہے اپنے منصبِ خلافت و نیابت کو استعمال کرے، بالآخر اسے عدالتِ آخرت میں اپنے رویے کا حساب دینا ہوگا کہ وہ وفادار نائب ثابت ہوا، یا غدار!

عارضی طور پر امتحانی دورِ جہالت میں کائنات کے تمام عناصر اس کے ساتھ تعاون کرتے رہیں گے، اور تمام موجودات پر اس کے امانتی علم و اختیار کا سکہ چلتا رہے گا۔ لیکن امانت کے غلط استعمال کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑے گا۔

بہر حال انسان کو ایک گونہ شرف و کرامت حاصل ہے اور اس نعمتِ گراں بہا کا مستحق تمام انسانوں کو کسی تمیز کے بغیر قرار دیا گیا ہے۔ اور اسی بنا پر ہر انسان کو دوسرے انسان کے لیے واجب الاحترام اور اخوت و ہمدردی اور مساوات و انصاف کا مستحق گردانا گیا ہے۔ اربابِ استکبار کا یہ ظلم ہے کہ وہ ضعیف لوگوں کو احترام و شرفِ انسانیت سے محروم کر کے رکھیں، اور قرآن کی دعوت کے مطابق محروم ہونے والے مستضعفین کی یہ مجرمانہ بے حسی اور کمزوری ہے کہ وہ چپ چاپ اس محرومی کو قبول کر لیں اور اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے کوئی جدوجہد نہ کریں۔

قرآن نے خلافت و نیابت کا جمہوری تصور دیا ہے۔ یعنی جو لوگ اس منصب کو خدا کی امانت مان کر اس کے احکام کے تحت کام کرنے پر تیار ہوں، وہ سب کے سب اجتماعی نظامِ خلافت و نیابت کو چلانے میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ کسی کو کسی پر سوائے ایمان و علم و تقویٰ کے کوئی فضیلت (قومی، ملکی، لسانی، لونی، طبقاتی یا خاندانی) حاصل نہیں۔

قرآن کے مطابق صحیح مسلم معاشرہ وہ ہے جو مشترک جمہوری تصورِ خلافت و نیابت کے ساتھ اقامتِ نظامِ اسلامی کی ذمہ داری انجام دے۔

قرآن کی اخلاقی تعلیمات



سید معروف شاہ شیرازی

بدی کبھی اپنی اصلی شکل میں رونما ہونے کی جرأت نہیں کرتی۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی نیکی کا لبادہ اوڑھ کر ہی سامنے آتی ہے، اور یوں خود اپنی شکست کا خاموش اعتراف کر لیتی ہے۔ اس سے انسان کی حقیقی فطرت کا بھی پتہ چلتا ہے جو خیر اور حسن خلق سے عبارت ہے۔ انسان کو باقی حیوانی دنیا سے ممیز کرنے والی چیز اخلاق ہی ہے۔ اس کے سنوارنے سے انسان کا سنوار ہے، اور اس کے بگاڑنے سے انسان کا بگاڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخِ تہذیب میں تمام معاشرے اور تمام تمدن جس چیز پر متفق نظر آتے ہیں وہ حسنِ اخلاق ہے۔ سچائی، پاسِ عہد، رحم، فیاضی، صبر، تحمل، بردباری، اولوالعزمی، شجاعت، ضبطِ نفس، خودداری، میل ملاپ، شائستگی، فرض شناسی، اتفاق اور دوسری اچھی صفات کو سب نے سراہا ہے اور اس کے برعکس تقریباً تمام معاشروں نے جھوٹ، بدعہدی، ظلم، بخل، بے صبری، بزدلی، ذلت، ترش روئی، خیانت، چغلی، غیبت اور تمام دوسری برائیوں کو برا کہا ہے۔ یہ اقدار انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہیں۔ اور اسلام نے ان معروفات[1] اور منکرات کو اپنے نظام میں سمو لیا ہے۔ البتہ جس پہلو سے قرآن کا نظامِ اخلاق منفرد ہے وہ یہ ہے کہ اس نے فلسفۂ اخلاق کے تمام بنیادی امور کے بارے میں ایک منظم اور مربوط نظریہ پیش کیا ہے۔ اور وہ اپنا ایک خاص ماخذِ علم اخلاق، قوتِ نافذہ اور قوتِ محرکہ رکھتا ہے اور یہ سب مل کر اس کے فلسفۂ اخلاق کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بنیادی باتیں قابلِ ذکر ہیں۔

(الف) قرآن کی اخلاقی تعلیمات کی پہلی بنیاد یہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش اور امتحان کے لیے بھیجا ہے اور ایک دن انسان کو پوری زندگی کا حساب اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کرنا ہوگا۔ اسلام نے اخلاقی امور کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں اور انسانوں کو خدا کے بتائے ہوئے معیارِ خیر و شر کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اسی میں اُن کی فلاح ہے۔

(ب) انسان خود اپنے مفاد اور برے بھلے کے متعلق محض اپنی عقل کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز کو اچھی اور مفید سمجھتا ہے لیکن درحقیقت وہ مضر ہوتی ہے۔ اور بعض چیزوں کو وہ مضر سمجھتا ہے حالانکہ وہ اس کے لیے حد درجہ مفید ہوتی ہیں۔ قرآن کے یہ الفاظ اسی مضمون کی ترجمانی کرتے ہیں:

وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمھارے حق میں بھلی ہو۔ اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمھارے لیے مضر ہو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (البقرہ: ۲۱۶)

آخر میں وجہ بھی بتا دی کہ اللہ ہی حقائقِ اشیاء سے کماحقہٗ باخبر ہے اور تمھارے علم کا دائرہ محدود ہے اگر ہر انسان یا انسانی گروہ اپنے لیے خود اخلاقی ضابطے وضع کرنے لگے تو انسانی معاشرہ انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق کا تعلق باہمی معاملات و مسائل سے ہے۔ یا یوں کہیے کہ باہمی تعلقات کی شیرازہ بندی کا دوسرا نام اخلاق ہے۔ "دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن و امان انہی اخلاق کی دولت سے ہے۔ اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنی قوت اور طاقت کے قانون سے پورا کرتی ہے۔ اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاق و فرائض کو پوری طرح خود انجام دیں تو حکومت کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔ اسی لیے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ اُن کے قدم قدم کو سیدھے راستے سے بھٹکنے نہ دے۔"[2]

اس اعتبار سے اسلام دنیا کے تمام مذاہب اور نظاموں سے کہیں زیادہ جامع ہے۔ اخلاق کے دائرے میں تو زندگی کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی پہلو بھی آ جاتے ہیں لیکن ہم اپنے مطالعے کی آسانی کے لیے اخلاق کو اس کے معروف اور عام تصور اور تعریف تک محدود رکھیں گے۔ اور اس ضمن میں قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات کو اختصار کے ساتھ پیش کریں گے۔ ویسے تو دنیا کے ہر مذہب اور نظام نے اخلاق پر زور دیا ہے لیکن قرآن نے اخلاق کی بلندی کا وہ معیار پیش کیا ہے، جہاں انسان اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اور اس کی زندگی میں اسمائے حسنیٰ کا پرتو نظر آتا ہے۔

قرآن نے اخلاقی تعلیمات کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے:

۱۔ اسلام میں چونکہ اخلاق بھی دوسرے مذہبی امور کی طرح ایک عبادت ہے، اس لیے اس کی غرض و غایت بھی، ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی حیثیت کچھ نہیں ہے۔ اور نہ ان اخلاقی امور کا کوئی اخروی فائدہ ہوگا۔

وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا (آل عمران: ۱۴۵)

"اور جو شخص دنیا میں (اپنے اعمال کا) بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے

---

[1] : معروف کے معنی ہیں جانا پہچانا ہوا۔ یہ گویا انسانیت کا اجتماعی ضمیر ہے۔

[2] : سیرت النبی از سید سلیمان ندوی، جلد ششم ص ۲۔ طبع چہارم ۱۹۶۴ء

اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو اس کو وہاں
اجر عطا کریں گے۔"

کوئی بھلائی کا کام اگر بدنیتی، ریاکاری اور نمائش کے جذبے سے کیا جائے، وہ باطل ہوگا۔ اور اس کا کوئی اجر نہ ملے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرہ: ۲۶۴)

"مومنو! اپنے صدقات کو احسان رکھنے
اور ایذا دینے سے برباد نہ کرو۔"

۲۔ اخلاق، درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے یا یوں کہیے کہ انسانوں کے باہمی میل جول سے جو فرائض اور ذمہ داریاں ایک دوسرے پر عاید ہوتی ہیں ان کا بحسن وخوبی ادا کرنا اخلاق کہلاتا ہے۔ اس لیے اخلاق کے وجود کے لیے انسانوں کا باہمی میل جول اور وابستگی ضروری ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے رہبانیت کو جائز نہیں قرار دیا۔ قرآنِ کریم یہ کہتا ہے :۔

وَرَهْبَانِيَّةَ ِۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (الحدید: ۲۷)

"اور رہبانیت جسے انھوں نے از خود گھڑا
ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔"

۳۔ اسلام میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے مطابق، جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے اسی اخلاقی اور شرعی فرض کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم کی وضاحت کے پیش نظر امت مسلمہ کی فضیلت ہی اس بات پر ہے کہ یہ امت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران)

"تم بہترین امت ہو، جو سارے انسانوں کے
لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم بھلائی کا حکم
دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو۔"

لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جہاں بھی بُرائی کو دیکھے اسے مٹانے کی کوشش کرے اور ہر حالت میں حق بات کہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر: ۳)

۴۔ عدل و انصاف کو ہمیشہ مدِ نظر رکھنا چاہیے، کسی فرد یا قوم کی دشمنی کی وجہ سے، راہِ اعتدال سے ہٹنا یا سچی شہادت دینے سے گریز کرنا ناجائز ہے خواہ اس کی خاطر رشتہ داروں، دوستوں اور انتہا یہ کہ اپنی ذات کے خلاف ہی گواہ کیوں نہ بننا پڑے اور اسی طرح اگر دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے کا معاملہ پیش آئے تو بے لاگ فیصلہ کرنا چاہیے۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا
بِالْعَدْلِ (النساء: ۵۸)

"اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو
تو انصاف کا فیصلہ کرو۔"

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا
"اور لوگوں کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ
نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو" (مائدہ: ۸)

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى
اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (نساء: ۱۳۵)

"انصاف پر قائم رہو، اللہ واسطے کے
گواہ بنو خواہ تمھاری گواہی تمھارے یا
تمھارے ماں باپ اور رشتہ داروں کے
خلاف ہی کیوں نہ ہو"

اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآن نے عدل کے ساتھ

ساتھ احسان کو بھی مسلمانوں کی ایک اخلاقی خصوصیت بتایا ہے۔ احسان کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی کمی کو پورا کر دینا، تاکہ معاشرے اور زندگی میں حسن قائم رہے۔ اسلامی مملکت میں عدل کا تعلق بڑی حد تک ریاست کے ہاتھ میں ہوگا۔ لیکن احسان ہر شخص کے ہاتھ میں۔

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ"
"اللہ تمھیں عدل اور انصاف کا حکم دیتا ہے"

۵۔ قرآن کے نزدیک وہ تمام صفات مذموم ہیں، جو معاشرے کی اخلاقی فضاء کو مکدر کریں اور مسلمانوں کے اتحاد وضبط کو نقصان پہنچائیں اور جن سے اس بات کا خطرہ ہو کہ پوری سوسائٹی ناقابلِ اعتماد قرار پائے۔ مثلاً جھوٹ، انتشار و افتراق، افترا پردازی، بدگمانی، چغلی، غیبت، نفاق اور تحقیر وغیرہ کہ یہ محرکات ہیں جن سے کسی سوسائٹی کی فضا مکدر ہو سکتی ہے۔ ان سب سے بچنے کے لیے اس طرح ہدایات دی گئیں :

(الف) وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ
"اور بچتے رہو جھوٹی بات سے" (الحج: ۳۰)

(ب) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ
"اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو۔" (آل عمران ۳)

(د) كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ
"سچوں کے ساتھ رہو۔"

(ه) اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ
"قیاس آرائیوں سے بچو۔" (حجرات ۱۲)

(و) وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا
"ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔"

(ز) لَا تَجَسَّسُوْا "ٹوہ میں نہ لگے رہو۔"

(ح) وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ
"ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ۔" (حجرات ۱۱)

(ط) لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ
"کچھ لوگ دوسروں کا مذاق نہ اڑائیں۔"

(ی) لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (حجرات ۱۱)
"ایک دوسرے کو بُرے ناموں سے نہ پکارو۔"

۶۔ مسلمانوں کی جان و مال، عزت، آبرو سب محترم ہیں۔ ناحق کسی کی جان لینا یا بے عزت کرنا، یا ذلیل وخوار کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ خیانت، بددیانتی، ظلم، فخر و غرور، خودستائی، حسد، بغض، ناپ تول میں کمی بیشی انتقام، قتلِ ناحق وغیرہ۔ قرآن کے نزدیک یہ سب مذموم صفات ہیں۔ ذیل کی آیات میں ان باتوں کی وضاحت موجود ہے :

(الف) لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا
اَمٰنٰتِكُمْ : "اللہ اور رسول کے ساتھ
خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت
کے مرتکب ہو۔" (انفال ۲۷)

(ب) وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي
الْاَرْضِ مَرَحًا : "اور لوگوں سے گال
پھلائے نہ رکھو، اور نہ زمین پر اکڑ کر
چلو" (لقمان ۱۸)

(ج) وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا : "زمین پر
اکڑ کر نہ چلو" (بنی اسرائیل، ۳۷)

(د) فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ : "اپنی پاکبازی
نہ جتاؤ" (نجم ۳۲)

(ه) مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ : "حاسد
کے حسد سے پناہ مانگتا ہوں۔" (الفلق ۵)

(و) اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ
الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
"جو لوگ پاک دامن بھولی بھالی، بے خبر

مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان
پر دنیا و آخرت دونوں میں لعنت ہے"
(النور۔ ۲۳)

(ز) وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ
"اللہ ظالموں کو محبوب نہیں رکھتا"

(ح) فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
اَشْيَآءَهُمْ
(الاعراف ۸۵)
"تول پوری کیا کرو اور لوگوں کو چیزیں کم
نہ دیا کرو"

۷۔ قرآن مجید کا یہ بھی حکم ہے کہ جائز سفارش کرو اور
کسی کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔ یعنی بطور رشوت یا کسی
اور ناجائز ذریعہ سے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا
بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ
النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ ۱۸۸)
"اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ
اور نہ اس کو حاکموں کے پاس پہنچاؤ تاکہ
لوگوں کے مال کا کچھ حصّہ ناجائز طور پر کھا
جاؤ اور اسے تم جانتے بھی ہو"

۸۔ باہمی میل ملاپ میں اور بات چیت میں تواضع
اور شیریں زبانی سے کام لو اور غرور اور بدمزاجی سے
پرہیز کرو۔
"قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا"
"سب لوگوں سے اچھی بات کہو"

"اور مومنین کے لیے اپنے بازو جھکا لو" (حجر ۸۸)
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
"ان مومنوں کے ساتھ خاطر تواضع سے پیش
آؤ جو آپ کے تابع ہیں" (شعراء ۲۱۵)

۹۔ عفو و درگذر سے کام لو اور ہر چھوٹی اور معمولی
بات پر آپے سے باہر نہ ہو جاؤ۔
وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ
عَنِ النَّاسِ (آل عمران ۱۳۴)
"غصّہ پی جانے والے اور لوگوں سے درگذر



کرنے والے"

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى
"اگر تم معاف کردو تو یہ تقویٰ سے زیادہ
قریب ہے"
وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا
"انہیں چاہیئے کہ معاف کر دیں اور درگذر
سے کام لیں" (نور ۲۲)
وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ
"اور جو صبر کرے اور درگذر سے کام لے تو
یہ بڑی ہمت کے کام ہیں"۔ (شوریٰ ۴۳)

۱۰۔ معاشی نقطۂ نظر سے وہ ایسی روش اختیار کریں
جس میں قناعت اور خرچ میں اعتدال ہو اور اسراف
سے دور رہیں۔ اگر اللہ نے کسی کو زیادہ دیا ہے تو لالچ
نہ کریں اور نہ اس سے حسد کریں۔ اگر اللہ نے انھیں زیادہ
دیا ہے تو اسراف نہ کریں۔ اور نہ بخل سے کام لیں۔
اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ
"یا جلے مرتے ہیں اس نعمت پر جو خدا نے
لوگوں کو عطا کی" (النساء ۵۴)
وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ
"اور جس چیز میں خدا نے تم میں سے بعض
کو فضیلت دی ہے اس کی ہوس مت
کرو" (النساء ۳۲)
وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا
تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ
"نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ
اُسے کھلا چھوڑ دو" (بنی اسرائیل ۲۹)
وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَ
كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا
"اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو
فضول خرچی نہیں کرتے۔ اور نہ تنگی اور بخل
سے کام لیتے ہیں بلکہ اس کے درمیان اعتدال
کے ساتھ خرچ کرتے ہیں" (الفرقان ۶۷)



قرآن کی سیاسی تعلیمات

سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱- تصورِ کائنات

فلسفۂ سیاست کے نقطۂ نظر سے اگر تصورِ کائنات کا جائزہ لیا جائے تو حسب ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں :

● (الف) اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا اور خود انسان کا اور ان تمام چیزوں کا خالق ہے جن سے انسان اس دنیا میں مستفید ہوتا ہے۔

"کہو اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی یکتا ہے سب کو مغلوب کر کے رکھنے والا۔" (۱۳/۱۶)

● (ب) اپنی پیدا کردہ اس خلق کا مالک فرمانروا اور مدبر و منتظم بھی اللہ ہی ہے۔

"اس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کی تہہ میں Underground ہے" (۲۰ - ۸)

"سورج اور چاند تاروں کو اس نے پیدا کیا۔ سب اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ خبردار رہو۔ اسی کی خلق ہے اور اسی کی حکمرانی ہے بڑا با برکت ہے اللہ رب العالمین" (۷-۵۴)

"زمین سے آسمان تک دنیا کا انتظام وہ کرتا ہے" (۳۲ - ۵)

● (ج) اس کائنات میں حاکمیت ایک اللہ کے سوا کسی کی ہے، نہ ہو سکتی ہے اور نہ کسی اور کا یہ حق ہے کہ حاکمیت میں اس کا کوئی حصہ ہو۔

"فیصلے کا اختیار کسی کو نہیں ہے سوائے اللہ کے۔" (۶ - ۵۷)

"بندوں کے لیے اس کے سوا کوئی ولی و سرپرست نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔" (۱۸ - ۲۶)

"وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اختیار میں بھی کچھ ہے۔ کہو اختیار سارے کا سارا اللہ ہی کا ہے۔ (۳ - ۱۵۴)

● (د) حاکمیت کی جملہ صفات اور اختیارات صرف اللہ ہی میں مرکوز ہیں۔ اس کائنات میں کوئی ان صفات اور اختیارات کا حامل سرے سے ہے ہی نہیں۔

"وہی اپنے بندوں پر غلبہ رکھنے والا ہے اور وہی دانا اور ہر چیز سے باخبر ہے" (۶ - ۱۸)

"بادشاہ عیب و نقص سے پاک، غلطی سے مبرا، امن دینے والا، نگہبان، غالب، بزور حکم نافذ کرنے والا، کبریائی کا مالک (۵۹-۲۳)

بڑا با برکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے (۶۷-۱)

جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اس کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو (۳۶-۸۳)

"بے شک اللہ جو کچھ چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے" (۵ - ۱)

"اللہ فیصلہ کرتا ہے اور کوئی اس کے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے" (۱۳-۴۱)

"جو کچھ وہ کرتا ہے اس پر کسی کے سامنے وہ جواب دہ نہیں اور دوسرے سب جواب دہ ہیں۔" (۲۱ - ۲۳)

"کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے" (۹۵-۸)

"کہو خدایا ملک کے مالک تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے۔ ساری بھلائی تیرے اختیار میں ہے تو ہر چیز پر قادر ہے (۳-۲۶)

۲- حاکمیتِ الٰہیہ

کائنات کے اسی تصور کی بنیاد پر قرآن کہتا ہے کہ انسانوں کا حقیقی فرمانروا اور حاکم بھی وہی ہے، جو کائنات کا حاکم و فرمانروا ہے۔ انسانی معاملات میں بھی حاکمیت کا حق اسی کو پہنچتا ہے اور اس کے سوا کوئی انسانی طاقت بطور خود حکم دینے اور فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ البتہ فرق صرف یہ ہے کہ کائنات میں تو اللہ کی حاکمیت اور فرمانروائی اپنے زور پر آپ قائم ہے۔ جو کسی کے اعتراف کی محتاج نہیں اور خود انسان بھی اپنی اپنی زندگی کے غیر اختیاری حصے میں طبعاً اس کی حاکمیت اور فرمانروائی کا اسی طرح مطیع ہے جس طرح ایک ذرّے سے لے کر کہکشاں نظاموں تک ہر چیز اس کی مطیع ہے۔ لیکن انسان کی زندگی کے اختیاری حصے میں وہ اپنی اس حاکمیت کو بزور مسلط نہیں کرتا بلکہ الہامی کتابوں کے ذریعے سے جن میں آخری کتاب قرآن ہے ان کو دعوت دیتا ہے کہ شعور ارادہ کے ساتھ اس کی حاکمیت تسلیم اور اس کی اطاعت اختیار کریں۔ اس مضمون کے مختلف پہلوؤں کو قرآن میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

● (الف) یہ کہ کائنات کا رب ہی درحقیقت انسان کا رب ہے اور اس کی ربوبیت تسلیم کی جانی چاہیے۔

"کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے معبود کی۔" (۱۱۴ - ۱تا۳)

"کہو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور کون دنیا کا نظام چلا رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو پھر تم ڈرتے نہیں؟ پھر تو وہ اللہ ہی تمہارا حقیقی رب ہے۔۔۔۔ آخر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے۔ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو۔" (۱۰- ۳۱)

● (ب) یہ کہ حکم اور فیصلہ کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اس کی بندگی انسانوں کو کرنی چاہیے اور یہی صحیح طریق کار ہے۔

"حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس

کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں " (۱۲-۴۰)

"وہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی کچھ اختیار ہے، کہو اختیار سارا اللہ ہی کا ہے (۳-۱۵۴)

قرآن کہتا ہے

"جہاں تک میرا اپنا مطالعۂ قرآن ہے، اسلام کا مقصد اتنا ہی نہیں کہ افراد کی اخلاقی اصلاح کر دی جائے۔ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ تدریجی مگر بنیادی انقلاب بنی نوعِ انسان کی پوری اجتماعی زندگی میں برپا کیا جائے اور قومی و نسلی زاویۂ نظر کو بدل کر ان کی جگہ خالص انسانی احساس و شعور پیدا کیا جائے۔۔

قرآن کہتا ہے کہ صرف اسلام ہی بنیاد و اساس ہے قومیت کی، خواہ اُسے تہذیبی مفہوم میں لیا جائے خواہ سیاسی مفہوم میں۔ یہی سبب ہے کہ قرآن نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ اگر کسی شخص نے اسلام کے سوا کسی اور ضابطۂ حیات کو بطورِ دین اختیار کیا تو یہ بات ہرگز قبول نہ کی جائے گی۔" (علامہ اقبال مرحوم)

● (ج) یہ کہ حکم دینے کا حق اللہ کو اس لیے ہے کہ وہی خالق ہے۔

"خبردار! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ (۷-۵۴)

(د) یہ کہ حکم دینے کا حق اللہ کو اس لیے ہے کہ وہ کائنات کا بادشاہ ہے۔

"چور مرد اور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو ... کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ کے لیے ہے" (۵-۳۸-۴۰)

● (ہ) یہ کہ اللہ کا حکم اس لیے برحق ہے کہ وہی حقیقت کا علم رکھتا ہے اور وہی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ "ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناپسند ہو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے ایک چیز تمھیں پسند ہو اور تمھارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" (۲-۲۱۶)

۳- اللہ کی قانونی حاکمیت

ان وجوہ سے قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ اطاعت خالصتہً اللہ کی اور پیروی اسی کے قانون کی ہونی چاہیے۔ اس کو چھوڑ کر دوسروں کی یا اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی ممنوع ہے۔

"اے نبی ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمھاری طرف نازل کی ہے۔ پس تم دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرو۔ خبردار دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے" (۳۹-۱-۱۲)

"کہو مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکا دینے والا میں ہوں" (۳۹-۱-۱۲)

"پھر ہم نے تجھ کو دین کے ایک خاص طریقے پر قائم کر دیا پس تو اسی کی پیروی کر اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر جو علم نہیں رکھتے" (۴۵-۱۸)

● وہ کہتا ہے کہ اللہ نے انسانی معاملات کو منضبط کرنے کے لیے جو حدیں مقرر کر دی ہیں۔ ان سے تجاوز کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

"یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کریں۔ وہی ظالم ہیں" (۲-۲۲۹)

● نیز وہ کہتا ہے کہ اللہ کے خلاف جو حکم بھی ہے نہ صرف غلط اور ناجائز ہے بلکہ کفر و ضلالت اور ظلم و فسق ہے۔ اس طرح کا ہر فیصلہ جاہلیت کا فیصلہ ہے جس کا انکار لازمۂ ایمان ہے۔

"اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں (۵-۴۴)

"اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں (۵-۴۵)

"اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔ (۵-۴۶)

"کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے" (۵-۵۰)

۴- رسول کی حیثیت

خدا کا وہ قانون جس کی پیروی کا اوپر کی آیتوں میں حکم دیا گیا ہے انسان تک اُس کے پہنچنے کا ذریعہ صرف اس کا رسول ہے۔ وہی خدا کی طرف سے اس کے احکام اور اس کی ہدایات انسانوں کو پہنچاتا ہے اور اپنے قول اور عمل سے ان احکام و ہدایات کی تشریح کرتا ہے۔ پس رسول انسانی زندگی میں خدا کی قانونی حاکمیت Legal Sovereignty کا نمائندہ ہے۔ اور اس بنا پر اس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔ خدا ہی کا یہ حکم ہے کہ رسول کے امر و نہی اور اس کے فیصلوں کو بے چون و چرا تسلیم کیا جائے حتیٰ کہ اُن پر دل میں ناگواری پیدا نہ ہو۔ ورنہ ایمان کی خیر نہیں ہے۔

"اور جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی (۴-۸۰)

"جو کچھ رسول تمھیں دے اُسے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرو۔ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔" (۵۹-۷)

"پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ (اے نبی) وہ تجھے اپنے باہمی اختلاف میں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس پر اپنے دل میں بھی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں" (۴-۶۵)

۵- بالاتر قانون

خدا اور رسول کا حکم قرآنِ کریم کی رُو سے وہ بالاتر قانون Supreme Law ہے جس کے مقابلہ میں اہلِ ایمان صرف اطاعت ہی کا رویہ اختیار کر سکتے ہیں جن معاملات میں خدا اور رسول اپنا فیصلہ دے چکے ہیں ان میں کوئی مسلمان خود آزادانہ فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہے اور اس فیصلے سے انحراف ایمان کی ضد ہے۔

"کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو اپنے اس معاملے میں ان کے لیے کوئی اختیار باقی

رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے
رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں
پڑ گیا (۳۳-۳۶)

۶۔ خلافت

انسانی حکومت کی صحیح صورت قرآن کریم کے مطابق صرف یہ ہے کہ ریاست خدا اور رسول کی قانونی بالادستی تسلیم کرکے اس کے حق میں حاکمیت سے دست بردار ہو جائے اور حاکمِ حقیقی کے تحت "خلافت" (نیابت) کی حیثیت قبول کرلے۔ اس حیثیت میں اس کے اختیارات خواہ وہ تشریعی ہوں یا عدالتی یا انتظامی لازماً ان حدود سے محدود ہوں گے جو ۳، ۴ اور ۵ میں بیان ہوئے ہیں۔

"(اے نبی)، ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف
حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ جو تصدیق کرتی
ہے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی اور نگہبان
ہے اُن پر، پس جو کچھ اللہ نے نازل کیا
ہے تم اس کے مطابق لوگوں کے درمیان
فیصلہ کرو اور لوگوں کی خواہشات کی
پیروی میں اس حق سے منہ نہ موڑو جو
تمہارے پاس آیا ہے" (۵-۴۸)

۷۔ خلافت کی حقیقت

اس خلافت کا جو تصور قرآن میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ زمین میں انسان کو جو قدرتیں بھی حاصل ہیں خدا کی عطا اور بخشش سے حاصل ہیں۔ خدا نے خود انسان کو اس حیثیت میں رکھا ہے کہ وہ اس کی بخشی ہوئی طاقتوں کو اس کے دیے ہوئے اختیار سے اس کی زمین میں استعمال کرے۔ اس لیے انسان یہاں خود مختار مالک نہیں بلکہ اصل مالک کا خلیفہ ہے۔

"اور یاد کرو جب تمہارے رب نے
ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ
بنانے والا ہوں" (۲-۳۱)

"پھر ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ
دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو" (۷-۱۲۹)

لیکن یہ خلافت صحیح اور جائز خلافت صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ یہ مالکِ حقیقی کے حکم کے تابع ہو۔ اس سے روگردانی کرکے جو خود مختارانہ نظامِ حکومت بنایا جائے وہ خلافت کے بجائے بغاوت بن جاتا ہے۔

"تم میں جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں
نے نیک عمل کیے ہیں۔ اللہ نے اُن سے
وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں خلیفہ
بنائے گا۔ جس طرح اس نے اس سے
پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا کہ وہ میری
بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی چیز کو
شریک نہ کریں" (۲۴-۵۵)

۸۔ اجتماعی خلافت

اس جائز اور صحیح نوعیت کی خلافت کا حامل کوئی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جماعت Community اپنی مجموعی حیثیت میں ہوتی ہے۔ جس نے مذکورہ بالا اصولوں کو تسلیم کرکے اپنی ریاست قائم کی ہو۔ آیت ۲۴-۵۵ کے الفاظ اس معاملہ میں صریح ہیں۔ اس کی رو سے اہلِ ایمان کا ہر فرد خلافت میں برابر کا حصہ دار ہے۔ کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کرکے انھیں اپنے اندر

مذکور کرلینے کا حق نہیں ہے نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی خصوصی خلافت کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ یہی چیز اسلامی خلافت کو ملوکیت، طبقاتی حکومت، اور تھیاکریسی سے الگ کرکے اُسے جمہوریت کے رُخ پر موڑتی ہے۔ لیکن اس میں اور مغربی تصورِ جمہوریت میں اصولی فرق یہ ہے کہ مغربی تصور کی جمہوریت عوامی حاکمیت Popular Seuereignty کے اصول پر قائم ہوئی ہے اور اس کے برعکس اسلام کی جمہوری خلافت میں خود عوام خدا کی حاکمیت تسلیم کرکے اپنے اختیارات کو برضا و رغبت قانونِ خداوندی کی حدود میں محدود کرلیتے ہیں۔

۹۔ ریاست کی اطاعت کے حدود

اس نظامِ خلافت کو چلانے کے لیے جو ریاست قائم ہوگی عوام اس کی صرف اطاعت فی المعروف کے پابند ہوں گے۔ معصیت (قانون کی خلاف ورزی) میں نہ کوئی اطاعت ہے اور نہ تعاون۔

"ان میں سے کسی گناہ گار اور ناشکرے
کی اطاعت نہ کرو" (۷۶-۲۴)

۱۰۔ شوریٰ

اس ریاست کا پورا کام اس کی تاسیس و تشکیل سے لے کر رئیسِ مملکت اور اولی الامر کے انتخاب اور تشریعی و انتظامی معاملات تک اہلِ ایمان کے باہمی مشوروں سے چلنا چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ مشاورت بلاواسطہ ہو یا منتخب نمائندوں کے ذریعہ سے۔

"اور اُن کا کام آپس کے مشوروں سے
چلتا ہے۔ (۴۲-۳۸)

۱۱۔ اولی الامر کی صفات

اس ریاست کا نظام چلانے کے لیے اولی الامر کے انتخاب میں جن امور کو ملحوظ رکھنا چاہیے وہ یہ ہیں:

(الف) وہ ان اصولوں کو جانتے ہوں جن کے مطابق خلافت کا نظام چلانے کی ذمہ داری اُن کے سپرد کی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ ایک نظام کو چلانے کی ذمہ داری اس کے اصولی مخالفین پر نہیں ڈالی جاسکتی۔

"اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اطاعت
کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور
ان لوگوں کی جو تم میں اولی الامر ہوں"
(۴-۵۹)

(ب) یہ کہ وہ ظالم، فاسق و فاجر خدا سے غافل اور حد سے گذر جانے والے نہ ہوں بلکہ ایماندار، خدا ترس اور نیکوکار ہوں۔ کوئی ظالم یا فاسق اگر امارت یا امامت کے منصب پر قابض ہو جائے تو اس کی امارت اسلام کی نگاہ میں باطل ہے۔

"اور تو اطاعت نہ کر کسی ایسے شخص کی،
جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل
کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس
کی پیروی اختیار کی ہے اور جس کا کام حد
سے گزرا ہوا ہے" (۱۸-۲۸)

"اور اطاعت نہ کرو ان گزر جانے والوں
کی جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں
کرتے (۲۶-۱۵۱-۱۵۲)

"تم میں سے سب سے زیادہ معزز اللہ کے
نزدیک وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو" (۴۹/۱۳)

(ج) وہ نادان اور جاہل نہ ہوں بلکہ ذی علم، دانا اور

معاملہ فہم ہوں اور کاروبارِ خلافت کو چلانے کے لیے کافی ذہنی اور جسمانی اہلیت رکھتے ہوں۔

"اپنے اموال جنھیں اللہ نے تمھارے لیے
ذریعۂ قیام بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالے
نہ کرو۔" (۴ - ۵)

(د) وہ ایسے امانت دار ہوں کہ ذمہ داریوں کا بوجھ ان پر اعتماد کے ساتھ رکھا جا سکے۔

"اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت
کے حوالے کرو۔" (۴ - ۵۸)

۱۲- دستور کے بنیادی اصول

اس ریاست کا دستور جن بنیادی اصولوں پر قائم ہوگا وہ یہ ہیں:۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اطاعت
کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔
اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر
ہوں۔ پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملہ
میں نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول
کی طرف پھیر دو اور اگر تم اللہ اور روزِ
آخر پر ایمان رکھتے ہو۔" (۴ - ۵۹)

یہ آیت چھ دستوری نکات واضح کرتی ہے:

(۱) اللہ اور رسول کی اطاعت کا ہر اطاعت پر مقدم ہونا (۲) اولی الامر کی اطاعت کا اللہ اور رسول کی اطاعت کے تحت ہونا (۳) یہ کہ اولی الامر اہلِ ایمان میں سے ہوں۔ (۴) یہ کہ لوگوں کو حکام اور حکومت سے نزاع کا حق ہے (۵) یہ کہ نزاع کی صورت میں آخری فیصلہ کُن سند خدا اور رسول کا قانون ہے۔ (۶) یہ کہ نظامِ خلافت میں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے جو اولی الامر اور عوام کے دباؤ سے آزاد رہ کر اس بالاتر قانون کے مطابق جملہ نزاعات کا فیصلہ دے سکے۔

(ب) مقننہ کے اختیارات لازماً حدود اللہ سے محدود اور خدا اور رسول کے قانون سے محصور ہوں گے جس سے تجاوز کر کے وہ نہ کوئی ایسی پالیسی اختیار کر سکتی ہے، نہ کوئی ایسا حکم دے سکتی ہے جو معصیت کی تعریف میں آتا ہو۔ کیوں کہ اس آئینی دائرے سے باہر جا کر اُسے اطاعت کے مطالبہ کا حق ہی نہیں پہنچتا (اس کے متعلق قرآن کے واضح احکام ہم اوپر بیان کر چکے ہیں) علاوہ بریں یہ مقننہ لازماً شوریٰ یعنی انتخاب کے ذریعہ سے وجود میں آنی چاہیے، اور اُسے شوریٰ یعنی مشاورت دونوں کے متعلق قرآن قطعی اور متعین صورتیں مقرر نہیں کرتا بلکہ ایک وسیع اصول قائم کر کے اس پر عمل درآمد کی صورتوں کو مختلف زمانوں میں معاشرے کے حالات اور ضروریات کے مطابق طے کرنے کے لیے کھُلا چھوڑ دیتا ہے۔

(ج) مقننہ لازماً ایک شوریٰ ہیئت (Consultative Body) ہونی چاہیے لیکن اس کے اختیاراتِ "قانون سازی" بہرحال ان حدود سے محدود ہوں گے۔ جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جن میں خدا اور رسول نے واضح احکام دیئے ہیں یا حدود اور اصول مقرر کیے ہیں۔ یہ مقننہ ان کی تعبیر و تشریح کر سکتی ہے۔ ان پر عمل درآمد کے لیے ضمنی قواعد اور ضابطۂ کارروائی تجویز کر سکتی ہے۔ مگر ان میں ردوبدل نہیں کر سکتی۔ رہے وہ امور جن کے لیے بالاتر قانون ساز نے کوئی قطعی احکام نہیں دیے ہیں۔ نہ حدود اور اصول متعین کیے ہیں۔ ان میں اسلام کی اسپرٹ اور اس کے اصولِ عامہ کے مطابق مقننہ ہر ضرورت کے لیے "قانون سازی" کر سکتی ہے کیونکہ اُن کے بارے میں کوئی حکم نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شارع نے ان کو اہلِ ایمان کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

(د) عدلیہ ہر طرح کی مداخلت اور دباؤ سے آزاد ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ عوام اور حکام سب کے مقابلہ میں قانون کے مطابق بے لاگ فیصلہ دے سکے۔ اسے لازماً ان حدود کا پابند رہنا ہوگا اور اس کا فرض ہوگا کہ اپنی اور دوسروں کی خواہشات سے متاثر ہوئے بغیر ٹھیک ٹھیک حق اور انصاف کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرے۔

"اُن کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون
کے مطابق فیصلہ کر اور ان کی خواہشات کی
پیروی نہ کر (۵ - ۴۸)

"اور اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کر
کہ وہ خدا کے راستے سے تجھے بھٹکا لے
جائے (۳۸ - ۲۶)

۱۳- ریاست کا مقصد

اس ریاست کو دو بڑے مقاصد کے لیے کام کرنا چاہیے۔ اول یہ کہ انسانی زندگی میں عدل قائم ہو اور ظلم و جور ختم ہو جائے۔

"ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات
کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب
اور میزان بھی نازل کی تاکہ لوگ انصاف
پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا نازل کیا جس
میں سخت قوت اور لوگوں کے لیے منافع
ہیں۔" (۵۷ - ۲۵)

دوسرے یہ کہ حکومت کی طاقت اور وسائل سے بھلائی اور نیکی کو ترقی دی جائے اور برائی کو دبایا جائے۔

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں
اقتدار دیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ
دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں
گے۔" (۲۲ - ۴۱)

اِنَّ السَّمَا یَزَعُ بِالسُّلْطَانِ
مَالَا یَزَعُ بِالْقُرْآنِ

(از حضرت عثمانؓ)

اللہ تعالیٰ (اپنے اطاعت گزاروں کی) حکومت
کی قوت کے ذریعے وہ کام لیتا ہے جو وہ (محض
قرآن (کے تلقینی ذریعے) سے نہیں لیا کرتا۔

۱۴- بنیادی حقوق

اس نظام میں رہنے والے مسلم و غیر مسلم باشندوں کے بنیادی حقوق یہ ہیں جنھیں تعدی سے محفوظ رکھنا ریاست کا فرض ہے:

(الف) جان کا تحفظ

"کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے حق
کے بغیر قتل نہ کرو۔" (۱۷ - ۳۳)

(ب) حقوقِ ملکیت کا تحفظ

"اپنے مال آپس میں ناجائز طریقوں سے
نہ کھاؤ۔" (۲ - ۱۸۸ - ۴ - ۲۹)

(ج) عزت کا تحفظ

"کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے
اور نہ تم ایک دوسرے کو عیب لگاؤ نہ
ایک دوسرے کو بُرے لقب دو، نہ تم
میں سے کوئی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی
بدی کرے (۴۹ - ۱۱ - ۱۲)

(د) نجی زندگی Private Life کا تحفظ۔

"اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں

میں داخل نہ ہو، جب تک کہ اجازت نہ
لے لو" (۲۴-۲۷)
" اور لوگوں کے بھید نہ ٹٹولو" (۴۹-۱۲)

(ہ) ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق۔
اللہ کسی پر زبان کھولنا پسند نہیں کرتا الاّ یہ
کہ کسی پر ظلم ہوا ہو" (۴-۱۴۸)

(و) امر بالمعروف ونہی عن المنکر جس میں تنقید کی آزادی کا حق بھی شامل ہے۔
" تم وہ بہترین امت ہو جسے نکالا گیا ہے
لوگوں کے لیے تم نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی
سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔
(۳-۱۱۰)

(ز) آزادیٔ اجتماع Freedum of Association کا حق بشرطیکہ وہ نیکی اور بھلائی کے لیے استعمال ہو اور اُسے معاشرے میں تفرقے اور بنیادی اختلاف برپا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔
" اور ہونا چاہیے تم میں سے ایک ایسا
گروہ جو دعوت دے بھلائی کی طرف اور
حکم دے نیکی کا اور روکے بدی سے۔ ایسے
ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور نہ ہو جاؤ
ان لوگوں کی طرح جو متفرق ہو گئے اور
جنھوں نے اختلاف کیا جب کہ ان کے پاس
واضح ہدایات آچکی تھیں۔ ایسے لوگوں کے
لیے بڑا عذاب ہے۔ (۳-۱۰۴-۱۰۵)

(ح) ضمیر و اعتقاد کی آزادی کا حق
" دین میں جبر نہیں ہے (۲-۲۵۶)
" کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن
ہو جائیں" (۱۰-۹۹)

" فتنہ قتل سے شدید تر چیز ہے" (۲-۱۹۱)

(ط) مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق
" یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن معبودوں کو پکارتے
ہیں انھیں گالیاں نہ دو"۔ (۶-۱۰۸)
اس معاملہ میں قرآن یہ صراحت کرتا ہے کہ مذہبی اختلافات میں بحث تو کی جا سکتی ہے مگر وہ احسن طریقہ سے ہونی چاہیے۔
" اہل کتاب کے ساتھ بحث نہ کرو، مگر احسن
Fair طریقہ سے"۔ (۲۹-۴۶)

(ی) یہ حق کہ ہر شخص صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہو اور دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری میں اُسے نہ پکڑا جائے۔
" ہر متنفس جو کماتا ہے اُس کا وبال اُسی پر
پر ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی
دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا"۔
(۶-۱۶۴، ۱۷-۱۵، ۳۵-۱۸، ۳۹-۷، ۵۳-۳۸)

(ک) یہ حق کہ کسی شخص کے خلاف کوئی کارروائی ثبوت کے بغیر اور انصاف کے معروف تقاضے پورے کیے بغیر نہ کی جائے۔
" اگر کوئی فاسق تمھارے پاس خبر لے کر
آئے تو تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ
کو بے جانے بوجھے نقصان پہنچاؤ اور پھر
اپنے کیے پر پچھتاؤ (۴۹-۶)

(ل) یہ حق کہ حاجت مند اور محروم افراد کو اُن کی ناگزیر ضروریاتِ زندگی فراہم کی جائیں۔
" اور ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے
والے اور محروم کا (۵۱-۱۹)

(م) یہ حق کہ ریاست اپنی رعایا میں تفریق اور امتیاز نہ کرے بلکہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔

" فرعون نے زمین میں سر اٹھایا اور اس کے
باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جن میں
سے ایک گروہ کو وہ کمزور بنا کر رکھتا تھا
یقیناً وہ مفسد لوگوں میں سے تھا"۔

۱۵۔ باشندوں پر حکومت کے حقوق

اس نظام میں باشندوں پر حکومت کے حقوق یہ ہیں :-

(الف) وہ اس کی اطاعت کریں۔
" اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو
رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے
صاحبِ امر ہوں"۔ (۴-۵۹)

(ب) وہ قانون کے پابند ہوں اور نظم میں خلل نہ ڈالیں۔
" زمین میں فساد نہ کرو۔ اس کی اصلاح
ہو جانے کے بعد" (۷-۸۵)

(ج) " وہ اس کے تمام بھلے کاموں میں تعاون
کریں"
" نیکی اور پرہیزگاری میں تعاون کرو"
(۵-۲)

(د) وہ دفاع کے کام میں جان اور مال سے اس کی پوری مدد کریں۔
" جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور
مال سے۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ اگر
تم جانو" (۹-۳۸-۴۱)

۱۶۔ خارجی سیاست کے اصول

اسلامی ریاست کی خارجی پالیسی کے متعلق جو اہم ہدایات قرآن میں دی گئی ہیں وہ یہ ہیں :

(الف) عہد و پیماں کا احترام اور اگر معاہدہ ختم کرنا ناگزیر ہو تو اس سے دوسرے فریق کو خبردار کر دینا۔
" عہد وفا کرو، یقیناً عہد کے متعلق باز پرس
ہو گی"۔ (۱۷-۳۴)
" اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم معاہدہ
کرو اور قسمیں پختہ کر لینے کے بعد ان کو
نہ توڑو"

(ب) معاملات میں دیانت و راست بازی
" اور اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکر و
فریب کا ذریعہ نہ بنا لو"۔ (۱۶-۹۴)

(ج) بین الاقوامی عدل
" اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل
نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف
کرو کہ یہی خدا ترسی سے زیادہ مناسبت
رکھتا ہے"۔ (۵-۸)

(د) جنگ میں غیر جانبدار ممالک کے حدود کا احترام
" اور اگر وہ (یعنی دشمنوں سے ملے
ہوئے منافق مسلمان)، نہ مانیں تو ان کو
پکڑو اور قتل کرو۔ جہاں پاؤ... سوائے
ان لوگوں کے جو کسی ایسی قوم سے جا
ملیں جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہو"

(ہ) صلح پسندی
" اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی
مائل ہو جاؤ (۸-۶۱)

(و) فساد فی الارض اور زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنے کی کوشش سے اجتناب
" وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے
لیے مخصوص کریں گے جو زمین میں اپنی

برتری نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں۔ نیک انجام پرہیزگار لوگوں کے لیے ہے" (۲۸-۸۳)

(ز) غیر معاند طاقتوں سے دوستانہ برتاؤ۔ "اللہ تم کو اس بات سے نہیں روکتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ ان کے ساتھ تم نیک سلوک اور انصاف کرو یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

(ح) نیک معاملہ کرنے والوں سے نیک برتاؤ۔ "کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے؟ (۵۵-۶۰)

(ط) زیادتی کرنے والوں کے ساتھ اتنی ہی زیادتی جتنی انھوں نے کی ہو۔

"پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے، اس پر بس اتنی ہی زیادتی کرلو جتنی اس نے کی تھی اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ پرہیزگار لوگوں کے ساتھ ہے"۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات

قرآن کے ان ۶ نکات میں جس ریاست کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) ایک آزاد قوم کی طرف سے یہ شعوری عہد اس ریاست کو وجود میں لاتا ہے کہ وہ پوری خود مختاری کے مالک ہوتے ہوئے اپنی مرضی سے خود رب العالمین کے آگے سرِ تسلیم خم کردے گی، اور اس کے ماتحت حاکمیت کے بجائے خلافت کی حیثیت قبول کرکے ان ہدایات و احکام کے مطابق کام کرے گی جو اس نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعہ عطا کیے ہیں۔

(۲) وہ حاکمیت کو خدا کے لیے خاص کرنے کی حد تک تھیاکریسی سے الگ ہوجاتا ہے۔ مذہبی پیشواؤں کے کسی خاص طبقے کو خدا کی خصوصی خلافت ٹھہرانے اور حل وعقد کے سارے اختیارات اُس طبقے کے حوالے کردینے کے بجائے وہ حدودِ ریاست میں رہنے والے تمام اہلِ ایمان کو (جنھوں نے رب العالمین کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا شعوری عہد کیا ہے) خدا کی خلافت کا حامل قرار دیتی ہے۔ اور حل وعقد کے آخری اختیارات مجموعی طور پر اُن کے حوالے کرتی ہے۔

(۳) وہ جمہوریت کے اس اصول میں Democracy سے متفق ہے کہ حکومت کا بننا اور بدلنا اور چلایا جانا بالکل عوام کی رائے سے ہونا چاہیے لیکن اس میں عوام مطلق العنان نہیں ہوتے کہ ریاست کا قانون، اس کے اصولِ حیات، اس کی داخلی و خارجی سیاست اور اس کے وسائل و ذرائع سب اس کی خواہشات کے تابع ہوں اور جدھر جدھر وہ مائل ہوں، یہ ساری چیزیں بھی اسی طرف مڑ جائیں، بلکہ اس میں خدا اور رسول کا بالاتر قانون اپنے اصول وحدود اور اخلاقی احکام و ہدایات سے عوام کی خواہشات پر ضبط قائم رکھتا ہے۔ اور ریاست ایک ایسے متعین راستے پر چلتی ہے جسے بدل دینے کے اختیارات نہ اس کی منتظمہ کو حاصل ہوتے ہیں، نہ عدلیہ کو، نہ مقننہ کو، نہ مجموعی طور پر پوری قوم کو، اِلّا یہ کہ قوم خود اپنے عہد کو توڑ دینے کا فیصلہ کرکے دائرہ ایمان سے نکل جائے۔

۴۔ وہ ایک نظریاتی ریاست ہے جس کا چلانا فطرۃً انھی لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو اس کے بنیادی نظریے اور اصول کو تسلیم کرتے ہوں۔ لیکن تسلیم نہ کرنے والے جتنے لوگ بھی اس کے حدود میں تابعِ قانون ہوکر رہنا قبول کرلیں انھیں وہ تمام مدنی حقوق اسی طرح دیتی ہے جس طرح تسلیم کرنے والوں کو دیتی ہے۔

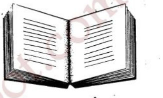
(۵) وہ ایک ایسی ریاست ہے جو رنگ، نسل، زبان یا جغرافیہ کی عصبیتوں کے بجائے صرف اصول کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ زمین کے ہر گوشے میں نسلِ انسانی کے جو افراد بھی چاہیں اِن اصولوں کو قبول کرسکتے ہیں اور کسی امتیاز و تعصب کے بغیر بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اس میں شامل ہوسکتے ہیں۔ اس نوعیت کی خالص اصُولی ریاست کے لیے ایک عالمی ریاست بن جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ لیکن اگر زمین کے مختلف حصوں میں بہت سی ریاستیں بھی اس نوعیت کی ہوں تو وہ سب کی سب یکساں اسلامی ریاستیں ہوں گی۔ کسی قوم پرستانہ کشمکش کے بجائے ان کے درمیان پورا پورا برادرانہ تعاون ممکن ہوگا، اور کسی وقت بھی متفق ہوکر اپنا ایک عالمگیر وفاق قائم کرسکیں گی۔

۶۔ سیاست کو مفاد اور اغراض کے بجائے اخلاق کے تابع کرنا اور اُسے خدا ترسی و پرہیزگاری کے ساتھ چلانا اس ریاست کی اصل رُوح ہے۔ اس میں فضیلت کی بنیاد اخلاقی فضیلت ہے۔ اس کے کارفرماؤں اور اہلِ حل وعقد کے انتخاب میں بھی ذہنی وجسمانی صلاحیت کے ساتھ اخلاق کی پاکیزگی سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ اس کے داخلی نظام کا بھی ہر شعبہ دیانت و امانت اور عدل و انصاف پر چلنا چاہیے۔ اور اس کی خارجی سیاست بھی پوری راست بازی، قول و قرار کی پابندی، امن پسندی، بین الاقوامی عدل اور حسنِ سلوک پر قائم ہونا چاہیے۔

(۷) یہ ریاست محض پولیس کے فرائض انجام دینے کے لیے نہیں ہے اور اس کا کام صرف نظم و ضبط قائم کرنا اور سرحدوں کی حفاظت کرنا ہو۔ یہ ایک مقصدی ریاست ہے جسے ایجابی طور پر اجتماعی عدل اور بھلائیوں کے فروغ اور برائیوں کے استیصال کے لیے کام کرنا چاہیے۔

(۸) حقوق اور مرتبے اور مواقع میں مساوات، قانون کی فرمانروائی، نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون، خدا کے سامنے ذمہ داری کا احساس، حق سے بڑھ کر فرض کا شعور، افراد اور معاشرے اور ریاست سب کا ایک مقصد پر متفق ہونا اور معاشرے میں کسی شخص کو ناگزیر لوازمِ حیات سے محروم نہ رہنے دینا، یہ ریاست کی بنیادی قدریں ہیں۔

(۹) فرد اور ریاست کے درمیان اس نظام میں ایسا توازن قائم کیا گیا ہے کہ نہ ریاست مختارِ مطلق اور ہمہ گیر اقتدار کی مالک بن کر فرد کو اپنا بے بس مملوک بنا سکتی ہے اور نہ فرد بے قید آزادی پاکر خود سر اور اجتماعی مفاد کا دشمن بن سکتا ہے۔ اس میں ایک طرف افراد کو بنیادی حقوق دے کر اور حکومت کو بالاتر قانون اور شوریٰ کا پابند بنا کر انفرادی شخصیت کے لیے نشو و نما کے پورے مواقع فراہم کیے گئے ہیں اور اقتدار کی بے جا مداخلت سے اس کو محفوظ کردیا گیا ہے، مگر دوسری طرف فرد کو بھی ضابطۂ اخلاق میں کسا گیا ہے اور اس پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق کام کرنے والی حکومت کی دل سے اطاعت کرے۔ بھلائی میں اس کے ساتھ مکمل تعاون کرے۔ اس کے نظام میں خلل ڈالنے سے باز رہے اور اس کی حفاظت کے لیے جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔



قرآن کی معاشی تعلیمات

خورشید احمد

قرآن نے جو معاشی تعلیمات پیش کی ہیں ان کا ایک اجمالی خاکہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے قرآن فرد اور جماعت دونوں کے ذہن سے اس باطل نظریہ کو ختم کرتا ہے کہ "اخلاق اور مذہب کا معاشی زندگی سے بھلا کیا سروکار؛ اور تجارت تو بس تجارت ہے" قرآن پاک بڑے بلیغ انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔

مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو تم اللہ کی یاد کی طرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو۔ اگر تم جانتے ہو تو یہی تمھارے لیے بہتر ہے۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتے رہو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔

قرآنِ پاک میں متعدد مقامات پر معاش کو "فضل اللہ" کہا گیا ہے اور اس سے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ سب اللہ کی عنایت سے ہے اور معاشی زندگی میں بھی انسان کو اسی طرح خدا کی حدود کا پابند بننا چاہیے جس طرح باقی تمام زندگی میں۔

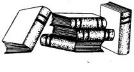
رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

(النور - ۳۷)

وہ لوگ، جنھیں خرید و فروخت اور تجارت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

اسی طرح معاہدہ لکھنے اور صحیح گواہی دینے کو تقویٰ قرار دیا گیا اور ناپ تول میں کمی بیشی کو ایسا عظیم گناہ کہ اس کی وجہ سے ایک پوری قوم کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اس طرح معاشیات اور اخلاق کا اساسی تعلق قائم کیا گیا۔

۲۔ قرآن کی معاشی تعلیمات کا ایک اہم مقصد انسانوں کے درمیان عدل و انصاف کا قیام ہے۔ مثبت طور پر جو چیزیں انصاف قائم کرنے والی ہیں ان کا حکم دیا گیا ہے اور جو چیزیں ظلم و تعدی کا ذریعہ بنتی ہیں ان کا سدِباب کیا گیا ہے۔ اس کام میں جو مرکزی قدر سامنے آتی ہے وہ معاشی عدل کا قیام ہے۔



۳۔ خدا کی ساری زمین کو انسان کے لیے میدانِ عمل قرار دیا گیا ہے۔ اور انسان کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ جد و جہد اپنی معاش کے حصول کے لیے کرے۔ معاشیات کی اصطلاح میں اسے پیداوار کو بڑھانے کی پالیسی کہہ سکتے ہیں۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (اعراف - ۱۰)

اور بیشک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور اس میں تمھارے لیے سامانِ معاش پیدا کیا۔

۴۔ اسلام کے مثبت معاشی مقاصد میں قیامِ عدل، معاشی فراغ البالی کا حصول، غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جد وجہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا بھی شامل ہے۔

۵۔ اسلام معاشی تنگی کو دور کرنے کا طریقہ یہ بتاتا ہے کہ حصولِ رزق کی کوشش کی جائے اور پیداوار بڑھانے کے ذرائع کو استعمال میں لایا جائے۔ اور محض غربت اور افلاس یا معیارِ زندگی کے گرنے کے خطرے سے انسان کُشی اور زندگی کو تلف کرنے کی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا۔ معاشی مسئلہ کا حل انسانوں کو کم کرنا نہیں معیشت کو فروغ دینا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۚ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۚ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (بنی اسرائیل ۳۱)

"اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم ان کو رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ ان کو مار ڈالنا بڑی ہی خطا ہے۔"

یہاں یہ بات خصوصیت سے قابلِ غور ہے کہ غربت اور افلاس اور معیارِ زندگی کے گرنے کے خطرے کے سبب قتلِ اولاد کو منع کیا گیا ہے۔ اس سبب کی نشاندہی نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ان خطرات کی بنا پر کوئی بھی ایسی پالیسی جو بلاواسطہ یا بالواسطہ انسان کُشی پر منتج ہوتی ہو۔ اسلامی نظریۂ حیات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن آبادی کے حقیقی مسئلہ کا حل اضافۂ پیداوار کی شکل میں کرتا ہے، انسان کو کم کرنے کی شکل میں نہیں۔

> **ایک ہاتھ میں قرآن**
>
> "لیکن موچی دروازے کا غریب غربا کے خلاف جب بھی اُٹھے گا تو اس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوگا۔
>
> (ڈاکٹر سید عبداللہ)

۶۔ اسلام پیداوار کے اضافے اور معیشت کے ہمہ جہتی فروغ کی پالیسی اختیار کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی شرط بھی لگاتا ہے کہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی جائے۔ وہ اس نفع کو جو حرام ذرائع سے حاصل ہو، دوزخ کی آگ قرار دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں رزقِ حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے وہ اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ اسلامی آئیڈیالوجی صرف جائز اور حلال رزق کے فروغ کی کوشش کرے گی اور تمام

ذرائع کا بھی انسداد کرے گی جو حرام ہیں اور جن کو شریعت نا جائز و نا روا قرار دیتی ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا

(البقرۃ - ۱۶۸)

"اے لوگو، جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ"

حلال کی طلب اور حرام سے بچنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔ جو حرام ہیں۔ ان میں سب سے بڑھ کر سود ہے۔ خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو اور اس لیے اس کو خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ قرار دیا گیا۔ اس طرح تجارتی اخلاق کا ایک ضابطہ بنایا گیا ہے کہ اہلِ تجارت اس کا اتباع کریں۔ اگر اس کے خلاف عمل ہوتا ہے تو وہ راہِ حق سے ہٹا ہوتا ہے۔ اس طرح اسلام آمدنی کے تمام ذرائع کو بند کر دیتا ہے جو غیر منصفانہ ہیں اور جن کی وجہ سے معاشرہ میں فساد اور عدمِ استحکام رونما ہوتا ہے۔ اور ایک معقول اور متوسط زندگی کے لیے انسان کو تیار کرتا ہے۔

پھر حلال کے ساتھ ساتھ "طیب" کی بھی قید لگی ہوئی ہے، مطلب یہ ہے کہ کسبِ معاش میں محض یہ احتیاط کافی نہیں ہے کہ چیز اللہ کی حرام کی ہوئی اشیاء کی فہرست میں سے نہ ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ چیز جائز طریقہ اور جائز ذریعہ و وسیلہ سے حاصل کی جائے ورنہ اگر جائز ذریعہ سے حاصل نہ کی جائے گی تو وہ چیز بھی حرام ہی قرار پائے گی۔ اگرچہ وہ بجائے خود حرام کی فہرست میں نہ ہو۔

۷۔ طلبِ حلال کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کو جائز مصارف پہ دولت خرچ کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے اور اسراف و تبذیر سے روکتا ہے[1]۔ جس کی وجہ سے دولت کا بے جا استعمال اور ضیاع رک جاتا ہے۔ اور وہ تعمیری مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ

(بنی اسرائیل ۲۶ - ۲۷)

"اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں"

پھر اسلام نے دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے کو بھی پسند نہیں کیا اور اس بات کا انتظام کیا ہے کہ مختلف قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ منصفانہ ہو اور وہ پورے معاشرہ میں گردش کرے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر ۷)

"ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف تمہارے دولتمندوں ہی میں محدود ہو کر رہ جائے"

دولت کی تقسیم کے لیے مندرجہ ذیل صورتیں تجویز کی گئی ہیں:

(الف) زکوٰۃ، جو ہر صاحبِ نصاب مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور جس کے ذریعہ دولت مستقلاً امراء سے غرباء کی طرف منتقل ہوتی ہے اور اس طرح اس کی گردش پورے معاشرہ میں عمل میں آتی ہے اور یہ کوئی خیرات نہیں بلکہ فقراء و مساکین کا "حق" ہے۔

---

[1] : "اسراف" ضرورت سے زائد خرچ کرنے کو کہتے ہیں اور "تبذیر" بے ضرورت اور بے محل خرچ کا نام ہے اور قرآن نے دونوں سے روکا ہے۔

(ب) صدقاتِ واجبہ۔ بہت سے صدقات مقرر کیے گئے ہیں جو مختلف مواقع پر ہر صاحبِ حیثیت مسلمان کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ جیسے صدقہ فطر وغیرہ، یہ بھی مندرجہ بالا مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔

(ج) انفاق: اسلام مسلمان میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے، مال سے محبت کو کم کرتا ہے اور خدا کی راہ میں خرچ کر کے دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ تقسیم دولت کو منصفانہ کرنے کا یہ ایک موثر ذریعہ ہے

(د) وراثت، یعنی ایک شخص کی وفات پر اس کی دولت کی منصفانہ تقسیم اس کے پورے خاندان میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ۔

(ہ) حق سوی الزکوٰۃ: زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کے علاوہ اگر ضرورت محسوس ہو تو حکومت کو اس بات کا حق ہے کہ وہ لوگوں سے مزید مال بطور ٹیکس لے اور اسے استحکام حکومت اور قیام انصاف کے لیے صرف کرے حضورؐ کا ارشاد ہے کہ:

ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ

(ترمذی)

"بیشک مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حق ہے"

(و) العفو۔ اور انسان کو صرف انفاق ہی کی ترغیب نہیں دی بلکہ اس میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا کہ اپنی ضرورت سے زیادہ جو بھی ہو اسے خدا کی راہ میں اور دوسروں کی بہتری کے لیے خرچ کر دے:

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ

(البقرۃ ۲۱۹)

"وہ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں۔ کہہ دیجیے العفو یعنی جو ضرورت سے زیادہ ہو"

اس طرح قرآنی تعلیم پورے معاشرے میں دولت کی تقسیم کی کوشش کرتی ہے، اس کی پالیسی کے دو بنیادی اصول "فروغِ پیداوار" اور "دولت کی منصفانہ تقسیم" ہیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔

۹۔ کتابِ الٰہی تمام زمین اور وسائلِ فطرت کو اصلاً خدا کی دین اور اس کی ملکیت قرار دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام معاشی معاملات میں انسان کو اس عظیم تر ملکیت کے تصور کے تحت "امینِ متصرف" کی حیثیت سے انفرادی ملکیت کا حق دیتی ہے۔ یہی وہ شکل ہے جس میں انسان کی معاشی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے اور اچھے اخلاق پروان چڑھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ حق غیر محدود نہیں ہے یعنی اگر ملکیت آلۂ ظلم بن جائے یا دوسروں کے حقوق پر اس کا غلط اثر پڑ رہا ہو تو ریاست کو مداخلت کا بھی حق ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں ملکیت کی حیثیت ایک امانت کی سی ہے جسے خالق کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق استعمال کرنا ہے جو ایک انقلابی تصور ہے اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے تصورِ ملکیت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

۱۰۔ اسلام ریاست کے معاشی وظائف کا بھی ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے اور سماجی، فلاحی اور معاشی انصاف کے قیام کو اس کی اولین ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ زکوٰۃ ایک سماجی فلاح کی اسکیم ہے جس کے نظام کو ریاست کے ہاتھوں قائم کیا جاتا ہے۔ معاشی قانون سازی اور عدلیہ کی طاقتوں کے ذریعہ ریاست معاشی انصاف قائم کرتی ہے جس کا کوئی وارث نہیں۔ اس کی ریاست وارث ہے۔ ناداروں، اپاہجوں کی مدد ریاست کا فرض ہے اور یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ تمام شہریوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے کی ذمہ داری لے۔

قرآن کی معاشرتی تعلیمات

—— ادارہ

اسلام نے معاشرت کے جو اصول وضع کیے ہیں وہ نہایت وسیع اور ہمہ گیر بنیادوں پر استوار کیے گیے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اسلام نے معاشرتی تعلیمات میں، سب سے زیادہ اہمیت عقیدہ و خیال اور نصب العین و مقاصد کی ہم آہنگی کو دی ہے۔ دو مختلف انسانوں کے درمیان تعلقات اسی وقت استوار ہو سکتے ہیں یا قائم رہ سکتے ہیں جب اُن کے درمیان عقیدہ و خیال اور عمل و کردار کا اتحاد پایا جاتا ہو۔ اس لیے قرآن نے انسانی سوسائٹی کو صرف دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ مومن اور کافر "هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ——— ۱ (التغابن-۲) مومنین کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا گیا" انما المؤمنون اخوۃ" "بیشک مومن بھائی بھائی ہیں" (الحجرات، ۱۰) دوسری جگہ قرآن کریم نے یہ حکم دیا ہے کہ کوئی مومن دوسرے مومن کو چھوڑ کر کافر سے دوستی نہ پیدا کرے۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان عقیدہ اور مقاصد کسی میں بھی یگانگت نہیں پائی جاتی۔ لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ "مومنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد و ہمساز ہرگز نہ بنائیں" (آلِ عمران، ۲۸)

۲۔ اسلام نے انسانی زندگی کی تنظیم کرتے وقت خاندان کو خشتِ اول قرار دیا ہے۔ اس طرح وہ معاشرت کی بنیاد مرد اور عورت کے تعلقات کے توازن پر رکھتا ہے۔ قرآن نے عورتوں اور مردوں کے دائرۂ کار کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے۔ مرد کے لیے جو دائرہ کار موزوں تھا وہ اُس کے لیے اور عورت کے لیے جو دائرۂ کار فطری طور پر مناسب تھا وہ اس کے لیے مقرر کر دیا۔ اس سلسلے میں گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش اور دیگر امورِ خانہ داری کو سرانجام دینا عورت کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اس فریضے کی خاطر خواہ تکمیل اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ عورت گھر کے دائرہ کو اپنی مملکت سمجھے یہ دائرہ محدود نہیں بلکہ نہایت وسیع ہے، اور انسانی معاشرہ کی بنیاد ہے کیونکہ خاندان انسانی معاشرہ کی اکائی ہے۔

۳۔ قرآنِ کریم کا یہ مسلمہ اور زریں اصول ہے کہ تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان رنگ، نسل اور زبان وغیرہ کی بنیاد پر فرق و امتیاز جائز نہیں، ایمان اور عملِ صالح

---

۱ : وہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مومن

یعنی تقویٰ ہی وہ بنیاد ہے جس کی رو سے ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلے میں فضیلت اور برتری حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى
وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (الحجرات: ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

اور اس نکتہ کی وضاحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی:

لا فضل العربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی الا بالتقوٰی

(کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے مگر صرف تقوٰی کے لحاظ سے)

۴۔ قرآنِ کریم نے اپنی معاشرتی تعلیمات کی بنیاد تمام انسانوں کی مساوات اور انسانی شرافت پر رکھی ہے۔ اور پوری انسانیت کے فطری شرف کا اعلانِ عام کیا ہے۔ "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ" "بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی" اور "فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا" اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی (بنی اسرائیل، ۷۰) اس شرف و فضیلت میں قرآن کی رو سے مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن اس بات کا انکار کرتا ہے کہ عورت اوّلین گناہ کا سبب بنی یا صنفِ نازک انسانی نقطۂ نظر سے مرد کے مقابلے میں کمتر ہے یا وہ کوئی ناگزیر برائی ہے، جیسا کہ بعض فلاسفر اسے اسی طرح پیش کرتے ہیں۔ اسلام تمام مخلوق کو عیال اللہ سمجھتا ہے جس سے اللہ کو یکساں محبت ہے۔

۵۔ مرد اور عورت کے باہمی تعلق سے ایک خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔ خاندان اسلامی معاشرت میں ایک اہم اور مستقل یونٹ قرار پاتا ہے اور اس کی تشکیل رشتۂ ازدواج سے ہوتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے رشتہ ازدواج معاشرتی زندگی کی اولین بنیاد ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ مسلم معاشرے میں نکاح کو سہل بنایا جائے۔ رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حالات کو نظر انداز کر کے اسلام نے نکاح کی وسیع سہولتیں فراہم کی ہیں۔ چند مخصوص قریبی رشتہ دار عورتوں اور مشرکات کو چھوڑ کر باقی تمام عورتوں سے نکاح کو جائز قرار دیا گیا۔ اگر ازدواجی زندگی میں کشیدگی ہو تو مرد کے لیے طلاق اور عورت کے لیے خلع کا راستہ کھلا رکھا گیا۔ اس طرح مرد و عورت کے آزادانہ اور بے لگام میل جول کی جڑ کاٹ دی گئی۔ اور اگر ان سہولتوں کے باوجود پھر بھی کوئی جنسی بے راہ روی اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے سخت ترین سزا تجویز ہوئی۔ یعنی ایسے لوگوں کے لیے کوڑے اور رجم کی سزائیں تجویز ہوئیں۔

۶۔ خاندانی زندگی کے بارے میں قرآن کریم نے جو خصوصی ہدایات دی ہیں یا مرد اور عورت کے لیے جو حدود کار اور فرائض اور حقوق مقرر کیے ہیں وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:

(الف) مرد کو خاندان کے معاش، تمدنی زندگی اور سیاسی زندگی کا نگران مقرر کیا گیا ہے اور عورت کو خاندان کی گھریلو زندگی، بچوں کی تربیت، نشوونما، ان کی تعلیم اور دوسری ضروریات کا نگہبان مقرر کیا گیا ہے۔ عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پردہ کریں اور اندرونِ خانہ کے فرائض سرانجام دیں، اور حتی الامکان، عام حالات میں مردوں

کے ساتھ، گھر سے باہر کی تگ و دو میں شریک نہ ہوں اپنی آرائش و زیبائش کا برملا اظہار نہ کریں۔ اگر انہیں کسی کام کے لیے باہر جانا بھی پڑے تو پردہ کریں:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ

(احزاب ۳۳)

"اور اپنے گھروں میں ٹھہری ہو اور جس طرح پہلے جاہلیت کے دنوں میں اظہارِ تجمل کرتی تھیں اس طرح زینت نہ دکھاؤ"

(ب) مرد اور عورت کا باہمی تعلق نہایت مقدس ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو حکم ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مخلص اور وفادار رہیں۔ بلکہ یک جان دو قالب ہوں۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ وہ تمھاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔ (بقرۃ ۱۸۷) وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم : ۲۱) ——— اور اس کے نشانات میں سے ہے کہ اُس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے عورتیں پیدا کیں تاکہ تم اُن کی طرف مائل ہو کر آرام حاصل کرو اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی (الروم : ۲۱) بیویاں اپنے شوہروں کے لیے وجۂ تسکین ہوتی ہیں۔

(ج) مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق کا مقصد محض تعیش، شہوت اور تسکینِ نفس نہیں قرار دیا گیا بلکہ اسے ایک تمدنی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ جس سے نسلِ انسانی کا تحفظ مطلوب ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عورت کا کام محض بچے پیدا کرنا ہی نہ ہو بلکہ ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی مناسب پرورش بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے عورت کے لیے "حرث" یعنی کھیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس طرح ایک کھیت کے دامن سے ایک خاص ترتیب اور عمل سے فصل تیار ہو کر نکلتی ہے۔ اسی طرح صنفِ نازک کے دامن سے بھی نسلِ انسانی کو مکمل طور پر تیار ہو کر نکلنا چاہیے۔

(د) اسلام نے وسیع تر انسانی مفاد اور ضروریات کے تحت ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی ہے اسی صورت میں حکم دیا ہے کہ اگر بیویاں ایک سے زیادہ ہوں تو مرد کو چاہیے کہ ان کے درمیان ممکنہ حد تک انصاف و عدل کا رویہ اختیار کرے۔ ایک ہی طرف نہ جھک جائے۔ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (النساء ۱۲۹) اور ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا ہوا چھوڑ دو"

(ہ) اگر مرد اور عورت کے درمیان جدائی ناگزیر بھی ہو تو بھی شرافت اور ہمدردی کے ماحول میں ہو۔ اور اس سے قبل عورت کو جو ہدایا اور تحائف دیے گئے ہوں وہ واپس نہ لیے جائیں۔ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا "اور نہ لو اس میں سے کچھ بھی جو تم ان کو دے چکے، بلکہ تمھیں چاہیے کہ مزید کچھ انھیں دے دو۔ فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا "ان کو کچھ متاع اور کوئی فائدہ دے کر اچھی طرح سے رخصت کرو۔ (الاحزاب ۴۹)

۷۔ میاں بیوی کے دائرہ کار کی علیحدگی اور باہمی تعلقات کے انضباط کے بعد ان کا اور ان کی اولاد کا تعلق سامنے آتا ہے۔ والدین کے بارے میں قرآن نے واضح تعلیمات دی ہیں اور کہا ہے کہ انھیں "اُف" تک نہ کہو، یعنی انھیں اپنے کسی قول یا عمل سے ذرا بھی دکھ نہ پہنچاؤ، اور جب تک وہ صریح اسلامی تعلیمات کے خلاف حکم نہ دیں اُن کی حکم عدولی نہ کی جائے۔ دوسری طرف والدین کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت کا خاص خیال رکھیں، بھوک و افلاس اور جاہلیت کے عار کی بنا پر بچوں کو قتل نہ کریں اور ان کی ایسی تربیت کریں کہ وہ معاشرہ

کے معزز فرد بن سکیں۔ "واجعلہ رب رضیا" "اے رب اس (ہونے والے بچے) کو خوش اطوار بنا دے" والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں" وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ ——— "اور وہ (اسماعیلؑ) اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے" (۱۹ : ۵۵) اور سورہ الفرقان کے آخر میں مومنین خاص کی یہ دعا ہے "اے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا (فرقان ۷۴)، مفسرین کے نزدیک ان آیات میں متقین سے مراد افرادِ خاندان ہیں۔

۸۔ خاندان کی تنظیم کے بعد اسلام نے تمام رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔ صلہ رحمی میں تمام رشتہ دار شریک ہیں۔ اس دائرے میں ایک خاندان سے آگے بڑھ کر کئی خاندان شریک ہو جاتے ہیں جن میں باہمی خونی تعلق ہوتا ہے یا رشتے ناطے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک خاندان کے افراد کے باہمی تعلق کے لیے احسان کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے بعد حکم دیا ہے کہ اپنی خوشیوں میں ذوالقربیٰ کو یاد رکھا جائے" وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ "والدین اور قریبی رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرو" (النساء ۳۶) وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ "اور باوجود عزیز رکھنے کے مال اپنے رشتہ داروں کو دے" (البقرۃ : ۱۷۷)

۹۔ ایک خاندان اور اُس کے قریبی رشتہ داروں کے بعد، اس خاندان اور اس کے ہم سایہ خاندان کے تعلقات کا مرحلہ آتا ہے اس میں ہمسایہ، اہلِ محلہ اور جان پہچان والے دوسرے لوگوں کا باہمی تعلق سامنے آتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمسائے سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور یہی حکم ان لوگوں کے بارے میں بھی ہے جن سے معمولی میل جول ہو۔ اس دائرے میں اہلِ محلہ آجاتے ہیں وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ "اور احسان کرو ہمسایوں، اجنبی ہمسایوں، پاس بیٹھنے والوں اور مسافروں کے ساتھ (النساء ۳۶) اہلِ محلہ کے لیے مسجد کو پورے محلے کا محور بنایا گیا۔ یہاں وہ پنجوقتہ نماز کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں اور باہم خوشیوں اور غم و درد میں شریک ہوتے ہیں۔

۱۰ حکم دیا گیا ہے کہ عام مسلمانوں سے ملاقات کی ابتدا "سلام" سے کی جائے۔ اس طرح یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آپ سے بات کرنے والا جس انداز سے بات کرتا ہے، آپ کا فرض ہے کہ آپ بھی اُسی انداز سے بات کریں یا اس سے بھی اچھے انداز سے بات کریں۔ سلام کے لیے یوں تعلیم دی گئی: وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ——— "جب کوئی احترام کے ساتھ سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اس کی طرح (۴ : ۸۶)

۱۱۔ معاشرے کے اندر نادار، اپاہج، یتیم اور بیوہ افراد کی نگہبانی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ الماعون میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ شخص خوفِ آخرت نہیں رکھتا جو ——— يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ——— جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے اور ناداروں کو کھانا کھلانے کے لیے ترغیب نہیں دیتا" اور دوسری جگہ ہے۔ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۵۱ : ۱۹) ان کے اموال میں سائل اور نادار کا حق ہوتا ہے۔" اس مقصد کے لیے شریعت نے زکوٰۃ اور صدقات کو مشروع قرار دیا اور حکم ہوا کہ یہ فقراء و مساکین کا حق ہے۔ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ

(۹ : ۶) (بے شک صدقات فقرا اور مساکین وَالْمَسٰكِيْنِ
کے لیے ہیں)

۱۲۔ غرض اسلام کے معاشرتی نظام کی بنیاد عالم گیر انسانی برادری، رنگ و نسل کے بجائے عقائد و اخلاق، خاندانی نظام کی مضبوطی، جنسی تعلقات کے انضباط، مرد و عورت کے دائرہ کار کی علیحدگی اور عام انسانی دوستی کے جذبات اور اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ ایک مسلمان جس طرح اپنا، اپنے خاندان اور اپنے محلے کا ہمدرد ہوتا ہے اسی طرح پوری انسانیت کا ہمدرد ہوتا ہے۔ قرآنی نقطۂ نظر سے وہ معاشرہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے جس میں پڑوسی ایک دوسرے کے دشمن اور ایک ہی منزل کے دو مختلف حصوں میں —— رہنے والے ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں اور ہوں دونوں مسلمان۔

۱۳۔ یہ ہے ایک مجمل خاکہ قرآنی نظامِ معاشرت کا۔ اس کی جھلکیاں آج بھی کسی حد تک مسلمانوں کے معاشرے میں نظر آتی ہیں۔ صدیاں گزر گئیں جب کہ مسلمانوں کا اجتماعی اور سیاسی نظام مختل ہو چکا ہے بلکہ کئی مسلم معاشرے صدیوں تک غیر مسلم حکومتوں کی ماتحتی میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی قرآنی نظام میں معاشرے کے آثار موجود ہیں اور انھیں نہیں مٹایا جا سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اسلامی نظامِ معاشرت کے لیے کچھ ایسی خاص اور مستحکم حفاظتی تدابیر اختیار کیں جن کی بدولت انتہائی ناساعد حالات کے باوجود آج اسلامی معاشرہ زندہ ہے۔ وہ تدابیر مختصراً حسب ذیل ہیں:

(الف) اسلام نے قرآن و سنت کی شکل میں اسلامی نظریۂ حیات کے تصور کو زندہ رکھا۔ مسلمانوں کے عقائد درست رہے اور سنتِ رسولؐ نے ہمیشہ انھیں حسنِ سلوک، اور حسنِ معاشرت پر ابھارے رکھا۔ حضورؐ کی ایک حدیث ہے کہ:

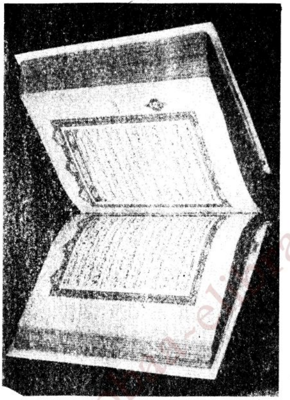
"مَن سن سنة فله اجرها واجر من عمل بها"
"جس نے بھی کسی اچھی روایت کی بنیاد رکھی اُسے اس کا اجر ملے گا۔ اور اس پر قیامت تک جو بھی عمل کرے گا اس کا اجر بھی" اچھی روایت قائم کرنا بھی اسلامی معاشرت کے بقا کا ضامن ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں نے ہمیشہ ایسی روایات کو سینے سے لگائے رکھا۔ جن کا تعلق حسنِ سلوک، فیاضی، مہمان نوازی، بڑوں اور اساتذہ کا ادب اور دوسرے آداب سے تھا۔

(ب) تعلیم کی وسعت اور اشاعت بھی اسلامی نظامِ معاشرت کے تحفظ کا اہم ذریعہ رہی۔ قرآن نے علم، تدبر اور حکمت کو حد درجہ اہمیت دی۔ حضورؐ نے حصولِ علم کو انسانی فریضہ قرار دیا اور مسلمان ہمیشہ علم دوست رہے۔

(ج) مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ بھلائی کا حکم دیں، اسے پھیلائیں اور برائی سے روکیں۔ یہ کام ہر شخص پر اس کی استطاعت کے مطابق فرض ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے معاشرے میں ہمیشہ منکر پر نکیر کیا اور اُسے پنپنے نہیں دیا۔ اور معروف کی حوصلہ افزائی کی اور یہ شعور اس حد تک آج بھی موجود ہے کہ جو لوگ بذاتِ خود منکر میں مبتلا ہیں ان کی اکثریت بھی معروف کو پسند کرتی ہے اور اسی کا احترام کرتی ہے۔

(د) شریعت نے قرآنی نظامِ معاشرت کی اولین بنیاد، خاندان کو اس حد تک مضبوط کیا ہے کہ مسلمانوں میں خاندانی نظام اور خاندان کی گرفت آج تک مضبوط ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے سیاسی، معاشی، قانونی اور تعلیمی نظام کے اضمحلال کے باوجود اسلامی معاشرہ کسی قدر زندہ ہے۔

احیاها الله الی الابد



[illegible] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا زیر مطالعہ قرآن مجید
[illegible] نے پنسل سے جا بجا نوٹ لکھے ہوئے ہیں

فتنہ میں ذریعۂ نجات

قرآن کے بارے میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اہم جامع ارشاد

— ادارہ —

ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں حارث اعور فرماتے ہیں :

مَرَرْتُ فِي الْمَسْجِدِ	میں مسجد میں داخل ہوا۔
فَاِذَا النَّاسُ يَخُوْضُوْنَ فِي الْاَحَادِيْثِ۔	تو دیکھا کچھ لوگ بعض مسائل میں جھگڑا کر رہے ہیں۔ میں حضرت
فَدَخَلْتُ عَلٰى عَلِيٍّ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ	علیؓ کے پاس گیا اور انھیں اس بات کی خبر دی۔ حضرت علیؓ نے
اَوَقَدْ فَعَلُوْهَا ؟	فرمایا، کیا یہ باتیں ہونے لگیں ؟
قُلْتُ نَعَمْ	میں نے کہا جی ہاں۔
قَالَ اَمَا اِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ	حضرت علی نے فرمایا، "یاد رکھو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلَا اِنَّهَا سَتَكُوْنُ	سے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا۔
فِتْنَةٌ۔	خبردار رہو عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اٹھائے گا۔"
قُلْتُ فَمَا الْمَخْرَجُ فِيْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ؟	میں نے عرض کیا۔ "اس فتنے میں ذریعۂ نجات کیا ہوگا ؟"
قَالَ "كِتَابُ اللّٰهِ"	فرمایا، "اللہ کی کتاب"
فِيْهِ نَبَاُ مَا قَبْلَكُمْ	اس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے حالات ہیں۔
وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ	تم سے بعد ہونے والی باتوں کی خبر ہے۔
وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ	اور تمہارے آپس کے معاملات کا فیصلہ ہے۔
هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ	اور یہ ایک دوٹوک بات ہے ہنسی دل لگی کی نہیں ہے۔
مَنْ تَرَكَهٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ	جو سرکش اسے چھوڑے گا، اللہ اس کی کمر توڑے گا۔
وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ	اور جو کوئی اسے چھوڑ کر کسی اور بات کو اپنی ہدایت کا ذریعہ بنائے

اَضَلَّهُ اللّٰهُ	گا، اللہ اُسے گمراہ کر دے گا۔
وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ	خدا کی مضبوط رسّی یہی ہے۔
وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ	یہی حکمتوں سے بھری ہوئی یاد دہانی ہے۔
وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ	یہی بالکل سیدھی راہ ہے۔
وَهُوَ الَّذِيْ لَا تَزِيْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ	اس کے ہوتے ہوئے خواہشیں گمراہ نہیں کرتی ہیں۔
وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ	اور نہ زبانیں لڑکھڑاتی ہیں۔
وَلَا تَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ	اہل علم کا دل کبھی اس سے سیر نہیں ہوتا۔
وَلَا يَخْلَقُ عَلٰى كَثْرَةِ الرَّدِّ	اسے بار بار دہرانے سے اس کی تازگی نہیں جاتی۔ (یہ کبھی پرانا محسوس نہیں ہوتا)
وَلَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ	اس کی عجیب باتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔
وَهُوَ الَّذِيْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذَا سَمِعَتْهُ حَتّٰى قَالُوْا	یہ وہی ہے جسے سنتے ہی جن پکار اُٹھے تھے۔
اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ	بلاشبہ ہم نے عجیب و غریب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے لہٰذا ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔
مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ	جس نے اس کی سند پر کہا، سچ کہا۔
مَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ	جس نے اس پر عمل کیا اجر پائے گا۔
وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ	جس نے اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا۔
وَمَنْ دَعَا اِلَيْهِ هُدٰى اِلٰى صِرَاطٍ الْمُسْتَقِيْمٍ	جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کی۔
خُذْهَا اِلَيْكَ يَا اَعْوَرُ	اے اعور! ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو۔

ان مبارک الفاظ میں بڑی نصیحت ہے۔ خصوصاً مندرجہ ذیل باتوں پر غور کیجیے۔

۱۔ فتنے کے زمانے میں قرآن ہی ذریعۂ نجات ہے۔

۲۔ یہی ہمارے سارے قضیوں اور جھگڑوں کا فیصل ہے

۳۔ اس کو چھوڑ دینا بہت بڑی سرکشی ہے اور اس کے بعد انسان اللہ تعالیٰ کی مدد اور حمایت سے محروم اور اس کے غضب کا شکار ہو جاتا ہے۔

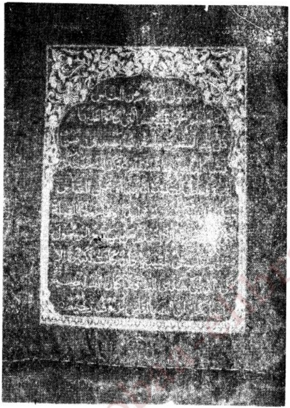
۴۔ قرآن پر ایمان رکھنے والوں کو قرآن سے منہ موڑنے کے بعد سوائے گمراہی کے کچھ نصیب نہ ہوگا۔

مصنف "تمدنِ عرب" کا اعتراف

"اس پیغمبر اسلام اس نبی امی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا اور اس درجے پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ اور اس وقت بھی وہی نبی امی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمۂ اسلام پر قائم رکھے ہوتے ہے۔"



مصحف عثمانی۔ یہ ان مصاحف میں سے ہے جو حضرت عثمانؓ کے ارشاد سے تحریر ہوئے اور مختلف دیار و امصار میں ارسال کیے گئے۔ یہ اُس مصحف کا عکس ہے جو بوقت شہادت آپ تلاوت فرما رہے تھے۔ یہ مصحف تاشقند میں ہے۔



سونے کی تاروں سے لکھا جانے والا قرآن مجید جو عنقریب پاکستان کے قومی عجائب گھر میں رکھ دیا جائے گا۔

سیارہ ڈائجسٹ جون ۱۹۹۸ میں ایک بہن ثریا عندلیب صاحبہ کی دردناک آپ بیتی شائع ہوئی جو نہ صرف ایک سنگین حادثہ کی آئینہ دار تھی بلکہ معاشرہ کی اخلاقی پستی کی بھی اس میں بڑی افسوسناک جھلک تھی اسے پڑھ کر یہ سطور قلمبند کی گئیں ——— (ایڈیٹر)

ایک نفسیاتی مشورہ

(قرآنی تعلیمات کی روشنی میں)

——— ادارہ

اللہ نے بہت سی نعمتوں کے ساتھ راقم ناچیز کو حساس قلب دیا ہے۔ آپ کی سرگذشت پڑھ کر میرا اوّلیں تاثر شدید رنج والم کا تھا، اور آپ سے ہمدردی ہونا فطری بات تھی۔ لیکن لمحۂ احساس سے جب میں لمحۂ شعور میں داخل ہوا اور تھوڑا سا غور وفکر کرنے کا موقع ملا تو چند باتیں ایسی سامنے آئیں کہ آپ ہی کی ہمدردی کے تحت ان کا عرض کرنا ضروری معلوم ہوا۔

اصل میں خود آپ کی گفتگو بھی محض حادثہ اور احساس تک محدود نہیں رہی، بلکہ آپ کے عقائد ونظریات بھی شاملِ بیان ہیں۔ اور ان میں خاصا تضاد ہے۔ آپ کے احساسِ غم کے ساتھ اگر زندگی کے متعلق یہ تصورات شامل رہیں تو آپ کے لیے صبر کا مقام حاصل کرنا مشکل ہوگا، اور ایک کربِ مسلسل آپ کے ساتھ ساتھ چلے گا۔ اس لیے آپ کے غم میں ایک غائبانہ حصہ دار ہوتے ہوئے محض ایک بھائی کی حیثیت سے حقائق کے چند پہلو آپ کے سامنے نمایاں کرنا چاہتا ہوں۔ جس پر اگر آپ نے کھلے دل سے غور کیا تو انشاء اللہ آپ صبر و رضا کا مقام پالیں گی اور زندگی جن حالات میں بھی بسر کرنی پڑے گی، اسے عزم وہمت سے بسر کرسکیں گی۔

آپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ خداوند کریم کا کوئی کام حکمت وعدل سے خالی نہیں اور یہ خیال بھی ٹھیک ہے کہ خرابیاں اور مشکلیں اور ناانصافیاں جو پیش آتی ہیں ان کا باعث ہم انسان خود ہیں ——— بہ حیثیت افراد بھی، بہ حیثیت نظامِ معاشرہ بھی!

لیکن فرطِ غم کے زیرِ اثر آپ نے بعض فقرے ایسے بار بار لکھے ہیں کہ آپ کے مرحوم ومغفور رفیقِ حیات جو نیک تھے، وہ نیک ہوتے ہوئے کیوں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، (اور ضمناً یہ بھی کہ ایک پست کردار ٹیکسی والا کیوں ٹھیک ٹھاک بچ نکلا)۔ ان فقروں کے پیچھے گویا خدا کے عدل کے بارے میں ایک شبہ نہیں تو سوال ——— اور بظاہر لاینحل سوال ——— مخفی ہے۔

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ نہ آدمی کی زندگی کا دائرہ اس دنیا

تک محدود ہے اور نہ خدا کا عدل یہاں مکمل ہوجاتا ہے۔ کتابِ زندگی کے دو باب ہیں۔ آپ جب اس کے صرف حصّہ اوّل کو دیکھتی ہیں کہ وہ ٹریجڈی پر ختم ہوگیا اور دوسرے باب کو (دیکھنے کا تو موقع نہیں آیا) تصور میں نہیں لاتی ہیں تو گویا ایک نامکمل داستان کو لے کر آپ ذہن میں ایک فیصلہ کرلیتی ہیں کہ ایک واقعہ یوں ہوا تو کیوں ہوا۔ ابھی اس واقعہ کی بڑی بڑی کڑیاں آگے باقی ہیں۔ ناولوں کی طرح داستانِ زندگی کا حصّہ اوّل بھی بسا اوقات ٹریجڈی پر ختم ہوتا ہے، مگر دوسرا حصّہ کامیڈی بن جاتا ہے۔ اس طرح اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ دنیا و آخرت عدلِ الٰہی کی میزان کے دو پلڑے ہیں۔ دونوں پلڑے سامنے ہوں گے تو آپ رائے قائم کرسکیں گی کہ آپ کے مرحوم شریف شوہر اور پست کردار ڈرائیور کے لیے عدلِ الٰہی کے تقاضے کس طرح پورے ہوتے؟ آپ کی مشکل یہ ہے کہ ساری رائے ایک پلڑے کو دیکھ کر قائم کر رہی ہیں۔

اگر محض اس دنیا کو دیکھا جائے تو حضرت زکریاؑ اور حضرت عیسیٰؑ جیسی برتر ہستیوں کے بارے میں توجہ فرمایئے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا؟ خاندانِ یاسر خصوصاً سمیہ پر کیا بیتی؟ حضرت خباب کے ساتھ کیا گذری؟ ایرانی گورنر فروہ کو ایمان لانے کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی؟ ستر حفاظ کا جو قافلہ مکروسازش سے شہید کردیا گیا اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ حضرت حمزہؓ کی لاش کو مسخ کیا گیا حضرت امام حسینؓ کے ساتھ اُن کے اہل وعیال کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا؟ حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ پر جو مراحل گذرے، آخر وہ کس قصور کی پاداش میں تھے؟ حضورؐ کے لیے مکہ میں کیوں کانٹے بچھائے جاتے رہے؟ طائف میں کیوں پتھر کھانے پڑے؟ اور اُحد میں کیوں دندانِ مبارک شہید ہوئے؟

بس ذرا ساری تاریخ کا نقشہ نگاہوں کے سامنے پھیلا کر دیکھیں ——— آپ کو صدہا لوگ راستی اور نیکی کے لیے زندانوں میں عمر گذارتے، کوڑے کھاتے، سُولیوں پر لٹکتے، تلواروں سے ذبح ہوتے دکھائی دیں گے ——— اور دوسری طرف پرلے درجے کے ظالم اور بدکار عیش کرتے اور جنتیں سجاتے ملیں گے۔

آپ اپنے محبوب رفیقِ مرحوم کی ذات سے آگے نکل کر وسیع پیمانے پر سوچیے! نیک اور راستباز لوگوں نے یوں کبھی نہیں سوچا کہ انھیں دُنیا سے کیا ملا، وہ ہمیشہ یہ سوچتے ہیں کہ وہ کیا دے سکے؟ اور اس کٹھن مسلک پر وہ بہ نفسی خوشی اگر چلتے ہیں تو اس یقین کے ساتھ کہ عدلِ الٰہی کی تکمیل باقی ہے۔

دوسری ضروری بات آپ یہ زیرِ غور لائیں کہ یہ دنیا اس طرح نہیں بنائی گئی کہ جو آدمی اچھا ہو اس کی اچھائی کے گل ولالہ بس اس کے لیے خاص ہوں، دوسروں کے لیے ان میں کوئی حصّہ نہ ہو، اور نہ یہی درست ہے کہ بُرے آدمی کی بُرائی لوٹ کر خود اسی کو ملتی ہو، دوسروں پر اثر انداز نہ ہوتی ہو خصوصاً نیک لوگوں کو ہر بُرے آدمی کی ہر برائی سے حفاظت دلانے کے لیے فرشتے مامور ہوں۔ اور اس کے برعکس نیک آدمی کی نیکی سے کسی بُرے کو فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہ پانے دیا جائے۔

ہماری زندگی اجتماعی زندگی ہے۔ اجتماعی ماحول جب خرابیوں سے بھرا پڑا ہو اور نظامِ معاشرہ کی زمین بدکرداری کے کانٹے اُگا رہی ہو تو وہ کانٹے اُن قلیل التعداد کو بھی چبھیں گے، جو نیکی اور راستی کے پھول اُگانے میں سرگرم رہتے ہوں۔ اسی لیے نیکی اور راستی کی زندگی کا ایک اصولی تقاضا یہ ہے کہ ایک فرد اپنی ذاتی اور محدود نیکی پر مطمئن نہ ہوجائے بلکہ پورے معاشرے اور ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے کوشش کرے۔ حالات جتنے خراب ہوں اور خرابی کا ازالہ کرنے والے حساس لوگ جتنے کم ہوں، ان کے سر اصلاح وتعمیر کی ذمہ داری اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ مدعائے گذارش یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں ہم ایک دوسرے کے اعمال وکردار سے حصہ پاتے ہیں۔ جلیب صاحب اور ٹیکسی والا اور سائیکل والا سب آپس میں

اثر ڈالتے ہیں اور اثر لیتے ہیں۔ بُرا بھی اور اچھا بھی۔

یہ بجا کہ جائے وقوعہ پر فضا آپ کے خلاف ہوگئی۔ مگر یہاں ایک مجبوری ہے۔ ہجومی نفسیات ایسی ہیں کہ لوگ واقعہ کے کسی ظاہری پہلو سے اور اس کے متعلق کسی فوری بیان یا توضیح سے اثر پذیر ہو جاتے ہیں اور ایک انصاف پسند فرد کی طرح تحقیق نہیں کرتے۔ دوسرے اس فضا میں ایک عام تاثر جو ہر صاحبِ حیثیت آدمی کے خلاف پیدا کر دیا گیا ہے وہ لوگوں کو اندھا بنا دیتا ہے۔ سائیکل والے کے مقابلے میں ٹیکسی والا، اور ٹیکسی والے کے مقابلے میں کار والا گویا ہجومی نفسیات کی عدالت میں پہلے سے طے شدہ مجرم ہے۔ اسی کے ساتھ آپ اس حقیقت کو بھی نہ بھولیں کہ سرکاری افسروں کے متعلق ان کی اکثریت کے رویّوں کی وجہ سے ایک خاص طرح کے احساسات عوام میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں کہیں انھیں موقع مل جاتا ہے وہ ایک غیر شعوری انتقامی رَو کا شکار ہو جاتے ہیں۔

کہنے کا مدعا یہ ہے کہ یہ سب چیزیں بھی معاشرے کی ان بےشمار خرابیوں میں سے ہیں جو دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں، جن کی جڑیں گہری ہیں اور جن کو بدلنے کے لیے جس شدید محنت و کاوش کی ضرورت ہے اس کا حق ادا کرنے والے لوگ کم ہیں۔ ہر کسی کو اپنے گھر، اپنی خوشی، اپنے مسائل سے واسطہ ہے۔ کاش کہ آپ اپنے موجودہ ردِّ عمل کو تعمیری رُخ پر ڈالیں اور طے کر لیں کہ اپنے ممکن وسائل و قویٰ کے ذریعے آپ کو سائیکل والوں کو بھی، ٹیکسی والوں کو بھی، کار والوں کو بھی، محبت و ہمدردی اور خدمت و ایثار کے راستے سے خیر و خوبی کی تربیت دینی ہے، اور پورے معاشرے کی خرابیوں کے خلاف ایک خیر خواہانہ جہاد لڑنا ہے۔ پھر جب آپ اس راہ پر نکلیں گی تو اس کے لیے آپ کو، جہاں قرآن اور اُسوۂ رسولؐ سے رہنمائی ملے گی، وہاں تھوڑے بہت لوگ اور بھی ایسے ملیں گے جو اسی قسم کی تگ و دَو میں لگے ہیں۔ ان کو اب تک آپ نے نہیں جانا، لیکن راہِ مقصد کی وحدت آپ کو ان سے بیگانہ نہ رہنے دے گی۔ آپ کا یہ کام گویا آپ کے شوہرِ مرحوم کے شجر کو مسلسل برگ و بار دے گا۔ آپ محسوس کریں گی کہ جیسے حبیب کی زندگی ایک نئے رنگ میں جاری ہے اور اب وہ آپ کے باہر جلوہ گر ہونے کی بجائے آپ کے اندر جلوہ آرا ہیں۔ ایسے قُرب کا تصور سابق زندگی میں بھی آپ کو کبھی نہ ہوا ہوگا۔

آخری گذارش یہ کہ ہمارے افسانوی ادب میں خدا کے متعلق اُلٹی سیدھی باتیں کہنے کا جو فیشن بعض لادین یا متشکک عناصر نے شروع کیا تھا، وہ اب اتنا زور پکڑ گیا ہے کہ خدا کو ماننے والے اور اس کے عدل پر بھروسہ کرنے والے لوگ بھی ویسی ہی باتیں کر گذرتے ہیں، حالانکہ یہ باتیں ایمان کے لیے گھُن ثابت ہوتی ہیں، جو آہستہ آہستہ چھید کرتا رہتا ہے۔ اپنی رُوح کو خدا سے تعلق کے معاملے میں اس مقام پر لائیے، جہاں حضرت یعقوبؑ نے محبوب ترین بیٹے سے بظاہر محروم ہو کر کہا تھا:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۚ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۚ

وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ

(یوسف : ۱۸)

ٹھیک ہے "صَبْرٌ جَمِيلٌ" کے الفاظ دہرانا آسان ہے مگر ان الفاظ کو روح میں رچا بسا لینا مشکل ہے۔ مگر اس مشکل کو بھی بارہا انسانوں نے سر کر دکھایا ہے۔ آپ کہیں گی کہ کہاں پیغمبروں کی باتیں اور کہاں ہم لوگ۔ بجا، مگر پیغمبروں کی باتیں اسی لیے ریکارڈ کی گئی ہیں کہ ان سے ہم نمونہ اور سبق لیں۔

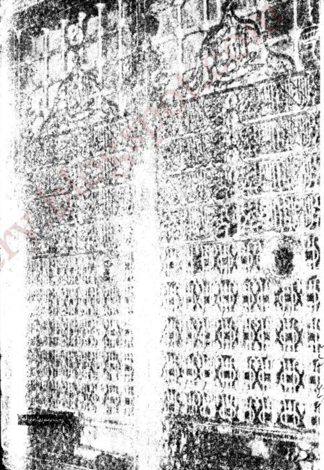
خدا آپ کا حامی و ناصر ہو، اور آپ کے جُدا ہونے والے رفیق پر رحم و بخشش فرمائے!



اور چاہیے کہ ہر شخص اِس بات پر کڑی نظر رکھے کہ اُس نے کل (یعنی آخرت) کے لیے کیا اندوختہ کیا ____؟



طائف کی جدید شاہراہ کا منظر





(بقیہ صفحہ ۵) اور اس کے زیرِ اثر ہر انسان دوسرے انسان کو منڈی کا مال سمجھنے لگتا ہے اور زندگی ایک کاروبار بن جاتی ہے۔

پروفیسر منور صاحب : یہ نفسیاتی اخلاق بازی دراصل تبادلۂ منافقت ہے۔ ایک لطیفہ یاد آیا کہ اسی مرتبہ مری میں حفیظ (جالندھری) صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب کے متعلق فرمانے لگے کہ یہ شخص مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اعتبار نہیں آتا۔

ایڈیٹر : اس حقیقت کی عکاسی ہماری ایک پرانی کہاوت میں ہے کہ "ماں سے زیادہ چاہے، کٹنی کہلائے" بہرحال یہ داؤں لڑانے کی نفسیات خلوص اور اخلاقی جوہر کے لیے تباہ کن ہے۔ ہمارے ہاں حسن تعلقات دینی، روحانی اور اخلاقی تقاضا ہے، حتّٰی کہ مسکرا کر ملنے کو صدقہ قرار دیا گیا ہے، لیکن مغرب والوں نے تعلقات کو بھی ٹیکنیکل آرٹ بنا دیا ہے۔ اچھا تو جعفری صاحب یہ فرمایئے کہ آپ کا دینی رجحان کہاں سے چلا؟ گھر اور خاندان سے؟ اساتذہ سے؟ یا ذاتی تجربات و مطالعہ سے؟

پرنسپل جعفری صاحب : یہ نتیجہ ہے گھر کے اثرات کا۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ والد تو انگریزی تعلیم تک کے خلاف تھے۔ میرے ننھیال کا گھرانہ بھی پابندِ مذہب تھا۔

ایڈیٹر : جس دَور کی آپ بات کر رہے ہیں اس وقت زیادہ تر گھرانے مذہبی تھے۔

پروفیسر منوّر صاحب : جعفری صاحب کے والد محترم میاں شیر محمد صاحب شرقپوری کے دوست اور پیر جماعت علی شاہ ثانی کے مرید تھے۔

پرنسپل جعفری صاحب : گھر کا یہ حال تھا کہ حقہ سگریٹ پینے والا کوئی نہ تھا نقشبندی سلسلہ کے لوگ تھے۔ میں اپنے گھر میں وہ پہلا شخص تھا جس نے ڈاڑھی منڈوا کر ایک خاندانی روایت توڑی۔ نمازیں میں نے کالج کے زمانے میں بھی باقاعدگی سے پڑھی ہیں۔

ایڈیٹر : آپ تعلیم کے میدان میں اتفاقاً آ گئے یا اپنے رجحان کے تحت؟

پرنسپل جعفری صاحب : میں اپنے ذوق سے آیا۔

ایڈیٹر : اس میدان میں آپ کا منتہا اب تک کیا رہا ہے؟ کیا صرف ملازمت اور تنخواہ داری؟ یا اس سے زائد کچھ اور؟

پرنسپل جعفری صاحب : میرا منتہا شروع سے لے کر اب تک یہ رہا ہے کہ اچھے طالب علم پیدا کیے جائیں، وہ پڑھ لکھ کر اچھے مسلمان بنیں، انسانیت کا بہتر نمونہ ہوں۔

ایڈیٹر : اس منتہا میں آپ کو کس درجہ کامیابی ہوئی؟

پرنسپل جعفری صاحب : مجھے خوشی ہے کہ میری کوششوں کے اچھے نتائج نکلتے رہے ہیں۔

ایڈیٹر : کیا آپ دس پندرہ سال پہلے کے طلبہ اور موجودہ دَور کے طلبہ کو سامنے رکھ کر بتا سکتے ہیں کہ کوئی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب : جہاں تک طلبہ سے میرے اور مجھ سے طلبہ کے تعلق کا معاملہ ہے، اس میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ ۱۹۲۴ء میں ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں تھا، پھر سرگودھا اور لائل پور میں رہا، اب لاہور میں ہوں۔

ان سارے ادوار میں بہ حیثیت استاد روابط طلبہ کے ساتھ یکساں رہے اور طلبہ کی طرف سے بھی احترام کا رویہ جاری رہا۔ میرا خیال یہ ہے کہ مختلف حالات میں بھی انسانیت کی ابجد نہیں بدلی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خود استاد کا انداز بدل گیا ہے۔ وہ بسا اوقات شاگرد لڑکیوں میں دلچسپی لیتے ہیں، اُن کو خاص طور پر زائد نمبر دیتے ہیں، اس طرح فضا خراب ہوتی ہے۔

پروفیسر منوّر صاحب: جعفری صاحب کے اس قول کی روشنی میں ان سے یہ بات بھی پوچھنی چاہیے کہ وہ مخلوط تعلیم کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟

پرنسپل جعفری صاحب: میں مخلوط تعلیم کے سخت خلاف ہوں۔

محمود مرزا: مخلوط تعلیم کا سلسلہ تو اب فی الفور ختم ہونا چاہیے۔ خود طالبات کی طرف یہ مطالبہ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے کہ ان کے لیے الگ یونیورسٹی ہونی چاہیئے۔

پرنسپل جعفری صاحب: ایک پہلو اور ہے کہ طلبہ کے اندر طلبِ علم میں فرق آیا ہو تو وہ الگ چیز ہے۔

محمود مرزا: مجموعی معیار گھٹ گیا ہے! اخلاقی معیار Standard of Character اور معیار مطالعہ Academic standard میں کمی واقع ہوئی ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب: جی ہاں، تعداد زیادہ، استعداد کم!!

محمود مرزا: میرے علم کے مطابق استادوں میں ایک نئی چیز یہ آگئی ہے کہ وہ اپنے مخصوص نظریات (سیاسی اقتصادی اور ثقافتی) کے تعصب کو کام میں لاکر بعض طلبا پر خاص کرم کرتے ہیں، اور بعض کے ساتھ زیادتی روا رکھتے ہیں۔

ایڈیٹر: میں آخری سوال یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آیا آپ کی رائے میں ہمارے ہاں علم النفس کو قرآنی بنیادوں پر از سرِ نو مدوّن کرنے کی ضرورت ہے؟

پرنسپل جعفری صاحب: یقیناً ہے۔ چاہیئے یہ کہ دوسرے علوم کی طرح کتبِ نفسیات میں جہاں جہاں موقع ہو اسلامی حقائق، قرآن و حدیث کے اصول، بزرگوں کے اقوال اور تاریخ اسلام کے واقعات کے حوالے شامل کیے جائیں تاکہ علوم کا مجموعی رنگ بدل جائے۔ اپنی حد تک میں یہی کرتا ہوں کہ مضمون پڑھاتے ہوئے اس میں اسلامی مواد شامل کرتا ہوں، مثلاً انسان کی جذباتی تحریکات Human inpulses کے دباؤ کا تذکرہ کرتے ہوئے میں قرآن سے والکاظمین الغیظ کی آیت کو سبق میں لاؤں گا، جنس اور ازدواج کے موضوع پر بات ہوگی تو میں یہ حقیقت نمایاں کروں گا کہ زنا ازدواجی زندگی کے لیے تباہ کن ہے۔ "توجہ" کی نفسیاتی ماہیت زیرِ بحث لاتے ہوئے نماز کی مثال دوں گا۔ غرضیکہ اپنی سی ایک کوشش جاری ہے۔

ایڈیٹر: جعفری صاحب! بڑے ادب سے میری گزارش یہ ہے کہ یہ تو کم سے کم درجے کی مجبورانہ تدبیر ہے جو آپ عمل میں لا رہے ہیں اور بہت مفید ہے۔ مگر میری رائے میں جب علم کا پورا ڈھانچہ اس کی ابتدائی تعریف سے لے کر تجزیۂ نفس کے تجربوں تک اسلام سے آزاد واقع ہوا ہے، اس ڈھانچے کو جوں کا توں نصاب میں لے کر ہم اسلام کے بعض اجزا اس میں شامل بھی کر دیں تو اس سے پیچیدگی حل نہیں ہوتی۔ کیا آپ اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ تدوینِ نصاب نئے سرے سے ہو، اس کے لیے پہلے سے ادارہ موجود ہے، وہ نئی سب کمیٹیاں بنا سکتا ہے، اس موضوع پر کانفرنس بلائی جا سکتی ہے، کمیشن مقرر کیا جا سکتا ہے مگر ہماری گاڑی جیسے چل رہی ہے چلی جا رہی ہے۔

پرنسپل جعفری صاحب: یہ سب کچھ تو ضرور ہونا ہی چاہیئے۔ نفسیات کا نیا نصاب مدوّن کیا جائے جس میں قرآن کے اصولوں کو اُبھارا گیا ہو۔ قرآن میں انسانی مطالعۂ نفس، قرآن میں تجزیۂ نفس، قرآن میں نفس کے تصادمی عمل اور تضادات کا تذکرہ، یہ اتنا وسیع مواد ہے کہ اس پر ہمارے علم النفس کو مبنی ہونا چاہیئے، اور اس کے ساتھ ہمیں طلبہ کی معلومات کے لیے اربابِ الحاد اور مادہ پرستوں کے نظریات بھی تقابلی مطالعہ کے لیے پیش کر دینے چاہئیں۔

پروفیسر منوّر صاحب: اس سلسلے میں تعلیمی کمیشن بھی مقرر ہوا تھا، اور تدوینِ نصاب کی کمیٹی بھی موجود ہے۔ آگے اللہ جانے کیا ہو رہا ہے اور کیسے؟

ایڈیٹر: جعفری صاحب! آپ کا بہت وقت لیا ہے مگر آپ نے ابھی جو قرآنی نفسیات کی بات چھیڑی ہے، میرے پیشِ نظر یہی موضوعِ گفتگو تھا، مگر گفتگو چھڑنے کے بعد جیسے ہم میں سے کسی کو بھی سلسلۂ گفتگو پر کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا۔ تاہم جو بھی باتیں سامنے آئیں بے حد پُر افادیت ہیں۔ آپ کا بھی شکریہ، اور پروفیسر منوّر صاحب اور محمود مرزا صاحب کا بھی جن کی مدد سے یہ معرکہ زیادہ کامیابی سے سر ہوا۔



کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یاسر کافی دن چڑھے گھر سمیہ سے نکلتا ہے۔ لیکن ایک روز جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو اپنے بستر سے نہیں اُٹھا، نہ کوئی لفظ زبان سے نکلا، بلکہ یونہی خاموش گم صم اپنی جگہ لیٹا پڑا رہا۔ جو شخص آج تک سکوت و سکون سے ناآشنا رہا ہو اُس کا آج اس طرح چُپ چاپ پڑا رہنا اُسے گوارا نہ ہو سکا۔ پاس جا کر ذرا جھجکتے ہوئے اُس کی مزاج پرسی کرنے لگی، بولی:

"کیا حال ہے یاسر؟ کیا کوئی تکلیف ہے؟"

یاسر نے بڑی دھیمی آواز سے جواب دیا، کہنے لگا:

"نہیں کوئی بات نہیں، ٹھیک ہوں۔"

سمیہ بولی:

"پھر کیا بات ہے، آج تم نے گھر میں شور نہیں مچایا؟ دیکھو گھر کیسا سُونا پڑا ہے۔"

یاسر بولا،

"واہ ری سمیہ! تو بھی عجیب ہے، تجھے آخر کیسے خوش رکھوں؟....."

اِس کے بعد اُس کی آواز آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتی گئی، کہنے لگا:

"اگر کچھ بولتا ہوں اور ہنسی مذاق کرتا ہوں تو کہتی ہے میری نیند خراب کر دی، اور اگر چپ رہتا ہوں تو کہتی ہے گھر سونا پڑا ہے، شور کیوں نہیں مچاتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا ہے، جس کی وجہ سے تمام ہنسی مذاق کی باتیں بھول گیا ہوں۔"

سمیہ مسکرا کر کہنے لگی:

"خدا کرے تم روز ایسا بھیانک خواب دیکھو اور شور کرنا بھول جاؤ! اس طرح مجھے نیند پوری کرنے کا موقعہ تو مل جائے گا۔"

یاسر مُسکرا دیا، لیکن اس کی باچھیں کھلیں اور فوراً بند ہو گئیں، چہرہ چمکا اور افسردگی طاری ہو گئی۔ کہنے لگا:

"نہیں سمیہ! یہ کوئی ایسا ویسا خواب نہیں۔ یہ کچھ غیر معمولی قسم کا تھا۔ اس کی ضرور کوئی نہ کوئی تعبیر ہو گی۔ کیونکہ مجھے آئے دن بہت سے خواب نظر آتے رہتے ہیں، لیکن جاگتے ہی ذہن سے اُتر جاتے ہیں۔ مگر یہ خواب کچھ عجیب قسم کا ہے اس کا پورا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ اس کا خیال میرے دل سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اب بھی میں اُسے دیکھ رہا ہوں۔"

سمیہ بولی:

"تو کچھ سناؤ تو سہی۔ شاید اس کو بیان کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔"

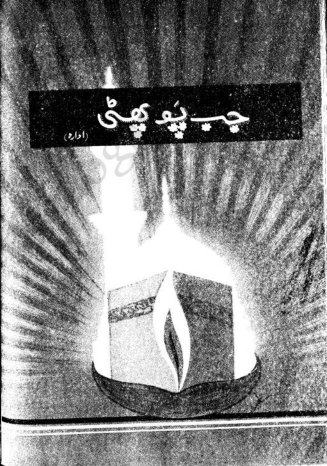
یاسر نے کہا:

"میں تمہیں اصل خواب نہیں سناؤں گا۔ اس کا بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ البتہ اُس واقعہ کا ایک ہلکا سا خاکہ کھینچ کر بتاؤں گا جو میں نے خواب میں دیکھا اور اب بیداری میں بھی میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے:

"وہ ایک وادی تھی، نہ بہت زیادہ چوڑی چکلی نہ بہت زیادہ تنگ، بس درمیانہ درجہ کی تھی۔ اس کے دونوں جانب دو بڑے بڑے پہاڑ تھے، اتنے اونچے اتنے اونچے کہ اُن کی چوٹی تک نگاہ نہیں پہنچتی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ جگہ جگہ سے پھٹ گئے ہیں اور اِن میں بے شمار گہری گہری دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ اِن دراڑوں میں سے ہولناک آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں، جو ایک دوسرے کی طرف لپک لپک کر جا رہے ہیں۔ اِن شعلوں اور لپٹوں کے ملنے سے تمام وادی میں آگ اِس طرح بہہ رہی ہے جیسے سیلاب کا پانی بہتا ہے۔ اس وادی کے پرلی جانب میری نظروں کے بالکل سامنے ایک سرسبز مرغزار ہے جس میں ٹھنڈے پانی کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ یہ آگ وہاں تک نہیں پہنچتی بلکہ اس سے پرے ہی رُک جاتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس سبزہ زار میں تم کھڑی ہو۔

چپ پُھٹی

(ادارہ)



تمہاری جوانی واپس لوٹ آئی ہے اور چہرہ ایسے چمک رہا ہے جیسے چودھویں رات کا چاند ہو۔ مجھے دیکھ کر تم مسکرا سی جاتی ہو اور اشاروں سے بلا رہی ہو اور آواز بھی دے رہی ہو۔ میرے پیچھے عمار کھڑا ہے اور اُس آگ میں گھس جانے کے لیے مجھے اُبھار رہا ہے۔ محبت بھری آواز میں کہہ رہا ہے۔ ابا جان! بڑھیے تو سہی، آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ چند چنگاریاں ہی تو ہیں، حد سے حد ایک دو چھالے پڑ جائیں گے۔ اس سے پرے تو دیکھیے کیسا ہرا بھرا باغ ہے اور اماں سمیہ کو دیکھیے وہاں جا کر جوان ہو گئی ہیں۔ آپ کا شباب بھی اُن کے قریب کھڑا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔" اِدھر یہ اُکسا رہا تھا، اُدھر تم بلا رہی تھیں۔ تمہاری آواز میرے کانوں میں برابر آ رہی تھی، آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ لیکن میں آگ میں گھسنے ہی کو تھا کہ اس کی لپیٹ لگتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے سر پیٹ لیا اور چیخنے لگا:

" ہائے! ہائے!! اُس آگ کی جلن مجھے اب تک محسوس ہو رہی ہے۔"

سمیہ تڑپ اُٹھی، بے قرار ہو کر کہنے لگی:

" خدا تمہیں ہر بلا سے بچائے! کچھ فکر نہ کرو۔ آؤ اُٹھو کچھ کھا پی لو۔ پھر باہر جا کر ہمارے کسی کاہن کو یہ بھیانک خواب سنانا، شاید وہ اس کی تعبیر بتا سکیں۔"

اُس روز شام بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ خواب خود ہی مجسم تعبیر بن کر سامنے آ گیا، حتیٰ کہ یاسر کو آگ کی جلن بھی محسوس ہو گئی۔

(۲)

سمیہ کو خواب سنانے کے بعد یاسر مسجد چلا گیا۔ وہاں بنی مخزوم کی مجلس میں پہنچا تو سلام کر کے بیٹھ گیا۔ مگر سب اپنی اپنی باتوں میں مشغول رہے، جیسے انھیں اس آنے والے کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ مخزوم ہمیشہ سے گھمنڈی، مغرور اور متکبر ہیں۔ اگر ابو حذیفہ سے کیے ہوئے عہد کا پاس نہ ہوتا تو وہ مخزوم کو چھوڑ کر کبھی کا کسی دوسرے قریشی قبیلے سے جا ملا ہوتا

لیکن اُس نے جس طرح ابو حذیفہ کی زندگی میں اس سے وفا کی، اسی طرح اس کی وفات کے بعد بھی میں معاہدہ کا پابند رہا۔

یاسر جب مخزوم کی مجلس میں شریک ہونے آ رہا تھا تو اس کا ارادہ تھا کہ یہاں آ کر اُن کو اپنا بھیانک خواب سنائے گا، تاکہ اس طرح ایک طرف ان کی دلچسپی کا سامان مہیا ہو جائے، دوسری جانب شاید وہ اس کی کوئی تعبیر بتا سکیں، لیکن جب اُس نے ان کی یہ سرد مہری اور بے التفاتی دیکھی تو زبان بند رکھی اور چپ سادھ کر بیٹھ گیا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ وہ اس بات کا خوگر ہو چکا تھا کہ ان مغروروں کے پاس خاموش بیٹھا رہتا، یہاں تک کہ یہ لوگ اپنی باتوں سے فارغ ہو کر خود ہی اس کی طرف متوجہ ہوتے اور پھر وہ ان کے کبر و نخوت کی تضحیک کرتا اور ہنسی مذاق میں ایسی کھری کھری باتیں سناتا جو عام طور پر انھیں پسند نہ ہوتی تھیں۔ تاہم اُسے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ کسی نے اس سے بات چھیڑ ہی دی۔ یہ عمرو بن ہشام (ابوجہل) ہے، اچانک پوچھ بیٹھتا ہے:

"کیوں یاسر! آج تمہیں اتنی دیر کیسے ہو گئی؟"

یاسر نے مذاقیہ انداز میں کہا:

" کوئی بات تو ہو گی ہی ابوالحکم، جو اتنی دیر ہوئی۔"

عمرو بن ہشام نے کینے اور غصہ کو دل میں پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا:

" اچھا، لیکن مجھے تم سے ایک بات پوچھنی ہے جو اب تک میرے لیے ایک راز بنی ہوئی ہے۔"

یاسر نے پوچھا:

" وہ کیا؟"

عمرو بن ہشام نے کہا:

" وہ یہ کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ تم ہمارے معبودوں کے پاس گئے ہو، یا اُن کو اچھے الفاظ سے یاد کیا ہو۔"

یاسر نے ہنس کر کہا:

" تو کیا کبھی بُرے الفاظ سے یاد کرتے بھی سنا ہے؟ یا کبھی دیکھا ہے کہ میں نے تمہارے معبودوں کو کبھی کوئی تکلیف پہنچائی ہو؟"

عمرو بن ہشام نے کہا:

" تو وہ ہمارے ہی معبود ہوئے نا ــــ تمہارا تو ان سے کوئی تعلق ہی نہیں؟"

یاسر نے کہا:

" آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟"

عمرو بن ہشام کے چہرے اور آواز دونوں میں غیظ و غضب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ کرخت آواز میں بولا:

" ہاں ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کون ہمارے ساتھ ہے اور کون ہمارے خلاف، کیوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ مکہ کا ہر باشندہ اپنے دل کی بات ظاہر کر دے اور اپنا مافی الضمیر صاف بیان کر دے اب تک ہم نے اپنے حلیفوں سے بہت نرمی برتی ہے اور ہمیشہ درگزر سے کام لیتے رہے ہیں لیکن آج سے ہم اُن کی ذرا بھی رُو رعایت نہیں کریں گے۔"

یاسر نے کہا:

" ابوالحکم ذرا سنبھل کر بات کرو۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جب سے میں تمہارے چچا ابو حذیفہ کا حلیف بنا ہوں اور تمہارے دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہونے کا عہد کیا ہے اُس وقت سے اب تک میری طرف سے نہ تم نے کوئی ایسی بُری بات دیکھی ہے نہ تمہاری قوم نے دیکھی ہے لیکن اب میں تم سے ایسی باتیں سُن رہا ہوں کہ جب سے حرم مکہ میں آیا ہوں اب تک سُننے میں نہیں آئیں۔"

عمرو بن ہشام نے کہا:

" تو گویا اس عہد کے مطابق آج سے تم اپنے بیٹے عمار کے دشمن ہو؟"

یہ کہہ کر وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا، لیکن اُس کی ہنسی میں خوشی سے زیادہ غصہ کی جھلک تھی۔

یاسر نے کہا:

" ابوالحکم: ذرا صاف صاف باتیں کرو، آج تو تمہاری کوئی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

عمرو بن ہشام نے کہا:

" کیا تمہیں نہیں معلوم، کل سے تمہارا بیٹا بے دین ہو گیا ہے اور محمدؐ اور اس کے ساتھیوں کو ماننے لگا ہے؟"

یہ سُنتے ہی یاسر کے ہوش و حواس قائم نہ رہے، وہ غش کھا کر گر پڑا، زبان رُک گئی، چہرہ زرد پڑ گیا اور پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر سردارانِ مخزوم ایک دوسرے کی طرف گھور گھور کر تعجب سے دیکھنے لگے۔

عمرو بن ہشام کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کا چچا ولید بن مغیرہ بول پڑا، کہنے لگا:

" بھتیجے! بس کرو۔ اس بوڑھے سے ذرا نرمی برتو۔ دیکھو بیچارے کی کیا بُری حالت ہو گئی ہے۔ اس کے بیٹے کے گناہوں کی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں، کیونکہ اب وہ چالیس سے زیادہ کا ہو چکا ہے"۔ اسی دوران میں یاسر کے حواس بھی آہستہ آہستہ درست ہو گئے جب اُس نے دیکھا کہ سب لوگ خاموش ہیں تو عمرو بن ہشام سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

" بڑی شرم کی بات ہے، ابوالحکم! .... تم اپنے حلیف سے بدسلوکی کرتے ہو! خدا کی قسم میں نے عمار کو نہ کل دیکھا ہے نہ آج دیکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت سے اب تک اس کا کیا حال رہا ہے۔ اب تک اس سے میری ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ تم بالکل بے موقع سختی کرتے ہو۔ ملامت کرتے وقت نہیں دیکھتے کہ دوسرے کا کوئی قصور بھی ہے یا نہیں۔ بس زبان چلانے سے کام ہے، جس پر بس چلتا ہے سختی شروع

کر دیتے ہو۔ آخر ارقم بن ابی ارقم پر سختی کیوں نہیں کرتے جو تمہاری ہی طرح مخزوم کا سردار ہے۔ اگر بقول تمہارے عمار بے دین ہو گیا ہے تو اس سے پہلے ارقم بھی تو اسی کی طرح بے دین ہو گیا ہے بلکہ اس نے تو اپنے گھر کو محمدؐ کے لیے وقف کر دیا ہے۔ وہاں اس کے ساتھی آ کر اس سے ملتے ہیں اور وہیں سے وہ اپنی دعوت پھیلاتا ہے اور تمہارے معبودوں کو بُرے کلمات سے یاد کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم ارقم بن ابی ارقم سے ڈرتے ہو کیونکہ اگر تم نے اُس پر ذرا انگلی اٹھائی تو اندیشہ ہے کہ اس کے بھائی بند اس کی پشت پناہی کو اُٹھ کھڑے ہوں گے لیکن میرے حلیف تمہارے چچا ابو حذیفہ یہاں موجود نہیں ہیں، اگر وہ آج زندہ ہوتے تو تم یہ سلوک کرنے سے پہلے خوب سوچ سمجھ لیتے۔"

یہ کہہ کر وہ اُداس قلب اور شکستہ دل گرتا پڑتا اُٹھا اور گھر کو چل دیا۔

(۳)

جیسے ہی وہ گھر کے دروازہ سے داخل ہوا، گھر کی ہر چیز اُسے بدلی ہوئی نظر آئی۔ گھر والے کسی اور ہی حالت میں تھے، سارا سماں بدلا ہوا تھا۔ بیوی کو دیکھا تو بڑی خوش خوش بشاش بشاش پھر رہی تھی۔ قریب آتے ہی بھاگ کر اُس سے لپٹ گئی نہایت مسرّت آمیز لہجے میں کہنے لگی:

"یاسر! مبارک ہو، آج عمار دُنیا اور آخرت کی بھلائی ہمارے پاس لایا ہے۔"

یاسر نے تعجب سے کہا:

"آخرت! آخرت کیا؟......... کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں تو آج کل بڑا تنگ آ گیا ہوں، راتوں کو خوابوں نے پریشان کر رکھا ہے، دن کو لوگوں کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ عجب مصیبت کا سامنا ہے۔"

ادھر سے عمار بولا:

"ابّا جان! مبارک ہو! میں آج آپ کے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لایا ہوں۔"

یاسر نے کہا:

"بتاؤ گے بھی آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ لوگ تو کہتے ہیں تو بے دین ہو گیا ہے! کم بخت! اپنے ماں باپ کے لیے کیا مصیبت کھڑی کر لی ہے؟"

عمار ہنس کر کہنے لگا:

"بلکہ یوں کہیے کہ کیا نعمت حاصل کر لی ہے! کیوں کہ میں تو آپ دونوں کے لیے دُنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں۔ بے شک کسی نے آپ سے کہا ہو گا کہ میں بے دین ہو گیا ہوں، لیکن فی الحقیقت میں بے دین نہیں ہوا، بلکہ اُس خدا کی فرماں برداری اختیار کر لی ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے، سورج چاند اور ستاروں کو پیدا کیا۔ اور محمدؐ کو ہمارے پاس رسول بنا کر بھیجا کہ وہ ہمیں سیدھی راہ دکھائیں۔"

بوڑھا یاسر بڑی توجہ سے یہ باتیں سُن رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس کے بیٹے کی یہ تمام باتیں کانوں سے گزرے بغیر سیدھی اس کے دل میں جا کر پیوست ہو رہی ہیں۔

بوڑھا یاسر چُپ سادھے خاموش پڑا تھا لیکن کبھی کبھی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑتے تھے۔

"اچھا یہ ہے وہ! یہ ہے وہ!!"

عمار نے نرمی سے پوچھا:

"ابا جان! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

یاسر نے بات کرنی چاہی، لیکن اُس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گر رہے تھے۔

اُس نے کہا:

"بے شک یہی ہے وہ! بیٹا! آج تم نے بڑی پرانی بات یاد دلا دی۔ یہ بات میرے اور ابو حذیفہ کے درمیان ہوئی تھی، جب کہ میں شروع شروع مکہ میں آیا تھا۔ اُس وقت میری عمر بمشکل بیس برس ہو گی۔ بات یہ تھی کہ وہ اپنے معبودوں کے پاس جا کر مجھ سے حلف باندھنا چاہتا تھا میں نے اُن کے پاس جانے سے انکار کر دیا تو سبب پوچھنے لگا۔ میں نے کہا کہ "اگر میں کسی کو اپنا معبود بناتا تو سمندر کو بناتا جس کی وسعت و بیکرانی سے بعض اوقات میں سہم بھی جاتا ہوں، یا سورج ہی کو بناتا جو کم از کم مجھے روشنی تو دیتا ہے ورنہ تاروں کو بناتا جو مجھے راستہ بتاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی خوف و رغبت پیدا کر کے مجھے ان کی عبادت یا پرستش پر آمادہ نہ کر سکی۔" تو بیٹا! تمھیں اب محمدؐ نے بتایا کہ ان تمام چیزوں کا ایک خالق ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور جو ان کا انتظام کرتا ہے..... تو یہ ہے وہ!"

یہ کہہ کر اُس نے سر جُھکا لیا اور کافی دیر تک جھکائے رہا۔ پھر جب اٹھایا تو بدستور آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی روتا جاتا تھا اور کہتا تھا:

"بے شک یہی ہے وہ! اسی کی خاطر میں وطن کو چھوڑ کر پردیس میں رہا۔"

پھر وہ سمیّہ کی طرف مڑ کر اُس کا سر سہلاتے ہوئے بولا

"سمیّہ تیری ہی محبت نے مجھے اس وقت کے انتظار پر آمادہ کیا۔"

اب اس کے آنسو تھم چکے تھے۔ لیکن ڈاڑھی کے بالوں میں اشک کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ سر اٹھا کر وہ اپنے بیٹے عمار سے کہنے لگا:

"بیٹا! محمدؐ کے پاس ہمیں کب لے چلو گے؟ ہم بھی تو اُن کی باتیں سنیں۔"

عمار نے کہا:

"ابھی چلے چلیے!"

اُس روز شام ہوئی تو ابوجہل (عمرو بن ہشام) قبیلہ مخزوم کے چند آزاد اور غلام نوجوانوں کو ساتھ لے کر یاسر کے گھر آیا۔ اُس نے عمار اور اُس کے ماں باپ کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں اور اُن کے گھر کو آگ لگا دی۔

ابوجہل کے لوگ اُن کو گھسیٹ گھسیٹ کر ایک کوٹھری میں قید کرنے لے جا رہے تھے اور بوڑھا یاسر سمیّہ سے کہہ رہا تھا:

"دیکھو سمیّہ! آج پہلا دن ہے کہ میرا وہ خواب میرے سامنے پیش ہو رہا ہے۔"

ادھر سے عمار کہنے لگا:

"بے فکر رہیے، اس کے بعد جنّت ہے، جہاں محمدؐ کی تصدیق کرنے والوں اور آپؐ کی دعوت قبول کرنیوالوں کے لیے ہر طرح کا عیش و آرام ہے اور سب سے بڑھ کر خدا کی خوشنودی۔"

(۴)

دوسرے روز جب کافی دن چڑھ گیا تو قریش کے تمام سردار مسجد میں جمع ہوئے، لیکن وہاں انھوں نے نہ کسی تجارت اور بیوپار کے متعلق گفتگو کی، نہ خرید و فروخت کے بارے میں بات چیت کی، بلکہ اس عظیم حادثہ کی بابت گفتگو کی جو مخزوم کے ایک سرپھرے نوجوان نے اس پُر امن شہر میں برپا کر دیا تھا۔ اُس شہر میں جہاں کے باشندوں کا دستور ہی نہ تھا کہ وہ بے گناہ لوگوں کے گھر جلاتے پھریں اور بے قصور مرد و عورتوں کو لوہے کی بیڑیاں پہنائیں اور انھیں طرح طرح کی سزائیں دیں جب کہ انھوں نے نہ کوئی قتل کیا ہو؛ نہ

چوری کی ہو، نہ کسی اور قابلِ سزا جرم کا ارتکاب کیا ہو۔

ولید بن مغیرہ نے ابوجہل عمرو بن ہشام سے کہا:

"بھتیجے بڑے افسوس کی بات ہے، تو نے اس حرم محترم میں ایک ایسی حرکت کی جو قریش کی روایات کے بالکل خلاف ہے۔ تو نے اس کام میں ہم سے مشورہ بھی نہ لیا اور نہ اپنی قوم کے سمجھ دار بزرگوں کی رائے لی۔ بس جو جی میں آیا کر گزرا۔ اس گھمنڈ اور غرور نے تیری عقل مار دی ہے اور چند بیوقوف نوجوان اور احمق غلام تیرے کہنے پر چل پڑے ہیں، خدا کی قسم! مجھے اندیشہ ہے کہ تیری اس حرکت کا ضرور کوئی بُرا نتیجہ برآمد ہوگا، کیونکہ اہلِ عرب کے دلوں میں اس حرم کی بڑی عزت و منزلت ہے۔ خوف و دہشت کے وقت وہ یہاں امان حاصل کرتے ہیں، بھوک اور فاقہ کشی کی حالت میں انھیں یہیں سے کھانا ملتا ہے اور تنگ دستی و غربت و افلاس میں سب جگہ سے مایوس ہو کر وہ اسی طرف رُخ کرتے ہیں، یہیں انھیں فراخ دستی اور کشائش ملتی ہے اور آرام و اطمینان کی زندگی نصیب ہوتی ہے۔ یہ مظلوموں کی پناہ گاہ ہے اور غریبوں اور مفلسوں کی امید گاہ، ستم رسیدہ لوگوں کو یہیں آکر سکون ملتا ہے۔ فریادوں کی دادرسی کا مقام یہی ہے۔ ذرا سوچ تو سہی، جب عرب یہ سنیں گے کہ جو لوگ حرم کی پناہ میں آتے ہیں انھیں اب پناہ نہیں ملتی۔

مَیں مخزومیوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ان قیدیوں کو آزاد کر دیں اور تجھ سے تیرے لوگوں سے ان کا انصاف کرائیں۔"

ابوجہل کے نتھنے پھول گئے، سانس تیز ہو گیا، چہرہ تمتما اُٹھا اور آنکھیں سُرخ انگارہ ہو گئیں۔ غصے میں لال پیلا ہو کر بولا:

"قسم ہے لات اور عزیٰ کی! جب تک جان میں جان ہے اور ہاتھ میں یہ تلوار، تم ان قیدیوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے مجھے اچھی طرح معلوم ہے مَیں نے اس شہر کے دستور کے خلاف کام کیا ہے، لیکن تمھیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ سے پہلے محمدؐ نے شہر کا دستور توڑا ہے۔"

ولید نے نرمی سے کہا:

"بھتیجے! کیا باتیں کر رہا ہے؟ محمدؐ نے تو کسی گھر میں آگ نہیں لگائی ہے، نہ کسی کو زنجیروں سے باندھ کر گھسیٹا ہے، نہ ہتھکڑیاں پہنائی ہیں۔"

ابوجہل بولا:

"بلکہ اُس نے اس سے بھی خطرناک کام کیا ہے۔ وہ غلاموں کو ہمارے خلاف بھڑکاتا ہے، لوگوں کو ورغلاتا ہے، ہمارے دیوتاؤں سے اُن کو بدظن کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری دولت و ثروت کے خلاف اُن کے جذبات ابھارتا ہے اور ہمارے اُن مراتب اور مدارج کا لالچ دیتا ہے جو ہم نے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پائے لیکن بعد میں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اب ہم ان کی حفاظت اور بچاؤ کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور اپنی تمام قوت صرف کر دیں گے۔"

اُمیہ بن خلف نے کہا:

"شاباش ابوالحکم شاباش! خدا تمھارا بھلا کرے۔ بخدا کل جو کچھ تم نے کیا بالکل ٹھیک کیا، اور آج جو کچھ کہا بالکل بجا کہا۔ خدا کی قسم محمدؐ اور اس کے ساتھی اس قبیلہ کے پہلو میں کانٹا ہیں، جب تک اس کانٹے کو ان کے پہلو سے نکال نہ لیا جائے گا، اس قبیلہ میں اسی طرح گڑبڑ رہے گی۔"

اِس کے بعد ابوسفیان صخر بن حرب کھڑا ہوا، کہنے لگا:

دیکھو! میں بھی مطمئن نہیں ہوں، مجھے اندیشہ ہے کہ کل اگر میں تمہارا تجارتی سامان لے کر شام یا یمن جاؤں اور چند مہینے بعد واپس آؤں تو یہاں اچھے خاصے مالداروں اور خوشحالوں کو ان کے گھروں اور جائدادوں سے محروم پاؤں۔"

ولید بن مغیرہ ہنس پڑا کہنے لگا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مَیں نے اپنے بھتیجے سے بات کر کے تمہارے دل کا چور پکڑ لیا۔ نہ معلوم کیا بات ہے، تم لوگ خواہ مخواہ اتنے ڈرے سہمے نظر آتے ہو۔ خوف کے مارے سٹ پٹا گئے ہو، نہ زبان قابو میں ہے، نہ دل قبضہ میں۔ اپنی اپنی ہانکے جا رہے ہو، گھبراہٹ میں آپے سے باہر ہوئے جاتے ہو۔ ایک ذرا سی ٹولی ہے اُسے نہ جانے کیا سمجھتے ہو؟ گنتی کے چند لوگ ہیں انھیں تم نے کیا سمجھ لیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ بیچارے بے پڑھے سادے مسکین لوگ ہیں۔ آپس میں باتیں کرتے رہتے ہیں، تمہارا آدمی تو کوئی انھوں نے چھینا نہیں ہے اور نہ تمہارے مال و دولت میں سے کچھ لیا ہے۔"

ابوجہل کہنے لگا:

"مَیں اس شجرِ خبیثہ کو جڑیں پکڑنے سے پہلے ہی بیخ و بنیاد سے اُکھیڑ دینا چاہتا ہوں۔ اس شر و فساد کا ہمیں پوری طرح قلع قمع کرنا ہے۔"

ولید بن مغیرہ ہاتھ سے اِدھر اُدھر سہارا لے کر اُٹھا اور متنفرانہ انداز میں اُس کی ہنسی اُڑا کر کہنے لگا:

"بھتیجے! جو کچھ تم کر رہے ہو، خدا کی قسم بہت بُرا ہے طاقتور آدمی اپنے برابر کے لوگوں پر قوت آزمائی کرتا ہے۔ اگر وہ حلیفوں، غلاموں اور کمزوروں پر طاقت آزمائے تو یہ اُس کی بُزدلی اور حماقت ہے۔ لیکن جس کی بات ہی نہ مانی جائے اُس کا مشورہ دینا نہ دینا برابر!"

اس کے بعد قریش کے تمام لوگ اُٹھ اُٹھ کر چلے گئے۔ لیکن ابوجہل اپنے ساتھی نوجوانوں اور غلاموں کو لے کر اپنے قیدیوں کے پاس آیا، اور اُس کوٹھری سے اُن کو باہر نکالا جہاں رات بھر وہ بند رہے تھے۔ پھر ان کو ہانکتا ہوا لے چلا۔ وہ پیچھے سے ان کو ہانکتا جاتا تھا اور دھکے دے دے کر کہتا تھا کہ "قدم بڑھا کر چلو"۔ جو بیچارے زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں کیسے قدم بڑھا سکتے ہیں! لیکن ابوجہل اور اس کے ساتھی ان بیکسوں کو نیزے چبھو چبھو کر تکلیف دیتے۔ خنجر کی نوکوں سے خراشیں ڈالتے اور جگہ جگہ سے زخمی کرتے۔ مگر ان تمام مظالم اور تکالیف کے باوجود اُن کے عزم و ثبات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ظالم کبھی اُن کو کوڑے مار مار کر لہولہان کر دیتے، کبھی یاسرؓ اور عمارؓ کی ڈاڑھی اور سمیہؓ کے بال کھینچتے اور خوب قہقہے لگاتے اور سیٹیاں بجا کر شور مچاتے۔ جہاں جہاں سے یہ گزرے، شور و غل سُن کر لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آتے اور کھڑکیوں، دروازوں، برآمدوں اور جھروکوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ راہ گیر ہر طرف سے اکٹھے ہو کر ان کے گرد جمع ہو جاتے اور یہ دردناک منظر دیکھتے۔ یہ قیدی بیچارے! صاف نظر آتا تھا کہ ان کے دل تو بول رہے ہیں لیکن زبانیں خاموش ہیں، گویا انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ کوئی آہ و فریاد یا حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں گے، نہ کسی قسم کی بے قراری اور تکلیف کا اظہار کریں گے۔

مظلوموں کا قافلہ ظالم کی قیادت میں اسی طرح آگے بڑھتا رہا۔ آخر جب مکّہ سے باہر ایک کھلے ریتلے میدان میں پہنچا تو ابوجہل رُک گیا۔ اُس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی رُک گئے۔ پھر ابوجہل آگے بڑھا اور یاسرؓ کے قریب آکر تمسخرانہ انداز میں کہنے لگا:

"کیوں؟ اب بھی مخزوم کے حلف پر قائم ہے یا نہیں؟ کل تک تو خوب اقرار کر رہا تھا۔"

یاسرؓ نے کہا:

"تو نے ہم پر ظلم توڑ کر خود حلف توڑ دیا ہے۔ اب اِس

کا بوجھ ہم پر نہیں رہا، ہم اس کی ذمہ داری سے اب پوری طرح آزاد ہیں۔"

ابوجہل بولا:

"تو آزاد ہو گیا نا ہمارے حلف سے؟"

یاسر نے کہا:

"ہاں بالکل اِسی طرح، جیسے ہر قسم کی بدی اور رُسوا کُن بُرائی سے آزاد اور بیزار ہوں۔"

ابوجہل نے یہ سُنتے ہی منہ پر ایک شدید ضرب لگائی اور اس کا تمام چہرہ لہولہان کر دیا۔ یہ دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی عمار اور سمیہ کے مُنہ پر مار لگائی اور انھیں بھی خونم خون کر دیا۔

اس کے بعد ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے قیدیوں کو زمین پر لٹانے کے لیے کہا، انھوں نے لٹا دیا۔ پھر اس نے اُن کے سینوں اور پیٹھوں کو گرم گرم سلاخوں اور تپتے ہوئے اوزاروں سے داغنے کا حکم دیا، انھوں نے سب کو داغ دیا، پھر اُس نے ان کی چھاتی پر وزنی پتھر رکھنے کو کہا، وزنی پتھر بھی رکھ دیے گئے پھر اس نے ان کے منہ پر پانی کی مشکیں لنڈھانے کو کہا، انھوں نے مشکیں بھی لنڈھا دیں۔ ادھر ابوجہل بے تاب تھا کہ کسی طرح کسی کے چیخنے چلّانے کی آواز سُنے، کسی کو کراہتا دیکھے، کوئی آہ یا فریاد تو کرے، لیکن ان قیدیوں کے دِل تو آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ایک دوسرے کی باتیں سمجھ بھی رہے تھے، لیکن اُن کی زبانیں گنگ تھیں اور قلب خدا کی یاد سے معمُور۔ انھوں نے اپنے جسموں کو ان ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا، وہ جو چاہتے کرتے۔ آخر جب ابوجہل اور اس کے ساتھی ان بیکسوں کے جسموں سے خوب دِل لگی اور تماشا کر چکے اور ان کے بدنوں پر ظلم کی مشق کرتے کرتے تھک گئے تو ان کو اسی حال میں جھلستی ہوئی گرم ریت پر لیٹا چھوڑ دیا، اور چند پہرہ داروں کو ان کی نگہبانی کے لیے مقرر کر کے چلے گئے، تاکہ کچھ سستا لیں اور سُورج ڈھلنے پر تازہ دم ہو کر ان کی گوشمالی کو پھر آموجود ہوں۔

قبیلۂ خثعم نے آج جیسا مبارک دن کبھی نہ دیکھا تھا۔ آج انھوں نے بغیر لڑے بھڑے دشمن پر فتح پائی اور بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ گویا انھوں نے نجاشی کے مال کی لُوٹ مچا دی تھی اور ان کے لیے اذنِ عام ہو گیا تھا کہ اس میں سے جس قدر چاہیں لے لیں، یہاں تک کہ دل بھر جائے۔ لیکن ان کا دل نہ بھرتا تھا۔ آج ابرہہ کی فوج بڑی طرح شکست کھا کر کتّے اُلٹے پاؤں واپس بھاگ رہی تھی۔ اس کی قوت و شوکت، آن بان اور کرّ و فر بغیر کوئی لڑائی لڑے سب خاک میں مل گیا تھا۔

اِن لوٹ مار کرنے والوں اور حملہ کرنے والوں کے ساتھ سُحیم بن سہیل خثعمی بھی نکل کھڑا ہوا اور ان کے ساتھ مل کر اس لشکر پر حملے کرنے لگا۔ اپنے بھائی بندوں کی طرح اس نے بھی سونے چاندی اور طرح طرح کے مال و اسباب پر ہاتھ صاف کیا۔ لیکن ان سب چیزوں سے قطع نظر اُس نے ایک دوڑتی ہوئی اونٹنی دیکھی جسے ایک درشت، تُند خو اور ترش رُو حبشی ہانک رہا تھا۔ وہ کافی توی اور مضبوط نظر آتا تھا۔ لیکن اب اس کی ہمت جواب دے چلی تھی۔ سحیم بن سہیل نے ذرا اور غور سے دیکھا تو اس کو اونٹنی پر ایک بڑا عمدہ ہودہ نظر آیا جس پر کارچوبی اور ہیرے جواہرات سے مُرصع ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ اس کو دیکھ کر بڑا للچایا اور ہاتھ میں نیزہ گھماتا ہوا اس غلام کی طرف دوڑا۔ غلام نے اُس کو دیکھتے ہی اونٹنی کی نکیل فوراً اُس کے حوالے کر دی اور اس کے آگے آگے بڑی عاجزی اور فرماں برداری سے چلنے لگا۔

سحیم بن سہیل نے اُس سے پوچھا:

"یہ اونٹنی اور ہودہ کس کا ہے؟"

غلام نے ٹوٹے پھوٹے عربی لہجے میں کہا:

"یہ سردار کی بھانجی ہے۔"

سحیم بن سہیل، غلام اور اونٹنی کو گھر کی طرف ہنکاتا لے جا رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

"مالِ غنیمت میں سے مجھے تو صرف یہ غلام اور اونٹنی اور اس پر لدا ہوا ساز و سامان ہی کافی ہے، رہی ہودہ والی خاتون، تو اس کا اور میرا کیا تعلق، اسے کسی قریشی سردار کو تحفہ میں پیش کر دوں گا۔"

وہ اسی طرح چلا جا رہا تھا اور غلام بھی اونٹنی کو لیے اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ جب وہ اپنے قبیلہ کے ڈیرے خیموں کے پاس پہنچا تو غلام کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ غلام نے اونٹنی کو بٹھا دیا اور خود کچھ دور نیچے زمین کی طرف سر جھکا کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ سحیم بڑی آہستگی سے ہودہ کے قریب آیا اور بڑی نرمی سے اس کا ایک پردہ اٹھایا ہودہ میں نظر ڈالی اور پھر ہٹا لی، اس کا چہرہ فرحت و مسرت سے کھل اٹھا، خوشی کے جذبات سے بے قابو ہو کر بولا:

"ربِ کعبہ کی قسم! یہ تو سچ مچ حمامہ (کبوتری) ہے! نازک بدن، پری چہرہ!!"

اس کی حیرت اور مسرت بجا تھی۔ اس نے ایک نہایت حسین دوشیزہ کو دیکھا تھا جو باوجود اپنی سانولی رنگت اور گندمی جلد کے حسن و جمال کا ایک نادر نمونہ تھی۔ قیامت کی نظروں والی، نہ زیادہ دراز قد، نہ زیادہ فربہ بدن، بلکہ قدرے دُبلی پتلی اور نازک اندام تھی، خوف و دہشت کی وجہ سے بیچاری سہمی بیٹھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود دلجمعی اور ضبط و تحمل سے کام لے رہی تھی۔ حیا اور وقار نے اس کو بے صبری اور گھبراہٹ کی دلی کیفیات کا اظہار کرنے سے روکے رکھا اور بے چین و بدحواس نہ ہونے دیا۔

پھر اس نے دوشیزہ کو بڑی نرمی و سہولت اور عزت و احترام کے ساتھ ہودہ سے نکالا۔ ساتھ ساتھ کہتا جاتا تھا:

"بیٹی! ڈرو مت، ڈرو مت، میں تم سے کوئی بُرا سلوک نہیں کروں گا، کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔"

پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ آہستہ اپنے گھر لے گیا اور دوشیزہ بھی اس کے حکم پر چلتی رہی۔ اُسے بغیر اس کے چارہ ہی کیا تھا! جب وہ اسے لے کر گھر میں داخل ہوا تو اپنی بیوی سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ تاکید کرتے ہوئے کہنے لگا:

"اس حمامہ (کبوتری) کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، بس یہی میری نصیحت ہے۔ کیونکہ قبیلہ خثعم کا گھرانا اس کے لائق نہیں، اس کا اصل مقام تو کسی قریشی سردار کا گھر ہے۔"

اس کے بعد ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ سحیم بن سہیل، خلف بن وہب جمحی کے پاس اُس کی زرعی اراضی میں ملنے گیا جو سراۃ میں واقع تھی۔ وہ اپنی اس شہزادی حبشی دوشیزہ کو لے کر وہاں پہنچا اور خلف کے گھر میں جا کر ٹھہرا۔ خلف کے گھر والوں نے اہلِ عرب کے دستورِ میزبانی اور قریش کے آدابِ مہمان نوازی کے مطابق اُس کی خوب آؤ بھگت کی۔ لیکن ابھی وہ سلام دُعا سے فارغ ہی ہوا تھا کہ بولا:

"سردار جمح! کاش تم جانتے کہ میں تمھارے لیے کیا لایا ہوں!"

خلف نے کہا:

"کوئی بھلی چیز ہی لائے ہو گے۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ تم ضرور کوئی اچھی چیز لائے ہو۔"

سحیم نے کہا:

"میں تمھارے لیے اُس سردار کی بھانجی لایا ہوں جو بیت اللہ پر حملہ کرنے آیا تھا لیکن ربِ کعبہ نے اس کو دھتکارا اور ذلیل و خوار کر کے لوٹا دیا۔"

خلف بولا:

"کیا ابرہہ کی بھانجی ہے؟"

سحیم نے کہا:

"ہاں! ابرہہ کی بھانجی!"

خلف سحیم سے پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ اس دوشیزہ کی کیا قیمت مانگتا ہے۔ لیکن سحیم فوراً ہی بولا:

"ذرا ٹھہرو ابوامیّہ! دیکھو میں یہ شہزادی تمہارے پاس بیچنے کی غرض سے نہیں لایا بلکہ تحفہ میں لایا ہوں سو اس کو اپنے دوست کا تحفہ سمجھو۔"

خلف نے کہا:

"تمہارے عطیّہ کا بہت بہت شکریہ! خدا تمہارے تعلق کو قائم رکھے!!"

پھر اس نے دوشیزہ کو اندر لے جانے کا حکم دیا اور وہ گھر والوں کے پاس پہنچا دی گئی۔ اس دوران میں سحیم نے محسوس کیا کہ اس کے تحفہ کا اس کے دوست کے دل پر وہ اثر نہ ہوا جس کا وہ متمنی تھا۔ لیکن خلافِ توقع خلف نے سر اُٹھایا اور بولا:

"سحیم! جانتے ہو، آج جو احسان تم نے مجھ پر کیا ہے، ایسا احسان پہلے کبھی نہ کیا ہوگا۔ دیکھو ہم نے ابرہہ سے جنگ نہیں کی اور نہ بیت اللہ کی مدافعت کا کوئی انتظام کیا۔ بلکہ ہم نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم اس کے پاس سے منتشر ہو جائیں اور وہاں سے الگ ہٹ کر اس کی حمایت اور حفاظت صرف اس کے پروردگار پر چھوڑ دیں۔ چنانچہ اس گھر کے مالک نے اپنے مقدس گھر کی خود حفاظت کی! اور ابرہہ، اس کے ہاتھیوں اور لشکریوں سب کو دھکیل کر ہم سے پھیر دیا اور ہم یہ منظر پہاڑوں کی چوٹیوں، گھاٹیوں اور ان دروں سے دیکھتے رہے جہاں ہم نے اِدھر اُدھر منتشر ہو کر پناہ لی تھی پھر جب دشمن واپس بھاگ گیا تو ہم مکہ میں اپنے گھروں کو لوٹ آئے، اُس وقت بہت سے لوگوں کے دل حسرت و افسوس میں مبتلا تھے، کیونکہ ہم نے اس مقدس گھر کی حفاظت و مدافعت کا حق اور حمایت و پاسداری کا فرض جو ہمیشہ سے ہمارے ذمہ ہے ادا نہیں کیا تھا۔ لیکن اب اِس امیرزادی کو میرے پاس لا کر تم نے مجھے دل کی بھڑاس نکالنے اور دشمن کی آگ ٹھنڈی کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ قسم ہے اُس پروردگار کی جس کے گھر کا میں نے تحفظ نہیں کیا۔ میں اس حبشن امیرزادی کو ایسا ذلیل و خوار کروں گا کہ کوئی حبشن ایسی ذلیل و خوار نہ ہوئی ہوگی۔"

سحیم بولا:

"بڑا افسوس ہے ابوامیّہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اِس نازک بدن حسین کبوتری سے یہ بدسلوکی کرو گے تو میں اس کو تمہارے پاس ہرگز نہ لاتا، اپنے گھر ہی رکھتا۔"

خلف ہنس کر کہنے لگا:

"واہ سحیم! یہ تو اُس ہستی کا طے کیا ہوا اٹل فیصلہ ہے جو مجھ سے اور تم سے اختیار و اقتدار میں بڑھ کر ہے۔ اِس امیرزادی کو اسی حرم کے قریب ذلیل و خوار ہونا چاہیئے، جس کی بے حرمتی کا ارادہ اس کی قوم نے کیا تھا۔ خدا کی قسم! جب تک میں زندہ ہوں یہ آزادی سے کبھی آشنا نہ ہوگی اور نہ آزاد بچے جنے گی۔"

سحیم نے کہا:

"پھر تو معلوم ہوتا ہے کہ تم اسے اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اگر ایسی ہی بات ہے تو یہ مجھے واپس دیدو۔"

خلف ٹھٹھا مار کر ہنسا اور کہنے لگا:

"واہ سحیم واہ! میں تو اسے تمہارے لیے بھی پسند نہیں کرتا۔ میں نے کہا ہے نا کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ آزاد بچے نہیں جنے گی۔ اس زمین میں میرے بہت سے اونٹ اور بکریاں ہیں جنھیں میرے غلام چراتے ہیں۔ ان غلاموں میں

گورے کالے ہر طرح کے ہیں۔ یہ بھی اُن ہی غلاموں کے ساتھ اونٹ اور بھیڑ بکریاں چرائے گی۔"

خلف کا ایک حبشی نژاد غلام تھا جسے رباح کہتے تھے۔ وہ کچھ اوپر پچیس برس کا ہوگا۔ بڑا ذہین ہوشیار، کام کاج میں ماہر اور زیرک و دُور اندیش تھا۔ اُس کے آقا نے خوش ہو کر اُسے آزاد کر دیا تھا اور اپنی سراۃ والی زمین کا نگران مقرر کر دیا تھا۔ صبح ہوئی تو خلف نے اپنے اُس آزاد کردہ غلام کو بلایا اور مسکرا کر کہنے لگا:

"دیکھو بھئی رباح! یہ تمہارے امیروں میں کی ایک امیرزادی کل ہمارے پاس لائی گئی ہے اور جو کچھ تمہاری قوم نے کیا ہے تمہیں معلوم ہی ہے۔ لہٰذا میں نے طے کیا ہے کہ میں اس سے اونٹ اور بکریاں چرواؤں گا تو کیا میں اسے تمہارے سپرد کر دوں تاکہ تم اس کو ایسا ذلیل و خوار کرو کہ میں بھی سمجھوں کہ ہاں واقعی یہ اسی لائق ہے؟"

رباح بولا:

"تو پھر انتظار کس بات کا ہے سردار؟ تم تو ہر قسم کے غلاموں کے ساتھ میرا برتاؤ دیکھ چکے ہو۔ کیا میں نے تدبیروں سے، ترکیبوں سے اور ہر قسم کی ذہانت اور فراست لڑا کر اُن کو تمہاری بہتر سے بہتر خدمت پر آمادہ نہیں کیا ہے اور ان سے ہر طرح کے کام نہیں لیے ہیں؟"

خلف نے کہا:

"ہاں بے شک! تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا تو اس لڑکی کو لے جاؤ اور اسے چرواہوں کا لباس پہنا کر اس کے ہم پیشہ لوگوں میں بھیج دو!"

رباح بولا:

"سردار! اس میں تو مجھے کوئی ذلت یا رُسوائی نظر نہیں آتی میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے، ممکن ہے اس سے تمہارا مقصد پورا ہو جائے، اجازت ہو تو پیش کروں؟"

خلف نے کہا:

"بتاؤ کیا ہے؟"

رباح نے کہا:

"یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ میں نہ حبشہ کا کوئی رئیس ہوں، نہ وہاں کا کوئی سردار، بلکہ محض ایک عام آدمی ہوں اور میری رگوں میں زنگی نسل کا خون ہے۔ اگر میں تمہارے ملک میں نہ لایا گیا ہوتا اور وہیں حبشہ میں ہوتا تو اِس شہزادی کے محل میں ملازم ہونے کی آرزو بھی نہ کر سکتا تھا۔"

خلف مسکرا دیا، خوش ہو کر کہنے لگا:

"تو تم اِسے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو؟"

رباح بولا:

"ہاں اگر تم اِس کی اور حبشہ کے سرداروں اور سالاروں کی ذلت و رُسوائی چاہتے ہو تو اس کو اپنے حبشی غلام سے بیاہ دو۔"

خلف نے کہا:

"چلو میں نے بیاہ دیا۔ آج سے تم اِس کے خاوند ہو۔ جب دن ذرا چڑھ جائے تو بڑی خوشی سے اپنی بیوی کو ساتھ لے جانا۔"

اس زنگی غلام نے اپنی اِس پیش کردہ تجویز میں بڑی چالاکی سے کام لیا تھا اور بہت دُور کی تدبیر سوچی تھی اور شاید اس دن سے پہلے اس نے کبھی اپنے آقا سے چالبازی اور حیلہ گری نہیں کی تھی اور نہ کبھی جھوٹ بولا تھا۔ لیکن اس مرتبہ اُس کو اِس شہزادی کا پورا حال معلوم ہو گیا تھا اور اُس پر ظاہر ہو گیا تھا کہ اُس کا آقا اِس بیچاری کو ذلیل کرنا چاہتا ہے، یہ چیز اس پر شاق گزری اور اُس نے سوچا کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ جو رُسوائی اور ذلت

اس پر مسلط کی جا رہی ہے اُس سے یہ محفوظ رہ سکے۔ لیکن اس کو سوائے اِس ترکیب کے اور کوئی صورت اُس کے چھٹکارے کی نظر نہ آئی۔

رباح اپنی شہزادی کو ساتھ لے آیا اور اپنے حقیر سے فقیرانہ گھر میں اُسے ٹھہرایا۔ وہاں وہ بہت عزت و اکرام کے ساتھ اس سے پیش آتا رہا اور اس کے ساتھ بڑی نرمی کا سلوک کرتا رہا۔ جس قدر محبت و الفت اور تعظیم و احترام کے جذبات اس کے لیے وقف کر سکتا تھا اس نے کیے۔ صبح و شام اس کی پسندیدہ اور مرغوب چیزیں اس کے پاس لاتا اور دن بھر کوئی ایسی بات نہ ہونے دیتا جو اُسے بڑی معلوم ہو۔ جب رات ہو جاتی اور سونے کا وقت قریب آجاتا تو وہ دروازے کے باہر چوکھٹ پر تکیہ رکھ کے اُس پر پڑا رہتا اور تمام رات سو کر گزارتا یا جاگ کر۔ وہ ہمیشہ اپنی بیوی کی فکر میں لگا رہتا اور کبھی آرام کی نیند نہ سوتا۔ خود وہ اُسے چھوتا تک نہ تھا، نہ اُس کے قریب جاتا تھا۔

وہ دوشیزہ بھی اپنے خاوند کے آگے بڑی عاجز اور فرماں بردار بنی رہی، لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ اس کی تعظیم و توقیر کرتا ہے اور مہربانی سے پیش آتا ہے تو مطمئن ہو گئی اور اُس کے دل کو سکون میسّر آگیا۔ پھر وہ اپنے بلند درجہ اور اعلیٰ مرتبہ کا خیال کر کے اس سے ایک مالکہ کی حیثیت سے گفتگو کرنے لگی، لیکن کچھ عاجزی بُردباری اور نرمی کے ساتھ۔

اِن دونوں کا باہمی رشتہ عجیب نوعیت کا تھا۔ خلف اور اُس کے ہم رتبہ قریشی سرداروں کے نزدیک تو یہ دوشیزہ رباح کی بیوی تھی، اسی طرح رباح کے ماتحت غلام بھی اُسے رباح کی منکوحہ سمجھتے تھے، لیکن اگر اُن دونوں کے اندرونی حالات اور باہمی تعلقات کو دیکھا جائے تو وہ رباح کی مالکہ اور شہزادی معلوم ہوتی تھی، خود رباح بھی اس کو یہی سمجھتا تھا۔

مگر اس نوجوان نے یہ بات دل ہی میں چھپائے رکھی اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دی۔ لیکن دوشیزہ اُس کے پوشیدہ ارادہ کو بھانپ گئی اور بڑی خوشی سے اُس کو قبول کیا۔ پیہم احسانات سے لڑکی کے دل میں اُس نوجوان کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات پیدا ہو گئے، پھر کچھ کشش محسوس ہونے لگی، پھر اُس کی فوقیت اور مرتبہ کا خیال دل میں آنے لگا، پھر یہ صورت ہو گئی کہ وہ ذرا دیر کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل ہوتا تو یہ بے چین ہو جاتی اور تنہائی محسوس کرنے لگتی۔

دن گزرتے گئے، ہفتے بیتتے گئے اور وہ نوجوان اپنی پُرخلوص محبت اور خدمت گزاری کا فرض اسی طرح خوش اسلوبی سے ادا کرتا رہا۔ اِدھر یہ لڑکی اِس جانگسل بے چینی اور درد انگیز اضطراب میں مبتلا رہی۔ پھر اُس کے دل میں یہ خواہش اُبھری کہ اِس طویل عرصہ میں ہم دونوں جس قدر ایک دوسرے مانوس ہوئے ہیں اب اس سے کہیں زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہونا چاہیے۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ کاش ہم دونوں کے درمیان جو خواہ مخواہ کی رکاوٹیں حائل ہیں میں ان کو دُور کر سکتی اور اس طرح برابر کے ساتھیوں کی طرح ہم ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے۔ لیکن اس کے لیے اُسے کوئی سہل اور ممکن ذریعہ نظر نہ آتا تھا۔

نوجوان کے دِل میں اِس قسم کی کوئی آرزو یا اُمید پیدا نہ ہوئی تھی کہ وہ اب یا بعد میں کبھی اس دوشیزہ کے ساتھ خاوند کی حیثیت سے رہے گا۔ اس کے سان و گمان میں بھی یہ نہیں آسکتا تھا کہ اس کے اور اس کی امیرزادی کے درمیان جو خلیجیں حائل ہیں وہ کبھی پاٹی بھی جا سکتی ہیں یا جو بُعد دونوں کے درمیان موجود ہے وہ دُور بھی ہو سکتا ہے یا کسی وقت وہ لالچی نظروں سے اُسے دیکھ بھی سکتا ہے۔ اُس کے خیال میں وہ ایک تختِ شہی پر متمکن شہزادی تھی جس تک نظریں تو جا

سکتی تھیں لیکن اس کی دلی خواہش کا وہاں گزر ہونا ایک امرِ محال تھا، کجا کہ اس کے قدم اس تک پہنچیں۔

اس طرح اُن دونوں کے درمیان عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ لڑکی تو اس کی عاشقِ زار تھی، لیکن نوجوان اپنے آپ کو اُس سے عشق و الفت رکھنے کے لائق نہیں سمجھتا تھا بلکہ کہیں فروتر خیال کرتا تھا۔ بعض اوقات تو یہ لڑکی اِس انوکھے رشتہ اور نرالے تعلق سے تنگ آجاتی، کبھی نوجوان سے بد دِل ہو جاتی اور اس کو مغرور و متکبر سمجھتی، گو نوجوان کے دل میں بدستور خاکساری اور تواضع کے جذبات موجود تھے۔ لڑکی کا دل گھبرانے لگا اور اس کی اُکتاہٹ اور کبیدگی روز بروز بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ اُس کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو گیا اور وہ ہر اچھی بُری بات سے نفرت کرنے لگی۔ آخر ایک روز تنگ آکر بولی:

"تم مجھ پر لطف و نوازش کر کے احسان کرنا چاہتے ہو لیکن اس بے محل احسان سے نادانستہ مجھے تکلیف دے رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہاری اِس نوازش و کرم کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت مند ہوں۔"

نوجوان نے بڑی عاجزی اور انکساری سے پوچھا:

"وہ کیا چیز ہے؟"

لڑکی نے طنزیہ انداز میں ایک تلخ چبھتا ہوا، دلخراش ٹھٹھا لگایا اور بولی:

"تم جانتے ہو کہ تم آزاد ہو اور میں......."

نوجوان بیچ میں ٹوک کر بولا:

"نہیں بلکہ نیا نیا آزاد ہوا ہوں۔ دو سال پہلے میں بھی غلام تھا۔"

وہ بولی:

"دو سال پہلے ہو گے، لیکن اب تو آزادی مل گئی ہے اور غلامی کا طوق اُتر گیا ہے۔ اِس لحاظ سے تم میری نسبت اچھے حال میں ہو اور اونچے رُتبہ پر ہو۔ پھر عاجزی و انکساری اور خاطر مدارت کیسی، جو تم عرصہ سے کرتے آرہے ہو؟ حالانکہ تمہیں حق ہے۔ بڑائی اور تکبر کا نہیں کہہ رہی بلکہ ہمارے موجودہ تعلق پر غور کرنے کا اور آئندہ ہونے والے رشتہ کو سوچنے سمجھنے کا۔ تمہارا خیال ہے کہ میں شہزادی یا امیرزادی ہوں اور اسی لیے تم میری امارت اور شہزادگی کے حقوق کی حفاظت اور نگہبانی کر رہے ہو لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میری امارت اور شہزادگی بیتے ہوئے دنوں کے ساتھ بیت گئی۔ جب تم آزاد ہوئے میں غلام ہو گئی اور پھر تم نے مجھے اپنی بیوی بنا لیا۔"

نوجوان کہنے لگا:

"میں نے تو تمہیں اِس لیے بیوی بنایا تھا کہ کوئی تم سے بدسلوکی نہ کر سکے۔"

لڑکی بولی:

"بے شک تم نے اپنا فرض ادا کر دیا اور اِس کی احسان مند ہوں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اب تمہاری بیوی بن چکی ہوں، لہٰذا ہمارا آپس میں وہی تعلق ہونا چاہیے جو میاں بیوی میں ہوتا ہے۔"

یہ سُننا تھا کہ رباح کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے، نہیں معلوم وہ آنسو خوشی کے تھے یا غم کے۔ یہ دیکھ کر لڑکی کے چہرے پر بھی سُرخی دوڑ گئی اور اُس کے رُخسار لال بھبوکا ہو گئے، نہیں کہا جا سکتا کہ آیا یہ سُرخی شرم و حیا کی تھی یا مسرت و شادمانی کی، کیونکہ اب وہ ان خلیجوں اور گھاٹیوں کو عبور کر چکی تھی جو اس کے اور اس کے محبوب خاوند رباح کے درمیان حائل تھیں۔

ایک روز خلف اپنی سراۃ والی زمین میں آیا اور کچھ دن وہاں قیام کر کے اس کا جائزہ لیا اور تمام حالات معلوم کیے۔ اپنے منتظم رباح سے وہ تمام باتیں سُنیں جو سُننا چاہتا تھا اور یہ سب حالات دیکھ سُن کر وہ مطمئن ہو گیا، کیونکہ اُس

کی اراضی کا تمام کاروبار حسب منشا ٹھیک طور پر چل رہا تھا۔ خلف اس قدر خوش ہوا کہ اس نے کچھ اونٹ اور بکریاں رباح کو عطا کیں اور اپنی زمین کی پیداوار میں سے بھی بہت کچھ دیا۔ رباح نے بھی انعام و اکرام کا شکریہ ادا کرکے اپنے آقا کا دل خوش کر دیا۔ رباح اب خوشی خوشی واپس جانے والا تھا کہ خلف نے اُسے روک لیا اور بڑے میٹھے انداز میں دل لگی اور مذاق کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ارے میاں رباح! ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں میں سے آخر بانجھ کون ہے؟..... دیکھو نا تمہیں وہ حبشی حمامہ سپرد کیے ایک عرصہ گزر گیا ہے لیکن تمہارے کوئی اولاد ہی ہوتی نظر نہیں آتی۔"

یہ سُن کر رباح جھنجلا گیا، اُس نے کچھ بات کرنی چاہی لیکن شرم و حیا سے اُس کی زبان بند رہی، اس نے آنکھیں نیچی کریں اور سر جھکا لیا۔ لیکن خلف نے پھر وہی سوال دہرایا اور ہنستے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ہاں بھئی رباح! بتاؤ بھی، آخر تم دونوں میں سے بانجھ کون ہے؟"

اب اُس کے دل میں کچھ جرأت پیدا ہو گئی اور خودداری کا احساس ہونے لگا، اس نے ہمت کرکے بے باکی سے جواب دیا۔

"لیکن تمہیں اس سے کیا، ہم خواہ بانجھ ہوں یا بال بچے والے ہوں؟"

یہ صاف جواب سُن کر خلف ٹھٹک گیا اور انداز بدلتے ہوئے کہنے لگا۔

"رباح ذرا تحمل سے بات کرو۔ شاید غصہ میں تم کچھ بھول رہے ہو۔ گو تم آزاد ہو لیکن تمہاری حمامہ تو ابھی میری ہی باندی ہے۔ پھر مجھے کیوں نہ فکر ہو گی؟"

رباح ناراض ہو کر بولا:

"اچھا تو تم نے اُسے میرے ساتھ اس لیے بیاہا تھا کہ بچے جنواؤ جیسے اونٹ اور بکریوں سے بچے جنواتے ہیں۔"

خلف نے کہا،

"رباح تم تو ناراض ہو گئے، مَیں تمہیں کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا، مَیں تو دوستانہ طور پر تمہارے حالات معلوم کر رہا تھا۔"

رباح بولا:

"یہی بات ہے تو جو چاہو معلوم کرو۔"

پھر اُس نے اپنا سر پیٹ لیا اور درد بھری آواز میں کہنے لگا:

"ہائے افسوس! مَیں یہ تو بھول ہی گیا کہ وہ لونڈی ہے اور اُس کا لڑکا بھی اسی کی طرح غلام رہے گا۔"

خلف نے تعجب سے پوچھا:

"رباح! کیا واقعی اُس کے لڑکا ہے؟"

رباح نے کہا۔

"ہاں لڑکا ہے اور اگر میرا دل آمادہ ہو جاتا اور طبیعت کو کچھ بھی گوارا ہوتا تو مَیں اُس کو زندہ درگور کر دیتا جیسے تم اپنی لڑکیوں کو کرتے ہو۔ انسان اِس بات سے کبھی خوش نہیں ہو سکتا کہ اُس سے اونٹ بکریوں کی طرح نسل کشی کرائی جائے اور مویشیوں کی طرح جفتی کرا کے بچے پیدا کرائے جائیں۔"

خلف کچھ آزردہ ہو کر بولا:

"افسوس ہے رباح! تم بلاوجہ میرے دل کو دُکھ پہنچا رہے ہو اور اپنی جان بھی ہلکان میں ڈال رہے ہو۔ بخدا مَیں نے تم سے نہ نسل کشی کرانے کا ارادہ کیا ہے نہ بچے جنوانے کا۔ تمہیں یاد ہو گا مَیں نے تم سے کیا کہا تھا۔ مَیں نے یہی کہا تھا کہ اس لڑکی کو دوسرے چرواہوں کے ساتھ اونٹ بکریاں چروانے میں لگا دینا، لیکن تم نہ

مانے اور اصرار کرنے لگے کہ مَیں اسے تمہاری بیوی بنا دوں۔ تمہارا دعویٰ تھا کہ اس طرح اس کی ذلت و خواری زیادہ ہو گی اور میری خواہش بہتر طور پر پوری ہو گی۔ تو پھر اب یہ ناراضگی کیسی؟ اور اس قدر خفگی کیوں؟..."

یہ سُن کر رباح دم بخود رہ گیا۔ اُس کو اب پچھلی تمام باتیں یاد آنے لگیں کہ اُس نے حبشی شہزادی کو ذلت و رسوائی سے بچانے کے لیے کیا تدبیر کی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کو یا اس کی بیوی کو کوئی نقصان پہنچے۔ یہ سوچ کر وہ بناوٹی طور پر ہنسا جس سے رونا ہزار درجہ بہتر تھا۔ پھر کہنے لگا۔

"اب کیا بتاؤں؟ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے دل میں جاگزیں ہو گئی اور مَیں اُس سے محبت کرنے لگا۔"

خلف بولا:

"اچھا! اب اُس سے محبت کرنے لگے!! اور کہہ یہ رہے تھے کہ مَیں اسے ذلیل کروں گا!"

رباح کہنے لگا:

"سوچنے کی بات ہے، پہلے وہ ایک شہزادی تھی، پھر باندی بنی، پھر ایک ایسے غلام سے بیاہی گئی جو اُس کا نوکر ہونے کی بھی آرزو نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے یہ رشتہ پہلے تو مجبوراً گوارا کیا، پھر رضامندی سے، اور پھر اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہوئے اسے قبول کیا۔ آخر بتاؤ تو سہی تم ایسی مظلوم اور شریف النفس لڑکی کو میرے ہاتھوں کیوں ذلیل کرانا چاہتے ہو؟"

یہ سُن کر خلف بہت مایوس ہوا، غمگین آواز میں بولا:

"اچھا یہ بات ہے! یوں کہو کہ غلامی نے تمہارے مابین جو رُتبوں کا فرق اور درجوں کی تقسیم کی تھی، اُسے ختم کر دیا۔"

رباح ہنس کر کہنے لگا:

"کیا یہ عجیب بات نہیں کہ غلامی تو لوگوں میں برابری اور مساوات قائم کرے اور درجوں کی تقسیم مٹا دے۔ مگر آزادی ان میں باہم فرق و امتیاز پیدا کرے اور امیر غریب، حاکم محکوم طاقت ور کمزور اور آقا غلام کے طبقے بنائے۔ خدایا! یہ اندھیری رات کب ختم ہو گی اور وہ سہانی روشن صبح کب نمودار ہو گی؟"

خلف متعجب ہوا، پوچھنے لگا۔

"واہ رباح! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کونسی رات؟ کونسی صبح؟"

رباح بولا:

"رات یہی زمانہ ہے جس میں ہم تم زندگی گزار رہے ہیں جس میں غلاموں کے درمیان غلامی، مساوات قائم ہے اور آزادوں کے درمیان آزادی، تفریق پیدا کرتی ہے اور صبح وہ آنے والا زمانہ ہے جس میں آزاد اور غلام دونوں کے درمیان مساوات قائم ہو گی اور لوگ صرف اپنے اعمال و کردار کے اعتبار سے ایک دوسرے سے افضل ہوں گے نہ کہ مال و دولت کے لحاظ سے۔"

خلف ہنس پڑا، کہنے لگا:

"رباح! آج تو تم کچھ نجومیوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ چھوڑو اپنی اِس اندھیری رات اور روشن صبح کو۔ ذرا اُس بچہ کے بارے میں کچھ بتاؤ جسے تم زندہ درگور کرنا چاہتے تھے۔ آخر اس کا نام کیا ہے؟ کیسی شکل صورت ہے؟"

رباح بولا:

"تم میری رات اور صبح کا مذاق اڑاتے ہو۔ انشاء اللہ یہ رات ختم ہو کر رہے گی اور اُمید ہے کہ ہم اس کے خاتمہ کو دیکھ لیں گے، اور وہ صبح روشن ہو کر رہے گی اور اُمید ہے کہ ہم اُس کی روشنی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور اگر ہم نہ دیکھیں گے تو تمہارا بیٹا اُمیہ اور میرا بچہ بلال اُسے ضرور دیکھ لے گا۔"



۱۳۴۷

نمونۂ خطاطی



خلف نے سر ہلایا، شانے چڑھائے، پھر کہنے لگا:

"بس بھی کرو رباح! یہ باتیں اب کسی اور سے کرنا۔ مَیں تمہارے اس نومولود بچے کی خاطر تمہاری تنخواہ میں اضافہ کیے دیتا ہوں۔ اور اگر مَیں نے ایک بڑی قسم نہ کھائی ہوتی تو مَیں ضرور تمہاری بیوی کو آزادی دے دیتا اور تمہارے بیٹے کو بھی تمہاری طرح آزاد کر دیتا، لیکن تم جانتے ہو وہ ہمیں ذلیل کرنے اور ہمارے مقدس مقامات کی بے حرمتی کرنے، ہم سے جنگ کو آئی تھی۔ لہٰذا اب تم اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو اور اپنے بچے کے ساتھ راضی خوشی رہو، جب تک مَیں زندہ ہوں تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی، مگر مَیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

رباح نے تمسخرانہ انداز میں سر ہلایا اور کہنے لگا:

"ہونہہ! وہ تم سے جنگ کرنے آئی تھی! جنگ کرنا جانتی بھی تھی وہ!! بے چاری سیدھی سادھی انجان لڑکی جسے اپنی بھی کچھ خبر نہ ہو جنگ کرنا کیا جانے۔ لیکن زمانہ کا عجیب قاعدہ ہے، جرم تو بڑے لوگ کرتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں چھوٹے۔"

خلف بولا:

"آج جیسا دانا شخص مَیں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اچھا جاؤ اور خوش و خرم زندگی بسر کرو لیکن اپنی اِس دانائی اور حکمت کا پرچار لوگوں میں نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔"

رباح اور حمامہ کافی مدت تک زندگی کے دن اِسی طرح گزارتے رہے پھر وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے پیچھے اپنے دو لڑکوں کو خلف کی اراضی میں کام کرتا چھوڑ گئے۔

اس کے بعد خلف بھی اِس دارِ فانی سے کوچ کر گیا اور اپنے پیچھے اس دنیا میں ایک مضبوط قوی اور کڑیل جوان بیٹے اُمیّہ کو چھوڑ گیا جو اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ تمام دھن دولت، کھیتی باڑی، ڈھور ڈنگر اور لونڈی غلاموں کا وارث بنا۔ اندھیری رات کا اختتام اور صبح روشنی کی نمود نہ رباح دیکھ سکا، نہ حمامہ دیکھ سکی، نہ خلف دیکھ سکا۔ البتہ بلال نے اُس صبح کا ظہور دیکھا اور اس کا نور اس کے دِل میں سما گیا۔

"تم لوگ اس بچہ پر بڑی سختی کرتے ہو...... اِس ننھی سی جان پر یہ ظلم توڑ رہے ہو! آج جیسے سنگدل، ظالم، پتھر جیسے کلیجے والے آدمی مَیں نے کبھی نہیں دیکھے!"

یہ الفاظ کہہ کر اُمِ انمار بنی عامر کے ان گنواروں میں جا گھسی، کسی کو سینہ پر مکا مار کر ہٹایا اور کسی کو کپڑے کھینچ کر الگ کیا۔ وہ اُن لوگوں کو ایک بچہ پر سے ہٹا رہی تھی جس پر یہ بُری طرح ٹوٹ پڑے تھے اور تھپڑ، چانٹے اور دھول مار رہے تھے اور ساتھ ساتھ جھڑکیاں بھی دیتے جاتے تھے بنی عامر کا یہ گروہ نجد سے آیا تھا اور اپنے ساتھ عراق کا غلّہ تجارت کے لیے اونٹوں پر لایا تھا۔ جب انھوں نے اپنا سامانِ تجارت بیچ دیا اور مال اٹھانے والے سواری کے جانور بھی فروخت کر دیئے تو آخر میں اِس لڑکے کو بیچنے کی ٹھانی۔ اِدھر اُدھر اُسے لیے پھرے جگہ جگہ فروخت کے لیے پیش کیا، مگر اس کو خریدنے والا کوئی نہ ملا۔ پھر انھوں نے سوچا کہ اس کو لے کر واپس چلیں اور جو قبائل عرب راستے میں آئیں یہ غلام ان کے آگے فروخت کے لیے پیش کریں۔ اس غلام نے کچھ لیس و پیش کی اور ساتھ جانے سے بھی انکار کر دیا۔ جب انھیں اس کی سرتابی کا علم ہوا تو اور بھی سختی اور ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ ابھی وہ اس کو مار پیٹ رہے تھے کہ اتنے میں ام انمار خزاعیہ اِدھر آنکلی۔ لڑکے کی تکلیف دیکھ کر اس کا دل پسیجا، ترس کھا کر اُسے بچانے لگی اور ان لوگوں کو ہٹانے لگی۔ یہ دیکھ کر بنی عامر کے اس گروہ کا ایک شخص اُمِ انمار سے کہنے لگا:

"تجھے اِس سے کیا؟ ہم نے ایسی بڑی عورت کبھی نہیں دیکھی، اگر تو اِس حرم سے کہیں باہر ہوتی تو ہم تجھے اچھی طرح مزا چکھا دیتے۔"

اُم انمار غصہ کی وجہ سے چپ سی ہو گئی اور اس کے جھری دار چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ آنے لگی بولی:

"چونکہ میں حرم میں ہوں اس لیے تم مجھ پر دست درازی نہیں کر سکتے۔ لیکن تمہیں اپنے ان چوڑے چکلے جسموں، لمبی لمبی کالی سفید ڈاڑھیوں اور شانہ تک لٹکی ہوئی لمبی لمبی زلفوں پر شرم نہیں آتی کہ اِس دُبلے پتلے کمزور بچے کو مار پیٹ رہے ہو!"

ایک عامری نے کہا:

"اگر اِس کے کھلانے پلانے کی فکر اور دوسرا بوجھ جو ہم پر ہے تجھ پر ہوتا تو کبھی تجھے ترس نہ آتا، اور نہ اس پر رحم کھاتی۔ بخدا یہ بالکل ناکارہ غلام ہے، ہم پر ہر طرح کا بوجھ تو ڈالتا ہے لیکن فائدہ کچھ نہیں دیتا۔ یہی نہیں بلکہ ہمارا کہنا بھی نہیں مانتا، ہمارے ساتھ چلنے سے انکار کرتا ہے، جیسے یہ شہر اُسے بہت پسند آگیا ہے حالانکہ یہاں کا کوئی باشندہ بھی تو اِسے پسند نہیں کرتا۔

اُم انمار بولی:

"کیوں نہیں! مجھے یہ بڑا اچھا لگتا ہے۔"

عامری کہنے لگا:

"تو پھر اِسے خرید کیوں نہیں لیتی۔ قیمت دیدے اور اس کو لے جا۔ دیوتا برکت نہ دیں اس کم بخت غلام میں!"

بالآخر معاملہ اِس طرح ختم ہوا کہ اُم انمار نے چند درہم دے کر بہت سستے داموں اُسے خرید لیا۔ اُم انمار بھی اس دُبلے پتلے غلام کو ہاتھ سے پکڑے بنی زہرہ کے قبیلہ میں اپنے گھر واپس آگئی۔ بھوک کے مارے اس غلام کا بُرا حال تھا، سفر کی تکلیف اور تکان سے بے چارہ چور چور ہو رہا تھا۔ اُم انمار جب کبھی بنی زہرہ کے مردوں یا عورتوں کے جمگھٹ کے پاس سے گزرتی، وہ ہنس کر کہتے:

"واہ بی اُم انمار! آج یہ کس مُردے کو گھسیٹتی لے جا رہی ہو؟"

وہ جواب میں کہتی:

"تمہیں اِس سے کیا؟ میں اس کو اپنے پاس رکھوں گی، یہ میری خدمت کرے گا اور میرے بچے کے ساتھ کھیلے گا۔" اس نے بچے کو گھر چھوڑا، اور کام سے شہر میں چلی گئی۔

شام کو جب وہ گھر واپس آئی تو اپنے بیٹے اور غلام کو دیکھا کہ طرح طرح کے کھیل کھیل کر خوب تھک گئے ہیں۔ اس نے ان کو خوب کھلایا پلایا اور پھر بڑی نرمی اور لطافت سے غلام سے باتیں کرنے لگی۔ بولی:

"بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟"

غلام نے کہا:

"خبّاب!"

پھر بولی:

"اور باپ کا نام کیا ہے؟"

غلام نے کہا:

"اَرت!"

اُم انمار بولی:

"اچھا بیٹا یہ تو بتاؤ، تمہاری ماں کا نام کیا ہے؟"

یہ سُننا تھا کہ وہ بچہ اِس قدر پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ بڑھیا کا دل پسیج گیا۔ اس نے مزید سوالات بند کر کے اس کو بہلانا شروع کر دیا اور آنسو پونچھنے لگی۔

قصہ یہ تھا کہ بنی عامر کے وہ لوگ ایک دن دھوکا دے کر اُس کے خاندان پر ٹوٹ پڑے۔ اس روز قبیلہ والے کہیں گئے ہوئے تھے کوئی موجود نہ تھا، لہٰذا جہاں تک ہو سکا اس کے والد نے تنہا ان کا مقابلہ کیا، لیکن انھوں نے اُس کی

بیوی، نوجوان بیٹی اسماء اور اِس بچہ کے سامنے اُسے قتل کر دیا، پھر اُس کا مال و اسباب سب سمیٹ کر لے گئے اور گھر والوں کو قید کر لیا۔ اس کی ماں کو تو عرب کے کسی قبیلہ میں بیچ دیا اور بہن کو ایک دوسرے قبیلہ میں فروخت کر دیا۔

پھر اُس کو اور لوٹے ہوئے مال و اسباب کو ادھر لے آئے۔ مال و اسباب تو بلا کسی دقت کے نہایت آسانی سے بک گیا، مگر آخر میں یہ بے فیض بچہ ان کے پاس رہ گیا جس کے اچھے دام انھیں کہیں نہ ملتے تھے۔ آخر اس کو بھی اُم انمار نے خرید لیا اور اس کے ساتھ غلاموں کا سلوک نہیں کیا بلکہ اپنے بیٹے کی طرح رکھنے لگی۔ جب وہ کام کاج کے قابل ہو گیا تو اُم انمار نے اُس کو ایک لوہار کے ہاں بٹھا دیا جہاں اس نے لوہے اور ہتھیار سازی کا کام سیکھا۔ ابھی اس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہ ہوئی تھی کہ وہ اپنے اور اپنی ماں کے لیے تھوڑا بہت کمانے لگا اور ایک دوکان میں یہی لوہے اور ہتھیار سازی کا کام کرنے لگا۔

اِس غلام نے بھی اپنے جیسے دوسرے ہم رتبہ غلاموں کی طرح پرورش پائی جو باہر سے مکہ لائے جاتے تھے یا جن کے ماں باپ کو قسمت نے یہاں لا ڈالا تھا۔ وہ اگرچہ ایک غلام کی طرح پروان چڑھا، لیکن غلامی کا بوجھ اُسے محسوس نہ ہوا، مگر آزادی کی مٹھاس سے بھی نا آشنا تھا۔ بس ان دونوں حالتوں کے بین بین تھا، نہ پورا غلام نہ پورا آزاد۔

یہ نوجوان جب ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے تو اپنی ناگفتہ بہ حالت کے متعلق طرح طرح کی خیال آرائیاں کرتے اور ان کی یہ تمام باتیں ہمیشہ ایک مُردہ حسرت اور بجھے ہوئے غصہ پر ختم ہوتیں۔ جب وہ اپنے قریب گرد و نواح کی بستیوں پر نگاہ دوڑاتے یا عرب کے بادیہ نشین قبیلوں پر نظر ڈالتے تو ان کی تمام اُمیدیں خاک میں مل جاتیں۔ یاس و حسرت اور ناکامی کے خیالات پھر لوٹ آتے اور ان کی رہی سہی ہمت جواب دے دیتی۔ اِن بستیوں کو دیکھ کر انھوں نے اندازہ لگایا کہ اُن کو اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو کسی طرح کی بھی گزر اوقات کا جب تک یہاں مکہ میں موقع ملتا ہے اس مکہ کی زندگی ہی ان کے لیے بہتر ہے۔ مکہ میں امن و امان تھا، یہاں بغیر کسی سخت محنت اور جان توڑ مشقت کے روزی مل جاتی تھی۔

لیکن خبّاب ایک روز اپنے ایک دوست سے ملا تو تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا دوست حسرت و نا امیدی سے نجات پا چکا ہے اور غم و یاس سے بالکل آزاد ہے۔ اب اُس میں یاس و نومیدی کے بجائے آس اور امید کی کرن نظر آتی ہے۔ یہ دیکھ کر خبّاب اپنے دوست سے کہنے لگا:

"تمہیں آخر کیا ہو گیا ہے؟ میں اب تم میں کچھ ایسی چیز پاتا ہوں جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ آج جو نئی بات میں تم میں محسوس کر رہا ہوں وہ کبھی کسی دوست میں نظر نہیں آئی، آخر بتاؤ تو سہی ماجرا کیا ہے؟"

اُس کے دوست نے اُس طریق پر جواب نہیں دیا جیسا کہ اُن کا معمول تھا بلکہ اُس نے یہ جملے پڑھ کر سنائے:

"پڑھو، اپنے رب کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا۔ ہاں پڑھو تمہارا پروردگار بڑا بزرگ ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا جس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا تک نہ تھا۔ مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو ذرا مالدار اور غیر محتاج دیکھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب کو آپ کے پروردگار ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔"[1]

---

[1] سورۃ علق کی آیات

یہ کلام سُنتے ہی خباب کے بدن میں کپکپی چھُوٹ گئی اور جسم پر سخت لرزہ طاری ہوگیا۔ اس کے دانت بجنے لگے، رونگٹے کھڑے ہوگئے اور پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ اس کے ساتھی نے کچھ دیر اُسے یونہی رہنے دیا۔ پھر جب اس کی کپکپی دُور ہوگئی، ہوش و حواس درست ہوئے اور وہ جم کر سیدھا کھڑا ہوگیا تو اپنے ساتھی سے کہنے لگا:

"ہونہہ! ابھی جو تم نے پڑھا ذرا دوبارہ سُنانا۔ دراصل میں اس کی تاب نہ لاسکا، اِس لیے کچھ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا۔"

خبّاب کے کہنے پر اُس کے ساتھی نے یہ آیات بار بار پڑھ کر سُنائیں۔ خبّاب نے جب اپنے ساتھی کو جواب دیا تو پہلے بڑے تعجب سے یہ آیات دہرائیں،

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝

پھر بولا:

"یہ آخر کونسا کلام ہے؟ تمہارا تو یہ ہو نہیں سکتا۔ پھر بتاؤ یہ کہاں سے سُنا؟ میں بھی ایسا کلام سن سکتا ہوں؟"

اس کا ساتھی کہنے لگا:

"ہاں ضرور! اگر تم سُننا چاہتے ہو تو چلو "امین" کے پاس وہ ہمیں یہ کلام پڑھ کر سُناتے ہیں اور یہ اُن پر آسمان سے اُترا ہے۔"

ایک روز صبح کے وقت ابوجہل اپنی قوم کے پاس دانت پھاڑ کر ہنستا ہُوا مسجد میں آیا اور رانیں بجا بجا کر کہنے لگا:

"قریشیو! اگر جی چاہے تو کل ہمارے ہاں آکر ایک دلچسپ تماشا دیکھنا۔ سُنو! اس ختانہ کا بیٹا بھی بے دین ہو گیا ہے، کل دوپہر کو ہم اُسے آگ میں جلائیں گے۔"

عبداللہ بن سُہیل عمرو جب اپنے بہنوئی ابوحذیفہ بن عُتبہ بن ربیعہ سے ملنے آیا تو وہاں اپنی بہن سہلہ بنت سہیل سے بھی ملاقات کی۔ یہ ابوحذیفہ کی بیوی تھی۔ جب عبداللہ اس سے ملنے آیا تو خلافِ معمول یہ بہت تپاک سے ملی۔ بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور خوب آؤ بھگت کی۔ خلافِ توقع یہ غیر معمولی استقبال دیکھ کر وہ بھی بہت خوش ہُوا اور اس کو خوش کرنے اور دل بہلانے کے لیے اپنی قوم اور قبیلہ کی باتیں سُنانے لگا۔

عبداللہ نے دیکھا کہ اُس کی بہن باوجود خوش و خرم ہونے اور اس سے راضی ہونے کے کبھی کبھی کچھ کھوسی جاتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دل اب حاضر نہیں اور اب حاضر ہے۔ نہ معلوم کیا بات ہے۔

اس کو اپنی بہن کی مسرت اور کھویا کھویا پن دونوں کچھ عجیب سے معلوم ہوئے، لیکن یہ بات اس نے دل ہی میں چھپائے رکھی اور اس پر کسی طرح ظاہر نہ ہونے دی۔ پھر وہ اسی طرح ہنستا ہنساتا رہا اور اپنی باتیں سُناتا رہا آخر جب کافی دیر اس سے باتیں کرلیں تو واپس جانے کے لئے اٹھا گھر کے صحن تک رخصت کرنے کے لیے اس کی بہن بھی اُٹھی۔ لیکن چلنے سے پہلے عبداللہ اپنی بہن کو گلے لگانے اور بوسہ دینے کے لیے اُس کی طرف جھکا۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور کچھ پیچھے ہٹنے لگی۔ عبداللہ بڑی حیرت اور استعجاب سے اُسے دیکھنے لگا اور وہ بھی حیرانی و پریشانی کے عالم میں اُسے تکنے لگی۔ پھر عبداللہ واپس آکر اپنی جگہ بیٹھ گیا، لیکن سہلہ اسی طرح گھبرائی ہوئی خاموش کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے، کیا کہے اور کیا نہ کہے؟ تھوڑی دیر بعد عبداللہ بولا:

"سہلہ! آج تو تمہاری حالت کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ کیا تم نے کل یہاں سے ہجرت کا ارادہ نہیں کرلیا ہے؟"

سہلہ پر کچھ خوف و دہشت کے آثار نمایاں ہوئے

گھبرا کر بولی:

"کیسی ہجرت؟ کونسی ہجرت؟"

یہ سن کر عبداللہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑا، کہنے لگا:

"ایسی بھولی لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی جو اپنے بھائی کو چرائے۔ حبشہ کی جانب محمدؐ کے ساتھیوں کی ہجرت کوئی ڈھکی چھپی بات تو ہے نہیں، لوگوں میں اِس کا خوب چرچا ہے اور قریشی سردار بھی اپنی مجلسوں میں اس کے تذکرے کرتے رہتے ہیں۔ اگر قریش چاہتے تو محمدؐ کے ساتھیوں کی ہجرت کے راستے روک لیتے۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتے۔ وہ ان کے ساتھ ترکیبیں، تدبیریں اور چالیں لڑاتے لڑاتے اُکتا چکے ہیں اور ان میں سے کمزوروں کو بار بار سزائیں دے کر اور جلا ستا کر تھک سے گئے ہیں۔ اب قریش اُن کی اِس ہجرت سے خوش ہیں اور اُن کے سردار کہتے ہیں کہ اب یہ فتنہ و فساد ہمارے سر سے ٹل جائے گا۔"

سہلہ یہ باتیں بڑی خاموشی سے سُن رہی تھی، اُس کے چہرہ پر رنج و غم اور خوف و دہشت کی وجہ سے ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ وہ خاموش کھڑی اپنے بھائی کی باتیں برابر سُنتی رہی اور کوئی جواب نہ دیا تو عبداللہ کہنے لگا:

"شاید تمہارا اور تمہارے خاوند کا یہ خیال ہے کہ قریش تم سے غافل ہیں، ہرگز نہیں۔ لیکن قریش تم دونوں کو نہیں روکتے۔ کیونکہ ہم تمہیں دل و جان سے چاہتے ہیں اور تم سے محبت کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم اس طرح چھُپ چھُپ کر زندگی بسر کرو جیسے آج کل تنگی اور مشکل میں گزر بسر کر رہے ہو۔ ہمارے دل میں اس بات سے کسی قسم کی تنگی پیدا نہیں ہوتی کہ تمہیں اس ہجرت کے بعد خوف و دہشت اور تنگی و عسرت کی بجائے امن و سکون اور فراخی و وسعت مل جائے گی۔ ہمیں اس سے کسی قسم کا رشک یا حسد پیدا نہیں ہوگا بلکہ دلی خوشی حاصل ہوگی اگر والد صاحب کو قریش یہ طعنہ نہ دیتے کہ "سہیل کا دِل بودا ہوگیا ہے اور اب وہ اپنی بیٹی کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا" تو آج میں تم سے اکیلا ملنے نہ آتا بلکہ والد صاحب بھی ساتھ آتے۔ مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ قریش میرے بارے میں کیا کہیں گے، بلکہ قریش کی ناراضگی میری خوشی کا باعث ہے اب سُن لی تم نے میری بات؟"

سہلہ بولی:

"ہاں سُن لیا!"

عبداللہ نے کہا:

"اچھا تو پھر تم کیا کہتی ہو؟"

سہلہ بولی:

"بھائی تم نے دیکھا ہوگا کہ جب سے آئے ہو صرف تم ہی باتیں کر رہے ہو، میں نے تو کسی بات کا جواب دیا نہیں ہے؟"

عبداللہ نے کہا:

"ہاں اسی بات پر تو مجھے بھی تعجب ہے! لیکن میں تمہاری اُس گھبراہٹ کا سبب اب تک نہ سمجھ سکا جب کہ میں گلے مل کر تمہیں الوداعی بوسہ دینا چاہ رہا تھا۔"

سہلہ اب اپنی مسکراہٹ اور ہنسی کو ضبط نہ کر سکی، ذرا کسما کر بولی:

"کیوں کہ آپ مشرک ہیں اور میں مشرکوں کا بدن چھُونا پسند نہیں کرتی۔"

عبداللہ کے چہرہ پر کچھ سنجیدگی آگئی، ناراض ہو کر کہنے لگا:

"کیا محمدؐ کی محبت اور اس کے دین میں تم لوگ اس قدر

سخت ہو گئے ہو کہ اپنے بھائیوں سے بھی اجتناب کرنے لگے ہو؟"

اب سہلہ کے چہرے سے بھی مسکراہٹ دور ہو گئی اور کچھ سنجیدگی آ گئی جس سے عبداللہ کا دل اور بھی دھڑکنے لگا وہ سنجیدہ ہو کر بولی:

"اگر تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دین سے محبت کرتے تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اس کی خاطر بھائیوں اور والدین سے اجتناب کوئی بڑی چیز نہیں ہے میرے بھائی! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم ماں باپ اور بھائیوں سے کہیں زیادہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتے ہیں اور دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے بلکہ خود اپنی جانوں سے زیادہ ہمیں اللہ اور اس کے رسول پیارے ہیں۔ تم نے ابھی ابھی یہ کہا تھا کہ قریش کو ہماری ہجرت پسند ہے لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ہمیں پسند نہیں ہے۔ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا اعلان نہ کیا ہوتا یا ہمیں اس کا حکم نہ دیا ہوتا تو ہمیں آپ کے قریب رہ کر ہر طرح کا دکھ درد اور سزا و تکلیف بلکہ موت تک زیادہ پسند تھی بہ مقابلہ اس کے کہ ہم آپ سے دور رہ کر دنیا کے کسی حصہ میں بھی فراخی و خوشحالی، راحت و آرام اور امن و اطمینان کے ساتھ زندگی کے دن گذاریں۔"

عبداللہ نے کہا:

"اچھا یہ بات ہے! تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں اپنے ماں، باپ، بھائی، بہن اور تمام دنیا و مافیہا زیادہ پیارے ہیں —— اور وہ تمہیں —— اپنی جانوں سے بھی زیادہ پیارے ہیں!!"

یہ کہہ کر اس نے متفکرانہ انداز میں سر جھکا لیا۔

سہلہ بولی:

"ہاں! اگر تم بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح محبت کرنے لگو، جیسے ہم کرتے ہیں تو تمہارا دل بھی اس محبت سے آشنا ہو جائے جو سراپا ایثار ہے اور صرف دینا جانتی ہے لینا نہیں جانتی، اور اپنی قیمت عیش و آرام کی شکل میں نہیں مانگتی۔"

اتنے میں ابو حذیفہ بھی آ گئے، انہوں نے عبداللہ کو اس طرح سر جھکائے سوچ بچار میں مشغول پایا اور اپنی بیوی سہلہ کو دیکھا کہ وہ ایک طرف کھڑی بڑی پُر اثر اور سنجیدہ، لیکن امید و ہمدردی سے پُر نظروں سے اُسے دیکھ رہی ہے۔ ابو حذیفہ نے پہلے اپنی بیوی کی طرف نظر اُٹھائی، پھر عبداللہ کی طرف، پھر بلند آواز سے کہنے لگے:

"سہلہ! بتاؤ کیا تمہارے بھائی کے دل پر خدا نے سکینت اُتار دی ہے؟"

سہلہ جواب دینے ہی والی تھی کہ عبداللہ نے سر اُٹھایا اور اپنی بہن سے پہلے ہی بول پڑا، کہنے لگا:

"سکینت! سکینت!! ——— یہ سکینت آخر کیا ہوتی ہے؟ تم لوگوں کے پاس کچھ مخصوص قسم کے الفاظ ہیں جو ہر وقت تمہاری زبانوں پر جاری رہتے ہیں اور ہمارے کانوں کو کھڑکھڑاتے رہتے ہیں، لیکن ہم ان کا مطلب نہیں نکال سکتے۔ ابھی یہ کہہ رہی تھیں کہ ہمیں اپنے ماں، باپ، بھائی بہن اور خود اپنی جان سے زیادہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیارے ہیں اور اب تم ان سے پوچھ رہے ہو کہ کیا خدا نے میرے دل پر سکینت اُتار دی ہے؟ بتاؤ تو سہی یہ سکینت آخر کیا ہوتی ہے؟ اور یہ بھی پتہ چلے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر تمہارے دلوں پر کونسا جادو کر دیا ہے۔"

ابو حذیفہ نے بڑی نرمی سے کہا:

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دلوں پر جادو وادو نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے ہمارے قلب کو ہر قسم کی کجروی سے پاک و صاف کر دیا ہے اور اب سکینت اُتر آئی ہے جس نے ہمارے دلوں کو امن و سکون، خوشی و اطمینان

یقین و ایمان اور امید و اعتماد کی بے بہا دولت سے مالا مال کر دیا ہے، اور خوف و دہشت، شک و وہم اور قنوط و یاس کے تمام بداثرات دل سے مٹا دیئے ہیں۔"

پھر انہوں نے یہ فرمانِ الٰہی پڑھ کر سنایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝[۱]

یہ دو آیتیں سن کر اس نوجوان پر سخت لرزہ طاری ہو گیا، تمام بدن کپکپانے لگا اور پیشانی سے پسینہ چھوٹ گیا۔ ابو حذیفہ یہ فرمانِ الٰہی آگے تک پڑھتے رہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝[۲]

ابو حذیفہ نے جب یہ آخری آیات پڑھیں تو اس نوجوان کی یہ خوف اور گھبراہٹ کی کیفیت دُور ہو گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے ابو حذیفہ سے ظریفانہ انداز میں بولا:

"واہ بھئی واہ! اب تو مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے، جیسے تمہاری سکینت میرے دل میں اُتر آئی ہے۔ ابو حذیفہ! کیا تم مجھے حضرت محمدؐ کے پاس لے چلو گے کہ میں بھی اُن سے یہ کلام پڑھ لوں۔"

رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر ہو کر اب عبداللہ بھی مسلمان ہو گیا اور واپس آ کر اپنی بہن، ابو حذیفہ اور سالم کے پاس بیٹھا اور ان سے قرآن سننے لگا۔ رات ہونے پر جب وہ واپس جانے لگا تو سہلہ نے اس سے کہا:

"بھائی جان! کیا آپ بھی ہمارے ساتھ ہجرت کریں گے؟"

عبداللہ بولا:

"بے شک تم سے دُور رہنا مجھ پر بہت گراں گزرے گا۔ لیکن میں نے رسول اللہ سے صرف آج ہی قرآن مجید سنا ہے اور آپ کی گفتگو بھی آج ہی سننے میں آئی ہے میں چاہتا ہوں کہ جب تک ممکن ہو آپ کے ساتھ رہوں لہٰذا تم خوشی سے جاؤ اور ہدایت پاؤ۔"

صبح ہوئی تو ابو حذیفہ اپنی بیوی اور بیٹے سالم کو لے کر دوسرے مسلمان مہاجرین کے ساتھ حبشہ کو چلے گئے اس کے کچھ عرصہ بعد جب حبشہ کی طرف دوسرا قافلہ ہجرت کر گیا تو اس میں عبداللہ بن سہیل بھی شامل تھے۔

ہجرتِ حبشہ سے جب عبداللہ بن سہیل واپس آئے تو والد ملاقات کو آئے۔ مگر بیٹا ان سے بے تکلف نہ ہوا۔

---

[۱] (جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اسی پر مطمئن ہو بیٹھے اور ہماری نشانیوں سے غافل ہو رہے، ان کا ٹھکانا ان اعمال کے سبب جو وہ کرتے ہیں، دوزخ ہے۔)

[۲] (اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، پروردگار ان کے ایمان کی وجہ سے انہیں سیدھی راہ دکھائے گا۔ ان کے نیچے نعمت کے باغوں میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہاں وہ کہیں گے، سبحان اللہ! اور آپس میں ان کی دعا "سلام علیکم" ہو گی اور پھر ۴

۴ بات کے آخر میں وہ یہی کہیں گے کہ تمام تعریفیں خدائے رب العالمین کو زیبا ہیں۔)

سہیل نے تالی بجائی اور اس کے ساتھ ہی اُس کے کڑیل اور ہٹے کٹے غلاموں نے آکر عبداللہ کو گھیر لیا، پھر ان کو باندھ کر ایک تہہ خانے میں لے گئے اور وہاں قید کر دیا۔ اسی دن سے ان کے باپ نے انہیں طرح طرح کی سخت سزائیں دینی شروع کر دیں۔

شام کے وقت جب[۸] آفتاب اپنے مقامِ غروب کی طرف ڈھلنا شروع ہوا اور ٹیلوں کی چوٹیوں اور پہاڑوں کی پھننگوں پر پھیلے ہوتے اپنے پھیکے رنگ کے دامن کھینچتا ہوا رخصت ہونے لگا اور رات بھی اس کے دامن کو ہٹا کر اپنی سیاہ زلفیں بکھیرنے لگی تو اس وقت وہ ہذلی نوجوان بے فکری اور بے توجہی سے اپنی بکریوں کو لاٹھی سے ہنکاتا ہوا مکہ لوٹ رہا تھا۔ اس وقت اُس کے دل میں بس ایک خیال سمایا ہوا تھا۔ جو اُسے محسوس تو ہوتا تھا لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے بکریوں کو تو باڑہ میں بند کیا اور خود بڑے سکون و اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا پریشاں قلبی اور پراگندہ خیالی کے ساتھ عقبہ بن اُبی مُعیط کو ڈھونڈھتا آیا۔ دیکھا تو وہ گھر کے صحن میں براجماں تھا، اور اردگرد اس کے بیٹے اور دوسرے اعزہ و اقربا گھیرا ڈالے حاضر تھے۔ یہ نوجوان جلدی سے اس کے پاس گیا اور کچھ دُور کھڑا ہو کر کہنے لگا:

"اے ابوالولید! کل سے تم اپنی بکریاں کسی اور غلام یا حلیف سے چرا لینا، کیونکہ آج سے میں ان کو چرانا چھوڑ رہا ہوں۔"

عقبہ بولا:

"کیا بات ہوئی ہذلی جوان! کیا تمہیں ہم سے یا بکریوں سے کوئی تکلیف پہنچی ہے؟"

نوجوان نے کہا:

"نہیں مجھے کسی سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ میں خود بکریاں چرانا چھوڑ رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ بغیر کوئی جواب سُنے اور لوگوں کی خیال آرائیوں کی پرواہ کئے اُلٹے پاؤں واپس لوٹ گیا اور پھر کبھی اُس کے گھر نہ آیا۔ اس کے بعد وہ سیدھا اُس مقام پر گیا جہاں کہ عقبہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ ان دُو آدمیوں کو تصور میں لایا جن پر پہلے تو کچھ خوف کی حالت طاری تھی اور پھر رفتہ رفتہ انہیں سکون و قرار آ گیا تھا۔ پھر جب انہوں نے دُودھ طلب کیا تو اُس نے انکار کر دیا تھا۔ پھر اُس نے دل ہی دل میں اُس بن بیاہی بکری کو یاد کیا جس کے تھن میں پہلے کبھی دُودھ نہ آیا تھا، پھر دیکھا تو وہ دودھ سے بھر گیا اور اُس میں سے دُودھ دھاروں دھار نکل کر جوفدار پتھر میں اکٹھا ہونے لگا۔ پھر اُس دُودھ کا ذائقہ یاد کیا تو اُسے محسوس ہوا کہ ایسا خوش ذائقہ دودھ کبھی پینے میں نہیں آیا۔ پھر اُس نے وہ دُعائیہ کلمات یاد کرنے کی کوشش کی جو پُرسکون نظروں والا شخص بکری کے تھنوں پر ہاتھ پھیرتے وقت پڑھ رہا تھا لیکن اُسے کچھ یاد نہ آیا۔ پھر تو اُسے یہ کلام یاد کرنے کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ دیگر تمام خواہشیں اس شوق کے آگے ماند پڑ گئیں۔ کلام ہی کچھ اور تھا۔ یہ سوچ کر نوجوان دل ہی دل میں کہنے لگا:

"اُس پُرسکون نظروں والے آدمی، اس کے ساتھی اور اس کے کلام میں ضرور کوئی نہ کوئی بھید ہے۔"

شام کے وقت وہ نوجوان وہاں سے لوٹا لیکن مکہ واپس نہیں آیا بلکہ اپنی وحشت میں مگن اور نشۂ خلوت میں سرشار مکہ کے گرد و نواح میں اِدھر اُدھر گھومتا اور چکر لگاتا رہا۔ اُسے نہ تکان محسوس ہوتی نہ ماندگی، نہ نیند آتی نہ پیاس لگتی، نہ بھوک ستاتی۔ نوجوان نے وہ تمام رات یونہی گزار دی، نہ کہیں چھت کا سایہ لیا نہ بستر پر لیٹا۔ پھر جب آفتاب نمودار ہوا تو وہ اس وقت مکہ لوٹا جب کہ چرواہے بکریاں لے کر

نکلتے ہیں۔ لیکن اس کی بے چینی اس وقت تک دُور نہ ہوئی جب تک کہ اس مطمئن شخص اور اس کے ساتھی کو معلوم نہ کر لیا اور اُن کی جگہ کا پتہ نہ لگا لیا۔ پتہ ملتے ہی وہ دوڑتا ہوا اُن کے پاس گیا، معلوم ہوا کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ پھر وہ آپؐ کی مجلس میں آیا تو آپؐ نے اپنی پُرسکون نظر ڈالی اور مسکرائے۔ پھر وہ برابر قریب ہوتا گیا یہاں تک کہ آپؐ تک پہنچ گیا اور بالکل سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ پھر لرزتی ہوئی دھیمی آواز سے کہنے لگا۔

"مجھے اس مؤثر کلام کی تعلیم دیجیے جو کل میں نے آپؐ سے سُنا تھا۔" آپؐ مسکرائے اور شفقت سے سر پر دستِ مبارک پھیرتے ہوئے فرمایا:

"بے شک تم تعلیم یافتہ بچے ہو۔"

اسی وقت سے نوجوان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ وہ نہ اپنی ذات کے لیے پیدا ہوا ہے نہ اپنے گھر والوں کے لیے نہ عقبہ بن ابی مُعیط کی بکریوں کے لیے، بلکہ اس کی پیدائش کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حضرت محمد الامین (صلعم) کی صحبت میں رہے، آپ کی باتیں سُنے، ان کو یاد کرے اور آپؐ کی دعوت کا پرچار کرے۔

یہ نوجوان بہت ہلکا پُھلکا اور کمزور تھا، جسم کا بھی دُبلا پتلا اور بالکل لاغر تھا لیکن نہایت چست و چالاک اور بلا کا پُھرتیلا تھا! ابھی کچھ ہی دن رسول اللہؐ کی صحبت میں رہ کر آپؐ کی باتیں سُنی اور یاد کی تھیں کہ قریش اس کو مکہ کے اطراف میں ہر جگہ گھومتے پھرتے اور حضرت محمد صلعم کا ذکر کرتے دیکھنے لگے۔ وہ ہر طرف آپ کے کلام کا پرچار کرتا، ہر مجلس میں اُس کو سناتا اور ہر جگہ بیان کرتا۔ اُس کی چستی اور پھرتی قریش کے لیے ایک مصیبت بن گئی تھی۔ وہ اس کو کسی جگہ تبلیغ کرتا دیکھ کر وہاں جانے کا ارادہ کرتے، لیکن وہاں پہنچتے تو معلوم ہوتا کہ وہ یہاں سے اُٹھ کر کہیں اور چلا گیا ہے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کیسے چلا گیا۔ رسول اللہ صلعم اور آپؐ کے اصحابؓ کا پیچھا کرنے والوں کو یہ نوجوان ہر جگہ نظر آتا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کو پکڑنے میں کسی جگہ کامیاب نہ ہوتے۔ آخر ایک روز ابوجہل زِچ ہو کر کہنے لگا:

"محمدؐ کے کسی ساتھی سے میں اتنا تنگ نہیں آیا جتنا اس ہذلی نوجوان سے آیا ہوں۔ ہر جگہ محمدؐ کی دعوت پھیلاتا نظر آتا ہے اور لوگوں کے خیالات خراب کرتا پھرتا ہے۔ پھر بھی میں اس پر کہیں قابو نہیں کر پاتا۔ اگر کسی دن قابو پا لیا تو ذرا رحم بھی نہیں کروں گا۔"

ایک روز ابوجہل مسجد کے پاس سے گذرا تو اُس نے لوگوں کا ہجوم دیکھا جو ایک دُبلے پتلے کمزور آدمی کے گرد جمع تھا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کچھ کہہ رہا ہے اور یہ لوگ اس کی تقریر سُن رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ابوجہل نے اپنی رفتار سست کر دی اور کچھ ذرا ٹھٹک گیا، پھر دیواروں کے سہارے سہارے چلنے لگا اور اِس طرح چھپتا چھپاتا آگے بڑھتا رہا اور اچانک مجمع کے پاس آ دھمکا۔ وہ ان کے قریب ہی ایک ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ تو انہیں دیکھ سکے لیکن وہ لوگ اُسے نہ دیکھ پائیں۔ اُس نے وہاں کھڑے ہو کر اس دُبلے پتلے کمزور شخص کی آواز پر کان دھرے، دیکھا تو وہ بڑی میٹھی آواز میں ایک نہایت شیریں کلام پڑھ کر سُنا رہا ہے۔ ابوجہل سراپا گوش بن گیا اور کان لگا کر پوری توجہ سے سننے لگا کہ اتنی میٹھی آواز سے یہ کونسا شیریں کلام سُن رہا ہے۔ دیکھا تو ابنِ مسعود مجمع کو سورۂ فرقان کی یہ معجز نما آیات سُنا رہے تھے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ...... الخ

"اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ اُن سے جاہلانہ گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں اور وہ جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے اور عجز و ادب سے کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔ اور وہ جو دُعا مانگتے ہیں کہ اے پروردگار! دوزخ کے عذاب کو ہم سے دُور رکھیو کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف دہ چیز ہے اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بُری جگہ ہے۔ اور وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اُڑاتے ہیں اور نہ کنجوسی کرتے ہیں بلکہ اعتدال کے ساتھ، نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔ اور وہ جو خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جاندار کا مار ڈالنا خدا نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے مگر جائز طریق پر اور بدکاری نہیں کرتے اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مُبتلا ہو گا۔ قیامت کے دن اُس کو دُونا عذاب ہو گا اور ذلت و خواری سے اس میں ہمیشہ پڑا رہے گا۔ مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے، تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو خدا نیکیوں سے بدل دے گا اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو بے شک وہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب اُن کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو سنجیدگی اور بُردباری سے گزر جاتے ہیں۔"

ابوجہل نے یہ کلام سُنا تو اس کا دل دہل گیا اور بدن بھی کچھ کانپنے لگا۔ اگر اُس نے نفس کو اپنی فطرت پر چھوڑ دیا ہوتا تو اُس کی زبان سے بھی وہی کچھ نکلتا جو اس نے وہاں پر دوسرے لوگوں کو کہتے ہوئے سُنا تھا۔ وہ حسرت بھری آواز میں عبداللہ بن مسعودؓ سے کہہ رہے تھے۔

"بخدا ہم بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔"

لیکن ابوجہل نے نفس کو اپنی فطرت پر نہ چھوڑا اور حسد، غرور اور تکبر سے کام لیا۔ پھر ان لوگوں پر ایسا جھپٹا جیسے شکرا کسی شکار پر جھپٹتا ہے۔ کرخت آواز میں چیخ کر بولا:

"لعنت ہے تم پر کم بختو! آج جیسی جرأت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ تم اس گمراہ شخص کے پاس جمع ہوتے ہو اور اس کی مفسدانہ باتیں سُنتے ہو؟"

اِس بھیانک شخص کو دیکھ کر اور اس کی کریہہ آواز سُنتے ہی وہ لوگ فوراً منتشر ہو گئے اور آخر میں ابنِ مسعودؓ اپنی جگہ اکیلے کھڑے رہ گئے، وہ وہاں سے نہیں ہٹے۔ ابوجہل غصہ میں اُن کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"بڑا افسوس ہے ابنِ اُمِ عبد! تو ہمارے حلیفوں اور غلاموں کو اب تک ہمارے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ میرے خیال میں تو میرے ہاتھ سے مار کھا کے ہی باز آئے گا۔"

ابنِ مسعودؓ نے اُس کا جواب دینا چاہا لیکن ابوجہل نے مُہلت نہ دی اور کمان مار کر اُن کا سر زخمی کر دیا۔ ابنِ مسعودؓ کے چہرے پر خون بہنے لگا۔ لیکن انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور بڑی پھرتی سے ابوجہل پر لپکے اور کہنے لگے:

"اچھا! اگر یہ بات ہے تو یہ لے! میں ہذیل کا جوان ہوں، ہذیل کا!!"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک ہاتھ سے تو ابوجہل کے سینہ میں گھونسا مارا اور دوسرے ہاتھ سے مُنہ پر تھپڑ رسید کیا پھر آہستہ آہستہ اس کے پاس سے سرک گئے اور اس کو غصہ میں لال پیلا اور بدحواسی کے عالم میں مبہوت کھڑا چھوڑ دیا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قریش کا کوئی حلیف اتنی جسارت کر سکتا ہے کہ اُس کے سینہ میں مُکا مارے اور رخسار پر طمانچہ رسید کرے۔

ابوجہل اپنی قوم کے پاس گیا اور مصنوعی غیظ و غضب اور کبر و نخوت کا اظہار کرتے ہوئے اہلِ مجلس سے کہنے لگا:

"اے بنی مخزوم! تُف ہے تم پر!! اگر اب بھی تمہیں اپنی رہی سہی عزت کا پاس ہے تو ابنِ اُمِ عبد سے میرا انتقام لے لو۔ اس نے میرا اتنا بڑا جُرم کیا ہے کہ صرف اس کا خون ہی اُسے دھو سکتا ہے۔"

ان لوگوں نے فوراً ہی مکہ اور اس کے اطراف میں عبداللہ بن مسعودؓ کی تلاش شروع کر دی لیکن کامیاب نہ ہو سکے نہ اُن پر کبھی قابو پا سکے۔ ابوجہل بھی اپنے حریف سے جنگِ بدر کے روز ہی مل سکا۔

(۹)

سلّامؔ بن جبیر قُرظی ہر سال کی طرح اب کی مرتبہ بھی بہت سا تجارتی مال و اسباب لے کر شام سے آیا۔ طویل سفر کی تکان دُور کی۔ پھر فوراً ہی یہ انواع و اقسام کا ساز و سامان لے کر لوگوں کو دکھاتے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد یثرب کے اوسی اور خزرجی اس کا سامان دیکھنے آنے لگے، اور یثرب کے مضافات سے یہودی بھی آنے شروع ہو گئے۔

تھوڑے ہی دنوں میں سلّامؔ بن جبیر نے اپنا تمام سامانِ تجارت فروخت کر دیا اور اس سے کافی نفع حاصل کیا لیکن ایک غلام بچّہ پھر بھی اس کی پریشانی کا باعث بنا رہا۔ وہ کسی طرح فروخت نہیں ہوتا تھا۔ یہ لڑکا اُس کے گلے میں کانٹے کی طرح اٹکا ہوا تھا۔

سلّامؔ اس لڑکے کو یثرب کے بازاروں میں اِسی طرح فروخت کے لیے پیش کرتا پھر رہا تھا کہ ایک روز صبح کے وقت قبیلۂ اوس کی خاتون ثبیتہ بنتِ یعار اس کے پاس سے گزری بچّہ کو دیکھتے ہی اُسے کچھ ترس آ گیا۔ ذرا نظر جما کر دیکھا ہی تھا کہ اس بچّہ کو خریدنے کی خواہش دِل میں اُبھر آئی۔

ثبیتہ بولی:

"ابنِ جبیر! تمہارے اِس غلام کا کیا نام ہے؟"

سلّامؔ نے کہا:

"بنی کلب کے جس آدمی نے اِسے میرے ہاتھ بیچا ہے وہ اس کا نام سالم بتاتا تھا۔"

ثبیتہ نے پوچھا:

"اور اِس کے والد کا نام؟"

سلّامؔ نے کہا:

"یہ مجھے نہیں معلوم! لیکن جس کلبی سے میں نے اِسے خریدا ہے اُس کا نام معقل ہے اور وہ کہتا تھا کہ اس لڑکے کا خاندان بہت اعلیٰ اور شریف ہے۔ یہ خاندانِ اصطخر سے ......"

ثبیتہ بولی:

"ہاں، ہاں! یہ خاندان اصطخر سے آ کر اُبلہ میں آباد ہوا، وہاں نبطیوں سے بٹائی پر کام کرایا اور عراق کے تمام علاقوں میں تجارتی کاروبار پھیلایا یہ سب باتیں ہمیں خوب اچھی طرح معلوم ہیں اور اب میں اس کو خریدنے آئی ہوں"

بالآخر ثبیتہ نے اُسے خرید لیا اور گھر لے آئی۔ یہودی

کو اس سودے میں بہت نفع ہوا اور اس عورت کو بھی خوب نفع ہوا مگر اس کے نفع کا اندازہ روپے پیسوں سے نہیں لگایا جاسکتا اس لیے کہ اُس نے یہ غلام تجارت کی غرض سے یا روزی کمانے کے لیے نہیں خریدا تھا بلکہ اس کے خریدنے کا مقصد سوائے نیکی بھلائی اور احسان کے کچھ نہ تھا. جب وہ بچہ کو لے کر گھر آرہی تھی تو دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"لعنت ہے اس زندگی پر جس میں انسان انسان پر رحم نہ کرے، طاقت ور کمزور پر ترس نہ کھائے اور جب کسی عورت کا بچہ گم ہو جائے تو اس کے لیے کسی کا دل موم نہ ہو اور نہ بچے کے لیے دل پسیجے جب کہ وہ بیچارہ ابھی پرورش کا محتاج ہو۔ ماں کو جانتا ہو نہ باپ کو پہچانتا ہو نہ اپنے کسی عزیز سے واقف ہو کہ اس کے پاس پناہ لے۔"

وہ بچہ کو لے کر گھر آرہی تھی اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہہ رہی تھی:

"اگر اسی طرح میرا کوئی بچہ ہوتا اور خدا نہ کرے مجھ پر لیٹرے حملہ کر کے اُس کو چھین لیتے اور کسی نامعلوم جگہ لے جاتے تو مجھ پہ کیا گزرتی! میں اسے کیسے برداشت کرتی' اور مجھ سے کس طرح صبر ہوتا! کیا آخر عمر تک مجھے اپنے بچہ کا صبر آجاتا؛ ہرگز نہیں! اگر میرا بھی ایسا ہی بچہ ہوتا اور لٹیرے اس کو اٹھا کر کسی نامعلوم جگہ لے جاتے تو میرا جینا دوبھر ہو جاتا۔ زندگی وبالِ جان بن جاتی کھانے پینے میں کوئی لطف نہ رہتا اور دنیا کی ہر نعمت مجھ پر حرام ہو جاتی۔"

وہ تصور ہی تصور میں اس بچہ کی ماں کو دیکھ رہی تھی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے یہ بچہ چھینا گیا، یا اس کی غیر موجودگی میں اُٹھا لیا گیا۔ پھر وہ اُس کی والہانہ محبت اور حسرت والم کا تصور کرنے لگی جو کبھی ختم نہیں ہوتا، اور اس کی ماںمتا کا تصور کرنے لگی جو کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔

اور ان آنسوؤں کا خیال دل میں لانے لگی جو کبھی رُکتے نہیں۔ وہ یہ سوچتی ہوئی اُس بچہ کو لے کر گھر آرہی تھی اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہہ رہی تھی:

"یہ لڑکا کسریٰ کے ملک سے اغوا کیا گیا ہے۔ کسریٰ کی فوج جب اس کو بچا نہیں سکی اور اس پر حملہ کرنے والوں کو نہ روک سکی تو پھر یہاں یثرب میں ہمارا کیا حال ہوگا" ہم اس کو کیسے بچا سکیں گے جب کہ یہ پہلے ہی دہشت زدہ شہر ہے، اس کو ہر طرف سے یہودی اور بدّو لوگ گھیرے ہوئے ہیں۔"

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد اَوس اور خزرج کے لوگوں نے نیز نواح یثرب کے بادیہ نشیں اشراف نے ثبیتہ کو پیغامِ نکاح بھیجا۔ لیکن اس نے سب سے انکار کر دیا۔ پھر گھر والے بھی اُس پر زور دیتے رہے لیکن وہ ایک نہ مانی اور طرح طرح کے عُذر کرنے لگی۔ آخر وہ بیچارے بھی تھک ہار کر چپ ہو رہے۔

ایک سال ایسا ہوا کہ قریش کا ایک قافلہ شام سے واپس ہوتے ہوئے یثرب سے گزرا اور کچھ دن کے لیے وہاں ٹھہر گیا۔ اس قافلہ میں ابو حذیفہ ہشیم بن عتبہ بن ربیعہ بھی تھا۔ ثبیتہ کے متعلق بہت سی باتیں اُس کے سننے میں آئیں اور اس کے غلام کا قصہ بھی معلوم ہوا تو خواہ مخواہ اُسے ان باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ آخر بلا دیکھے بھالے محض لوگوں سے اس کی باتیں سُن کر ابو حذیفہ کے دل میں ثبیتہ کی محبت بیٹھ گئی اور اس نے بڑی امیدوں اور ارمانوں سے اس ہٹیلی دوشیزہ کو پیغامِ نکاح بھیجا۔ پہلے پہل تو ثبیتہ نے اس کا پیغام مسترد کر دیا لیکن جب اُسے ابو حذیفہ کا قریش میں درجہ و رُتبہ معلوم ہوا کہ وہ اس حرمِ محترم کا پاسبان ہے۔ جس پر دھاوا بولنے والے اصحابِ فیل کو خدا نے پرے دھکیل دیا تھا، تو وہ اس کی طرف مائل ہونے لگی اور آخر کار

اس مکی کا پیغامِ نکاح منظور کر ہی لیا۔

شادی کے بعد ابو حذیفہ اپنی بیوی اور اُس کے غلام سالم کو لے کر قافلہ کے ساتھ مکہ واپس آیا ابھی وہ مکہ آکر ٹھہرا ہی تھا کہ وہاں اُسے کچھ باتیں عجیب سی نظر آئیں جن کا اس سے قبل قطعاً وجود نہ تھا۔ وہ قریش کی مجلسوں میں گیا۔ ان مجالس میں بہت سی باتیں اُسے پہلے جیسی ہی نظر آئیں، لیکن بہت سی کچھ عجیب معلوم ہوئیں۔ ابو حذیفہ کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ گویا ان مجالس میں کسی چیز کی کمی واقع ہو گئی ہے اور مکہ میں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ پتہ نہیں کہ وہ چھوٹا ہے یا بڑا، لیکن کچھ نہ کچھ واقعہ ضرور پیش آیا ہے جس کی وجہ سے اس کی قوم میں کچھ ایسا تغیر و انقلاب پیدا ہو گیا ہے جو محسوس تو ہوتا ہے لیکن اس کی اصل معلوم نہیں ہوتی۔ پھر اُس نے اپنے بعض دوستوں کو ان مجالس میں ڈھونڈا لیکن نہ ملے۔ آخر اُس نے لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ عثمان بن عفان اُموی کہاں ہیں؟ طلحہ بن عبیداللہ تیمی کہاں ہیں؟ فلاں دوست کہاں ہے؟ فلاں رفیق کدھر ہے؟ لیکن لوگوں نے کوئی صاف جواب نہیں دیا۔ بعض تو چپ رہے بعض نے توریہ سے کام لیا اور بعض نے زبان توڑ مروڑ کر مبہم سی کوئی بات کہہ دی۔ بس ابو حذیفہ بیچارہ سُنتا اور حیرت سے ان کی شکلیں تکتا۔ اب تو اس کی بے چینی اور اضطراب اور بھی بڑھ گیا اور سکون و اطمینان کوسوں دُور بھاگ گیا۔

ایک دن اچانک اُسے خیال آیا کہ میرے تمام دوست احباب مکہ ہی میں تو ہیں، کہیں باہر تو گئے نہیں، پھر کیوں میں دوسروں سے اُن کے متعلق پوچھتا پھر رہا ہوں وہیں ان کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا۔

وہ عثمان بن عفان کے پاس پہنچا۔ باوجود تفاوتِ سن کے یہ اس کے گہرے دوست تھے۔ عثمان کی عمر کچھ اوپر چالیس ہوگی اور ابو حذیفہ ابھی تیس برس کا بھی نہ ہوگا۔ جب ابو حذیفہ عثمان کے گھر پہنچا اور اندر گیا تو عثمان اسی نرمی، مسکراہٹ خندہ پیشانی اور تپاک سے ملے جیسے پہلے ملا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ابو حذیفہ نے اُن میں کچھ سنجیدگی اور بُردباری کے آثار دیکھے۔

ابو حذیفہ بولا:

"ابو عمرو! میں تمہیں قریش کی مجالس میں اُس وقت سے ڈھونڈھ رہا ہوں جب سے تجارتی قافلہ مکہ واپس آیا ہے لیکن تم کہیں نظر نہ آئے۔ آخر کیا بات ہے، تم وہاں کیوں نہیں آتے؟"

عثمان نے کہا:

"یہ مجلسیں مجھے بالکل پسند نہیں ہیں، نہ وہاں کی باتیں کچھ اچھی معلوم ہوتی ہیں۔"

ابو حذیفہ بولا:

"کیا تمہیں اپنی قوم سے کوئی تکلیف پہنچی ہے؟"

عثمان خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ ابو حذیفہ بولا:

"ابو عمرو! کوئی بات ضرور ہے۔ قسم ہے لات اور عزیٰ کی۔"

اُس کی یہ قسم سنتے ہی عثمان کی پیشانی پر بل آگیا۔ ابو حذیفہ نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو اُسے اپنے دوست کی تیوری چڑھی نظر آئی اور چہرہ پر خفگی کے آثار دکھائی دیئے جو پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔

ابو حذیفہ بولا:

"دیکھو ابو عمرو! تم جانتے ہو ہم دونوں میں کتنی دوستی ہے۔ تم میرے وفادار اور امانت دار دوست ہو۔ تمہیں اپنی دوستی کا واسطہ کچھ اپنے دل کا حال تو بتاؤ!"

عثمان نے بڑی نرم اور پُرسکون آواز میں کہا:

"ہاں! ہمارے مابین جو دوستی اور محبت ہے اگر تم اُسے قائم رکھنا چاہتے ہو تو لات و عزیٰ اور ان دیوتاؤں کا نام زبان پر نہ لاؤ جو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔"

یہ سُننا تھا کہ ابو حذیفہ جھنجلا کر کچھ دیر کے لیے چُپ سا ہو گیا، پھر کہنے لگا:

"ابو عمرو! پھر تو معلوم ہوتا ہے تم بے دین ہو گئے ہو!"

عثمانؓ نے اور بھی نرمی اور ملائمت سے کہا:

"نہیں ابو حذیفہ میں بے دین نہیں ہوا ہوں۔ میں تو ہدایت یافتہ ہو گیا ہوں۔ تم بے شک ایک عقلمند اور صاحب الرّائے نوجوان ہو، اگرچہ تمہاری عمر ابھی اتنی نہیں ہوئی، لیکن تم نے دُنیا دیکھی ہے، زمین کے کونہ کونہ میں گئے ہو، لوگوں کے حالات سے واقف ہو، زمانہ کے انقلاب اور دنیا کے نشیب و فراز اور اُس کے مصائب و آفات کا تمہیں تجربہ ہے۔ آخر بتاؤ یہ کونسی عقلمندی ہے کہ مجھ جیسا آدمی یا تم جیسا عقلمند شخص اِن لکڑی اور پتھر کے بُتوں کی پُوجا کرے، جنہیں انسانوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور جو چاہے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے؟"

ابو حذیفہ کچھ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا:

"ابو عمرو! بات تو تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن تعجب ہے میں نے آج تک ان چیزوں پر غور نہیں کیا۔ بس اپنی قوم کو ان بُتوں کی پُوجا کرتے دیکھا پھر خود بھی ان کی دیکھا دیکھی پُوجنے لگا۔"

عثمانؓ نے کہا:

"اچھا اَب جب ہدایت کا راستہ واضح ہو گیا اور اصل بات ظاہر ہو گئی تو پھر؟"

ابو حذیفہ بولا:

"پھر ہمیں لازم ہے کہ ہدایت کو قبول کریں اور حق بات کی پیروی کریں۔ اچھا محمدؐ کے پاس مجھے کب لے کر چلو گے؟"

عثمانؓ نے کہا:

"چاہو تو ابھی چلے چلو۔"

آخر شام کو ابو حذیفہ نے اسلام قبول کر لیا اور مسلمان ہو کر ثبیتہؓ کے پاس آئے۔ ثبیتہؓ نے جب ان کی باتیں سُنیں تو وہ بھی حضرت محمدؐ اور آپؐ کی دعوت پر ایمان لے آئیں۔ اُن کے غلام سالمؓ نے جب ان دونوں میاں بیوی کی باتیں سنیں تو اس کا دل بھی اس طرف مائل ہونے لگا اور پھر وہ بھی ان دونوں کی طرح ایمان لے آیا۔ اِس طرح اُس روز رات ہونے سے پہلے پہلے مکّہ میں ایک اور مسلمان گھرانے کا اضافہ ہو گیا۔

ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ثبیتہؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت محمدؐ غلاموں کو آزاد کرنے والوں کو خدا کی مغفرت اور خوشنودی کا وعدہ دیتے ہیں۔ یہ بات معلوم ہوتے ہی انہوں نے اپنے اِس فارسی غلام کو بُلایا اور کہنے لگیں:

"سالمؓ! اب تم جہاں دل چاہے جا سکتے ہو، میں نے تمہیں خدا کی راہ میں آزاد کر دیا ہے۔ اب تم جس کو چاہو اپنا ولی بنا لو۔"

سالمؓ نے ابو حذیفہؓ سے کہا:

"کیا تم میرے ولی بن جاؤ گے؟"

ابو حذیفہؓ بولے:

"نہیں بچے! میں تمہارا ولی کیوں بننے لگا، تم تو آج سے میرے بیٹے ہو!"

(۱۰)

مکّہ کی پوری تاریخ میں آج جیسا دن کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا، اس کے بعد بھی جو دن آئے وہ سختی اور شدّت میں اِس روزِ بد سے کسی طرح کم نہ تھے۔

اِس سے قبل حالت یہ تھی کہ یہ ایک نہایت پُرامن اور پُرسکون شہر تھا، اس کے باشندے نہ چالبازی اور عیّاری سے واقف تھے۔ نہ انہیں بغض و عداوت سے کوئی واسطہ تھا۔ کوئی کسی پر ظلم کرتا نہ کسی کو مارتا پیٹتا۔ اگر اُن میں کچھ جھگڑا ہو بھی جاتا تو حد سے حد اتنا ہوتا کہ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہہ دیتے، لیکن پھر فوراً ہی شیر و شکر ہو جاتے، اُن کا یہ شہر اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ پُرامن حرم بن گیا جہاں خوفزدہ لوگ پناہ لیتے اور مظلوم فریادی امان حاصل کرتے۔

لیکن مکّہ پر آج کا دن ایسا آیا کہ فلکِ کجرو بھی اُس پر مُسکرانے لگا اور صبح ہوتے ہی اپنے قرصِ آتشیں کی حسین سنہری شعاعوں سے اُس کے سنگستانوں، پہاڑوں اور ٹیلوں کو روشن کرنے لگا، لیکن اُس کی مسکراہٹ میں خفگی تھی، اس کے تبسّم میں غیظ و غضب تھا اور اس کے خنداں لبوں میں اہلِ مکّہ کے لیے تباہی و بربادی کا پیغام پوشیدہ۔

پورے مکّہ میں شاید کوئی گھر بھی ایسا نہ رہا تھا جس میں یاسرؓ، ان کی بیوی اور بیٹے، نیز صہیبؓ، خبابؓ اور بلالؓ کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔ اُس ظالم گروہ نے ان غریب بنتے لوگوں پر جو ظلم ڈھائے تھے اس کے متعلق قریش کی رائیں اور نظریے مختلف تھے: قریش کے شیوخ اور دانشمند بزرگ، ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کی اس حرکت کو شر و فساد کی انتہا اور جَور و جفا کی بدترین مثال سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دلوں کو اس طرح تسلی دے لیتے کہ اس سختی اور شدت سے محمدؐ اور آپؐ کے ساتھی خوفزدہ ہو جائیں گے اور بالآخر ڈھیلے ہو کر "راہِ راست" اور "دانشمندانہ طریقہ و مذہب" اختیار کر لیں گے۔ مزید یہ کہ آئندہ دوسرے غلام اور کمزور لوگ بے دین ہونے سے رُک جائیں گے۔ اس طرح اُن کے ضمیر تو ان حرکات کو بُرا سمجھ رہے تھے لیکن دِل خاموش تھے اور زبانیں انہیں اچھا کہہ رہی تھیں۔ دوسری جانب قریش کے نوجوانوں کو اس انوکھے تماشے میں کچھ عجیب سا لُطف آ رہا تھا۔ اس کے ذریعہ انہیں دل لگی، خوش طبعی اور دل بہلاوے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔ لوگوں کی طبیعت فطری طور پر شرارت کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے۔ نوجوان عام طور پر سنگدل اور چھچھورے ہوتے ہیں، وہ اس شخص کو بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھتے ہیں جس کے بدن کو اذیت دی جا رہی ہو اور وہ اپنی تلملاہٹ اور چیخ و پکار سے ان لوگوں کی خوش وقتی اور کھیل تفریح کا سامان مہیا کرے، لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہی عذاب و بلا ممکن ہے اُن پر بھی آ پڑے۔ اگر انسان تھوڑی دیر کے لیے یہ سوچ لے کہ بالفرض ان گرفتارانِ عذاب اور مصیبت زدہ لوگوں کی جگہ وہ خود ہوتا تب کیسی تکلیف ہوتی تو وہ لوگوں کو ستانے سے بہت حد تک باز آ جائے۔

حارثؓ بن ہشام اپنے بھائی عکرمہ بن ابی جہل سے کہنے لگا:

"تم نے سمیّہؓ کو نہیں دیکھا، جب اُس پر تڑاتڑ کوڑے پڑ رہے تھے تو وہ کیسی تلملا رہی تھی۔ مُنہ سے تو اس نے ذرا بھی چیخ نہیں نکالی، کمال ہے نہ روئی نہ آہ کی اور وہ بھی دیکھا تم نے! جب ہم ہاتھ کے ذرا ذرا سے اشاروں سے اس کو ڈرا دیتے تھے۔ ہم اِدھر ہاتھ کرتے تو وہ اُدھر جُھک جاتی اور اُدھر کرتے تو اِدھر گر جاتی۔ پھر کوڑے مارتے تو ایسی سیدھی اکڑی ہوئی اٹھتی جیسے زمین کے نیچے سے کسی نے لوہے کے آنکڑے کے ذریعہ اوپر کو اُٹھا دیا ہو، اس وقت تو بڑا ہی مزہ آ رہا تھا اور مذاق بھی ہم خوب اُڑا رہے تھے۔"

عکرمہ نے کہا:

"مجھے تو سب سے زیادہ عجیب اور دلچسپ اُس کا بوڑھا خاوند معلوم ہوا۔ دیوتاؤں کے حق میں اچھے الفاظ کہلوانے کے لیے کوڑوں سے مار مار کر اس کی بوٹیاں اُڑا دیں، آگ میں بھی جلایا لیکن پھر بھی میرے والد اس کے مُنہ سے کچھ نہ کہلوا سکے۔ مگر اس کا بیٹا عمار بالکل گُم صُم رہا، اس کا جسم بھی مار پڑتے وقت بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا اور تو اور اس کے چہرے پر اس وقت بڑی عجیب مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی جو بیک وقت شیریں بھی تھی اور تلخ بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی وہ نرالی مسکراہٹ اس کے چہرہ سے زیادہ میرے دل پر نقش ہوگئی ہے اور اس کا اثر شاید تمام عمر دور نہ ہو۔"

صفوان بن اُمیہ بولا:

"اگر تم بلال حبشی کو اور اسے ستانے والے آزاد اور غلام نوجوانوں کو دیکھتے تو اور بھی مزہ آتا۔ وہ ہر طرف سے بلال کے اعضاء پکڑے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے اور خوب دوڑ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تکا بوٹی کرکے اُسے آپس میں بانٹ لیں گے لیکن تعجب ہے وہ نہ روتا تھا نہ آہ بھرتا تھا بلکہ محمدؐ اور اپنے اس معبود کی تعریف و توصیف بیان کئے جا رہا تھا۔"

خالد بن ولید نے کہا:

"مجھے تو صہیب کی حالت بڑی عجیب نظر آئی۔ لوگ اُسے آگ میں جلا رہے تھے، نیزے چبھو رہے تھے، بدن پر کوڑے برسا رہے تھے لیکن پھر بھی وہ بہادر اُن سے ایسے باتیں کرتا رہا جیسے ان کے مارنے پیٹنے کی اُسے کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔ کبھی اس پر مار زیادہ پڑتی تو کچھ دیر کے لیے زبان بند ہوجاتی اور پیشانی سے تھوڑا پسینہ ٹپکنے لگتا لیکن پھر جیسے ہی کچھ ہوش آتا، وہ پھر اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا جیسے انہوں نے اس کو مارا ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ اس کو کوڑوں سے مارتے رہے گرم لوہوں اور آگ سے جلاتے رہے لیکن وہ اپنے صبر و سکون کے ذریعہ اور ان کی ذرا ذرا سی چیز کے متعلق گفتگو کرکے انہیں جلاتا رہا۔ آخر جب وہ تنگ آگئے تو آپے سے باہر ہو کر بہت ہی سخت ایذائیں دینے لگے۔ اس مار پیٹ اور ظلم و ستم سے صہیب ادھ مؤا ہوگیا اور پھر وہ بیہوش ہوگیا۔ لیکن پھر بھی وہ اسی طرح دلیرانہ اُن سے باتیں کرتا رہا۔ سچ کہتا ہوں جب میں ان لوگوں کے پاس سے لوٹا تو اُن کی بہت سی حرکتیں دل کو بڑی ناگوار محسوس ہو رہی تھیں۔"

حارث بن ہشام بولا:

"خبردار جو یہ بات مُنہ سے نکالی! تمہارا چچیرا بھائی یہ نہ سُن لے ورنہ وہ تمہیں بھی سزا دے بیٹھے گا۔"

رہے قریش کے غلام اور بیکس و بے بس لوگ، تو وہ دل میں تو اس ظلم و تعدّی کو سخت ناپسند کرتے لیکن ظاہری طور پر زبان سے اچھا کہتے۔ ان میں سے بیشتر افراد پر تو خوف و ہیبت طاری تھی اور کچھ لوگوں کے دل میں محبت اور ہمدردی کے جذبات موجزن تھے۔ وہ جب تنہا ہوتے تو ایک دوسرے سے کہتے کہ "نیکی اور بھلائی تو ساری کی ساری محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کے پاس ہے اور ہمارا بھلا بھی اِسی میں ہے کہ ہم انہی سے جا ملیں، کیونکہ کمزور کمزور مل کر طاقتور بن جاتے ہیں اور کسی کو کیا معلوم! ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان بے چارے مظلوموں کا بدلہ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کے ذریعہ ان ظالموں اور جابروں سے دلوا دے۔"

رہے وہ مسلمان جو قریش کے عتاب سے بچے ہوئے تھے اور ان کی ستم رانیوں سے محفوظ تھے وہ لوگ اِس ظلم و ستم کو دیکھتے تو خواہش کرتے کہ کاش ہم ان کی جگہ ہوتے اور یہ تکلیفیں برداشت کر لیتے۔

اس روز شام کے وقت مکّہ کی صحیح کیفیت تو یہ تھی کہ اس کے اکثر باشندے حیران و پریشان اور فکر و تردّد میں مبتلا تھے۔ وہ اِس ایذا و عقوبت کو دیکھتے لیکن بتا نہ سکتے کہ آیا وہ اس کو پسند کرتے ہیں یا ناپسند۔ کیوں کہ ان کو معلوم ہی نہ تھا کہ آیا یہ سب کچھ درست ہے یا نادرست۔

اگر اہلِ مکّہ کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹا دیا جاتا تو اس روز رات کو وہ دیکھتے کہ مکّہ کے اردگرد شیاطین عیدیں منا رہے ہیں، خوشی میں پھُولے نہیں سماتے، فرحت و انبساط سے بیخود ہوئے جا رہے ہیں۔

اگلے روز نبی صلعم بھی سنگستانِ مکّہ کے ایک حصّہ میں تشریف لے گئے۔ آپؐ حضرت عثمان بن عفانؓ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جا رہے تھے کہ خاندان یاسر کے پاس پہنچے۔ ان سب کو ہاتھ پیر باندھ کر زمین پر چت لٹا دیا گیا تھا اور ان کے سینوں پر بھاری بھاری پتھر رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مشرک لوگ ان کے بدن کو آگ سے چھیڑتے اور کبھی کبھی نیزے اور خنجر چبھوتے مگر یہ تینوں افراد بالکل خاموش پڑے تھے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالتے۔ مشرک بہت ہی غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے کیوں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے کہ اُن کے مُنہ سے اپنے مطلب کی بات نکلوالیں اُن کی یہ مسلسل خاموشی ان ظالموں کو بہت ناگوار گزر رہی تھی۔

جب نبی صلعم اور آپؐ کے ساتھی اِن مظلوم لوگوں کے پاس سے گذرے تو مشرکین نے اس روز پہلی مرتبہ یاسر کی آواز سُنی۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ یاسر ان کی طرف متوجہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں:

"یا رسول اللہؐ! کیا زمانہ کا یہی حال رہے گا؟"

رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

"اے آلِ یاسر! تمہیں بشارت ہو! جنّت تمہاری منتظر ہے!"

اُس وقت سمیّہ کی آواز بھی مشرکین نے دن میں پہلی دفعہ سُنی، انہوں نے دیکھا کہ وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ نبی صلعم سے مخاطب ہو کر کہہ رہی ہے۔

"میں گواہی دیتی ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور اس بات کی بھی گواہ ہوں کہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔"

پھر اُسی وقت عمار کی آواز بھی مشرکین نے دن میں پہلی بار سُنی، لیکن انہوں نے دیکھا کہ وہ نہ اپنے والدین کی طرف متوجہ ہے نہ نبی صلعم کی طرف بلکہ خود ان ہی کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے:

"خدا کے دشمنو! اب تم جتنا چاہو ہم پر ظلم توڑ دو ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ جنّت ہماری منتظر ہے اور ذلت تمہاری۔"

یہ کلمات سُن کر مشرکین بُری طرح بھنا اُٹھے اور جذبات سے مغلوب ہو کر ان بیکسوں پر وہ ستم ڈھائے کہ بیان سے باہر ہیں۔

دوسری جانب ابوبکرؓ وادیٔ بطحا کے ایک حصّے سے گزرے تو وہاں بلالؓ کو دیکھا کہ اُنہیں مشقِ ستم بنا بنا کر قریش تھک گئے ہیں۔ وہ انہیں آگ میں جلاتے، پانی میں غوطے دیتے، لوہے کی گرم سلاخوں سے داغتے اور کوڑوں سے مار مار کر لہولہان کرتے، تپتی ہوئی ریت، جلتے ہوئے سنگریزوں اور دہکتے انگاروں پر لٹا دیتے اور اوپر سے بھاری بھاری پتھر رکھ دیتے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح اپنے معبودوں کے حق میں اچھے الفاظ ان کی زبان سے نکلوالیں، لیکن اس وارفتۂ توحید کی زبان نے اَحَد۔ اَحَد"

کے سوا کچھ نہ سُن پاتے۔

اُمیّہ بن خلف اور اس کے ساتھی جب انہیں طرح طرح کی سزائیں دے کر عاجز آ گئے تو اُن پر سے بوجھ ہٹا دیا اور سیدھا کھڑا کر کے رسّیوں سے جکڑا، دونو بازوؤں اور ٹانگوں میں لمبی لمبی رسّیاں باندھیں پھر بازاری لڑکوں کو بلایا اور یہ رسّیاں ان کے حوالے کر کے بلالؓ کو آخر دم تک خوب دَوڑانے بھگانے کے لیے اُن سے کہا۔ بچّے رسّیاں لے دوڑے، کبھی انہیں دائیں طرف بھگاتے کبھی بائیں طرف، کبھی ان کو گھسیٹتے ہوئے آگے بھاگتے کبھی پیچھے، پھر چیختے جاتے اور ہنستے جاتے، اُمیّہ بن خلف اور اس کے ساتھی بھی دُور سے یہ تماشا دیکھتے رہے لیکن بلالؓ کو کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ برابر کہتے جاتے "اَحَد، اَحَد"۔ اَحَد۔ اَحَد" آخر جب یہ بچے بالکل تھک گئے اور سانس پھولنے لگا توان کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے رسّیاں زمین پر ڈال دیں۔ لیکن بلالؓ اسی طرح کھڑے رہے۔ "اَحَد، اَحَد" کی صدا بلند کرتے رہے۔ اُمیّہ اور اس کے ساتھی یہ دیکھ کر جھنجھلا اُٹھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر بلالؓ کے سینے میں مُکّا مارا اور زمین پر چِت گرا دیا۔ وہ گرے اور بڑے خوفناک دھماکے سے گرے، لیکن اس وقت بھی اُس فرزندِ توحید کی زبان پر یہی "اَحَد، اَحَد" کا کلمہ جاری تھا اُن کے اس زمرۂ توحید کو بند کرنے کے لیے اُمیّہ اُن پر جھپٹنا ہی چاہتا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

"بڑا افسوس ہے اُمیّہ! آخر تم اس شخص کو کیوں۔ تکلیف دیتے ہو؟"

اُمیّہ بولا:

"ابنِ ابی قحافہ! تمہیں اس سے کیا؟ ہمارا غلام ہے، ہم جو چاہیں اس کے ساتھ کریں۔"

ابوبکرؓ نے کہا:

"اُمیّہ! تم سے پہلے وہ خدا کا بندہ اور غلام ہے۔ سوچو اگر تم اس کو مار ڈالو گے تو نہ صرف گناہ کے مرتکب ہو گے بلکہ اپنا مال بھی ضائع کرو گے، کیا تمہیں اس سے بہتر صورت نہ بتا دوں؟"

اُمیّہ بولا:

"وہ کیا؟"

ابوبکرؓ نے کہا:

"میں اس کو تم سے خرید لیتا ہوں۔ بتاؤ اس کی کیا قیمت ہے؟"

اُمیّہ بلالؓ سے تنگ آ گیا تھا اور ان کو مشقِ ستم بناتے بناتے بالکل عاجز آ چکا تھا کہنے لگا:

"اچھا میں نے بیچ دیا، لاؤ سات اوقیے۔"

ابوبکرؓ نے بلالؓ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں لے کر اپنے گھر آئے۔ وہاں اُن کو دلاسا اور تسلّی دے کر رنج و تکلیف دُور کی اور پھر اُمیّہ کو اس کی رقم بھجوا دی۔ پھر وہ کچھ دیر اسی طرح بلالؓ کو دلاسے دیتے رہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ان کا دل بہلایا اور قرآن کی آیات پڑھ پڑھ کر سنائیں پھر جب ان کا بھیجا ہوا آدمی پیسے دے کر آ گیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ اُمیّہ نے رقم وصول کر لی ہے تو وہ بلالؓ کی طرف مخاطب ہوتے اور مسکرا کر کہنے لگے:

"اچھا بلالؓ اب تم آزاد ہو، جہاں چاہو جا سکتے ہو۔"

شام کو ابوبکرؓ رسول اللہ صلعم سے ملے تو بلالؓ کی تمام بپتا کہہ سُنائی اور بتایا کہ وہ صرف انہیں خرید کر ہی اس مصیبت سے چھٹکارا دِلا سکے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ابوبکر! مجھے بھی اس میں شریک کر لو۔"

ابوبکرؓ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہؐ! میں تو اب انہیں آزاد کر چکا ہوں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اصحاب قریش کے ایک اور قبیلہ سے گزرے وہاں انہوں نے ایک منظر دیکھا اور بڑا دردناک منظر دیکھا! انہوں نے دیکھا کہ ایک زبردست آگ دہکائی جا رہی ہے اور ایک شخص کی مشکیں کسی جا رہی ہیں۔ پھر —— کچھ لوگ اُٹھا کر اُسے آگ کے قریب لے جاتے ہیں۔ جیسے ہی آگ اُسے اپنی لپیٹ میں لینے کو ہوتی ہے وہ لوگ فوراً ہی اُسے اُٹھا لیتے ہیں اور آگ سے دُور لا کر ہاتھ پیر باندھے اپنے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک بدبخت آگے بڑھ کر اس کے سینہ میں زور سے لات مارتا ہے، وہ بیچارہ دھڑام سے زمین پر گر پڑتا ہے اور یہ ٹھٹھے مارتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ بار بار یہی حرکت کرتے ہیں۔ پھر ایک اُن میں سے کہتا ہے:

"ہمارے معبودوں کو اچھے الفاظ سے یاد کر، اور محمدؐ اور اس کے دین کو بُرا بھلا کہہ، ورنہ یہ آگ تجھے جھلس کر رکھ دے گی یا زمین پر پٹخنیاں کھاتے کھاتے مر جائے گا۔"

لیکن اُس وارفتۂ اسلام کی زبان سے وہ یہی الفاظ سنتے:

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَرْسَلَهٗ
بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ۔

گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے رسول ہیں
خدا نے ان کو ہدایت دیکر اور دینِ حق کے
ساتھ بھیجا ہے۔

وہ لوگ اسی طرح اُسے آگ میں جلاتے اور اس سے نکالتے رہے، پھر زمین پر پٹختے اور کھڑا کرتے رہے، آخر وہ بیچارہ بیہوش ہو گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ آپس میں کہنے لگے:

"بس اَب اس پر رحم کرو۔ کہیں اس کی جان نہ نکل جائے، ورنہ اس کے نبی زہرہ والے حلیف تم سے جواب طلب کریں گے۔"

پھر یہ اصحابِ نبیؐ اس جانگسل منظر کو دیکھ کر اپنے احباب کے پاس آئے اور انھیں خبّاب بن اَرت کی بپتا سنائی۔

قریش اور بیکس مسلمانوں کی باہمی کش مکش دنوں، مہینوں اور سالوں یونہی جاری رہی لیکن قریش ان کے دین کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

قریش ایک روز دوپہر کو بڑے بھاری کام کے لیے جمع ہوئے۔ ابوجہل نے بڑے دھڑلے کے ساتھ ان سے یہ دعوٰی کیا کہ وہ یاسرؓ اور اس کے گھر والوں سے اپنی مرضی کے مطابق ہر قسم کی بات کہلوانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

عُتبہ بن ربیعہ بولا:

"نہیں ابوالحکم! یاسر تو بڑا دل گردے والا آدمی ہے میرے خیال میں وہ مر جائے گا لیکن تمہاری بات ہرگز نہ مانے گا۔"

ابوجہل نے کہا:

"اور اگر مان لی؟ ۔۔۔۔ کہو تو تمہارے سامنے اُس کے مُنہ سے کہلوا لوں!"

عُتبہ نے کہا:

"چلو، پھر بیس اونٹ تمہارے"

ساتھ ہی شیبہ بن ربیعہ نے کہا:

"اور اتنے ہی میری طرف سے!"

عُتبہ نے کہا:

"اچھا اور اگر یاسر تمہارے ہاتھ سے مر گیا ۔۔۔۔"

فوراً ہی شیبہ بولا:

"۔۔۔۔۔ اور تم اُس سے یہ الفاظ نہ کہلوا سکے تو پھر؟"

ابوجہل نے کہا:

"پھر جو تم فیصلہ کرو۔"

عُتبہ بولا:

"نہیں ہم کوئی فیصلہ ویصلہ نہیں کریں گے۔ بس یہی کافی ہے کہ تم خود ہی اپنی ناکامی پر کُڑھتے رہو۔"

آخر یہ تینوں جفاکار جن کی عقل شرط بازی نے مار دی تھی، وہاں سے اُٹھ کر آئے اور یاسر، سُمیّہ اور عمّار کو مشقِ ستم بنتے دیکھنے لگے۔

قریش نے مکّہ میں ایسی اذیت رسانی اور ظلم و ستم کبھی نہ دیکھا تھا جیسا کہ اس روز دیکھنے میں آیا۔ لیکن اس جبر و تشدد کے باوجود ان ظالموں کی مُراد پوری نہ ہوئی۔

ابوجہل اور اس کے ساتھی آئے تو انہوں نے دیکھا کہ قدِ آدم چمڑے کی ٹنکیاں پانی سے بھری رکھی ہیں۔ ایک جانب آگ دہک رہی ہے اور داغنے کے اَوزار اس میں تپائے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف اس مسلم خاندان کے تینوں نفر ہاتھ پاؤں بندھے راستے کے ایک جانب بیکار لاوارث مال کی طرح پڑے ہیں۔

ابوجہل اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچا تو اپنے غلاموں کو ان تینوں قیدیوں کے لانے کا حکم دیا انہوں نے یاسر، سُمیّہ اور عمّار کو اس کے آگے لا پٹخا۔ ان بیکسوں کی زبانوں پر اس وقت بھی ذکرِ الٰہی جاری تھا۔ ابوجہل نے ان پر اندھا دھند کوڑے برسانے شروع کر دیئے، پھر آگ سے جلایا، پھر اُن پر پانی کی مشکیں اُنڈھا دیں اور بار بار یہی مشقِ ستم جاری رکھی پھر اُس نے پانی میں ڈبونے کا حکم دیا تو انہیں پانی سے بھری ہوئی چرمی ٹنکیوں میں اِس قدر غوطے دیئے گئے کہ ان کا سانس گھٹنے لگا۔ پھر انہیں باہر ہوا میں نکال لیا اور سانس ٹھیک ہونے تک انتظار کرتا رہا کہ دیکھو اَب کچھ دَم آنے پر کیا کہتے ہیں لیکن انہوں نے پھر وہی اللّٰہ، اللّٰہ کہنا شروع کر دیا اور محمدؐ کی تعریفیں بیان کرنے لگے۔ ابوجہل اَب غصے سے آگ بگولا ہو گیا تھا، بھنّا کر سُمیّہ سے کہنے لگا:

"ہمارے معبودوں کو اچھا اور محمدؐ کو بُرا بھلا نہیں کہے گی تو یونہی سسک سسک کر مر جائے گی۔ یاد رکھ اگر محمدؐ اور اس کے خدا سے انکار نہ کیا تو آج شام دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔"

سُمیّہ نے نہایت پُرسکون لیکن کچھ ٹوٹی ٹوٹی آواز میں کہا:

"ناس جائے تیرے معبودوں کا! مجھے موت سے پیاری کیا چیز ہے! پھر کم از کم تیری منحوس بھونڈی شکل تو دیکھنے میں نہیں آئے گی!"

عُتبہ اور شَیبہ بن ربیعہ یہ سُن کر بہت ہنسے اور ابوجہل غصہ میں آپے سے باہر ہو کر سُمیّہ کے پیٹ میں بُری طرح لاتیں مارنے لگا، لیکن سُمیّہ لڑکھڑاتی ہوئی پُرسکون آواز میں کہتی جا رہی تھی،

"ناس جائے تیرے معبودوں کا!"

ابوجہل اب غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے بے تاب ہو کر ہاتھ میں پکڑا ہوا نیزہ سُمیّہ کے کھینچ مارا۔ ایک ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور اسلام کی راہ میں پہلی شہادت سُمیّہؓ کے حصہ میں آئی۔

یاسر نے چلّا کر کہا:

"او خدا کے دشمن! تو نے اِسے قتل کر دیا! لعنت ہے تجھ پر اور تیرے معبودوں پر!!!"

عمّار نے کہا:

"تو نے قتل کر دیا اِسے خدا کے دشمن! لعنت ہے تجھ پر اور تیرے معبودوں پر! اب جل بھُن کر خاک ہو جا کہ رسول اللّٰہؐ نے اس سے جنت کا وعدہ کیا ہے۔"

یاسر نے کہا:

"یقیناً خدا کا وعدہ سچا ہے!"

لیکن ابوجہل نے کچھ آگے کہنے کی مہلت نہ دی، اور پیٹ پر زور سے لات ماری۔ یاسر کی چیخ نکلی اور اسلام کا دوسرا شہید بھی جاں بحق ہو گیا۔

عُتبہ اور شَیبہ نے ابوجہل سے کہا:

کیا تم نے ہم سے نہیں کہا تھا کہ اگر میں یاسر اور اس کی بیوی سے اپنے دین کا اقرار کرانے میں کامیاب نہ ہوا تو پھر تم جو چاہو فیصلہ کرنا۔

ابوجہل چُپ رہا لیکن قریش کے دوسرے سرداروں نے کہا:

"ہاں بے شک یہی کہا تھا! ہم اِس بات کے گواہ ہیں!"

عُتبہ نے کہا:

"پھر تمہیں چاہیئے کہ اس شخص کو آزاد کر کے چھوڑ دو، تاکہ یہ اپنے ماں باپ کو دفن کر دے۔"

اُس روز ابوجہل بڑے غیظ و غضب میں شکستہ خاطر ہو کر گھر لوٹا۔ معلوم نہیں اُس کے غم و غصّہ کا اصل سبب کیا تھا۔ آیا وہ ان دونو شہیدوں کے ہاتھ سے نکل جانے پر پیچ پا تھا کہ وہ اس کا دلی منشا پُورا کیے بغیر مر گئے یا اُن کے صبر و ثبات سے جل بھُن رہا تھا کہ وہ بغیر کسی گھبراہٹ، بے چینی اور بے صبری کا اظہار کیے ختم ہو گئے کیونکہ یہ چیز قریش اور اس کے قدیم مذہب پر حضرت محمد صلعم اور آپؐ کے جدید مذہب کا غلبہ ظاہر کرتی تھی۔

ابوجہل تو اس طرح اپنے گھر سدھارا اور اسی بے چینی میں رات کاٹی۔ دوسری جانب زخمی عمّار کو اٹھا کر لوگ اُن کے گھر لے گئے، اور ان کے ساتھ ان کے ماں باپ کی نعشیں بھی اُن کے گھر پہنچا دیں۔ ان تینوں کو قریش کے ہی چند لوگوں نے اُٹھایا تھا۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ اس وقت دونوں اپنی عداوت بھول گئے تھے یا از خود بُھلا دی تھی۔ ان کے ذہن میں بس ایک خیال سمایا ہوا تھا کہ ان میں ایک مصیبت زدہ ہے جس کی غمخواری کرنی ہے اور دو میّتیں ہیں جنہیں جلد از جلد دفن کرنا ہے۔ یہ سوچ کر وہ سب اُٹھے اور ایک دوسرے سے ہر ممکن تعاون کیا۔ وہ عمّار کی غمخواری کرنے لگے، لیکن عمّار کو اس غمخواری کی ضرورت نہ تھی۔ پھر انہوں نے عمّار کے والدین کی تجہیز و تکفین میں ہاتھ بٹایا۔ بے شک اس تعاون کی انہیں ضرورت تھی۔ والدین کو دفن کرنے کے بعد عمّار اپنے گھر آئے تو مشرکین ان سے رخصت ہوئے اور مسلمان حلقہ باندھ کر اُن کے گرد بیٹھ گئے۔

اُس وقت عمّار کی یہ حالت تھی کہ بدن اب تک ان مظالم کی شدّت اور تکلیف محسوس کر رہا تھا، دل ایمان کی حلاوت سے سرشار تھا اور طبیعت ماں باپ کے رنج و غم سے اُداس تھی۔ عثمان بن عفانؓ نے ان سے کہا:

"تمہیں آخر ان کا غم کیوں ہے؟ انہوں نے تو اپنا وقت پُورا کر لیا اور تم سے پہلے ہی خدا کی نعمت اور رضا حاصل کر لی کیا تم نے نبی صلعم کو فرماتے نہیں سُنا، وہ ایک مرتبہ تمہارے لیے جنت کا وعدہ فرما رہے تھے اور ایک دفعہ تمہیں صبر کی تلقین کر کے دُعا فرمائی تھی کہ 'اے اللہ! آلِ یاسر کو بخش دے۔' تو کیا تم صبر نہیں کرو گے؟"

عمّار بولے:

"ابوعمرو! آپ نے بجا فرمایا۔ مجھے یہ زیبا نہیں کہ میں اُن پر رنج کروں، بلکہ مجھے تو ان کی خوشی منانی چاہیئے کہ وہ مجھ سے پہلے ہی جنت میں پہنچ گئے، آخر رسول اللّٰہؐ نے اُن کو یہ وعدہ دیا تھا! اور خدا کا وعدہ سچا ہے۔"

عثمانؓ نے کہا:

"اور تمہیں بھی تو دیا تھا!"

عمّار نے کہا:

"افسوس ابو عمرو! اگر میں بھی ان دونوں کے ساتھ مر جاتا تو بے شک مجھے بھی خوش ہونے کا حق تھا لیکن وہ دونو تو گزر گئے اور اب میں رہ گیا ہوں۔ زندگی میں فتنے بہت ہیں اور نفس کمزور ہے۔ مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ موت نے مجھے ان سے جُدا کر دیا، اور اب میں لوگوں کا تختۂ مشق بنوں گا۔ وہ مجھے گناہوں اور بُرائیوں پر آمادہ کریں گے، میرے اعمال حبط ہوں گے اور نیکیاں مٹیں گی۔"

عثمانؓ بولے:

"خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اس کی مہربانی سے اُس نہ توڑو۔ تمہیں گناہوں کا اسی طرح موقع ملے گا جیسے نیک اعمال کا۔ برائیوں سے اسی طرح واسطہ پڑے گا جیسے نیکیوں سے۔ تمہیں زندگی سے نفرت نہیں کرنی چاہیے جب کہ رسول اللہ ہم میں موجود ہیں۔"

عمار نے کہا:

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔"

پھر وہ اس پھرتی سے اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے کوئی دُکھ بیماری یا تکلیف سرے سے تھی ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان میں قوت و طاقت لوٹ آئی ہے جیسی دوسرے قوی انسانوں میں ہوتی ہے۔ وہ اُٹھتے ہوئے عثمانؓ اور اپنے دوسرے احباب سے کہنے لگے:

"واہ بھئی واہ! ہم خواہ مخواہ یہاں رُکے بیٹھے ہیں، رسول اللہ کے پاس کیوں نہ چلیں!"

پھر وہ سب کے سب دارِ ارقم گئے اور اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ نبی صلعم کے پاس بیٹھے اور آپؐ کی باتیں سُننے لگے۔ آپؐ انہیں نصیحت فرماتے، دلوں کو پاک کرتے اور قرآن پڑھ کر سناتے۔

ایک روز نبی صلعم کے اصحابؓ آپؐ کے گرد جمع تھے، جب دن کافی چڑھ گیا تو انہوں نے وہاں عمار کو نہ پایا۔ اس کا ذکر نبی صلعم سے کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ عمار کو خدا کی راہ میں ستایا جا رہا ہے۔ پھر نبی صلعم دن چڑھے بطحا، مکہ کے ایک مقام سے گذرے، وہاں ابو جہل کو دیکھا کہ وہ پھر اپنی پہلی حرکتوں پر اتر آیا ہے: نہایت تیز آگ دہک رہی ہے، چمڑے کی بڑی بڑی ٹنکیوں میں پانی بھرا ہوا ہے۔ عمار کو ان دونو کے درمیان ڈال رکھا ہے۔ قریش کے احمق لوگ نیزے چبھو رہے ہیں اور آگ میں جلا رہے ہیں۔ عمار صبر و سکون کے ساتھ خاموش کھڑے دل ہی دل میں خدا کو یاد کر رہے ہیں، زبان سے ایک حرف نہیں نکالتے۔ نبی صلعم نے جب یہ ہولناک منظر دیکھا تو کمال شفقت سے فرمایا:

"اے آگ! تو عمار پر بھی اسی طرح ٹھنڈی اور باسلامت ہو جا جیسے حضرت ابراہیمؑ پہ ہوئی تھی۔"

ابو جہل نے عمار کو اس طویل عرصۂ اذیت و ابتلا میں اس قدر آگ سے جلایا تھا کہ ان کی جان لینے کے لیے کافی تھا لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ

(مجھ سے دُعا مانگو، میں قبول کروں گا)

عمار کے لیے خدا سے اُس شخص نے دُعا کی تھی جو اسے تمام بندوں سے پیارا اور محبوب تھا۔ خدا کی حکمت بھی خوب ہے اور ہر کام کا ایک وقت معین ہے۔

عمار نے اس روز ایسی ایسی اذیتیں برداشت کیں جن میں سے بعض تو انسان سہار سکتا ہے، لیکن بعض کا سہنا اس کے بس سے باہر ہے۔ آخر جب سُورج ڈھلنے لگا تو ان پر ظلم و ستم موقوف ہوا، اور وہ اپنے گھر واپس آئے۔

ابو جہل نے پھر ان کو کافی دن ڈھیل دیئے رکھی، حتیٰ کہ عمار نے خیال کیا کہ اب دوبارہ ان کو مشقِ ستم نہ بنایا جائے گا۔ لیکن ابو جہل نے یہ ڈھیل محض اس لیے دی تھی کہ اپنے

ظلم و ستم میں شدت پیدا کرے اور اذیتوں میں اضافہ کرے۔

اس بدترین اذیت اور عذاب سے جو کبھی ختم ہو جاتا اور کبھی پھر شروع ہو جاتا، عمار نے اس وقت خلاصی پائی جب کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم فرمایا۔ چنانچہ عمار نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور پھر اس کے بعد مدینہ ہجرت کی اور وہاں رسول اللہ صلعم کے ساتھ امن و سلامتی سے اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے:

(۱۱)

مکہ میں مُنادی آیا اور اُس نے بتایا قافلہ کے سالار ابو سفیان نے اُن سے فوری مدد طلب کی ہے اور جنگ کے لیے اسی لمحہ کوچ کرنے کو کہا ہے کیونکہ محمدؐ ہمارا تجارتی قافلہ لوٹنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ سے نکل آیا ہے۔

قریش یہ سُن کر بہت گھبرائے۔ صبح ہوتے ہی گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور لڑائی کی تیاری کرنے لگے۔ قریش کے شرفا نے اس تیاری میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ابو جہل کو یقین ہو گیا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جس کا وہ برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔

اس جنگی مہم میں سہیل بن عمرو بھی شامل ہوا۔ وہی سہیل جس نے اپنے بیٹے عبداللہ کی مشکیں باندھ کر انہیں قید خانہ میں ڈال دیا تھا اور پھر اس وقت تک ستاتا رہا جب تک پختہ یقین نہ ہو گیا کہ اب میرا بیٹا اپنے آبائی دین میں لوٹ آیا ہے اور محمدؐ کو چھوڑ کر قریش سے آملا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سہیل دیگر اُمرائے قریش کے ساتھ جنگ کے لیے نکلا تو اُس نے اپنے بیٹے کو بھی بڑے فخر و اعتماد کے ساتھ اپنے آگے آگے رکھا۔

بدر میں فریقین کا سامنا ہوا۔ قریش نے نظر دوڑائی تو انہیں حضرت محمدؐ کے ساتھ بہت ہی کم افراد نظر آئے۔ یہ دیکھ کر وہ غرور در گھمنڈ سے پھولے نہ سماتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سے وہاں تک نظر دوڑائی تو دیکھا کہ قریش چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب ہی نکل آئے ہیں اور ہر طرح کیل کانٹے سے لیس ہیں۔ آپؐ نے خداوند تعالیٰ سے نصرت کا وعدہ پورا کرنے کی التجا کی۔ نہایت عاجزی و انکساری سے مدد مانگی اور خوب گڑگڑا کر دُعا کی کہ مسلمانوں کے دلوں کو عزم و ثبات عطا کر!

اس کے بعد دونو فریق قریب تر ہونے گئے۔ لیکن قریش نے نگاہ اُٹھائی تو انہیں ایک عجیب چیز نظر آئی۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی وہ کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ قریش نے دیکھا کہ ان کا ایک تر و تازہ چہرے اور گٹھیلے بدن کا مضبوط اور قوی ترین کڑیل جوان ان کی صفوں سے نکل کر محمد صلعم کے لشکر سے ملنے جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے بھی خاص طور پر مہاجرین نے اپنے ایک جانے پہچانے دوست کو دیکھا جس سے پہلے تو وہ محبت کرتے تھے لیکن پھر جب یقین ہو گیا کہ وہ اپنے آبائی دین میں لوٹ گیا ہے تو اس پر افسوس کرنے لگے۔ یہ نوجوان عبداللہ بن سہیل بن عمرو ہے جس نے مشرکین کو اتنے عرصہ تک اپنے بارے میں دھوکہ میں رکھا۔

دراصل انہوں نے دل سے کفر کا اقرار نہیں کیا تھا اور نہ کفر کے لیے ان کا دل کھُلا تھا۔ انہوں نے قریش کے ظلم و ستم کے وقت عمارؓ کی طرح اپنے دل کو بھی ایمان کے ساتھ مطمئن پایا تھا۔

اور اب! ------ یہ دیکھو وہ نوجوان اپنی قوم کی صفوں سے نکل کر مسلمانوں کی صفوں میں جا رہا ہے۔ وہ دوڑتا بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ آخر نبی صلعم کے پاس پہنچ کر آپؐ کو سلام کرتا ہے اور آپؐ سے برکت کی دُعا لیتا ہے

پھر اپنے مہاجر احباب کے پاس جاتا ہے اور ان کے ساتھ مل کر قریش کے خلاف صف آرا ہوتا ہے حالانکہ ان ہی میں اس کا باپ بھی ہے۔ اس پیش قدمی کے دوران وہ اپنی بہن سہلہ کے خاوند ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ سے ملتا ہے اور اپنا پورا واقعہ بیان کرتا ہے۔ ابو حذیفہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں "بہت اچھا ہوا!" اس کے علاوہ آگے کچھ نہیں کہتے۔ دونو گروہ آہستہ آہستہ قریب آتے جاتے ہیں اور اب ان کی مڈبھیڑ ہونے میں ایک تلوار یا تیر چلنے کی دیر رہ جاتی ہے۔ کہ اتنے میں قریش ایک حیرتناک منظر دیکھتے ہیں۔ مسلمان بھی نگاہ اٹھاتے ہیں تو انہیں ایک عجیب نظارہ دکھائی دیتا ہے:

کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نوجوان دونو صفوں کے درمیان بیچ میدان میں کود کر قریش کے سالار عتبہ بن ربیعہ کو مبارزہ کے لیے للکار رہا ہے۔ عتبہ اس کی مبارزہ طلبی پر مقابلہ کے لیے باہر نکلتا ہے لیکن اس کو دیکھتے ہی فوراً واپس ہو لیتا ہے۔ اس غیر معمولی واقعہ سے قریش غیظ و غضب میں آجاتے ہیں۔ مسلمان بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ تو ابو حذیفہ ہے جو اپنے باپ کو مبارزہ کے لیے للکار رہا ہے۔

اس جنگ میں دیگر مہاجرین کے ساتھ عبداللہ بن مسعود بھی شریک تھے۔ وہ ہلکے پھلکے اور دبلے بدن کے تھے۔ گوشت کم تھا لیکن بلا کی چستی اور پھرتی تھی۔ ابھی یہاں دکھائی دیتے تو ابھی وہاں نظر آتے۔ یہاں میدانِ جنگ میں بھی قریش کے ساتھ ان کا وہی طریقہ تھا جو مکہ میں تھا جب کہ مسلمان ایک دورِ ابتلاء سے گزر رہے تھے۔ ابن مسعودؓ کبھی یہاں حملہ کرتے، کبھی وہاں بلہ بولتے۔ پورے میدانِ جنگ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ چیتے کی طرح اڑتے پھرتے تھے۔ وہ اسی طرح میدان کارزار گرم کر رہے تھے کہ انہوں نے فرزندانِ عفراء کو دیکھا کہ ان دونو نے ابوجہل کو مار گرایا ہے اور بری طرح تہ تیغ کر دیا ہے۔ ابن مسعودؓ جلدی سے اس کے پاس پہنچے، دیکھا تو ابھی اس میں اتنی جان باقی تھی کہ دیکھ سکے، سن سکے اور بمشکل کچھ بول سکے۔ ابن مسعود لپک کر اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھے، بولے:

"ہاں او خدا کے دشمن! آخر خدا نے تجھے ذلیل کر دیا نا!"

ابوجہل مریل آواز سے رک رک کر بولا:

"اوہو! تم ہو گڈریے!! تم تو بڑی مشکل جگہ چڑھ آئے ہو۔"

ابن مسعود نے کہا:

"ہاں! اب ذرا دنیا کے عذاب کا مزہ چکھ لے آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ سخت اور عبرتناک ہے۔"

پھر اس کا سر قلم کر دیا اور دوڑتے بھاگتے نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابوجہل کے قتل کی خبر دی۔ نبی صلعم نے بہ آوازِ بلند بلند فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ غَیْرُهٗ!

ابن مسعودؓ نے بھی زور سے پکارا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ غَیْرُهٗ!

پھر نبی صلعم نے پکارا "اَللّٰهُ اَکْبَرُ" آپ کے اردگرد مسلمانوں نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد نبی صلعم قریش کے کشتوں پر کھڑے ہو کر جو ایک پرانے کنوئیں میں ڈال دیئے گئے تھے ان کو پکار کر فرمانے لگے:

"اے کنوئیں والو! کیا تم نے خدائی وعدہ کو سچا پایا؛ مجھ سے جو کچھ وعدہ ہوا تھا۔ حق ثابت ہوا۔"

بعض صحابہؓ نے عرض کی:

"یا رسول اللہ! یہ تو سب مردہ ہیں!"

آپؐ نے فرمایا:

"نہیں یہ بالکل تمہاری طرح سن رہے ہیں، البتہ بول نہیں سکتے۔

(۱۲)

داستان سناتے سناتے جب قصہ گو یہاں پہنچا تو اس نے سر جھکا لیا، اور کافی دیر جھکائے رہا حتیٰ کہ سامعین نے سمجھا کہ اب آگے وہ کچھ نہیں کہے گا۔ لہٰذا وہ اٹھ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ اس نے سر اٹھایا اور یہ آیت پڑھی:

وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ ۝ وَنُمَکِّنَ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا کَانُوْا یَحْذَرُوْنَ ۝

(اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں بیکس اور بے بس کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنائیں اور انہیں ملک کا وارث کریں اور ملک میں ان کو قدرت و اقتدار دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکر کو وہ چیز دکھا دیں جس سے وہ ڈرتے تھے)

اس کے بعد کچھ دیر رک کر بولا:

صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ! خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا ان بیکس و بے بس لوگوں کو اپنی زمین کا وارث بنایا، قیصر و کسریٰ سے حکومت چھین کر ان کے ہاتھوں میں دی، اور جب تک وہ زندہ رہے لوگوں کا امام اور پیشوا بنایا، اور جب اپنے پاس بلا لیا اور اپنی بہشتی نعمتوں سے بہرہ ور کیا تو ان کے ذکر کو دائمی زندگی بخشی، ان کی سیرت کو پسندیدہ سیرت کہا ان کی زندگی کو قابلِ تقلید نمونہ اور لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔ اب وہ رہتی دنیا تک مسلمانوں کے امام اور سردار ہیں۔

قرآنی نقطۂ نظر

قرآن مجید علوم طبیعیہ کا بھی ذکر فرماتا ہے لیکن

فلسفی اور صاحبِ قرآن کے نقطۂ نظر میں فرق ہے۔ مثلاً ایک طبیب جانوروں کو دیکھتا ہے تو وہ ان کے خواص پر غور کرتا ہے اور صاحبِ دولت جب جانوروں کو دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کہ ان میں سے سواری کے لائق کون ہے اور بار برداری کے لائق کون ہے؟ اسی طرح قرآن بھی کائنات سے تعرض کرتا ہے۔ مگر اس کا مقصود خدا کی قدرت اور اس کے علم و حکمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا ہے۔ (شاہ ولی اللہ۔ سطعات)

قرآن کریم کے انڈکس

عاصم نعمانی

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسولؐ پر اپنی آخری کتاب نازل فرما کر دنیا والوں پر اتمام حجت کر دی۔ اب انسانیت کی فلاح و بہبود اسی کتاب کی پیروی میں منحصر ہے۔

اس کتاب پر ایمان لانیوالوں نے اسے پڑھا، سمجھا اور اس کے علوم و معارف سے واقفیت حاصل کی۔ پھر اس کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ ترجمے کیے گئے، تفاسیر لکھی گئیں، لغات تیار کیے گئے، اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کی زبان و انداز پر مختلف علوم و فنون وجود میں آ گئے۔ ہر ہر شعبے میں وسیع پیمانے پر کام کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ اپنے تو اپنے غیروں تک نے اس کے علمی لغوی اور ادبی پہلوؤں پر بہت کچھ کام کیا۔ عقیدت مندوں نے فرطِ محبت و عقیدت میں اس کے الفاظ کی حرکات و سکنات تک گن ڈالیں۔

انہی قرآنی خدمات میں سے ایک خدمت فہارسِ قرآنی کی ترتیب بلحاظ الفاظ و مضامین بھی ہے۔ جس طرح قرآن کریم کی تفاسیر، لغات، احکام اور دوسرے علوم و فنون سے متعلق انسانی کاوشوں کا استقصا کر لینا ممکن نہیں ہے، اسی طرح قرآنی انڈکس اور اشاریے کے عنوان پر جو کام کیا جا چکا ہے اس کا احاطہ بھی حدِ امکان سے خارج ہے۔ مجھے اس کام کے لیے بہت مختصر وقت ملا اس میں جو کچھ معلومات حاصل ہو سکی ہیں وہ یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔ اس موضوع پر کام کرنے کی وسیع گنجائش موجود ہے۔ میں نے اس مضمون میں چند مطبوعہ تالیفات کا تعارف پیش کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب مستقبل میں اس موضوع پر قلم اٹھائیں اور تفصیل کے ساتھ کوئی مواد سامنے لا سکیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد نمبروار ان کتابوں کا تعارف ملاحظہ فرمائیے جو اس موضوع پر میرے سامنے آسکی ہیں۔

(۱)

المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم (عربی)

مرتب: محمد فواد عبدالباقی

مطبوعہ: مصر (۱۹۴۵ء/۱۳۶۴ھ) بڑا سائز صفحات ۷۸۲

اس وقت تک قرآن کریم کے انڈکس کے موضوع پر جتنی کتابیں مرتب ہو چکی ہیں یہ ان سب سے زیادہ مفصل اور مفید کتاب ہے۔ قرآن کریم کا کوئی لفظ جہاں جہاں آیا ہے مرتب نے محض اس کا مجمل حوالہ دیدینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ تمام آیات مع حوالہ آیت و سورت درج کر دی ہیں جن میں وہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی "محمد"[۱] ملاحظہ ہو:

۱۔ وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل ------ آل عمران، آیت ۱۴۴

۲۔ ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ ------ احزاب، آیت ۴۰

۳۔ آمنوا بما نزل علی محمد وھو الحق من ربھم ------ محمد، آیت ۲

۴۔ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم ------ الفتح، آیت ۲۹

قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی "محمد" ان چار ہی مقامات پر آیا ہے۔

اسی طرح کوئی لفظ لے لیجئے وہ جہاں جہاں استعمال ہوا ہے وہ تمام آیات مع حوالہ الگ الگ سطروں میں نہایت ہی خوبصورت طریقے پر دے دی گئی ہیں۔ چنانچہ لفظ "قال" ۱۴ ½ کالموں میں مکمل ہوا ہے۔ کوئی چاہے تو گن لے کہ یہ لفظ کتنی بار قرآن کریم میں آیا ہے۔ میں نے اسے گنا تو اس کی تعداد ۵۳۴ ہوئی۔ (اس میں ایک آدھ ہندسے کی کمی زیادتی کا امکان ہے)

مرتب نے ایک اور بات کا التزام بھی کیا ہے وہ یہ کہ ہر سورہ کے ساتھ نمبر شمار Serial Number دیا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سورہ مکیہ ہے یا مدنیہ۔ مکیہ کے لیے حرف "ک" اور مدنیہ کے لیے حرف "م" استعمال کیا گیا ہے۔

اس انڈکس کی مدد سے قرآن پاک کا کوئی لفظ تلاش کرنے کے لیے "مادہ" (Root) معلوم ہونا ضروری ہے ورنہ سخت دقت پیش آئے گی اور ممکن ہے کہ اس کے باوجود ناکامی کا سامنا کرنا پڑے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک "محمد" کو تلاش کرنے کے لیے ح، م، د جو اس لفظ کی اصل ہے، کی طرف رجوع کریں گے تو فوراً منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دونوں مبارک نام ساتھ ساتھ آئے ہیں اس لیے کہ دونوں کا مادہ ایک ہے۔ احمد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی ہے جو قرآن کریم میں صرف ایک جگہ سورہ الصف، آیت ۶ میں آیا ہے۔ (ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد ......)۔

مادہ کے حروف ہر صفحہ کی پیشانی پر لکھ دیے گئے ہیں۔

کتاب کے شروع میں حروف تہجی کے لحاظ سے مادوں کی فہرست صفحات کے حوالوں کے ساتھ درج کر دی گئی ہے جس سے مادہ تلاش کرنے میں بہت آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً لفظ ادریس کا مادہ بتایا ہے "د، ر، س" اسحاق کا "س، ح، ق"، "اتقاکم" کا "و، ق، ی"، "اللہ" کا "ا، ل، ہ"۔ ان میں سے جس لفظ کو تلاش کرنا مقصود ہو اس کے مادے کی مدد سے تلاش کیا جا سکے گا۔ "مادہ" کی ترتیب حروفِ تہجی کے مطابق رکھی گئی ہے۔

مرتب نے دیباچے میں بتایا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں نجوم الفرقان فی اطراف القرآن کو سامنے رکھا ہے اور اس سے مدد لی ہے۔ یہ کتاب ایک جرمن مستشرق (فلوگل) کی تالیف ہے جو پہلی بار ۱۸۴۲ء میں شائع ہوئی (یہ کتاب انگریزی میں ہے، آگے نمبر ۵ پر اس کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے)۔ کتاب پر ڈاکٹر منصور فہمی کی تقریظ ہے۔ اس میں انہوں نے اس موضوع پر تین مزید کتابوں کے نام بتائے ہیں

۱۔ مفتاح کنوز القرآن (جس کا تعارف اس مضمون میں شامل ہے)

۲۔ فتح الرحمن (اس کا مختصر تعارف بھی اس مضمون

---

[۱] حضورؐ کے اسم گرامی "محمد" پر قرآن کریم کی ایک سورہ کا نام بھی ہے۔

میں شامل ہے)

۳۔ ترتیب زیبا۔
المعجم المفہرس ٹائپ طباعت اور کاغذ، ہر لحاظ سے معیاری کتاب ہے اور پاکستان میں دستیاب ہے۔

(۲)

تفصیل البیان فی مقاصد القرآن

مؤلفہ: سید ممتاز علی (دیوبندی)
مطبوعہ: دارالاشاعت پنجاب (لاہور) ۱۳۴۸ھ

یہ کتاب علحدہ علحدہ چھ حصوں پر مشتمل ہے اور ان کے مجموعی صفحات تقریباً گیارہ سو ہیں۔

یہ کتاب قرآن کریم کے مضامین کا مفصل انڈکس ہے۔ ذیل کی تفصیل سے اس کی افادیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) الجزء الاول :—

کتاب العقائد۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کا بیان ہے اور وہ تمام آیات جو ان سے متعلق ہیں بقید حوالہ درج کر دی گئی ہیں۔ دوسرے میں وہ آیات جمع کی گئی ہیں جو بدء الخلق (آغازِ تخلیق) سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۲) الجزء الثانی :—

کتاب الاحکام۔ اس حصے میں فقہی احکام سے متعلق آیات جمع کی گئی ہیں مثلاً ایمان لانے کا حکم، تزکیۂ نفس، رسول کی اطاعت کا حکم، کتاب العبادات، جہاد، نکاح، طلاق وغیرہ۔

(۳) الجزء الثالث :—

کتاب الرسالہ۔ اس حصے میں وہ آیات جمع کی گئی ہیں جن میں نزولِ قرآن، کافروں کے شبہات اور اعتراضات اور ان کے جوابات ہیں۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔ نزولِ قرآن، اوصافِ قرآن، مناظرِ قدرت، رسالت کے دلائل، صفاتِ رسل، پیشین گوئیاں، تورات، انجیل، اصحاب وغیرہ۔

(۴) الجزء الرابع :—

کتاب المعاد۔ اس حصے میں وہ آیات جمع کی گئی ہیں جو قیامت میں پیش آنیوالے واقعات سے متعلق ہیں۔ مثلاً دارِ آخرت، کتاب الاعمال، موت، قیامت، حشر، نفخِ صور، حساب، میزان، شفاعت، دوزخ، جنت وغیرہ۔

(۵) الجزء الخامس :—

کتاب الاخلاق، فضیلتِ علم، صبر، شکر، توکل، اخلاص، صدق، ایفائے عہد، جھوٹ، افترا، ریاکاری، تکبر، اصلاحِ بین الناس، آدابِ مجلس، اکل و شرب، سیاسیات وغیرہ عنوانات کے تحت آیات جمع کی گئی ہیں۔

(۶) الجزء السادس :—

کتاب بدء الخلق۔ آفرینشِ عالم، نظامِ شمسی، آسمان، بارش، لیل و نہار، معدنیات، اشجار، پہاڑ، حشرات الارض، عرش وغیرہ عنوانات کے تحت آیات ہیں۔

ہر جلد کے ساتھ مفصل فہرست مضامین شامل ہے اور اس میں ہر موضوع کے متعدد پہلو درج کر دیئے گئے ہیں یعنی جن مسائل کے مختلف پہلو ہیں اور وہ کئی عنوانات کے تحت آ سکتے ہیں انہیں ان تمام عنوانات کے تحت درج کیا گیا ہے۔ مثلاً سفر میں نمازِ قصر کا حکم قرآن میں تلاش کرنا ہو تو وہ سفر کے عنوان کے تحت بھی ملے گا، قصر کے عنوان کے تحت بھی اور نماز کے عنوان کے تحت بھی۔ ان تینوں

عنوانوں کے تحت وہ آیت مل جائے گی جس میں نمازِ قصر کا ذکر ہے۔

کتابت، طباعت اور کاغذ ہر چیز عمدہ ہے۔

(۳)

مفتاح کنوزِ القرآن

مؤلفہ: کاظم بک۔ استنبول (ترکی)، اور قازان (روس) میں کئی بار شائع ہوئی۔
کارخانۂ وطن (لاہور) کے مالک محمد انشاء اللہ صاحب نے ۱۹۳۰ء میں اسے شائع کیا جو بڑے سائز کے ۶۵۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

ہر لحاظ سے عمدہ اور کامیاب کتاب ہے۔ غیر عربی دانوں کے لیے اس میں خوبی کی ایک بات یہ بھی ہے کہ آیات کی تلاش میں مادہ کے بجائے حروفِ تہجی کی بنیاد پر اس کو ترتیب دیا گیا ہے جس کی وجہ سے بہت آسانی پیدا ہو گئی ہے جو آیت تلاش کرنی ہو اس کے کسی مستقل اسم یا فعل کے پہلے اور دوسرے حرف کی مدد سے بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حرف کا نام باب ہے اور دوسرے کا نام فصل۔ اسم مبارک "محمد" تلاش کرنا ہو تو باب "م" فصل "ح" میں ملے گا اور لفظ خلق باب "خ" اور فصل "ل" میں ملے گا۔ کتاب کے آخر میں ابواب اور فصول کی فہرست شامل کر دی گئی ہے ——

یہ ایک بہت ہی مفید کتاب ہے کتابت اور طباعت کے لحاظ سے غنیمت ہے۔

(۴)

الفاظ القرآن المسمّٰی بہ نجوم الفرقان جدید لتخریج آیات القرآن المجید

مؤلفہ: مولوی فقیر اللہ صاحب لاہوری
مطبوعہ: لاہور ۱۳۳۱ھ صفحات ۲۷۴
سائز بڑا۔

اس کتاب میں حروفِ تہجی کی ترتیب سے الفاظ دیے گئے ہیں اور حوالوں کے لیے پارے اور رکوع کے نمبر دیے گئے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں قرآنِ کریم کے رکوعوں کا انڈکس پاروں کی ترتیب کے مطابق دیا گیا ہے۔ یعنی ہر رکوع جس آیت سے شروع ہوتا ہے۔ اس آیت کے ابتدائی چند کلمات لکھ دیے گئے ہیں گویا وہ رکوع کا نام ہے اور ہر پارہ کے مجموعی رکوعوں کی تعداد بھی دی گئی ہے مثال کے طور پر پہلے پارے کے شروع میں لکھا ہے کہ اس کے ۱۶ رکوع ہیں۔ پہلا رکوع سورۃ البقرہ کا "الم" دوسرا "ومن الناس"، تیسرا "یایہا الناس"، اور چوتھا "واذ قال"……

کاغذ، کتابت، طباعت ہر اعتبار سے کتاب ناقص ہے۔

(۵)

نجوم الفرقان

مطبوعہ: فیض بخش ایجنسی فیروز پور ۱۹۰۷ء
چھوٹے سائز کے ۲۴۶ صفحات

یہ کتاب دراصل جرمن مستشرق (فلوگل) کی مشہور کتاب نجوم الفرقان فی اطراف القرآن کا اردو ایڈیشن ہے۔ (اصل کتاب انگریزی میں ہے)۔

الفاظ کی تلاش کے لیے ترتیب ماخذ کے لحاظ سے رکھی گئی ہے اور ماخذ حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق ترتیب دیے گئے ہیں مثلاً ابصار، مستبصرین، بصیر، تبصرہ، بصائر وغیرہ سب "بصر" کے تحت دیے گئے ہیں،

کیونکہ ان سب کا ماخذ یہی لفظ ہے۔ وعلیٰ ھذا القیاس حوالے میں سورہ کے نام کے بجائے نمبر استعمال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی آیت کا نمبر بھی دیدیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں سورتوں کی فہرست دی گئی ہے جس میں سورت کے نام کے ساتھ اس کا نمبر اور اس کے ہر رکوع کی آیات کی تعداد بھی بتائی گئی ہے۔

کتاب کا طباعتی معیار اچھا ہے۔

(۶)

تفصیل آیات القرآن الحکیم (عربی)

مترجم: محمد فواد عبدالباقی

مطبوعہ مصر، بڑا سائز، صفحات ۱۳ ا، ٹائپ

کاغذ، طباعت ہر چیز معیاری

اصل کتاب جولی لابوم نے فرانسیسی میں مرتب کی ہے جسے محمد فواد عبدالباقی صاحب نے عربی میں منتقل کیا ہے۔

یہ کتاب قرآنی مضامین کا بہترین انڈکس ہے کتاب ۱۸ ابواب اور ان کے تحت ۳۵۰ فصول پر مشتمل ہے۔ چند ابواب اور فصول ملاحظہ ہوں۔

ابواب	فصول
التاریخ ـــــ	ابابیل، یاجوج ماجوج، ذوالقرنین، الروم۔
محمد صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ	طبیعۃ الرسالۃ، تائیدِ رسالت، شخصیت، قریش، ہجرت، مدینہ، مہاجرین وغیرہ
التبلیغ ـــــ	دعوت، تبلیغ کی زبان، انبیاء و رسل، انبیائے تورات۔ وہ انبیا جن کا ذکر تورات میں نہیں، مسیح وغیرہ۔
توحید ـــــ	اللہ، وجود باری، وحدانیت، ذات و صفات۔ احکامِ الٰہی، خشیتِ الٰہی۔ وغیرہ
عبادات ـــــ	طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، وغیرہ
نظامِ اجتماعی ـــــ	نکاح، طلاق وغیرہ، معاشرتی احکام وہدایات
علوم وفنون ـــــ	العلم، علم الفلک، التقویم، سمٰوات، رجوم، علم الصحۃ، البلاغہ، الشعرا وغیرہ
علم تہذیب الاخلاق ـــــ	صالحات، فلاح وسعادت، الزہد، مودت، التعاون، تواضع، طاعت، شکر، بخل، وغیرہ

ہر عنوان کے تحت اس سے متعلق جملہ آیات مع نام سورت، نمبر سورت اور نمبر آیت درج کی گئی ہیں۔ ہر آیت الگ الگ سطر میں لکھی گئی ہے جس سے کتاب کے طباعتی حسن کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

(۷)

ریاض القرآن

از: محمد عزیز الدین

مطبوعہ: شیخ الٰہی بخش، جلال الدین کشمیری بازار لاہور (۱۹۲۹ء صفحات ۴۷۹)

الفاظ کی ترتیب حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق ہے۔ مرتب نے دیباچے میں لکھا ہے:

"ترتیب الفاظ کی اس کتاب میں بطورِ لغات رکھی گئی ہے، تاکہ کل الفاظ آسانی سے مل سکیں۔ پھر ایک لفظ کے سامنے خطِ عرضی دے کر اس کے اوپر سورت کا نمبر، نیچے آیت کا نمبر دیا گیا ہے اور معانی الفاظ بزبان اردو سلیس لکھے گئے ہیں۔ چونکہ ہر قرآن شریف میں آیتوں کے نمبر نہیں ہوتے اس لیے کتاب کے پہلے فہرست رکوعات لگادی ہے جس میں ہر ایک آیت کے رکوع

نمبروار درج کر کے ہر ایک رکوع کے ساتھ نمبر ہائے آیات درج کیے گئے ہیں کہ فلاں رکوع فلاں آیت سے شروع ہو کر فلاں پر ختم ہوتا ہے"۔

کتاب کا طباعتی معیار غنیمت ہے۔

(۸)

مفتاح القرآن (انگریزی)

مؤلف: احمد شاہ

مطبوعہ: بنارس (۱۹۰۶ء)

(جہازی سائز کے ۲۲۶ صفحات۔ حصہ اول۔ ۱۰۰ صفحات حصہ دوم)۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں الف سے ی تک قرآن کریم کے الفاظ مع حوالہ دیے گئے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ انگریزی میں تلفظ دیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ مادہ کے لحاظ سے قرآنی الفاظ کے معانی پر مشتمل ہے۔ معانی انگریزی میں دیے گئے ہیں یعنی قرآن کے لفظ کا انگریزی ترجمہ، یہ کوئی باقاعدہ لغت نہیں ہے بلکہ جس طرح بعض کتابوں کے ساتھ فرہنگ یا حل مشکلات شامل ہوتی ہے اس کی حیثیت بھی وہی ہے۔ طباعتی معیار بہت عمدہ ہے۔

(۹)

المرشد الی آیات القرآن الکریم وکلماتہ (عربی)

مؤلف: محمد فارس برکات

مطبوعہ: دمشق۔ بڑا سائز صفحات ۵۹۲۔

طبع ثانی ۱۹۵۷ء

کتاب کے شروع میں ترتیب تلاوت کے لحاظ سے سورتوں کی فہرست مع نمبر دی گئی ہے کیونکہ کتاب میں حوالہ کے لیے صرف سورت کا نمبر دیا گیا ہے۔ اس طرح سورتوں کا یہ انڈکس سورت کا نمبر معلوم کرنے کے لیے سہولت فراہم کرتا ہے۔

کسی لفظ کو تلاش کرنے کے لیے مادہ (Root) کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اس چیز کو سمجھانے کے لیے مؤلف نے دو مثالیں "لفظ کس طرح تلاش کیا جائے" کے عنوان کے تحت دی ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ٥

لفظ	مادہ	صفحہ
كنت	كون	۴۵۳
فظاً	فظظ	۳۷۷
القلب	قلب	۳۹۹
انفضوا	فضض	۳۷۵
حولك	حول	۱۳۵

"کُنْتَ" کا لفظ تلاش کرنے کے لیے اس کے ماخذ "کون" کے تحت تلاش کیا جائے گا۔ "فظاً" کو "فظظ" کے تحت۔ علیٰ ہذا القیاس ہر صفحے کی پیشانی پر مادہ کے حروف درج ہیں جنہیں کسی فہرست کی مدد کے بغیر بھی بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

صفحات کو تین کالموں میں لکیر لگا کر تقسیم کر دیا گیا ہے اور نہایت ہی خوبصورت انداز میں عربی ٹائپ میں آیات اور ہندسے درج کیے گئے ہیں۔ ابواب کا عنوان بہت جلی ہے۔ لفظ کا عنوان نمایاں ہے اور آیات کے الفاظ باریک ٹائپ میں ہیں۔ کتاب کا صوری معیار بہت بلند ہے۔

(۱۰)

ترتیب نزولِ قرآن کریم

مؤلف: پروفیسر محمد اجمل خان ایم۔ اے۔

مطبوعہ: کتاب گھر الہ آباد (۱۹۴۱ء) بڑا

سائز، صفحات ۹۹

یہ دراصل پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کے انگریزی مقالے کا اردو ترجمہ ہے جو مقالہ نگار نے خود ہی کیا ہے۔ اور دسمبر ۱۹۴۸ء میں اخبار مدینہ (بجنور) میں شائع ہو چکا ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس مقالہ میں قرآن کریم اور آیات کی ترتیبِ نزول پر مقالہ نگار نے دادِ تحقیق دی ہے۔ صحابہ کرامؓ اور بعد کے محققین کے درمیان اس موضوع پر جو اختلافات ہیں ان کو بیان کرنے کے بعد مؤلف نے اپنی تحقیقی رائے کا اظہار کیا ہے اور اس پہلو پر اب تک جو کام ہوا ہے مقالہ نگار نے اس کا جائزہ بھی لیا ہے۔ نیز مستشرقین نے اس وادی میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں انہیں بڑی جرأت کے ساتھ واضح کیا ہے۔ قرآنی علوم کے طالب علموں کے لیے یہ مختصر سی کتاب بہت کام کی چیز ہے۔

فہرستِ مضامین کی ایک جھلک سے کتاب کی افادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :۔۔۔۔

- ★ اب تک اس سلسلہ میں کیا گیا کام
- ★ مختلف صحابۂ کرام کے مصاحف
- ★ ترتیبِ نزول کے سلسلے میں مستشرقین کی ناکام کوششیں
- ★ مکّی و مدنی سورتوں میں امتیاز کرنے کا طریقہ
- ★ ترتیب نزولِ قرآن کریم بعدِ ہجرت تا وفاتِ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، وغیرہ

کتاب کے آغاز میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی رائے بھی دی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "مولانا محمد اجمل خان بالقابہ کا مفسرین پر ہمیشہ احسان رہے گا۔ انہوں نے اندرونی شہادت کی مدد سے مکّی سورتوں کے معین کرنے کا راستہ کھول دیا ہے اور روایات کے اختلاف سے جو اغلاق پیدا ہوا تھا اُسے دُور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے"۔

(۱۱)

فہرست موضوعات (قرانی مشمولہ تفہیم القرآن)

مؤلف : مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے سے ۲۶ ویں پارہ کی سورہ احقاف تک چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہر جلد کے آخر میں فہرست موضوعات یعنی قرآن کے مضامین کی فہرست شامل ہے۔ یہ فہرست بڑے سائز کے ۲۲۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے (یہ چاروں جلدوں کی فہرستوں کے مجموعی صفحات کی تعداد ہے)۔

حروفِ تہجی کی ترتیب سے الف سے ی تک عنوانات دیے گئے ہیں۔ چاروں جلدوں کے عنوانات ایک ہی ہیں مثلاً چاروں جلدوں کے پہلے حرف الف کے تحت پہلا لفظ "ابراہیم" ہے۔ اس طرح چاروں جلدوں میں سے ابراہیم کے تحت تمام عنوانات کو یکجا کیا جا سکتا ہے البتہ حوالوں کے لیے چونکہ ہر جلد کے صفحات الگ الگ ہیں اس لیے صفحے کے حوالہ کے ساتھ جلد کا حوالہ بھی دینا ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ انڈکس اپنی موجودہ شکل میں صرف تفہیم القرآن کے ساتھ ہی استعمال ہو سکتا ہے اس لیے کہ تفہیم القرآن کے انڈکس میں تفہیم القرآن ہی کے صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ نیز حوالے میں آیات کا نمبر نہیں

دیا گیا۔ اس لیے موجودہ صورت میں اس سے صرف قارئین تفہیم القرآن ہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر جب تفہیم القرآن اللہ کی مشیت و توفیق سے مکمل ہو جائے تو کوئی صاحب اس انڈکس کو پورے قرآن کے انڈکس کے طور پر مرتب کرنے کی طرف توجہ دیں اور اس طرح سے اس سے استفادے کا حلقہ وسیع ہو جائے۔

(۱۲)

لغات القرآن

تالیف : مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب و مولانا عبدالدائم جلالی صاحب

مطبوعہ : ندوۃ المصنفین دہلی۔ چھ جلدوں میں ہے اور مجموعی صفحات ۲۱۶۲ ہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ قرآن کریم کا لغت ہے لیکن الفاظ کی فہرست کا فائدہ ضمناً حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خود مؤلف نے نام کے ساتھ "مع فہرستِ الفاظ" بھی لکھا ہے۔ اس کتاب کا یہی ضمنی پہلو یعنی فہرستِ الفاظ ہی ہمارا موضوعِ گفتگو ہے۔ اس لیے ہم اسی پہلو کا تعارف کرائیں گے۔ جہاں تک بحیثیت لغات قرآن کا تعلق ہے اس کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان میں اس سے بہتر قرآن کریم کا کوئی لغت ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

کتاب چھ مجلدات پر مشتمل ہے۔ ایک سے چار تک مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی تالیف ہے اور پانچویں اور چھٹی جلد مولانا عبدالدائم صاحب جلالی کی مرتب کردہ ہے۔

اس لغت کو مادہ و ماخذ سے ہٹ کر الفاظ کی موجودہ مشتق شکلوں کی ترتیب پر مرتب کیا گیا ہے۔ مفتاح کنوز القرآن کی مانند (جس کا تعارف اوپر دیا جا چکا ہے) پہلا حرف باب اور دوسرا حرف فصل ہے اس طرح ہر لفظ اور کلمہ بغیر مادہ معلوم کیے آسانی کے ساتھ تلاش کیا جا سکتا ہے۔

حوالے میں سورہ کے بجائے پارے اور رکوع کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مؤلف کے نزدیک ہمارے ہاں (ہندو پاک میں) سورتوں کے ناموں اور آیات کے نمبروں کے بجائے پاروں کے نام اور رکوعوں کے نمبروں کا رواج زیادہ ہے اور یہ بات درست بھی ہے۔

یہ کتاب طباعت، کاغذ وغیرہ ہر لحاظ سے عمدہ اور ندوۃ المصنفین کی روایات کے مطابق ہے اور پاکستان میں دستیاب ہے۔

(۱۳)

تبویب القرآن لضبط مضامین القرآن

مؤلف : مولانا وحید الزمان مرحوم

مطبوعہ : لاہور صفحات ۔۔۔۔ کتابت۔ کاغذ طباعت ناقص

مضامین کی فہرست کے چند ابواب ملاحظہ ہوں۔ اعتقادات، فقہ القرآن، قصص القرآن، المتفرقات سورتوں کی نمبروار فہرست شامل ہے۔

(۱۴)

قرآنِ مُعرّیٰ

مطبوعہ : انجمن حمایت اسلام

قرآن کریم کے مُعرّیٰ نسخوں میں سورتوں اور پاروں کی فہرست کم و بیش ہر قرآن کریم کے ساتھ شامل ہوتی ہے مگر بعض نسخوں میں خاص طور پر کچھ تفصیلی معلومات کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان میں سرِفہرست انجمن حمایتِ اسلام لاہور کا مطبوعہ قرآنِ کریم ہے۔

شروع میں سورتوں، رکوعوں، منزلوں اور پاروں

کی مفصل فہرست شامل ہے۔ نجوم الفرقان جدید کی طرح پورے قرآن کریم کے رکوعوں کا انڈکس دیا گیا ہے۔ یعنی ہر رکوع جن الفاظ سے شروع ہوتا ہے وہ ابتدائی الفاظ بطور رکوع کے نام لکھ دیے گئے ہیں۔ نیز الفاتِ زائدہ، متقدمین اور متاخرین کے معانقے اور سجداتِ تلاوت کی فہرست بھی شامل کر دی گئی ہے۔ سورتوں کی تلاوت اور ترتیبِ نزول دونوں علیحدہ علیحدہ دی گئی ہیں جن سے واقفیت قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے والے ہر شخص کو ہونی چاہیے۔

قرآنِ کریم کے معرّیٰ نسخوں میں اس قسم کی معلومات کم ہی نظر سے گذری ہیں۔

(۱۵)

قرآن مترجمہ مولینا احمد علی مرحوم

مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کے ترجمہ قرآن کریم کے شروع میں بھی قرآن کے مضامین کی ایک فہرست شامل ہے۔ وہ فہرست فقہی ابواب کے مطابق ترتیب دی گئی ہے مثلاً کتاب العقائد، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، نکاح، طلاق وغیرہ، اس طرح کے مسائل کے تلاش کرنے میں اس سے کافی مدد مل سکتی ہے۔

(۱۶)

حمائل شریف مترجم

ترجمہ: شاہ رفیع الدین صاحبؒ

مطبوعہ: لاہور ۱۳۲۶ھ

شروع میں مضامینِ قرآن کی مفصل فہرست شامل ہے۔ چند ابواب ملاحظہ ہوں:

خدا کا ثبوت، توحید کا بیان، ردِ شرک، اللہ کی صفات، عذاب، آزمائش، تقدیر، لوحِ محفوظ، اسلام، ایمان، وحی، پیغمبر، جنت کی نعمتیں، سود، قرض، نکاح، طلاق، بیع وغیرہ

(۱۷)

حمائل التفسیر

از: ڈاکٹر محمد الحکیم

مطبوعہ: کرنال ۱۹۰۶ء

شروع میں مختصر فہرست مضامین درج ہے۔ ایک فہرست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر شامل ہے اور آخر میں سورتوں کی فہرست ہے۔

(۱۸)

انڈکس قرآنی (یعنی فہرست احکامِ الٰہی)

مرتبہ: سید معصوم علی صاحب سبزواری

شائع کردہ: ادارۂ تعلیم انسانیت، ۱/۱۴۵

مسجد روڈ، بہار کالونی کراچی

مرتب کے سامنے اس انڈکس کا خاکہ ۱۲ جلدوں کا ہے اور ابھی اس کی جلد اول طبع ہوئی ہے، جس کا عنوان "کتاب الاخلاق" ہے۔ کتاب الاخلاق کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: اخلاق حسنہ، اخلاق سیئہ، اخلاق متفرقہ

اس میں موضوعات کے تحت آیات کے اردو تراجم مرتب کیے گئے ہیں اور آیت کا حوالہ جدید طریق سے درج کیا گیا ہے جس کے ذریعے بہ سہولت اسے قرآن مجید میں دیکھا جا سکتا ہے۔ فاضل مؤلف نے اردو تراجم مستند مفسرین کے ہاں سے لیے ہیں۔

جلد اول ۲۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ کتاب مکمل ہو گئی (اور خدا معود بزرگ مؤلف کی اس میں مدد فرمائے) تو قرآنی خزائنِ علم و ہدایت کے دروازے اردو خواں عوام پر پوری طرح کھل جائیں گے۔

نہایت قیمتی کاغذ پر آفسٹ کی طباعت ہے اور اس لحاظ سے قیمت بھی بہت کم رکھی گئی ہے، یعنی صرف دس روپے۔

مزید کتب کا اجمالی تذکرہ

اس موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں تالیف کی گئی ہیں لیکن ان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ ذیل میں چند کتابوں کے نام ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ جواہر القرآن۔ از امام غزالیؒ۔ مختصر سی کتاب ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کے متعلق آیات جمع کی گئی ہیں

۲۔ فتح الرحمٰن لطالب آیات القرآن (از فیض اللہ حسینی)

۳۔ مفتاح کنوز القرآن (جس کا تعارف اوپر دیا جا چکا ہے) اسی طرز کی کتاب ہے۔ آیات تلاش کرنے کا انداز بھی سہل ہے۔

۴۔ الجواہر الصمدیہ (مطبوعہ لاہور)

۵۔ دلیل الحیران فی الکشف من آیات القرآن (مطبوعہ مصر)

۶۔ سبیکۃ الابریز فی فہرس الکتاب العزیز

۷۔ مفتاح القرآن (از مرزا قلیچ بیگ لڑکانہ)

۸۔ اقتباس الانوار من کلام الغفار (از مولوی عبید اللہ مرحوم لاہور) اس کتاب میں ان آیات کے جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے جن میں روحانی تعلیم کا ذکر ہے۔

۹۔ آئینہ قرآن (از پادری ویری) اس کتاب میں ان آیات کے حوالے دینے کا اہتمام کیا گیا ہے جو عیسائیوں سے متعلق ہیں۔ دوسری آیات کی طرف توجہ بہت کم کی گئی ہے۔ عیسائیوں کے ساتھ گفتگو کرنے والے حضرات کے لیے بہت مفید کتاب ہے۔

۱۰۔ تنقید القرآن (از پادری عماد الدین)

۱۱۔ سائنس والوں کو دعوتِ حق (مرتبہ اسد اللہ خاں علیگ) اس رسالے میں ایسی تمام آیتیں مع ترجمہ (ترجمہ مولینا فتح محمد جالندہری کا ہے) درج کی گئی ہیں جن کا تعلق کسی بھی صورت میں سائنس کے موضوع سے ہے۔

ایک غیر مطبوعہ قرآنی انڈکس

الفاظ القرآن

قلمی نسخہ، مؤلفہ حافظ غلام حسین مرحوم و مغفور[1]

اس انڈکس کے مرتب دینی علوم کے ساتھ ساتھ عربی لغت و ادب میں مہارت رکھتے تھے، نادم تخلص کے ساتھ عربی و فارسی میں شعر گوئی اور تاریخ گوئی کا شغل بھی فرماتے تھے لیکن اشاعت و شہرت سے طبعاً گریز تھا ان کی متعدد تصانیف کے مسودے جن میں لغات الاضداد (عربی) بھی شامل تھی، ضائع ہو گئے ہیں۔ صرف یہی کتاب محفوظ ہے[2]۔ اس کتاب میں زمانۂ تالیف کے جو حوالے درج ہیں ان کے رو سے یہ اب سے ۷۵ سال پیشتر یعنی ۱۳۱۳ھ میں مرتب ہوئی۔ اس لحاظ سے برصغیر کے بیشتر انڈکس اس کے بعد مرتب ہوئے ہیں۔

اس فہرستِ الفاظ و آیاتِ قرآنیہ میں عام غیر عربی داں آدمی کی سہولت کو مدنظر رکھا گیا ہے اور مادہ کے بجائے حروف تہجی کی ترتیب سے تمام کے تمام الفاظ (مشتقات) پر انڈکس کو مبنی کیا گیا ہے۔ ہر آیت کا ہر لفظ اپنے باب میں

[1] فاضل مؤلف ضلع راولپنڈی کے ایک گاؤں جابہ یا جادہ متصل تخت پڑی تھانہ روات کے رہنے والے تھے۔

[2] یہ مخطوطہ مدیر سیارہ نعیم صدیقی صاحب کے زیر استعمال ہے۔ مؤلف مرحوم ان کے خاندانی بزرگوں میں سے تھے۔

آیت متعلقہ کے سیاق و سباق کے ساتھ درج کیا گیا ہے اس طرح یہ سہولت پیدا ہو گئی ہے کہ جس خاص آیت کو برآمد کرنا ہو اسے انڈکس ہی میں مشخص کیا جا سکتا ہے۔ البتہ زمانۂ ترتیب کے رواج کے مطابق سورت اور آیت کے نمبر کے بجائے پارہ اور رکوع کا نمبر درج کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر آپ لفظ مَلَكًا کو لیجیے۔ اس سے متعلقہ آیات کا اشاریہ یوں ملے گا :—

وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ۔ ۔۔۔ ۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا ۔ ۔۔۔ ۔

عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا ۱۵ — ۱۱

یا مثلاً لفظ "تِسْعَةَ" کو لیجیے :۔

فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ ۱۹ — ۱۹

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۲۹ — ۱۵

اس انڈکس پر تھوڑی سی محنت مزید کی جائے یعنی ایک تو سورۃ اور آیات کے نمبر اور دوسرے اعراب لگا دیئے جائیں تو یہ بے حد مفید اور سہل الاستعمال ہے۔

AF-413

صرف ایک لمحہ کے لیے ——

کیا آج

سوچیے!

—— آپ نے قرآن کا کچھ حصہ پڑھا ؟

—— کسی حلقۂ درس میں شمولیت کی ؟

—— قرآن اور ترجمۂ قرآن سنا ؟

—— قرآن سے متعلق کسی کتاب یا مضمون کا مطالعہ کیا ؟

—— قرآن کے کسی مضمون سے کسی سے کوئی گفتگو کی ؟

—— قرآن کی کوئی بات گھر والوں، خصوصاً بچوں کو سنائی ؟